



فردوسِ انیس

حسن بن صباح اور اسکی بہشت کی پراسرار داستان

عنایت اللہ التمش

PDFBOOKSFREE.PK

ادبی دنیا ۵۱۰ گلی منیا محل
دہلی

فردوسِ ابلیس

دوسرا اور آخری حصہ

(2)

حسن بن صباح اور اُس کی بہشت کی پراسرار داستان

عنایت اللہ

ادبی دنیا، نیا محل، ۱۱۰۰۰

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

طابع :..... ریحان احمد صدیقی

مصنف :..... عنایت اللہ التمش

ایڈیشن :..... 2000

تعداد :..... 1100

مطبوعہ :.....

قیمت :..... فی جلد -/100 روپے

ناشر

ادنی دنیا۔ ۵۱۰/ ٹیا محل جامع مسجد دہلی۔ ۶

پیش لفظ

”فردوسِ ابلیس“ کا پہلا حصہ آپ نے پڑھ لیا ہے۔ اب دوسرا حصہ ملاحظہ فرمائیے جو آخری ہے۔ اس میں یہ داستانِ ابلیس ختم ہو جاتی ہے۔

پہلے حصے میں آپ نے پڑھ لیا ہے کہ حسن بن صباح اصل میں کیا تھا، وہ کس طرح ابھرا اور کیسے کیسے دلچسپ اور سنسنی خیز ہتھکنڈوں اور کیسی کیسی فریب کاریوں سے مخلوقِ خدا کے دلوں پر اور ان کے سوچنے کی صلاحیتوں پر غالب آ گیا۔ تاریخ میں چند اور شخصیتوں نے فریب کاری اور قتل و غارت میں شہرت پائی اور ان کے نام تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں لیکن حسن بن صباح کی اہلیست کے سامنے یہ تاریخی شخصیتیں ایسی ہیں جیسے سورج کے سامنے چراغ رکھ دیئے جائیں۔

حسن بن صباح نے سب سے بڑا اور انتہائی گھناؤنا فراڈ اللہ کے عظیم دین اسلام کے ساتھ کھیلا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اہل سنت ظاہر کرتا تھا۔ یہ اس لئے کہ اس کا دائرہ عمل سلطنتِ اسلامیہ کے اندر تھا اور حکومتِ اہل سنت کی تھی۔

اس نے اپنی اہلیست کی تبلیغ میں ہمیشہ اسلام کا نام لیا، اسلام کے حوالے سے بات کی اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لیتا تو اس پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی لیکن باطنی طور پر وہ اللہ کا بھی منکر اور اللہ کے رسول کا بھی منکر تھا۔ لوگ اسلام اور رسالت کے معاملے میں بہت ہی جذباتی تھے لیکن علم سے بے بہرہ تھے۔ اس کے نتیجے میں وہ حسن بن صباح کے جال میں آتے گئے۔

اس کے ساتھ ہی حسن بن صباح کو یہ سہولت مل گئی کہ آج کل کے برادری سسٹم کی طرح اس دور میں لوگوں کے الگ الگ قبیلے تھے۔ ہر قبیلہ اپنے سردار کا حکم مانتا تھا۔ اکثر سردار عیش و عشرت کے دلدادہ تھے۔ حسن بن صباح نے لوگوں کے مذہبی جذبات کو دکھتی رگ کی طرح مٹھی میں لیا اور ان کے سرداروں کی عیش پرستی کو پیش

نظر رکھا۔ یہ ان سرداروں کی دھکتی رگ تھی۔ حسن بن صباح نے انہیں اپنی تربیت یافتہ لڑکیوں کے ذریعے شیشے میں اتار لیا۔

لوگ جب دل و جان سے اس ابلیس کے مرید ہو جاتے تو وہ انہیں اسلام کے احکامات اور پابندیوں سے آزاد کر دیتا تھا۔ کہتا تھا کہ اسلام انسان پر کوئی جبر نہیں کرتا۔ جو جی میں آئے کرو۔

”فردوسِ ابلیس“ میں آپ کو یہ ساری تفصیلات واقعات کی صورت میں ملیں گی۔ کچھ بھولے بھالے اور بعض بڑے ہی چالاک اور ہوشیار کردار جن میں حسن بن صباح کے خون کے پیاسے بھی تھے، اس کے جال میں آتے اور پھر اسی کے گن گاتے یوں دیکھیں گے جیسے سکرین پر فلم چلتی دیکھ رہے ہوں۔

ایک اور وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے ملک میں ”تاریخی ناول“ دبا کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ طرزِ تحریر بے حد جذباتی ہوتا ہے۔ فلمی قسم کا رومان لازمی سمجھا جاتا ہے۔ ان ہی دو اجزاء سے ناول میں ایسی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے جو پڑھنے والوں کو نشے جیسا لطف دیتی ہے، اسی لئے ”تاریخی ناول“ ہمارے ہاں بہت مقبول ہوئے ہیں لیکن ان میں تاریخی حقائق برائے نام اور ناول یعنی افسانہ زیادہ ہوتا ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ ان نام نہاد تاریخی ناولوں کے مصنفین نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہی نہیں۔

”فردوسِ ابلیس“ کو بھی قارئین کرام تاریخی ناول ہی کہتے ہیں لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میری یہ کاوش ناول کم اور تاریخ زیادہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے صحیح، مستند اور مکمل تاریخ پیش کی ہے، مؤرخوں اور بعد کے تاریخ نویسوں کے حوالے بھی ساتھ ساتھ دیئے ہیں، البتہ اس تاریخی داستان کو تاریخ کے مضمون کی طرح خشک، بے مزہ اور بور نہیں رہنے دیا۔ اسے ایک دلچسپ ناول کے انداز سے لکھا ہے اور ایک حقیقت کو افسانے سے زیادہ پُر لطف بنا دیا ہے۔

کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پڑھئے اور دیکھئے کہ میرا دعویٰ کہاں تک صحیح ہے۔

ہکماري اسلامي تاريخي ناول

۶۰٪	شاہین	نسیم حجازی
۶۰٪	یوسف بن تاشقین	" "
۶۰٪	آخری چٹان	" "
۵۰٪	محمد بن قاسم	" "
۷۰٪	معظم علی	" "
۷۰٪	اور تلوار ٹوٹ	" "
۶۰٪	اندھیری رات کے مسافر	" "
۵۰٪	کلیسا اور آگ	" "
۹۰٪	قیصر و کسریٰ	" "
۷۵٪	قافلہ حجاز	" "
۳۵٪	داستان مجاہد	" "
۲۰٪	پاکستان سے دیارِ حرم تک	" "
۳۵٪	سفید جزیرہ	" "
۵۰٪	انسان اور دیوتا	" "

اکبری کتب خانہ

۵۱۰، مشیاء محل، جامع مسجد دہلی ۶

قریب لا کر کتے کھول دیے گئے۔ اس باطنی کے جسم پر کوئی بُوئل دی گئی تھی جس پر کتے ٹوٹ پڑے۔ تماشاؤں کا ہجوم دُور کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اُس باطنی کی چیخیں زمین و آسمان کو ہل رہی تھیں۔ آخر اس نے بڑی ہی بلند آواز میں نعرہ لگایا — ”امام حسن بن صباح زندہ باد“ — یہ اس کی آخری آواز تھی۔ اس وقت تک کتے اس کی کھال اُدھڑ چکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں کتوں نے اس کا ایک ایک عضو الگ الگ کر دیا۔ اس کا سر دُور مچا پڑا اور پھر کتے اس کے جسم کے ٹکڑے اٹھا کر اُدھر اُدھر ہو گئے۔

لوگوں کو یہ نہ بتایا گیا کہ اس شخص کو یہ سزا کیوں دی گئی ہے لیکن لوگوں میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ اس نے سلطان ملک شاہ کو زہر دیا ہے۔ ایسی غصیلی آوازیں اور ایسی للکار بھی سنائی دی کہ اس شخص کے خاندان کے بچے بچے کو یہاں لا کر کتوں سے پھڑوا دو۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کے گھر کو آگ لگا دو۔ یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔

اس سوال کا صحیح جواب صرف روزینہ دے سکتی تھی جو اس باطنی کی بہن تھی۔ اُس وقت روزینہ سلطان کے محل کے ایک کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اُسے ابھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی قسمت کا کیا فیصلہ ہو گا۔

سلطان ملک شاہ سپردِ خاک ہو گیا اور اُس کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ گیا اور سلطان کے گھر میں روزینہ ایک مسئلہ بن گئی۔ اس خاندان کی کوئی عورت روزینہ کو قبول نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ سلطان کے قاتل کی بہن تھی۔ یہ شک بے جا نہ تھا کہ وہ بھی قتل کی اس سازش میں شریک تھی۔ سب دیکھ رہے تھے کہ اُس نے سلطان کے بڑے بیٹے برکیارق کو دامِ محبت میں گرفتار کر لیا تھا اور برکیارق نے اعلان کر دیا تھا کہ کوئی بھی روزینہ سے باز پرس کی جرأت نہ کرے اور وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرے گا۔ برکیارق نے تو یہ اعلان کر دیا تھا لیکن برکیارق کی ماں کے لئے یہ شادی قابلِ قبول نہیں تھی۔ وہ شام کے وقت کسی کو بتائے بغیر اُس کمرے میں چلی گئی جہاں روزینہ اکیلی بیٹھی تھی۔ تصور میں لایا جاسکتا ہے کہ سلطان ملک شاہ مرحوم کی بیوی کس قدر غمگین اور ادا اس ہو گی۔ روزینہ نے اسے دیکھا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیٹھ جاؤ لڑکی!“ — سلطان مرحوم کی بیوہ نے ایک طرف بیٹھتے ہوئے کہا —

”میں تمہارے ساتھ کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔ تمہیں صرف میرے بیٹے نے ہی پسند

بلکہ رعایا کا بچہ بچہ اُس کا نام احترام اور محبت سے لیتا تھا۔

وہ جب فوت ہوا تو اس کے گھر میں جو کھرام بپا ہوا وہ جنگل کی آگ کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے سارے شہر میں پھیل گیا۔ ایک ہجوم تھا جو اس کے گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ دربان کسی کو اندر جانے سے روک نہ سکے تھے۔ خود دربان دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ان سب کے سامنے اس باطنی جعلی درویش کو پکڑ کر باہر لائے اور اُسے زد و کوب کیا جا رہا تھا۔ گھر کی عورتیں چیخ چلا رہی تھیں کہ اس کافر نے سلطان کو زہر دے دیا ہے۔ اس قسم کی صورت حال میں سلطان کی موت کا اصل باعث پوشیدہ نہ رکھا جاسکا۔

ایک تو سارے شہر میں برکیارق نے اعلان کروا دیا کہ سلطان ملک شاہ فوت ہو گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہر طرف قاصد دوڑا دیے گئے کہ تمام سلطنت میں یہ اطلاع پہنچ جائے۔ اس اعلان کے ساتھ دوسرا اعلان یہ بھی کروا دیا کہ کل نماز جنازہ کے بعد تمام لوگ گھوڑ دوڑ کے میدان میں اکٹھے ہو جائیں، ایک باطنی کو سزائے موت دی جائے گی۔ اس اعلان سے قدرتی طور پر ہر کسی کے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ اس باطنی کو سزائے موت کیوں دی جائے گی۔

سلطان ملک شاہ کا سرکاری عملہ، گھر کے ملازمین اور دیگر شاہی خاندان سے کوئی نہ کوئی تعلق رکھنے والے افراد کچھ کم تعداد میں نہ تھے۔ جذبات کی گرما گرمی میں ہر فرد جو اس راز سے واقف تھا، یہ سوال پوچھنے والوں کو صحیح جواب دیتا اور غصے کا اظہار یوں کرتا تھا کہ کل اس کافر کو کتوں سے پھڑوایا جائے گا۔



اگلے روز ظہر کی نماز کے بعد جنازہ اٹھا اس وقت تک جہاں جہاں تک اطلاع پہنچ سکتی تھی وہاں وہاں سے لوگ سیلاب کی طرح اُمنڈ کر مڑ میں آگئے تھے۔ نماز جنازہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں پڑھائی گئی۔ اس کے بعد سلطان ملک شاہ کو قبر میں اتارا گیا اور جب قبر میں مٹی ڈال دی گئی تو اُس باطنی کو میدان میں لایا گیا جس نے سلطان مرحوم کو زہر دیا تھا۔ اس کی سزا کے لئے گڑھا پہلے سے تیار تھا اسے گڑھے میں کھڑا کر دیا گیا جو اس کے گھٹنوں سے ذرا اوپر تک بھر رہا تھا۔

گڑھے میں مٹی ڈال کر مٹی کو اچھی طرح کوٹ کوٹ کر دبایا گیا اس شخص کے بازو کھول دیے گئے۔ ایک طرف سے چار خونخوار شکاری کتے لائے گئے۔ اس شخص کے

نہیں کیا تھا بلکہ مرحوم سلطان نے اور میں نے بھی تمہیں دل سے پسند کیا اور فیصلہ کر دیا تھا کہ برکیارق تمہارے ساتھ شادی کر لے لیکن جو ہوا وہ تمہارے سامنے ہے۔ میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ اُس شخص کی بہن کو اپنی بہو بنا کر ایک سلطان کے خاندان کی فرد بالوں جس نے صرف مجھے ہی بیوہ نہیں کیا بلکہ مرحوم کی دو اور بیویاں بھی بیوہ ہوئی ہیں اور لوگوں سے پوچھنا کہ وہ یوں کہہ رہے ہیں کہ سلطنت سلجوقیہ بیوہ ہو گئی ہے۔ میں تمہیں کوئی سزا سنانے نہیں آئی۔ میں تمہارے ساتھ ایک نیکی کرنا چاہتی ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں کہاں جانا ہے۔ میں دو چار محافظوں کے ساتھ باعزت طریقے سے تمہیں وہاں تک پہنچانے کا انتظام کر دوں گی۔“

”محترم خاتون!“ — روزینہ نے غم سے بوجھل آواز میں کہا — ”یہ تو بعد کا حادثہ ہے کہ سلطان میرے بھائی کے ہاتھوں اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اس صورت میں یہی ہونا چاہئے کہ آپ سب مجھے دھتکار دیں میں اس سے پہلے کی بات آپ کو سناتی ہوں۔ برکیارق نے جب مجھے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو میں نے انکار کر دیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ میں شاہی خاندان کے قابل نہیں۔ ہم آپ کے مقابلے میں بہت چھوٹے لوگ ہیں خاتون محترم! برکیارق نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اُس کے ساتھ یہاں آؤں اور سلطان مرحوم اور آپ مجھے دیکھیں۔ میں نہیں آرہی تھی۔ آئی اس لئے کہ میرے بھائی نے یہاں آنا تھا اور وہ مجھے اکیلا سرائے میں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ اُس کی یعنی میرے بھائی کی نیت کیا تھی۔ میں یہاں آگئی سلطان مرحوم نے مجھے دیکھا.....“

”وہ باتیں مجھے کیوں سناتی ہو!“ — سلطان مرحوم کی بیوہ نے کہا — ”میں نے تمہیں کوئی سزا نہیں دینی میں کہہ چکی ہوں کہ تمہیں باعزت طریقے سے رخصت کروں گی۔“

”میری عرض ہے کہ میں جو کہنا چاہتی ہوں وہ آپ سن لیں“ — روزینہ نے کہا — ”میں یہ بتا رہی ہوں کہ میں برکیارق کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر چکی تھی۔ برکیارق نہیں مان رہا تھا۔ سلطان مرحوم نے اور آپ نے بھی مجھے قبول کر لیا تو میں خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد جو خوفناک اور انتہائی غم ناک صورت پیدا ہوئی، اس کے پیش نظر میں اپنے آپ کو اس احترام اور عزت کی حق دار نہیں سمجھتی جو آپ مجھے دے

رہی ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ جس طرح آپ نے میرے بھائی کو سزائے موت دی ہے۔ اسی طرح مجھے بھی سزائے موت دیں۔ میں سلطان مرحوم کے قاتل کی بہن ہوں۔ میں رحم کی طلب گار نہیں۔“

”کیا تمہیں معلوم تھا کہ تمہارا بھائی سلطان کو زہر دینا چاہتا ہے؟“ — بیوہ نے پوچھا۔

”نہیں!“ — روزینہ نے بڑی زور سے سر ہلا کر کہا — ”اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں برکیارق کو یتیم نہ ہونے دیتی اور اسے دھوکہ نہ دیتی۔ میں کوئی بات چھپا نہیں رہی۔ سچ بول رہی ہوں۔ سچ یہ ہے کہ برکیارق پہلا آدمی ہے جسے میں نے دل و جان سے چلایا ہے اور برکیارق مجھے اس سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔ میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ میں اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر سکوں۔ میں اب برکیارق کی بیوی نہیں بنوں گی۔ مجھے اپنے بھائی کی نیت کا علم تھا یا نہیں، یہ الگ بات ہے لیکن یہ حقیقت بدل نہیں سکتی کہ میں سلطان کے قاتل کی بہن ہوں۔ مجھے سزائے موت ملنی چاہئے۔“

”تم لوگ آخر آئے کہاں سے تھے؟“ — سلطان کی بیوہ نے پوچھا — ”کیا تمہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تمہارا بھائی باطنی ہے؟..... یہ میں کیسے مان سکتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ حسن بن صلیح کے فدائین میں سے تھا۔“

”محترم خاتون!“ — روزینہ نے کہا — ”ہمارا کوئی ایک ٹھکانہ ہوتا تو میں آپ کو بتاتی کہ ہم کہاں سے آئے ہیں۔ بھائی نے بتایا تھا کہ ہم اصفہان کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں میرے ماں باپ مر گئے تھے اور اس بھائی نے مجھے پالا پوسا تھا۔ میں نے اسے خانہ بدوش ہی دیکھا۔ چھوٹا موٹا کاروبار کرتا تھا جس سے ہمیں دو وقت کی روٹی اور سفر کے اخراجات مل جاتے تھے۔ ہم کئی ایک شہروں اور قصبوں میں ایک ایک سال اور دو دو سال بھی رہے ہیں۔ بھائی مجھے ہمیشہ چار دیواری میں بند رکھتا تھا اس لئے میں نہیں بتا سکتی کہ باہر اس کی سرگرمیاں اور دلچسپیاں کیا تھیں اور وہ کن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ وہ ہر سال حج کا ارادہ کرتا تھا جو پورا نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ میرے فرض سے فارغ ہو کر حج کا فریضہ ادا کرنے کا عزم کئے ہوئے تھا۔“

اس گفتگو کے دوران روزینہ روتی رہی، آنسو پونچھتی رہی اور کبھی تو وہ سسکنے لگتی تھی۔

”میرے بیٹے نے فیصلہ سنا دیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ہی شادی کرے گا۔“
 سلطان کی بیوہ نے کہا — ”وہ میری نہیں مانے گا اور وہ کسی کی بھی نہیں مانے گا۔ کیا تم اس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر سکتی ہو؟“

”انکار ہی تو کر رہی ہوں“ — روزینہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا — ”میں یہ جو کہتی ہوں کہ مجھے بھی سزائے موت دے دیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں قاتل کی بہن ہوں اور اس کے ساتھ تھی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں، کوئی گھر اور میرا کوئی وارث نہیں، میرے لئے ایک ہی پناہ ہے اور وہ قبر ہے۔ میں آپ سے عرض کرتی ہوں کہ مجھے قبر میں اتار دیں۔ میں آپ کو فیصلہ سنا چکی ہوں کہ آپ کے خاندان کی فرد نہیں بنوں گی نہ اپنے آپ کو اس کا حق دار سمجھتی ہوں۔“

برکیارق کی ماں روزینہ کے رونے سے، اس کے بولنے کے انداز سے اور اس کے بار بار یہ کہنے سے کہ اسے سزائے موت دی جائے، اتنی متاثر ہوئی کہ اس سوچ میں پڑ گئی کہ اس لڑکی کو بھٹکنے کے لئے یا کسی غلط آدمی کے ہاتھ چڑھ جانے کے لئے تنہا نہ چھوڑے۔ یہ تو برکیارق کی ماں کا فیصلہ تھا کہ اُس کا بیٹا اس لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرے گا لیکن وہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ لڑکی کو کہاں بھیجے۔ ویسے بھی وہ سلطان مرحوم کی طرح رحم دل عورت تھی۔

”میں تمہیں اپنے گھر سے نکالنا نہیں چاہتی روزینہ!“ — سلطان کی بیوہ نے کہا — ”اگر میں تمہاری شادی کسی اور آدمی سے کروادوں تو تم قبول کر لو گی؟“

”میں بلا سوچے کوئی جواب نہیں دے سکتی“ — روزینہ نے کہا — ”خدا کی قسم، ابھی تو میرے دل اور دماغ پر اس قدر بوجھ ہے کہ میں یہی ایک فیصلہ کئے ہوئے ہوں کہ مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔“

”میں تمہیں زندہ رہنے کا حق دیتی ہوں“ — سلطان کی بیوہ نے کہا — ”تم سوچ لو پھر مجھے بتا دینا، میں تمہارا کوئی بہتر بندوبست کروں گی۔“

”محترم خاتون!“ — روزینہ نے کہا — ”آپ یہ کام کریں کہ برکیارق کے دل سے مجھے نکال دیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسے قاتل کریں کہ میرا خیال چھوڑ دے۔ بیشک وہ سلطان ہو گیا ہے اور اُس نے سلطان کی حیثیت سے حکم دیا ہے کہ وہ میرے ساتھ ہی شادی کرے گا لیکن اُس کا یہ حکم مجھے اچھا نہیں لگا۔ بیٹے ماؤں کو حکم دیتے اچھے

نہیں لگتے بلکہ یہ گناہ ہے۔ میں اس گناہ میں شریک نہیں ہونا چاہتی۔“
 سلطان کی بیوہ نے سر جھکا لیا جیسے اسے کوئی اور سوچ آگئی ہو۔ کمرے کا دروازہ
 کھلا۔ ماں نے اور روزینہ نے دیکھا، دروازے میں برکیارق کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے کے
 تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے ماں کا اس کمرے میں آنا اچھا نہیں لگا۔



”آپ کا احترام مجھ پر فرض ہے ماں!“ — برکیارق نے اپنی ماں سے کہا —
 ”لیکن یہ پوچھنا میرا حق ہے کہ آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟..... میرا خیال ہے کہ آپ
 اسے یہ کہنے آئی ہیں کہ یہ قاتل کی بہن ہے اس لئے اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔“
 برکیارق روزینہ کے بستے آنسو دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اُس کی ماں اسے
 کیا کہہ رہی ہوگی۔

”برکیارق!“ — روزینہ نے کہا اور ذرا رک کر بولی — ”معاف رکھنا مجھے
 برکیارق نہیں بلکہ مجھے سلطان محترم کہنا چاہئے..... آپ کی والدہ نے جو کچھ کہا اور جو
 کچھ میں نے انہیں کہا ہے وہ میں لفظ بہ لفظ سنا دیتی ہوں۔“
 روزینہ نے وہ تمام باتیں جو اس کے اور برکیارق کی والدہ کے درمیان ہوئی تھیں
 سنا دیں۔

”تمہیں اس فیصلے پر عمل کرنا ہو گا جو میں سنا چکا ہوں“ — برکیارق نے کہا —
 ”میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں تمہیں حکم دے کر اپنی بیوی بتاؤں گا۔ یہ میرے دل کی
 آواز اور میری روح کا مطالبہ ہے۔“

”روح کی آواز روح ہی سن سکتی ہے سلطان محترم!“ — روزینہ نے کہا۔
 ”میری روح مر گئی ہے۔ میرے بھائی نے سلطان کو ہی زہر نہیں دیا بلکہ میری روح کو بھی
 زہر دے کر مار ڈالا ہے۔ میرے ضمیر پر بڑے ہی گھناؤنے جرم کا بوجھ ہے۔ میں یہاں
 سے بھاگ جاؤں گی اور میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ مجھے بھاگ جانے
 دیں۔“

”میرے عزیز بیٹے!“ — برکیارق کی ماں بول پڑی — ”تم ابھی نوجوان ہو۔
 میری عمر دیکھو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے اور انسانوں کو پڑھا ہے۔ میں تمہیں اس شادی کی
 اجازت دے سکتی ہوں لیکن آگے جو کچھ ہو گا وہ میں جانتی ہوں۔“

”یہ بتاؤ روزینہ!“ — برکیارق نے پوچھا — ”تم نے میری ماں سے کہا ہے کہ تمہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ تمہارے بھائی کی باہر سرگرمیاں کیا تھیں اور وہ کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا؟ وہ باطنی کیسے بنا؟..... اُس نے مرنے سے پہلے امام حسن بن صباح کا نعرو لگایا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ حسن بن صباح کے فدائین میں سے تھا... وہ فدائی کیسے بنا تھا؟ تم جانتی ہوگی!“

”میں کچھ بھی نہیں جانتی“ — روزینہ نے جواب دیا — ”وہ مجھے الموت لے گیا تھا۔ وہاں ہم سات آٹھ مہینے رہے تھے۔ میں نے آپ کی والدہ محترمہ کو بتایا ہے کہ مجھے وہ چار دیواری میں بند رکھتا تھا اور مجھے کچھ بھی نہیں بتاتا تھا کہ وہ باہر کیا کرتا ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ وہ باطنیوں سے جا ملا تھا اور جیسے کہ آپ کہہ رہے ہیں وہ فدائی بن گیا ہو گا۔ میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ روزینہ، اللہ کرے تمہیں کسی نیک آدمی کے پتے باندھ دوں تو میں حج کا فریضہ ادا کر لوں۔“

”ماں!“ — برکیارق نے کہا — ”آج ہی تو ہم نے اپنے عظیم باپ کو دفن کیا ہے۔ غم اور دکھ ابھی تازہ ہے۔ کچھ دن گزر جانے دیں۔ اس لڑکی کو یہیں رہنے دیں۔ میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا، کچھ دن انتظار کر لیں۔“

”سلطان محترم!“ — روزینہ نے کہا — ”آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے مجھے کہا تھا کہ آپ کو میری یہ خوبی پسند آئی ہے کہ میں وہی بات کرتی ہوں جو میرے دل میں ہوتی ہے..... میں سچ بولتی اور سچ سنتی ہوں خواہ وہ کتنا ہی تلخ ہو۔ میرے ذہن میں گناہ کا تصور ہی نہیں آیا اس لئے مجھ میں اخلاقی جرأت بھی ہے۔ میں آپ کو آپ کا باپ واپس نہیں دے سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنی جان دے دوں شاید اس سے آپ کے اور آپ کی والدہ محترمہ اور خاندان کے دوسرے افراد کی تسکین ہو جائے۔ یہ میری روح کی آواز ہے کہ مجھے بھی سزائے موت ملنی چاہئے۔ میں آپ کی والدہ محترمہ کو بتا چکی ہوں کہ میں زندہ رہوں گی بھی تو کس کے لئے؟“

”میرے لئے!“ — برکیارق نے کہا — ”میں جو فیصلہ کر چکا ہوں اس پر قائم رہوں گا لیکن اپنی ماں سے اجازت لینے کے لئے میں کچھ دن انتظار کروں گا۔“

یہ حسین و جمیل لڑکی برکیارق کے اعصاب پر تو پہلے ہی غالب آچکی تھی لیکن اب اس نے جو باتیں کیں اور جس انداز سے کیں اس سے وہ اور زیادہ متاثر ہوا۔ اس کی ماں

بھی شش و پنج میں پڑ گئی اور ماں بیٹے نے فیصلہ کیا کہ روزیہ کو کچھ دن یہیں رکھا جائے اور پھر کچھ فیصلہ کیا جائے۔



مرؤ پر غم و غصے کی جو گھٹنا چھا گئی تھی وہ سلطان کی موت کی خبر کے ساتھ ساتھ تمام تر سلطنت سلجوقیہ پر چھا گئی۔ ساری سلطنت ماتم کدہ بن گئی۔

الموت میں خوشیوں کا ہنگامہ تھا۔ وہاں سلطان ملک شاہ کی موت کی خبر پہنچی تو باطنی گھروں سے نکل آئے اور خوشی سے ناچنے کو دے لگے۔ جشن کا سماں بندھ گیا۔ مرؤ چونکہ دار السلطنت تھا اس لئے اس شہر میں باطنیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ جوں ہی سلطان مرحوم کے قاتل کو کتوں نے چیر پھاڑ دیا ایک جاسوس الموت کی طرف چل پڑا تھا۔ ”یا امام!“ — اس جاسوس نے حسن بن صباح سے کہا تھا — ”سب سے بڑا دشمن مارا گیا ہے۔ دفن بھی ہو گیا ہے اور اُس کی گدی پر اُس کا بڑا بیٹا برکیارق بیٹھ گیا ہے۔“

”اور قاتل کا کیا بتا؟“ — حسن بن صباح نے پوچھا۔

”اے آدھا زمین میں گاڑ کر کتوں سے مروایا گیا ہے“ — جاسوس نے بتایا تھا۔

”اُس کے ساتھ ایک لڑکی تھی“ — حسن بن صباح نے پوچھا تھا — ”کچھ معلوم

ہے وہ کہاں ہے؟“

”سلطان کے گھر میں ہے“ — جاسوس نے جواب دیا تھا — ”اس نے نئے

سلطان کو پہلے ہی اپنے جال میں لے لیا تھا۔“

”کیا وہ اکیلی کچھ کر سکے گی؟“ — حسن بن صباح نے پوچھا — ”اس سوال کا

جواب دو تین دنوں بعد آجائے گا“ — جاسوس نے کہا تھا — ”میں سلطان ملک شاہ

کے دفن ہونے کے بعد اپنے آدمی کی سزائے موت دیکھ کر چل پڑا تھا۔“

حسن بن صباح نے اپنے جاسوس کو فارغ کر دیا اور اپنے مصاحبوں اور تائبین کو

بلایا۔ وہ فوراً ”سلطان ملک شاہ کی موت“ کی خبر سن کر خوشی اور فتح کا دوا بٹاپا کرنے لگے۔

”دیکھ لیا تم نے؟“ — حسن بن صباح نے کہا — ”میں نے کچھ عرصہ پہلے تم

لوگوں کو ایک اصول بتایا تھا کہ کسی خاندان کو تباہ کرنا ہو تو ضروری نہیں کہ اُس کے ہر فرد

کو قتل کر دیا جائے بلکہ اتنا ہی کیا جائے کہ اس خاندان کے سربراہ کا دماغ خراب کر دو۔

اسے عیش و عشرت میں ڈال دو اور اسے یہ یقین دلا دو کہ تم آدمی دنیا کے بادشاہ ہو اور تم

جیسا کوئی نہیں۔ اس پر کوئی نشہ طاری کر دو۔ ایک خوبصورت اور چالاک عورت سے بڑھ کر کوئی ایسا نشہ نہیں جو کسی زاہد اور پارسا کی توبہ اور قسمیں نہ توڑ سکے۔ کسی خاندان کو تباہ کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس خاندان پر ایک شیطان عورت آسیب کی طرح غالب کر دو۔ تم نے ایسے خاندان دیکھے ہوں گے جو عورت اور دولت پر تباہ ہوئے ہیں۔“

”یا امام!“ — ایک مصاحب نے کہا — ”ہم نے دیکھ لیا ہے۔“
 ”کسی سلطنت کو تباہ کرنا ہو تو“ — حسن بن صباح نے کہا — ”اُس کے حکمران کو عظمت کے راسخے سے ہٹا دو اور اُس کے دل سے رعایا کی محبت نکال دو پھر بھی کام نہ بنے تو اسے قتل کر دو۔“

”یا امام!“ — ایک مصاحب نے پوچھا — ”یہ کام تو ہو گیا۔ اب بتائیں کہ اس سے آگے کیا کرنا ہو گا۔“

”یہ کام وہ لڑکی کرے گی“ — حسن بن صباح نے کہا — ”مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ لڑکی بڑی تیز ہے اور اپنا کام کرنے کے لئے ہر ڈھنگ کھیل سکتی ہے۔ اس لڑکی کا انتخاب میں نے خود کیا تھا۔ اب یہ کرنا ہے کہ کوئی ایسا عقل مند آدمی مَرُو جائے جو روزینہ کے ساتھ رابطہ رکھے..... مجھے کون بتا سکتا ہے کہ یہ لڑکی قابلِ اعتماد ہے اور جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے وہ کر لے گی۔“

”میں بتا سکتا ہوں یا امام!“ — ایک آدمی بولا — ”اس کی تربیت میری نگرانی میں ہوئی ہے۔ مَرُو میں اس کے ساتھ ایک تجربہ کار آدمی اور دو بڑی خزانہ عورتیں موجود ہیں۔“

”تم جانتے ہو ہم نے مَرُو میں کیا کرنا ہے“ — حسن بن صباح نے کہا —
 ”ہمارے اس فدائی نے وہاں زمین ہموار کر دی ہے۔ اس نے سلطنتِ سلجوقیہ کا سرکٹ دیا ہے۔ اب اس کا باقی جسم دو حصوں میں کاٹنا ہے۔“

”ہاں امام!“ — ایک آدمی نے کہا — ”سلطنتِ سلجوقیہ کے دارالسلطنت میں خانہ جنگی کرانی ہے۔ یہ کام روزینہ کر لے گی۔“

”ملک شاہ کا بڑا بیٹا برکیارق جو ان آدمی ہے“ — حسن بن صباح نے کہا — ”اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی میں اس کی فطرت اور خصلت کے متعلق تمام معلومات حاصل

کر چکا ہوں۔ وہ تو یوں سمجھو جیسے موم ہے۔ اگر روزیہ ثابت قدم رہی تو وہ اس موم کو پگھلا کر اپنے سانچے میں ڈھال لے گی۔ روزیہ بہت ہی حسین لڑکی ہے۔ میں اسے ذاتی طور پر جانتا ہوں۔“

”یا امام!“ — اُس کے ایک مصاحب نے کہا — ”آپ یہ بات کیوں دہراتے ہیں ایک بار آپ نے ہم سب کو بتا دیا ہے کہ ملک شاہ کے قتل کے بعد کیا کرنا ہے۔ یہ ہم پر چھوڑیں کہ آپ کے حکم کی تعمیل ہوتی ہے یا نہیں۔“

”تم اچھی طرح جانتے ہو“ — حسن بن صباح نے کہا — ”کہ میرے حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو ان سب کا کیا انجام ہو گا جنہیں یہ حکم دیا گیا تھا۔“



یہ داستان اُس دور میں داخل ہو گئی تھی جو بلاشبک و شبہ حسن بن صباح کا دور تھا۔ اہلبیت نقطہ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اس سے مراد اور رے جیسے شہر بھی محفوظ نہیں رہے تھے۔

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح نے ایک جنت بنائی تھی۔ اس جنت میں جو داخل ہوتا تھا وہاں سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے کچھ عرصے کے لئے وہاں سے نکال لیا جاتا تو وہ واپس اسی جنت میں جانے کو ترپتا تھا۔ اسے کہا جاتا کہ وہ فلاں فلاں بڑی شخصیت کو قتل کر آئے تو وہ ہمیشہ اسی جنت میں رہے گا۔ اس طرح وہ آدمی جا کر دو تین بتائے ہوئے آدمیوں کو قتل کر دیتا اور بعد میں اسے بھی قتل کر دیا جاتا تھا۔ اس جنت کی حقیقت اس سے کچھ مختلف تھی جو تاریخ نے بیان کی ہے۔

بیشتر مورخوں نے حسن بن صباح کی جنت کو جس طرح بیان کیا ہے اس کی تفصیل ”آئمہ تبیس“ میں ان الفاظ میں ملتی ہے ”حسن بن صباح نے جانبازوں کی ایک جماعت تیار کی اور اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے ان کی لوح دل پر یہ بات ثبت کرا دی کہ شیخ الجبل یعنی حسن بن صباح تمام دنیا کا مالک اور اس دنیا میں بڑا قادر ہے۔ اس تعلیم و تلقین کے علاوہ اس نے ایک ایسی تدبیر کی جس کی وجہ سے اس جماعت کو جان سپاری پر آمادہ کرنا بالکل چٹکی بجانے کا کام تھا.....“

”اس نے قلعہ الموت کے ارد گرد نظر فریب مرغزاروں اور جاں بخش نزہت گاہوں میں نہایت خوبصورت محل، برج اور کوشکیں تعمیر کروائیں۔ عالیشان محلات کی

دنہ دہی اور خوشنمائی، باغوں اور مرغزاروں کی نزہت اور تروتازگی دیکھنے والے کے دل پر جادو کا اثر کرتی تھی۔ ان کے پتھوں بچ جنت کے نام سے ایک نہایت خوش نماباغ بنوایا جس میں وہ تمام سامان مہیا کئے جو انسان کے لئے موجب تفریح ہو سکتے ہیں، مثلاً "اشیائے نعیش، ہر قسم کے میوہ دار درخت، پھول، چینی کے خوبصورت ظروف، بلوری، طلائی اور نقرئی سامان، بیش قیمت فرش، یونان کے اسباب تہیشت، پر تکلف سامان خورد و نوش، نغمہ و سرور، جنت کی دیواروں پر نقش و نگار کا نہایت نازک کام بنوایا.....

"نلوں کے ذریعے سے مہلات میں پانی، دودھ، شراب اور شہد جاتا تھا۔ ان سب لذائذ کے علاوہ دل بہلانے کے لئے پری تمثال کمن نازینس موجود تھیں۔ ان ماہوشوں اچھوتیوں کی سادگی و وضع اور ان کے حسن و جمال کی دلربائی وہاں دیکھنے والوں کو یہ یقین دلاتی تھی کہ یہ عالم سفلی کے سوا کسی اور ہی عالم کی پیکر ہیں۔ کوشش کی گئی تھی کہ اس جنت میں داخلے کے بعد زائر کے دل پر فرحت کا ایسا شیریں اثر پیدا کیا جائے کہ وہ اس فرحت اور مسرت کو دنیاوی نہیں بلکہ اخروی یقین کرے.....

"یہاں کے حور و غلمان کا تمام کاروبار بالکل رازداری سے انجام پاتا تھا۔ ہر وہ چیز جس کی باہر سے مہیا کرنے کی ضرورت ہوتی تھی، اس حسن اسلوب سے فراہم کی جاتی تھی کہ کسی کو کبھی سراغ نہ لگ سکتا تھا.....

"حسن بن صباح علاقہ طالقان اور رودبار وغیرہ کے خوبصورت، تندرست اور قوی ہیکل نوجوان جو سادہ لوح ہوتے اور ان میں ہر بیان باور کرنے اور ایمان لانے کی صلاحیت نظر آتی، فدائین کی جماعت میں بھرتی کر لیتا۔ یہ وہ لوگ تھے جو حسن بن صباح کے ہر ایک حکم کی بلا عذر آنکھیں بند کر کے تعمیل کرتے تھے.....

"بھنگ جسے عربی میں حشیش کہتے ہیں شاید ان ایام میں ایک غیر معلوم اور غیر معمولی چیز تھی اور غالباً حسن بن صباح ہی پہلا شخص ہے جس نے اپنی دانشمندی سے وہ کام لیا جو اس سے پہلے شاید کسی نے نہ لیا ہو گا۔ جب فدائی امیدواری کا دور ختم کر لیتا تو حسن بن صباح اسے بھنگ کے اثر سے بے ہوش کر کے جنت میں بھجوا دیتا جہاں وہ جاں پرور حوروں کی گود میں آنکھ کھولتا اور اپنے آپ کو ایسے عالم میں پاتا جہاں کی خوشیاں اور مسرتیں شاید بڑے بڑے شاہان عالم کو بھی نصیب نہیں تھیں.....

"یہاں وہ انواع و اقسام کی نزہت گاہوں کی سیر کرتا، حوروں کے حسن سے

آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا، ان کی صحبت اس کی جاں ستانی کرتی اور ان مہوشوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر مئے ارغوانی کے جام اڑاتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ غذا میں اور بہترین قسم کے میوے کھاتا اور ہر طرح کے تعیشات میں محو رہتا۔ ہفتہ عشرہ کے بعد جب ان محبت شعار حوروں کی محبت کا نقش اس کے دل پر اتنا گہرا پڑ جاتا کہ پھر مدت العمر مٹ نہ سکے، تب وہی حوریں بھنگ کا ایک جام پلا کر اسے شیخ الجبل یعنی حسن بن صباح کے پاس بھجوا دیتیں۔ جہاں آنکھ کھول کر وہ اپنے تئیں شیخ کے قدموں میں پاتا اور جنت کے چند روزہ قیام کی خوشگوار یاد اُس کو سخت بے چین کر دیتی.....

”حسن بن صباح اس کو جنت میں بھیجے جانے کی پھر امید دلاتا اور کہتا کہ جنت کے دائمی قیام کی لازمی شرط جاں ستانی اور جاں سپاری ہے۔ وہ شخص جس کے دل پر گزشتہ لذات اور عیش و عشرت کا اثر اتنا مضبوط پڑ چکتا تھا اور حوروں کی ہم نشینی کی تصویر ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی تھی، وہ حسن بن صباح کے احکام کی تعمیل میں کس طرح کوتاہی کر سکتا تھا!.....

”چنانچہ جب حسن بن صباح کو کسی دشمن کا قتل کرانا منظور ہوتا تھا تو ایک فدائی نوجوان کو حکم دیتا کہ جافلاں شخص کو قتل کر کے قتل ہو جا، مرنے کے بعد فرشتے تجھے جنت میں پہنچا دیں گے.....

”یہ فدائی اپنے حوصلے سے بڑھ کر مستعدی دکھاتا تاکہ کسی طرح جلد جنت میں پہنچ کر وہاں مسرتوں سے ہمکنار ہو۔ یہی وہ خطرناک لوگ تھے جن سے خون آشامی کا کام لیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کو جس کے قتل کا بھی اشارہ دیا جاتا وہ وہاں کوئی روپ بھر کر جاتے، رسائی اور آشنائی پیدا کرتے، اس کے معتمد بنتے اور موقع پاتے ہی اس کا کام تمام کر دیتے تھے۔“

تاریخ کی یہ تحریری شہادت مصدقہ تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ اُس دور میں محلات کی تعمیر چند دنوں یا چند مہینوں میں ناممکن تھی۔ جس قسم کے محلات مہورخوں نے بیان کئے ہیں ان کی تعمیر کیلئے پچیس تیس سال درکار تھے۔ پھر پھل دار درختوں کا جو ذکر آتا ہے، وہ اس لئے مشکوک ہے کہ درخت اتنی جلدی تناور نہیں ہو سکتا کہ وہ پھل اور میوہ جات دینے لگتے۔ مہورخوں اور ان کے بعد آنے والے تاریخ نویسوں نے ایک دوسرے کی تحریروں میں زیب و استن اور مبالغہ آرائی کے ذریعے اضافے کئے اور ہمارے سامنے

اس جنت کا نقشہ آگیا جو اللہ کی بنائی ہوئی جنت سے بھی زیادہ خوشنما اور دل فریب لگتا ہے۔ دودھ شہد اور شراب کے نلکوں کو تو شاید تصور میں لایا جاسکے اور لایا بھی جا رہا ہے لیکن ان کا وجود بھی مشکوک ہے۔

پھر یہ سب کیا تھا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ حسن بن صباح نے جنت بنائی تھی۔ اس کے قاتل فدائین نے اسی جنت میں جنم لیا تھا۔ ان قاتلوں کی اگلی نسلیں حسن بن صباح کی موت کے بعد بھی قاتل ہی کہلاتی رہیں اور ان نسلوں نے کرائے کے قتل کی وارداتوں میں نام حاصل کیا تھا۔

داستان گو قبل از مسیح کے دور میں کچھ دیر کیلئے جاتا ہے۔ ایسی ایک جنت کا ذکر یونان کی دیو مالائی داستانوں میں ملتا ہے۔ یہ اُس دور کی بات ہے جب یونان والوں نے پوجا کرنے کیلئے کئی دیوتا اور دیویاں تخلیق کر لی تھیں۔ یہ معبود آسمانوں پر بھی رہتے تھے اور زمین پر بھی۔ ایک داستان میں اس جنت کا ذکر ملتا ہے جس کی خوشنمائی اور دلکشی کی تفصیلات پڑھو یا سنو تو حسن بن صباح کی جنت سامنے آ جاتی ہے، لیکن وہ یونانی داستان لکھنے والے تھے جنہوں نے اس جنت کی حقیقت بھی بیان کر دی تھی۔ اس جنت کا تجزیہ آج کے سائنسی دور میں جب دیگر علوم بھی نقطہ عروج پر ہیں کرو تو یقین آ جاتا ہے کہ وہ جنت ہی تھی لیکن اس کی حقیقت کیا تھی؟

حقیقت یہ تھی کہ یونان میں ایک پہاڑ تھا۔ اس پہاڑ میں ایک غار تھا جو دور اندر تک چلا گیا تھا لیکن سیدھا نہیں بلکہ بھول بھلیوں کی صورت میں۔ اُس وقت کے بادشاہ نے اس غار کے اندر کوئی ایسی جڑی بوٹیاں رکھ دی تھیں جن کی بو اس سارے غار میں پھیل گئی تھی۔ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد یہ جڑی بوٹی تروتازہ پھر وہاں بکھیر آتے تھے۔

بادشاہ اپنے کسی مخالف کو یا کسی اور وجہ سے کسی آدمی کو کوئی لالچ دے کر اس غار میں بھیج دیتا تھا۔ وہ شخص اس غار میں دور اندر تک جاتا تو اسے اندر حوریں نظر آنے لگتی تھیں اور اسے یوں نظر آتا جیسے وہ اس کے استقبال کیلئے بے تاب ہوں وہ ان حوروں کے ساتھ عیش و عشرت کرتا اور پھر اسے یہ حوریں ایسے ایسے کھانے پیش کرتیں جو زمین پر رہنے والے انسانوں نے کبھی دیکھے اور کبھی سنے نہیں تھے۔ یہ تجربہ بھی کیا گیا کہ اندر

جانے والے اور کچھ دن اندر رہنے والے شخص کو باہر لائے تو وہ مرنے مارنے پر اتر آیا اور دوڑ کر پھر غار میں چلا گیا۔ وہ اس جنت میں سے کسی قیمت پر نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پھر اندر چلا جاتا اور چند دنوں میں ہی مر جاتا اور تھوڑے عرصے بعد اس کی ہڈیاں رہ جاتیں۔

حقیقت یہ تھی کہ اس غار کے اندر چھوٹی چھوٹی چٹانیں ستونوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں ان چٹانوں کو وہ حور و غلمان سمجھ لیتا تھا اور یہ چٹانیں اسے حور و غلمان ہی کی شکل میں نظر آتی تھیں۔ وہ جو مرغن اور عجیب و غریب کھانے کھاتا تھا وہ کنکریاں اور مٹی ہوتی تھی۔

یہ اس بُو کا اثر تھا جو جڑی بوٹیوں سے اٹھتی اور غار کی اندرونی فضا میں پھیلی رہتی تھی۔ اس بُو میں نشے کا ایسا اثر تھا جو ذہن کو انتہائی خوبصورت اور دل فریب تصور دیتا تھا۔ یہ دیو مالائی داستان بہت ہی طویل ہے جس میں تخیلاتی اور ان ہونے واقعات بھی شامل کئے گئے ہیں لیکن داستان لکھنے والے نے دانشمندی کا یہ ثبوت دیا ہے کہ اس جنت کی اصل حقیقت پوری طرح بیان کر دی ہے۔

داستان گو ضروری سمجھتا ہے کہ یونان کی اس دیو مالائی داستان کا ایک باب مختصراً بیان کر دے۔ اس میں وہ عقل و دانش کا راز نظر آتا ہے جو ہر انسان کے لئے سمجھنا ضروری ہے۔ یہ داستان لکھنے والا لکھتا ہے کہ ایک شہزادے کے دل میں یہ خواہش ابھری کہ وہ اس غار میں جائے اور اس جنت میں دو تین دن گزار کر واپس آجائے۔ اس نے اپنے بوڑھے اتالیق سے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا تو بزرگ اتالیق نے اسے سمجھایا کہ اس جنت کی حقیقت کیا ہے۔ شہزادہ چونکہ شہزادہ تھا اس لیے وہ اپنی ضد پر قائم رہا اور اس نے اتالیق کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ اس غار تک چلے۔

اتالیق نے دھاگے کا ایک گولا اٹھایا اور شہزادے کو ساتھ لے کر اس پر اسرار غار تک چلا گیا اس نے دھاگے کا ایک سرا شہزادے کی ایک کلائی سے باندھ کر کہا کہ تم غار کے اندر چلے جاؤ۔ اندر بھول بھلیاں ہیں جن میں تم گم ہو جاؤ گے۔ ان میں سے تم نکل نہیں سکو گے۔ تمہیں یاد ہی نہیں رہے گا کہ تم کس راستے سے اندر آئے تھے۔ یہ دھاگہ ٹوٹنے نہ دینا۔ میں باہر بیٹھ جاؤں گا اور دھاگہ کھولتا جاؤں گا۔ جہاں تمہیں حوریں اور ایسی ہی چیزیں نظر آنے لگیں وہیں سے اس دھاگے کو پکڑ کر واپس آ جانا۔ یہ دھاگہ تمہاری راہنمائی کرے گا۔

7479
3733

شہزادہ غار میں داخل ہو گیا اور بزرگ اتالیق دھاگہ ڈھیلا کر مانگیا کر مانگیا حتیٰ کہ بڑا ہی لمبا دھاگہ شہزادے کے ساتھ غار کے اندر چلا گیا۔ دن گذر گیا مگر شہزادہ باہر نہ آیا۔ یہاں کئی اور واقعات بیان کئے گئے ہیں لیکن داستان گو اس کا صرف ایک حصہ پیش کرتا ہے۔

بزرگ اتالیق نے جب دیکھا کہ شہزادہ ابھی تک باہر نہیں آیا وہ دھاگے کا باقی گولا باہر رکھ کر دھاگے کو پکڑ پکڑ کر غار کی بھول بھلیوں میں جاتے شہزادے تک پہنچ گیا۔ خود اس معمر اور دانشمند اتالیق کو حسین و جمیل چیزیں نظر آنے لگیں مگر اس نے اپنی ناک پر کپڑا باندھ لیا اور شہزادے تک جا پہنچا۔ شہزادہ مٹی کھا رہا تھا اور قمقمے لگا رہا تھا اور بازو پھیلا کر یوں اپنے سینے پر سمیٹ لیتا تھا جیسے اس نے اپنے بازوؤں میں کوئی چیز دبوچ لی ہو۔ اتالیق شہزادے کو گھسیٹ گھسیٹ کر باہر لایا۔ اگر دھاگہ ٹوٹ جاتا تو دونوں باہر نہ نکل سکتے۔

باہر آکر شہزادہ اپنے اتالیق سے الجھ پڑا اور پھر غار کی طرف دوڑا۔ اتالیق نے اسے پکڑ لیا لیکن اتالیق بوڑھا اور شہزادہ نوجوان تھا۔ شہزادے کو بے بس کرنے کیلئے اس کے سر کے پچھلے حصے پر پتھر کی ضرب لگائی۔ شہزادہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ شہزادہ جب ہوش میں آیا تو اُس نے اٹھ کر فوراً ”ادھر ادھر دیکھا لیکن اسے غار کا دہانہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اتالیق سے پوچھا۔ اتالیق نے اسے اپنے پاس بیٹھا لیا اور کہا کہ اپنے منہ میں انگلیاں ڈالو اور انگلیاں دیکھو۔ شہزادے نے اپنے منہ میں ایک انگلی پھیری تو اسے کچھ مٹی نظر آئی جو اس کی انگلی کے ساتھ لگ گئی تھی۔ اس وقت اس نے محسوس کیا کہ اس کے دانتوں کے درمیان ریت اور مٹی موجود ہے۔ اس نے تھوکا تو تھوک مٹیالے رنگ کا تھا۔ شہزادے نے اپنے دانشمند اتالیق کی طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھا۔

”میرے عزیز شہزادے!“ — اتالیق نے کہا — ”میں آج تمہیں ایک ایسا سبق دوں گا جو مرتے دم تک تمہیں فریب کاروں اور بے وفالوں کے دھوکوں سے بچائے رکھے گا۔ اس غار کے اندر کوئی جنت نہیں نہ کوئی حور ہے اور نہ حوروں جیسے لڑکے اور نہ ہی وہاں آسمان سے اترے ہوئے کھانے ہیں اور نہ ہی وہاں کوئی ایسی شراب ہے جسے تم سمجھتے ہو زمین پر نہیں ملتی۔ یہ جنت ہر انسان کے اپنے ذہن میں موجود ہے۔ ہر انسان

زندگی کے حقائق سے بھاگ کر اپنے ذہن کی جنت میں چلا جانا چاہتا ہے لیکن اس کے ہوش و حواس اس حد تک بیدار رہتے ہیں کہ وہ تصور کو تصور ہی سمجھتے ہیں۔ اس غار میں ایک خاص بوٹی کی بو چھوڑی گئی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کے ذہن سے یہ حقیقی زندگی نکل جاتی ہے اور جو حسین تصور انسانی ذہن نے تخلیق کئے ہوتے ہیں وہ حقیقت بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ انسان کی بیداری والی حس سو جاتی ہے اور تصورات بیدار ہو جاتے ہیں.....

”تمہارے بھسپھڑوں میں یہ بو گئی اور تمہارے دماغ پر قابض ہو گئی پھر تم حقیقت سے کٹ گئے اور تمہارے ذہن نے جو خوبصورت تصورات تخلیق کر رکھے تھے وہ باہر تمہارے سامنے حوروں اور جنت نظیر ماحول کی صورت میں سامنے آ گئے۔ انسان بڑی کمزور چیز ہے۔ انسان ذہن کا غلام ہوتا ہے۔ تخریبی قوتوں کا حملہ ذہن پر ہوتا ہے۔ ان ہی تخریبی اور سفلی قوتوں کو شیطان کہا گیا ہے..... میں نے تمہاری کلائی کے ساتھ دھاگہ باندھ دیا تھا اور اس کا دوسرا سرا میں نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ غور کرو شنزادے! میں حقیقی زندگی میں بیٹھا ہوا تھا اور تم تصورات میں گم ہو گئے تھے لیکن یہ دھاگہ حقیقت اور تصور کے درمیان ایک رشتہ تھا۔ یہ دھاگہ ٹوٹ جاتا تو تم ہمیشہ کیلئے حقیقی زندگی سے کٹ جاتے۔ یاد رکھو حسین تصورات اور حقیقی زندگی کے درمیان صرف ایک کچا دھاگہ حائل ہے۔ جس نے اس دھاگے کو توڑ ڈالا وہ اپنی موت خود مرا اور جس نے اس دھاگے کو ٹوٹنے نہ دیا وہ بھٹک بھٹک کر کبھی تو واپس حقیقت میں آ ہی گیا.....

”یہ ایک نشہ ہے جو کسی جابر بادشاہ پر بھی طاری ہو جائے تو وہ حسین تصوروں میں جا پڑتا ہے اور تھوڑے ہی عرصے بعد گم ہو جاتا ہے۔ بادشاہ اپنے دشمن کو قتل کروا دیتے ہیں۔ دشمن کو مارنے کا بہترین اور بڑا ہی حسین طریقہ یہ ہے جو ہمارے بادشاہ نے اختیار کیا ہے۔ دشمن کو کسی نشے میں مبتلا کر کے اس میں یہ غلط احساس پیدا کر دو کہ تم تو ساری دنیا کے بادشاہ ہو اور اتنے خوب رو ہو کہ کسی بھی دیس کی شنزادیاں تم پر مرثیں گی۔ اس کی زندہ مثل تم اس غار کے اندر دیکھ آئے ہو۔ تمہارے لئے سبق یہ ہے کہ اپنے ذہن کو اپنے قابو میں رکھو، اپنے ہوش و حواس کو اپنے ذہن کے حوالے کبھی نہ کرو اور بچو اس نشے سے جو نیک و بد کا احساس ہی مٹا دے لیکن انسان کی فطرت اتنی کمزور ہے کہ وہ لذت اور تعیش کو فوراً قبول کر لیتی ہے اور انسان کا حلیہ ہی بگاڑ دیتی اور اسے تباہی کی



آج کی سائنس نے قدیم زمانے کے اسرار کو بے نقاب کر دیا ہے۔ کوئی انسان غصے سے باؤلا ہو جائے، درندہ بن جائے اور مرنے مارنے پر اتر آئے تو چھوٹی سے ایک گولی یا ذرہ سا ایک انجکشن اسکے ذہن کو سُلا دیتا ہے اور وہ کمزور سا ایک انسان بن جاتا ہے۔ اب تو ایسے ملزموں کو جو اپنے جرم کا اقبال نہیں کرتے، دھوکے میں کھانے یا پینے کی اشیاء میں ذرا سی دوائی ملا کر دی جاتی ہے اور پھر اس کے ساتھ ایسی باتیں کی جاتی ہیں جیسے وہ بہت بڑی شخصیت ہو اور حسین ترین لڑکیاں اس پر جان نثار کرتی ہوں، اور اسے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ اس قدر بہادر، دلیر اور دانشمند ہے کہ اس نے وہ جرم کیا ہے جو اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس طرح دو چار مرتبہ اسے یہ دوائی کھانے پینے میں دی جاتی ہے اور وہ بڑے فخر سے اپنے جرم کا اقبال ہی نہیں کرتا بلکہ ہر ایک تفصیل سناتا اور اپنے ساتھیوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

حسن بن صباح کی جنت کا زیادہ تر تعلق انسانی ذہن ہی سے تھا۔ تاریخوں میں جو تفصیلات آئی ہیں، ان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور اختلاف ہے بھی لیکن یہ ایک مصدقہ امر ہے کہ حسن بن صباح اپنے فدائین کو حشیش پلاتا تھا۔ حشیش کے جو اثرات ذہن پر مرتب ہوتے ہیں وہ ان تمام منشی اشیاء کے اثرات سے مختلف ہیں جو انسان استعمال کرتے ہیں۔

حشیش پی کر انسان نے اگر ہنسنا شروع کیا تو وہ نشہ اترنے تک ہنستا ہی چلا جائے گا اور اگر وہ رونے پر آیا تو گھٹنوں روتا ہی رہے گا۔ کسی انسان کو آہستہ آہستہ حشیش پلاتے رہیں اور ساتھ ساتھ کوئی بڑا ہی حسین منظر الفاظ میں بیان کرتے رہیں تو وہ شخص ایسے ہی منظر میں چلا جائے گا خواہ اس منظر کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔

تاریخ میں یہ بالکل صحیح لکھا گیا ہے کہ جس دانشمندی سے حسن بن صباح نے حشیش کو استعمال کیا ہے اس طرح اُس وقت تک اور کوئی نہیں کر سکا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن بن صباح غیر معمولی طور پر دانشمند آدمی تھا۔

یونان کی دیو مالائی داستان کی جنت اور حسن بن صباح کی جنت میں فرق یہ تھا کہ اس یونانی داستان میں ایک غار تھا جس میں چھوٹی چھوٹی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں اور وہاں

کنکریاں اور مٹی تھی لیکن حسن بن صباح نے جس علاقے میں جنت بنائی تھی، وہ بڑا ہی حسین اور روح افزا جنگل تھا۔ اس جنگل میں پھل دار درخت بھی تھے اور پھول دار خود رو پودے بھی تھے۔ ایسے اور بھی بہت سے پودے وہاں اگائے گئے تھے اور اس خطے کو کانٹ چھانٹ کر مزید خوبصورت بنا دیا گیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قلعہ الموت بلندی پر تھا اور اس کا اپنا ایک حُسن تھا۔ یہ قلعہ بنانے والوں نے اس کی خوبصورتی کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔

حسن بن صباح کے ہاں نوجوان اور بڑی ہی حسین لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ اس کا ایک گروہ دن رات قافلے لوٹنے میں لگا رہتا تھا۔ یہ گروہ قافلوں سے سونے چاندی کے علاوہ نقد رقیں لوٹ لیتا تھا اور اس کے ساتھ ہی کسمن بچیوں کو بھی اٹھالاتا تھا۔ ان بچیوں کو خاص طور پر ٹریننگ دی جاتی تھی لیکن ان پر ذرا سا بھی ظلم اور تشدد نہیں کیا جاتا تھا۔ انہیں بڑی خوبصورت زندگی مہیا کی جاتی تھی اور اس کے ساتھ انہیں مردوں کے دلوں پر قبضہ کرنے کی خصوصی تربیت دی جاتی تھی۔ ان لڑکیوں کے ہاتھوں فدا مین کو تیار کرنے کے لئے حشیش پلائی جاتی تھی۔ حشیش پلا کر یہ لڑکیاں ان کے ساتھ ایسی باتیں کرتی تھیں جن سے انہیں یہ تاثر ملتا تھا کہ وہ اتنے بہادر ہیں کہ جسے چاہے قتل کر دیں اور چاہیں تو ساری دنیا کو فتح کر لیں۔

مختصر یہ کہ حسین اور نوجوان لڑکیوں اور حشیش کے ذریعے ان آدمیوں کے ذہنوں پر قبضہ کر لیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ وہاں کا قدرتی ماحول اپنا ایک اثر رکھتا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس شخص کو اس ماحول، ان لڑکیوں اور حشیش سے محروم کر کے قلعے کے تہ خانے میں پہنچا دیا جاتا تھا وہ شخص تڑپتا اور کانٹنے کو دوڑتا تھا۔ اس کیفیت میں اسے حسن بن صباح کے سامنے لے جایا جاتا اور تاثر یہ دیا جاتا کہ حسن بن صباح ساری دنیا کا بادشاہ ہے اور وہ جسے چاہے جنت عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہے جہنم میں پھینک دیتا ہے۔

اس شخص کی اس ذہنی اور جذباتی حالت میں حسن بن صباح اپنا جادو چلاتا تھا۔ وہ اسے قتل کرنے اور قتل ہو جانے پر آمادہ کر لیتا تھا۔ بات وہیں پر آتی ہے کہ یہ ان انسانوں کے ذہن تھے جن پر حسن بن صباح قابض ہو جاتا اور انہیں اُس مقام تک لے جاتا تھا جہاں وہ لوگ اس کے اشارے پر جانیں قربان کر دیتے تھے۔

انسان کی سب سے بڑی کمزوری تعیش پرستی ہے۔ اللہ کے بندوں کی یہی وہ دکھتی

رگ ہے جسے ابلیس اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اسی لئے حسن بن صباح کی جنت کو فردوس ابلیس کہا گیا ہے۔

پھر حقائق سے فرار انسان کی دوسری بڑی کمزوری ہے۔ کوئی انسان جب عورت کو فرار کا ذریعہ بناتا ہے تو اس کے ذہن میں فردوس ابلیس وجود میں آجاتی ہے پھر اس انسان کو دنیا کی کوئی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ ایسا انسان اللہ کے اس فرمان کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے جس میں اللہ نے انسان کو یہ وارننگ دی ہے کہ تم پر جو بھی مصیبت نازل ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی اعمالِ بد کا نتیجہ ہوتی ہے۔



حسن بن صباح کا باطنی عقیدہ بڑی تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا اور بے شمار علاقہ اس کی زد میں آچکا تھا۔ اس عقیدے نے تیزی سے ہی پھیلنا تھا۔ انسان فطری طور پر خود سر اور سرکش واقع ہوا ہے۔ یہ بھی ایک فطری کمزوری ہے۔ اگر کوئی مخلص قائد مل جائے اور وہ کچھ انسانوں کی خود سری اور سرکشی کو منظم طریقے سے کسی نصب العین کے لئے استعمال کرے تو یہ ایک قوت بن جاتی ہے لیکن اسی خود سری اور سرکشی کو انسان جب اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال کرتا ہے تو یہ اوصاف اس کی تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔ انسان پابندیاں قبول نہیں کیا کرتا۔ حسن بن صباح نے لوگوں کو جو عقیدہ دیا تھا اس کا نام اسلام ہی رہنے دیا تھا لیکن اس میں ترمیم یہ کی تھی کہ انسان کے باطن میں جو کچھ ہے وہی مذہب ہے۔ اس نے شریعت کو اسلام میں سے نکال دیا تھا۔

وہ پسماندگی کا دور تھا۔ تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان علاقوں کے لوگ مسلمان تھے۔ حسن بن صباح نے ان کو مسلمان ہی رہنے دیا اور کمال یہ کر دکھایا کہ انہیں تمام مذہبی اور اخلاقی پابندیوں سے آزاد کر دیا۔

اس کا باطنی عقیدہ تیزی سے پھیل رہا تھا پھر بھی سلطان ملک شاہ اس کے راستے میں ایک رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ سلطان اس کے خلاف بہت بڑی فوج تیار کر رہا ہے۔ حسن بن صباح نے اپنے ایک فدائی کے ہاتھوں سلطان ملک شاہ کا ہتھیار کاٹ دیا تو یہ رکاوٹ راستے سے ہٹ گئی۔ اسے برکیارق کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے مصاحبوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ جوان آدمی ہے جس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ اُسے ذہنی طور پر بیکار کرنے کے لئے روزینہ کو بھیج دیا تھا جس کے حُسن

وجہ اور انداز میں طلسماتی اثرات چھپے ہوئے تھے۔

اس علاقے میں ابھی کچھ اور قلعے ایسے تھے جو حسن بن صباح کے قبضے میں نہیں آئے تھے۔ وہ اس خیال سے ان قلعوں کی طرف نہیں بڑھتا تھا کہ سلطان ملک شاہ فوج لے کر آجائے گا۔

ان قلعوں میں ایک اہم قلعہ قلعہ ملاذ خان تھا جو فارس اور خوزستان کے درمیان واقع تھا۔ کسی وقت یہ قلعہ ڈاکوؤں اور راہزنوں کے قبضے میں تھا۔ وہ قافلوں کو لوٹتے اور مال اس قلعے میں لا کر جمع کر دیتے تھے۔ قافلوں میں سے انہیں کسں بچیاں اور نوجوان لڑکیاں ملتی تھیں تو انہیں بھی اس قلعے میں لے آتے تھے۔

ان ڈاکوؤں کے ڈر سے قافلوں کی آمد و رفت بند ہو گئی اور اس کا اثر تجارت پر بھی پڑا۔ لوگ سلطان ملک شاہ کے ہاں گئے اور فریاد کی کہ ان کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ ان دنوں سلطان ملک شاہ جوان تھا اور نیا نیا سلطان بنا تھا۔ اس نے اپنے ایک سالار کو حکم دیا کہ وہ اس قلعے پر قبضہ کرے اور ان ڈاکوؤں کا قلع قمع کر دے۔ اس سالار کا نام عہد الدولہ بن بویا تھا۔ سلجوقیوں کی تاریخ کا یہ ایک نامور سالار تھا۔ اس نے ایک روز طوفان کی طرح جا کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ ڈاکو آخر ڈاکو تھے، وہ کوئی جنگجو نہیں تھے۔ سالار بویا نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ کمندیں پھینک کر قلعے کی دیواروں پر چڑھیں اور اپنی جانیں قربان کر دیں۔

وہ مجاہدین تھے جنہیں بتایا گیا تھا کہ ان ڈاکوؤں نے کتنے ہی قافلے لوٹے ہیں اور سینکڑوں کسں لڑکیوں کو اغوا کیا ہے اور سینکڑوں نہیں ہزاروں گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی ہے۔ ان مجاہدین نے جانوں کی بازی لگا دی اور قلعے میں دیواریں پھاند کر داخل ہو گئے۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں طوفان کی طرح قلعے میں داخل ہوئے تھے۔ ان کا جذبہ ایسا تھا کہ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اللہ کے حکم سے اس قلعے پر حملہ آور ہوئے ہوں۔

ایک بھی ڈاکو قلعے میں سے زندہ نہ نکل سکا۔ سب کو کاٹ دیا گیا۔ صرف عورتوں اور بچوں کو زندہ رہنے دیا گیا جنہیں سلطان ملک شاہ کے حکم سے دارالسلطنت میں بھیج دیا گیا تھا اور ان سب کو لوگوں کے گھروں میں آباد کر دیا گیا تھا۔

سلطان ملک شاہ نے یہ قلعہ اپنے ایک رئیس میرانز کو بطور جاگیر دے دیا۔ اس کے

تھوڑا ہی عرصہ بعد حسن بن صباح نے اپنا ایک وفد اس رئیس کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ وہ یہ قلعہ خریدنا چاہتا ہے۔ رئیس قلعہ نے صاف انکار کر دیا اور پیغام کا جواب یہ دیا کہ آئندہ کوئی باطنی اس قلعے میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرے۔

قافلے محفوظ ہو گئے اور اس وسیع قلعے میں لوگ آ آ کر آباد ہونے لگے، حتیٰ کہ یہ ایک شہر کی صورت اختیار کر گیا۔ حسن بن صباح کی نظر ہمیشہ اس قلعے پر لگی رہی لیکن اس نے ظاہر یہ کیا کہ اسے اس قلعے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔

سلطان ملک شاہ قتل ہو گیا تو حسن بن صباح نے اپنے خاص مصاحبوں سے کہا کہ اب قلعہ ملاذخان اپنے قبضے میں آ جانا چاہئے۔



رئیس قلعہ بن بویا شام کے وقت اپنے مصاحبوں میں بیٹھا ہوا تھا جب اُسے اطلاع ملی کہ ایک سفید ریش بزرگ اسے ملنے آئے ہیں۔ بن بویا بااخلاق اور صاحبِ کردار رئیس تھا۔ وہ اس بزرگ کو اندر بلانے کی بجائے خود اس کے استقبال کے لئے چلا گیا۔ اسے بڑے تپاک اور احترام سے ملا اور اندر لے آیا۔

”رئیس قلعہ!“ — بزرگ نے بن بویا کے کان میں سرگوشی کی — ”میں علیحدگی میں ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“

بن بویا اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

”رئیس قلعہ!“ — بزرگ نے بات شروع کی — ”میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں باطنی ہوں..... آپ نے اس قلعے میں بائنیوں کا داخلہ بند کر رکھا ہے۔“

”پھر آپ اس قلعے میں کس طرح داخل ہوئے؟“ — بن بویا نے ذرا تھکمانہ لہجے

میں کہا — ”کیا دروازے پر آپ سے کسی نے پوچھا نہیں تھا کہ آپ کون ہیں؟“

”پوچھا تھا!“ — بزرگ نے جواب دیا — ”میں نے جھوٹ بولا تھا کہ میں اہل

سنت ہوں..... اب آپ پوچھیں گے کہ میں نے جھوٹ کیوں بولا؟..... میرا عقیدہ کچھ

ہی کیوں نہ ہو، میں تارک الدنیا ہوں اور میرے دل میں بنی نوع انسان کی محبت ہے۔

خداوند تعالیٰ نے مجھے کشف کی طاقت دی ہے۔ میں اس قلعے میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں

رکھتا تھا نہ میرا یہاں کوئی کام تھا۔ میں اس قلعے کی دیوار کے ساتھ جاتے ہوئے راستے پر

جا رہا تھا کہ مجھے ایک اشارہ ساملا اور میں نے گھوڑا روک لیا۔ کوئی طاقت جو کشف کی طاقت ہی ہو سکتی ہے، مجھے قلعے کی دیوار کے قریب لے آئی۔ مجھے صاف اور واضح اشارہ ملا کہ قلعے کے اندر خزانہ دفن ہے۔ میں نے فوراً تسلیم کر لیا کہ یہاں خزانہ دفن ہونا چاہئے تھا اور یقیناً ہے کیونکہ یہ قلعہ صدیوں سے ڈاکوؤں کے قبضے میں تھا۔ جہاں ڈاکو ہوتے ہیں وہاں کی زمین میں خزانے کا دفن ہونا لازمی ہوتا ہے۔“

”کیا آپ مجھے اس خزانے کی خوشخبری سنانے آئے ہیں؟“ — بن بویا نے کہا —
 ”اس کے بعد آپ یہ کہیں گے کہ میں آدھا خزانہ آپ کو دینے کا وعدہ کروں تو آپ خزانے کی نشاندہی کریں گے۔“

”میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں تارک الدنیا ہوں“ — بزرگ نے کہا —
 ”میں نے خزانہ حاصل کر کے کیا کرتا ہے۔ میں خزانے کی نشاندہی کروں گا لیکن شرط یہ نہیں ہوگی کہ آدھا خزانہ مجھے دیں بلکہ شرط یہ ہوگی کہ اس خزانے میں لوگوں کا لوٹا ہوا مال ہے۔ اس خزانے کے لئے ڈاکوؤں نے نہ جانے کتنے سو یا کتنے ہزار آدمی مار ڈالے ہوں گے۔ یہ خزانہ نہ میرا ہے نہ آپ کا۔ میں اس کی نشاندہی کروں گا لیکن اس شرط پر کہ اس خزانے کا صرف چالیسواں حصہ آپ لیں گے باقی سب غریبوں میں تقسیم کر دیں گے۔“

”ہاں بزرگوار محترم!“ — بن بویا نے کہا — ”میں خزانہ غریبوں میں تقسیم کر دوں گا..... کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ خزانہ کتنا کچھ ہے؟“

”نہیں!“ — بزرگ نے جواب دیا — ”یہ بتانا مشکل ہے لیکن یہ بتایا جاسکتا ہے کہ خزانہ خاصا زیادہ ہے..... ایک بات اور بھی ہے جو ذرا تحمل سے سنیں۔ آپ ہم بائیسویں کو کافر کہتے ہیں۔ میں کبھی خود بھی شک میں پڑ گیا تھا لیکن جب مجھے کشف ہونے لگا تو یہ خیال آیا کہ میں کافر ہوتا تو اللہ کی ذات مجھے کشف کی طاقت نہ عطا کرتی۔ آج مجھے اس خزانے کا اشارہ ملا تو میں نے پہلے یہ سوچا کہ خزانہ ہے تو پڑا رہے، مجھے اس سے کیا! خیال آگیا کہ نہیں یہ خزانہ اللہ کے بندوں کے کام آنا چاہئے۔ اس پر مجھے اشارہ ملا کہ یہ غریبوں میں تقسیم ہو۔ میں بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک بار ہمیں موقع دیں کہ ہم آپ کے ساتھ باطنی عقیدے پر بات کر سکیں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ ہمارے عقیدے میں آجائیں، البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ ہمیں اپنا دشمن سمجھنا چھوڑ

دیں۔“

”کیا آپ ہم سے مناظرہ کرنا چاہتے ہیں؟“ — رئیس قلعہ بن بویا نے پوچھا —
”اگر ایسی بات ہے تو مناظرہ آپ کریں گے یا کوئی آئے گا؟“

”میں مناظرے کی بات نہیں کر رہا“ — بزرگ نے کہا — ”مناظرے کا مطلب
ہو گا کہ ہم آپ کو جھٹلانے کی کوشش کریں گے..... نہیں رئیس قلعہ!..... میرا ایسا
کوئی ارادہ نہیں نہ میں آپ کی توہین کرنے کا خواہشمند ہوں۔ میں اپنا مطلب پھر واضح کر
دیتا ہوں کہ ہمیں بات کرنے کا موقع دیں تاکہ ہم آپ کا دل صاف کر سکیں۔“

”کیا آپ خزانے کی بات اس کے بعد کریں گے؟“ — بن بویا نے پوچھا — ”یا
آپ یہ کوشش کریں گے کہ میں آپ کے عقیدے کو قبول کر لوں؟“

”نہیں رئیس قلعہ!“ — بزرگ نے جواب دیا — ”خزانے کی بات الگ ہے۔
میں وہ بھی کروں گا۔ میں آپ کے ساتھ ہو کر خزانے کی نشاندہی کروں گا۔ عقیدوں کی
میں نے جو بات کی ہے، وہ تو میں نے آپ سے اجازت مانگی ہے۔ آپ اس قلعے کے
مالک ہیں، اجازت نہ دیں گے تو میں آپ کا کیا بگاڑ لوں گا، میرے دل میں اللہ کے ہر
بندے کی محبت ہے۔“

بن بویا ایک تو اس بزرگ کی باتوں سے متاثر ہوا اور خزانے کی موجودگی نے تو اس کا
دماغ ہی پھیر دیا۔ خزانہ انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ یہ اُس دور کا واقعہ ہے جب
مدفون خزانہ کوئی عجوبہ نہیں ہوتا تھا۔ اُس دور میں قدیم بادشاہ بھی اپنے خزانے کا کچھ حصہ
کسی خفیہ جگہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ چونکہ یہ قلعہ ڈاکوؤں اور راہزنوں کا تھا اس لئے
رئیس قلعہ بن بویا نے فوراً ”تسلیم کر لیا کہ یہاں خزانہ دفن ہے۔ مدفون خزانوں کے
متعلق دو روایات مشہور تھیں جو آج بھی سنی سنائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں خزانہ
دفن ہوتا ہے وہاں ایک بڑا ہی زہریلا سانپ ہوتا ہے جو خزانے کے قریب آنے والے کو
ڈس لیتا ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ خزانہ زمین کے اندر چلتا رہتا ہے اور اصل جگہ
سے دُور پہنچ جاتا ہے۔ ایک عقیدہ ہے کہ خزانے کی سراغ رسانی کوئی ایسا شخص کر سکتا ہے
جس کے پاس کشف کی طاقت ہوتی ہے۔

”مجھے یہ بتائیں بزرگوارم!“ — رئیس قلعہ بن بویا نے پوچھا — ”آپ کتنے
آدمیوں کو اپنے ساتھ لائیں گے؟“

”رئیس قلعہ!“ — بزرگ نے کہا — ”میرے ساتھ کوئی عام قسم کے آدمی نہیں ہوں گے۔ وہ چند ایک علماء ہیں اور کچھ ان کے شاگرد ہوں گے۔ ان سب کی دلچسپی صرف مذہبی عقیدوں کے ساتھ ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے ساتھ کم و بیش چالیس علماء اور ان کے شاگردوں کو لے آؤں..... میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ یہاں آکر آپ کے لوگوں میں گھومیں پھریں، سلام و دعا کریں اور اس طرح ہم میں بھائی چارے کی فضا پیدا ہو جائے۔“

”میں اجازت دے دوں گا“ — بن بویا نے کہا — ”لیکن میں یہ اجازت نہیں دوں گا کہ آپ کے آدمی یہاں تبلیغ شروع کر دیں۔“

”نہیں کریں گے!“ — بزرگ نے کہا — ”اگر میرے ساتھ آنے والا کوئی بھی آدمی اپنے عقیدے کی تبلیغ کرتا ہوا پکڑا گیا تو میں آپ سے کہوں گا کہ اسے جو بھی سزا دینا چاہتے ہیں دے دیں۔“

”اور خزانے کی بات اُسی روز ہوگی؟“ — بن بویا نے پوچھا۔

”نہیں!“ — بزرگ نے کہا — ”میں ان لوگوں کے ساتھ واپس چلا جاؤں گا اور دو چار دنوں کے بعد آپ کے پاس واپس آجاؤں گا۔ پھر میں آپ کو ساتھ لے کر خزانے کا سراغ لگاؤں گا اور اپنی موجودگی میں کھدائی کرواؤں گا۔“

رئیس قلعہ بن بویا نے اس بزرگ کے ساتھ ایک دن طے کر لیا کہ وہ اپنے علماء کے ساتھ آجائے۔ اس کے دماغ پر خزانہ سوار ہو گیا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اس لئے بن بویا نے اس بزرگ کو رات بھر کے لئے اپنے ہاں مہمان رکھا اور اگلی صبح رخصت کر دیا۔

اگلی صبح بزرگ کو رخصت کر کے بن بویا نے شہر کی بڑی مسجد کے خطیب کو بلایا اور اسے بتایا کہ فلاں دن بائیسویں کے علماء آئیں گے اور خطیب انہیں جھٹلانے کے لئے تیاری کر لے۔



مقررہ روز یہ بزرگ دوپہر کے وقت کم و بیش چالیس آدمیوں کو ساتھ لئے پہنچ گیا۔ ان سب آدمیوں نے لمبے چٹے پن رکھے تھے۔ ان کی پگڑیاں عالموں جیسی تھیں۔ پگڑیوں کے اوپر بڑے سائز کے رومل ڈالے ہوئے تھے جو ان کے کندھوں سے بھی نیچے

آئے ہوئے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں تسبیحیں تھیں۔ ان کا لباس، ان کی چال ڈھال اور ان کے بولنے کا انداز جتنا تھا کہ ان لوگوں کو مذہب کے سوا کسی اور چیز میں کوئی دلچسپی نہیں۔ رئیس قلعہ بن بویا نے ان کا استقبال بڑے احترام سے کیا اور ان کی خاطر تواضع کی۔

بزرگ تین چار علماء کو ساتھ لے کر رئیس قلعہ کو الگ کمرے میں لے گیا۔ اس نے رئیس قلعہ سے کہا تھا کہ وہ الگ بیٹھ کر بات کریں گے۔

”رئیس قلعہ!“ — بزرگ نے بن بویا سے کہا — ”ہم آپ کے ساتھ باتیں کریں گے اور آپ کی باتیں سنیں گے۔ آپ نے اچھا کیا ہے کہ اپنے خطیب کو بھی یہاں بلا لیا ہے۔ جتنی دیر ہم آپس میں بات چیت کرتے ہیں اتنی دیر میں ہمارے ساتھ آئے ہوئے آدمی شہر میں گھوم پھر لیں گے۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ یہ بے ضرر آدمی ہیں۔“

بن بویا مسکرا دیا اور اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس کے اپنے حکم کے مطابق کسی باطنی کا اس قلعہ بند شہر میں داخل ہونا ممنوع تھا لیکن خزانے کی خاطر وہ اس باطنی بزرگ کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے رہا تھا۔ وہ ان باطنی علماء کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا اور باقی باطنی شہر میں نکل گئے۔ ان کا انداز یہ تھا کہ ہر آدمی کو جو ان کے قریب سے گزرتا تھا، السلام علیکم کہتے تھے، اور جو سلام پر رک جاتا اس سے وہ بغلیں ہو کر ملتے تھے۔ لوگوں کو تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ باطنی ہیں اور انہیں رئیس قلعہ نے قلعے میں آنے کی اجازت دی ہے۔ لوگ انہیں مذہبی پیشوا یا کسی دوسرے شہر کے دینی مدرسے کے استاد سمجھ رہے تھے۔

یہ باطنی کچھ آگے جا کر تین چار ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں تسبیحیں تھیں اور ان کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہوں۔ لوگ انہیں دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

ان میں سے آٹھ نو آدمی قلعے کے بڑے دروازے تک چلے گئے۔ دروازے کے ساتھ اندر کی طرف ایک کمرہ تھا جس میں دروازے کے پانچ چھ محافظ بیٹھے ہوئے تھے۔ دو محافظ دروازے پر کھڑے تھے۔ یہ باطنی ان دونوں محافظوں کے ساتھ بغلیں ہو کر ملے اور باتوں باتوں میں انہیں اپنے ساتھ محافظوں کے کمرے میں لے گئے۔

کمرے میں جو پانچ چھ محافظ بیٹھے ہوئے تھے، ان باغیوں کو عالم سمجھ کر بڑے احترام سے ملے۔ ایک باغی نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ تمام باغیوں نے اپنے پنوں کے اندر ہاتھ ڈالے اور جب ان کے ہاتھ باہر آئے تو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک چھوٹی ٹکوار تھی۔ محافظ نیتے تھے۔ ان کی ٹکواں اور برچھیاں الگ رکھی تھیں۔ انہیں اپنے ہتھیاروں تک پہنچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ باغیوں نے انہیں دیوچ لیا۔ بعض نے اپنے ہاتھ آئے ہوئے محافظوں کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور دوسروں نے ٹکواروں سے ان کے پیٹ چاک کر دیے۔ ان محافظوں میں کلید بردار بھی تھا یعنی وہ محافظ جو محافظوں کا کمانڈر جس کے پاس قلعے کی چابیاں تھیں۔ ان باغیوں نے اس کی لاش سے چابیاں اپنے قبضے میں لے لیں۔

باقی باغی بھی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر ادھر ادھر ہو گئے۔ شر کے کچھ لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ یہ بھی باغی تھے جو پہلے ہی اس قلعے میں موجود تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ حسن بن صباح چالیس فدائی بھیج رہا ہے جو علماء کے بھیس میں آئیں گے۔ اس قلعے میں فوج تو تھی لیکن اس کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ قلعے میں کسی نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ قلعے پر حملہ بھی ہو سکتا ہے۔ حملہ ہوا بھی تو ایسا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ رئیس قلعہ باغیوں کے علماء کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ باغی فدائین نے اس تھوڑی سی فوج کی ساری نفی کو مار ڈالا یا بیکار کر دیا۔

ایک باغی اس کمرے میں داخل ہوا جس میں رئیس قلعہ بن بویا باغیوں کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ اس باغی نے السلام علیکم کہا۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ باہر کام مکمل ہو گیا ہے۔ ایک باغی جو دوسروں کی طرح علماء کے بھیس میں تھا، اٹھا اور اس نے بن بویا کو دیوچ لیا۔ ایک اور باغی نے خطیب کو دیوچ لیا اور انہوں نے دونوں کو قتل کر دیا۔ اس طرح یہ قلعہ باغیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

حسن بن صباح کو اطلاع دی گئی۔ اس نے ایک آدمی کو امیر قلعہ بنا کر بھیج دیا۔



قلعہ ملاذ خان سے کچھ دور ایک اور قلعہ تھا جس کا نام قستان تھا۔ کسی بھی تاریخ میں اس قلعے کے حاکم کا نام نہیں ملتا۔ اس کے نام کی بجائے تقریباً ہر مورخ نے لکھا ہے کہ وہ فاسق اور بدکار تھا۔ اسے سلجوقیوں نے یہ قلعہ دیا تھا۔ تمام مستند تاریخوں میں

اس قلعے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

اس قلعے میں بھی ایک شہر آباد تھا۔ اس شہر کا ایک رئیس تھا جس کا نام منور الدولہ تھا۔ اس کے متعلق تاریخوں میں آیا ہے کہ صحیح العقیدہ اور جذبے والا مسلمان تھا۔ اس قلعے پر بھی باغیوں کی نظر تھی۔ قلعے کے دفاع کے لئے کوئی خاص فوج نہیں تھی۔ چند سو محافظ قلعے میں موجود رہتے تھے۔ چونکہ امیر قلعہ اپنی عیش و عشرت میں مگن رہتا تھا اس لئے باطنی اس قلعے میں کھلے بندوں آتے جاتے رہتے تھے۔

رئیس منور الدولہ کو کسی نے بتایا کہ یہاں ایک مکان میں پانچ چھ باطنی رہتے ہیں جو یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے کہ وہ باطنی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پکا مومن ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں مشکوک سی تھیں۔

دو چار آدمیوں نے رئیس منور کو بتایا کہ یہ لوگ خطرناک معلوم ہوتے ہیں، ان کی موجودگی کی اطلاع امیر قلعہ تک پہنچی چاہئے تاکہ وہ ان پر جاسوس اور مخبر مقرر کر دے۔ امیر قلعہ تک کوئی رئیس ہی پہنچ سکتا تھا۔ ایک روز منور امیر کے ہاں چلا گیا اور اسے ان باغیوں کے متعلق بتایا۔ رئیس منور امیر قلعہ کے ہاں آتا جاتا رہتا تھا۔

”ہمارے لوگ وہی ہیں منور!“ — امیر قلعہ نے بے نیازی اور: ”پرواہی سے کہا۔“ ”کو تمہاری بہن کا کہیں رشتہ ہوا ہے یا نہیں۔“

منور اس پر طیش آئی کہ وہ بات کتنی اہم کرنے آیا تھا اور امیر قلعہ اس کی بہن کے رشتے کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ منور کی ایک چھوٹی بہن تھی جو جوانی کی عمر کو پہنچ گئی تھی۔ مورخ لکھتے ہیں کہ وہ بہت ہی حسین اور شوخ لڑکی تھی۔ اس کے حسن کی شہرت سارے شہر میں پھیلی ہوئی تھی۔ امیر قلعہ نے اس لڑکی کے رشتے کے متعلق پوچھا تو منور نے بات کو ٹال دیا اور کہا کہ وہ جس کام کے لئے آیا ہے اس کام کی طرف توجہ دینا بہت ہی ضروری ہے۔

”میں دیکھوں گا“ — امیر قلعہ نے کہا — ”میں ان پر اپنے جاسوس مقرر کر دوں گا۔“

چونکہ منور صحیح معنوں میں مسلمان تھا اس لئے وہ باغیوں کا جانی دشمن بنا ہوا تھا۔ تین چار دنوں بعد وہ پھر امیر قلعہ کے پاس گیا اور اسے کہا کہ اس نے ابھی تک ان مشرک باغیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

”تمہیں میرے قلعے کا اتنا فکر کیوں لگا ہوا ہے؟“ — امیر قلعہ نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا — ”یہ پانچ سات باطنی میرا کیا بگاڑ لیں گے؟“

”امیر محترم!“ — منور نے کہا — ”کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ یہ باطنی کس طرح چھاتے چلے جا رہے ہیں۔ سلطان ملک شاہ کو انہوں نے قتل کیا ہے۔ اس سے پہلے سلطان مرحوم کے وزیر اعظم خواجہ حسن طوسی نظام الملک کو بھی ان ہی باطنیوں نے قتل کیا تھا۔ اگر آپ بیدار نہ ہوئے تو اس قلعے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ کیا آپ نے سنا نہیں کہ انہوں نے قلعہ ملاذ خان پر قبضہ کر لیا ہے۔“

”کیا بات کرتے ہو منور!“ — امیر قلعہ نے ہنس کر کہا — ”باطنی میرے قلعے پر قبضہ کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ یہاں آ بھی گئے تو یوں سمجھو کہ انہیں موت یہاں لے آئی ہے۔“

یہ قلعہ اتنا اہم تو نہ تھا کہ اسے تاریخ میں اتنا زیادہ بیان کیا جاتا لیکن اس کے ساتھ جو واقعہ وابستہ ہے، اس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ اسی وجہ سے منور خوں نے یہ واقعہ تاریخ میں شامل کیا ہے۔

منور الدولہ کے جذبے کا یہ عالم کہ وہ قلعے کی سلامتی کے متعلق پریشان تھا اور وہ ان پانچ چھ آدمیوں کے متعلق بھی فکر مند تھا جن کے متعلق بتایا جا رہا تھا کہ مشکوک ہیں اور باطنی معلوم ہوتے ہیں لیکن امیر قلعہ کی ذہنی حالت یہ تھی کہ جس روز رئیس منور اسے ملا، اس سے دو روز بعد امیر قلعہ نے اپنے دو خاص آدمیوں کے ہاتھ منور کی طرف بیش قیمت تحفے بھیجے اور ساتھ یہ پیغام کہ منور اپنی بہن کو اس کی بیوی بنا دے۔

”کیا امیر قلعہ کا دل غٹھیک کام کرتا ہے؟“ — منور نے تحفے دیکھ کر اور اس کا پیغام سن کر کہا — ”یہ تحفے واپس لے جاؤ اور اسے کہنا کہ میں اپنی نوجوان بہن کو ایک ایسے بوڑھے کے حوالے نہیں کروں گا جو شرابی بھی ہے، بدکار بھی ہے اور جس کی پہلے ہی نہ جلنے لگتی بیویاں ہیں۔“

”اس کی یہ جرات!“ — امیر قلعہ نے اپنے تحفے واپس آتے دیکھ کر اور رئیس منور کا انکار سن کر کہا — ”میں اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دوں گا۔ میں اس کے ساتھ دوستی قائم رکھوں گا اور تم دیکھنا کہ بہت جلد اس کی بہن میرے پاس ہوگی۔“

منور اپنے آپ میں یوں تڑپنے لگا جیسے امیر قلعہ نے اسے بڑی شدید ضرب لگائی

ہو۔ منور کو قلعے کا غم کھائے جا رہا تھا اور امیر قلعہ کی نظر اس کی بہن پر لگی ہوئی تھی۔ منور کی ایک ہی بیوی اور دو بچے تھے اور اس کے گھر کی ایک فرد اس کی یہ بہن تھی۔ منور نے بڑے غصے کی حالت میں اپنی بیوی اور بہن کے ساتھ یہ بات تفصیل سے کر دی۔

”میں ان پانچ چھ باطنیوں کو پکڑنا چاہتا ہوں“ — منور نے کہا — ”اگر یہ پکڑے گئے اور یقین ہو گیا کہ یہ باطنی جاسوس اور تخریب کار ہیں تو میں اپنے ہاتھوں انہیں قتل کروں گا۔“

تاریخی واقعات کے ایک انگریزی مجموعے میں یہ واقعہ اس طرح آیا ہے کہ منور کی بہن کا قومی جذبہ بھی منور جیسا ہی تھا۔ اس نے جب اپنے بھائی کی زبان سے سنا کہ وہ ان باطنیوں کو پکڑنا چاہتا ہے اور یہ بھی کہ بھائی نے اسے امیر قلعہ سے بیاہنے سے انکار کر دیا ہے تو اس لڑکی کے دل میں بھائی کی عظمت اور قومی جذبہ اور زیادہ شدت سے ابھر آیا۔

”میرے عزیز اور عظیم بھائی!“ — بہن نے منور سے کہا — ”میں آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے بتائیں کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں آپ کے خلوص، آپ کی محبت اور آپ کے جذبے کو دیکھ کر اپنا ایک راز آپ کو دے رہی ہوں۔ یہ جو پانچ چھ جواں سال آدمی ہیں اور جن پر آپ کو شبہ ہے، ان میں سے ایک مجھے چاہتا ہے اور میں اسے پسند کرتی ہوں۔ میں بلا جھجک آپ کو بتا رہی ہوں کہ میں اس آدمی سے تین چار مرتبہ تنہائی میں مل چکی ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا ہوا ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ پاک محبت کرتا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اس آدمی کو جذبات میں الجھا کر معلوم کر سکتی ہوں کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔“

”آفرین!“ — منور نے کہا — ”کوئی بھائی اپنی نوجوان بہن کو اس طرح استعمال نہیں کیا کرتا لیکن تمہارا ان لوگوں میں سے ایک کے ساتھ رابطہ ہو گیا ہے تو اس تعلق کو استعمال کرو۔ اگر تمہیں کہیں بھی خطرہ محسوس ہو تو فوراً مجھے بتا دینا۔ تم اس کے ساتھ حسن بن صباح کی بات چھیڑ دینا اور اس طرح باتیں کرنا جیسے تم حسن بن صباح کو اچھا سمجھتی ہو اور اس کے پاس جانا چاہتی ہو۔“

منور کی بہن خوبصورت تو تھی لیکن شوخ اور ذہین بھی تھی۔ اس نے منور سے کہا کہ وہ ان لوگوں کی اصلیت معلوم کر لے گی۔

امیر قلعہ نے منور کو اپنے ہاں بلایا۔ منور نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کے

جواب میں امیر قلعہ نے اپنی محفل میں اس قسم کے الفاظ کہے کہ وہ منور کو اُڑا دے گا اور اس کی بہن کو اپنے ہاں لے آئے گا۔ اس کی یہ دھمکی منور کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اس کا اس پر بہت ہی برا اثر ہوا اور وہ ایک کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ کشمکش یہ تھی کہ وہ اپنے جذبے کو قائم رکھے یا امیر قلعہ کے رویے سے متاثر ہو کر اپنے جذبے سے دستبردار ہو جائے۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ امیر قلعہ کو اپنے قلعے کا کچھ خیال نہیں تو اسے کیا پڑی ہے کہ وہ جاسویاں کرتا پھرے۔ جذبے مرا تو نہیں کرتے، اس کے خیالوں پر قومی جذبہ غالب آ گیا۔



تین چار دنوں بعد ہی منور کو اس کی بہن نے بتایا کہ یہ لوگ باطنی ہیں اور یہاں جاسوسی اور تخریب کاری کے لئے آئے ہیں لیکن ابھی اپنے باطنی عقیدے کی درپردہ تبلیغ کر رہے ہیں۔

”تم نے کیسے معلوم کیا ہے؟“ — منور نے بہن سے پوچھا۔

”مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی“ — بہن نے کہا — ”جس طرح آپ نے کہا تھا، میں نے اسی طرح کیا۔ میں نے حسن بن صباح کی باتیں ایسے الفاظ میں کیں جیسے میں اسے نبی سمجھتی ہوں اور اسے دیکھنے کو بے قرار ہوں۔ اس نے پہلے تو یہ ظاہر کیا کہ وہ حسن بن صباح کو کافر سمجھتا ہے لیکن میں اسے جذبات میں لے آئی اور اپنی بات پر قائم رہی۔ دوسرے دن وہ میری بات پر آگیا اور اس نے کہا کہ وہ مجھے حسن بن صباح کے پاس لے جائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ امام حسن بن صباح تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔“

مختصر یہ کہ اس لڑکی نے پانچ چھ آدمیوں کے اس گروہ کی اصلیت معلوم کر لی۔ وہ جس آدمی سے محبت کرتی تھی، اس آدمی نے وہ دن بھی مقرر کر دیا تھا جب اس آدمی نے اس لڑکی کو اس شہر سے لے جانا تھا۔ دو دن گزر گئے۔ منور کی بہن باہر نکلی اور پھر واپس نہ آئی۔ سورج غروب ہو گیا، رات گہری ہو گئی، لڑکی واپس نہ آئی۔ تب منور کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے بہن کو خطرناک آدمی کے ساتھ دوستی بنائے رکھنے پر اکسایا تھا۔ اس میں کوئی شک تھا ہی نہیں کہ اس کی بہن اس باطنی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ منور کو معلوم تھا کہ حسن بن صباح کے پاس اس قسم کی سینکڑوں حسین اور تیز طرار لڑکیاں

ہیں جنہیں وہ اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہ سوچ کر منور کا غصہ بڑھتا ہی گیا اور وہ پیچ و تاب کھانے لگا کہ وہ کیا کرے۔ اسے امیر قلعہ کا خیال آیا کہ اسے جا کر بتائے اور وہ ان مشکوک آدمیوں کو پکڑ کر معلوم کرے کہ لڑکی ان کے قبضے میں ہے یا نہیں لیکن اس نے جب سوچا کہ امیر قلعہ نے اسے دشمن سمجھ لیا ہے تو اس نے امیر قلعہ کو ذہن سے اتار دیا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔

”میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے“ — منور کو اس کی بیوی نے کہا — ”آپ امیر قلعہ کے پاس جائیں اور اسے بتائیں کہ اس کی بہن کو ان مشکوک آدمیوں میں سے ایک آدمی نے محبت کا جھانسنہ دے کر غائب کر دیا ہے۔ پھر امیر قلعہ سے کہیں کہ اگر آپ میری بہن کو ان سے آزاد کروادیں تو میں اپنی بہن کو آپ کے ساتھ بیاہ دوں گا۔“

”یہ تو میں کسی قیمت پر نہیں کروں گا“ — منور نے کہا — ”بہن مجھے نظر آگئی تو میں اسے قتل کر دوں گا“ اسے اس امیر قلعہ کی زوجیت میں نہیں دوں گا۔

”میں آپ سے یہ تو نہیں کہہ رہی کہ اپنی بہن ضرور ہی اسے دیتی ہے“ — منور کی بیوی نے کہا — ”پہلے اپنی بہن کا سراغ تو لگائیں۔ وہ مل گئی تو امیر قلعہ کو صاف کہہ دینا کہ میں تمہیں اپنی بہن نہیں دوں گا۔ آپ ڈریں نہیں۔ میرے تین بھائی ہیں۔ میں ان کے ہاتھوں اس امیر قلعہ کو قتل کروا سکتی ہوں۔“

منور اسی وقت امیر قلعہ کے ہاں چلا گیا۔ امیر قلعہ شراب پی رہا تھا اور اس وقت اس کے ساتھ ایک نوخیز لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے منور کو اندر بلا لیا اور لڑکی کو وہاں سے اٹھا دیا۔

”کہو ریس!“ — امیر قلعہ نے طنزیہ سے لہجے میں پوچھا — ”کیسے آنا ہوا؟“

”مجھے آپ کی مدد کی ضرورت آپڑی ہے“ — منور نے کہا — ”میری بہن لاپتہ ہو گئی ہے۔ مجھے ان ہی پانچ چھ آدمیوں پر شک ہے جن کے متعلق میں آپ کے ساتھ بات کر چکا ہوں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ ان میں سے ایک آدمی نے میری بہن کو محبت کا جھانسنہ دیا تھا۔ مجھے شک ہے کہ میری بہن کو وہی لے گیا ہے اور میں جس مسئلے پر پریشان ہو رہا ہوں وہ یہ ہے کہ میری بہن کو حسن بن صباح تک پہنچا دیا جائے گا۔“

”وہ کہیں نہیں گئی“ — امیر قلعہ نے ایسے لہجے میں کہا جس میں شراب کا اثر

نمایاں تھا۔ ”وہ ہمیں ہے اور میرے پاس ہے..... پریشان مت ہو رنیں!..... اگر تم اجازت دے دو تو یہ شادی دھوم دھام سے ہوگی اور اگر تم اجازت نہیں دو گے تو بھی یہ شادی ہو کے رہے گی اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے..... کو کیا کہتے ہو؟ کیا تم بھول گئے تھے کہ میرے ہاتھ میں کتنی طاقت ہے؟“

”شراب کی طاقت کوئی طاقت نہیں ہوتی“۔ منور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں صرف ایک بار شرافت اور دوستی سے کہوں گا کہ میری بہن ابھی میرے حوالے کر دو۔ دوسری بار نہیں کہوں گا۔“

اس وقت امیر قلعہ نشے میں بدست تھا۔ شراب کا نشہ تو کوئی نشہ نہیں تھا، اصل نشہ تو یہ تھا کہ وہ قلعے کا اور اس شہر کا حاکم تھا۔ یہ تھا اصل نشہ۔

”رنیں منور!“۔ امیر قلعہ نے کہا۔ ”تم چلے جاؤ۔ سوچ کر کل مجھے جواب دینا۔ اگر اس وقت دھمکیوں کی زبان میں بات کرو گے تو میں اپنے نوکروں کو بلا کر تمہیں دھکے دلا کر گھر سے نکالوں گا اور اپنے دو شکاری کتے تم پر چھوڑ دوں گا۔“

منور وہاں سے نکل آیا۔



منور اپنے گھر پہنچا تو منور وہ منور نہیں تھا جو قوی جذبے سے سرشار رہتا تھا۔ اس کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے اور اس کی ذات میں آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ بیوی نے اس سے پوچھا تو وہ چپ رہا۔ بیوی کو ایک طرف کر دیا اور تلواریں لے کر پھر باہر نکل گیا۔ اس کی بیوی اس کے پیچھے دوڑی اور باہر تک آگئی۔ منور نے رک کر پیچھے دیکھا۔

”تم واپس چلی جاؤ“۔ اس نے بیوی سے کہا۔ ”میں کسی کو قتل کرنے نہیں جا رہا۔ میں انشاء اللہ زندہ واپس آؤں گا۔“

بیوی واپس اپنے گھر آگئی لیکن وہ بہت ہی پریشان تھی۔ منور نے اس حویلی کے دروازے پر جادو تک دی جس میں پانچ چھ مشکوک آدمی رہتے تھے۔ دروازہ کھلا تو منور نے دیکھا کہ دروازہ کھولنے والا وہی آدمی تھا جسے اس کی بہن چاہتی تھی اور جو اس کی بہن کو چاہتا تھا۔ منور اسے اور وہ منور کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ منور کو اندر لے گیا۔ سارے آدمی منور کے پاس بیٹھ گئے۔

”میرے دوستو!“۔ منور نے کہا۔ ”میں قتل کرنے نہیں آیا نہ قتل ہونے کا

ارادہ ہے۔ میری بہن لاپتہ ہو گئی ہے اور مجھے پتہ چل گیا ہے کہ وہ امیر قلعہ کے پاس ہے۔ وہ بد بخت کبھی کا میری بہن کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور میں اسے صاف الفاظ میں کہہ چکا تھا کہ میں اپنی بہن اس کی زوجیت میں نہیں دوں گا۔

”آپ ہمارے پاس کیوں آئے ہیں؟“ — اس آدمی نے پوچھا جس کے ساتھ منور کی بہن کی محبت تھی — ”ہم آپ کی جو مدد کر سکتے ہیں وہ بتائیں۔“

”میرے دوستو!“ — منور نے کہا — ”میں جانتا ہوں کہ تم سب باطنی ہو اور حسن بن صباح کے بھیجے ہوئے یہاں آئے ہو۔ میں تمہیں کسی بھی وقت پکڑوا کر قتل کروا سکتا تھا لیکن میری یہ بات اب غور سے سنو کہ اب میں تمہارا ساتھی ہوں۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ صبح ہوتے ہی تم میں سے کوئی ایک آدمی حسن بن صباح کے پاس جائے اور اسے کہے کہ اپنے آدمی بھیجے جس طرح تم نے قلعہ ملاذخان میں بھیجے تھے۔ یہ قلعہ بھی لے لو۔“

اس سلسلے میں ان کے درمیان کچھ اور باتیں ہوئیں اور ایک آدمی حسن بن صباح کے پاس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ منور کی حالت ایسی تھی جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ اس کو بہن سے بہت ہی پیار تھا۔ اس بہن کو امیر قلعہ لے اڑا تھا۔ وہ پاگل نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔ وہ بھول ہی گیا کہ وہ باطنیوں کا دشمن ہے اور باطنی اسلام کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں۔

دو یا تین دن گزرے ہوں گے کہ جو آدمی حسن بن صباح کے پاس گیا تھا وہ واپس آگیا اور اسی روز شہر میں تاجروں کا ایک قافلہ آیا۔ ان کے ساتھ اونٹ تھے جن پر اثابج اور مختلف قسم کا سامان لدا ہوا تھا۔ ان تاجروں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی۔ یہ سرائے میں ٹھہرے۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ امیر قلعہ حسب معمول شراب پی رہا تھا۔ اس نے منور کی بہن کو اپنے پاس بٹھا رکھا تھا اور شراب پینے پر مجبور کر رہا تھا۔ لڑکی رو رو کر انکار کر رہی تھی اور امیر قلعہ قہقہے لگا رہا تھا۔ عین اس وقت دربان نے اندر جا کر اسے بتایا کہ رئیس شہر منور الدولہ آئے ہیں۔ امیر قلعہ نے قہقہہ لگا کر کہا کہ اسے اندر بھیج دو۔

جب منور اندر گیا تو وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے آٹھ نو آدمی تھے۔ امیر قلعہ نے حیرت زدہ سا ہو کر ان سب کو دیکھا لیکن اسے یہ پوچھنے کی مہلت نہ ملی کہ وہ کون ہیں اور

کیوں آئے ہیں۔ انہوں نے امیر قلعہ کو پکڑ لیا اور اُن میں سے ایک نے فخر امیر قلعہ کے دل میں اتار دیا۔ ایک ہی وار کافی تھا۔

یہ جو تاجر آئے تھے، یہ سب حسن بن صباح کے فدائین تھے۔ وہ ٹولیوں میں بٹ گئے تھے اور جب امیر قلعہ کو قتل کیا گیا اُس وقت وہ اُن چند سو محافظوں پر قابو پا چکے تھے جو مختلف جگہوں پر سوئے ہوئے تھے۔

اگلی صبح اعلان ہوا کہ اب امیر قلعہ کوئی اور ہے۔ اس طرح یہ قلعہ بھی حسن بن صباح کے قبضے میں چلا گیا۔

منور کو توقع تھی کہ باطنی اسے کوئی اعزاز دیں گے۔ تاریخی حوالوں کے مطابق، اس کی خواہش یہ تھی کہ اسے اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنی بیوی کو، بہن اور بچوں کو ساتھ لے کر مرو یا رے چلا جائے لیکن اس کا انجام بہت بُرا ہوا۔ منور پر اسرار طریقے سے قتل ہو گیا اور اس کی بہن کو حسن بن صباح کی جنت میں بھیج دیا گیا۔ اس کے بیوی بچوں کا تاریخ میں ذکر نہیں ملتا۔

منور الدولہ قتل ہو گیا۔ اس کے بیوی بچوں کا کچھ پتہ ہی نہ چلا وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں یا غائب کر دیئے گئے ہیں اور اس کی بہن کو باطنی لے اڑے۔ منور الدولہ نے اسی بہن کی خاطر قلعہ قستان پر باطنیوں کا قبضہ کروا دیا تھا۔ وہ تو پکا مومن تھا لیکن بہن کی عزت اور عصمت پر اس نے اپنا ایمان بھی قربان کر دیا تھا۔ منور الدولہ کے خاندان کا تو نام و نشان ہی مٹ گیا تھا لیکن یہ کہانی ہمیں پر ختم نہیں ہوتی۔

اس کی بہن کا نام حمیرا تھا۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ وہ بڑی ہی حسین لڑکی تھی۔ وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی اپنے دین و ایمان کی پکی تھی۔ اس میں اپنے بھائی منور الدولہ جیسا جذبہ تھا۔ اس کے دل میں بھی حسن بن صباح اور اس کے باطنی فرقے کی نفرت موجزن تھی لیکن اسے محبت ہوئی تو ایک باطنی سے ہوئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ خوہرہ اور جواں سال آدمی حسن بن صباح کا بھیجا ہوا تخریب کار اور جاسوس ہے۔

پچھلے باب میں آچکا ہے کہ اس شہر کے ایک مکان میں پانچ چھ آدمی رہتے تھے جو بظاہر دین دار اور زاہد تھے لیکن یہ ان کا بہروپ تھا۔ وہ پانچوں وقت مسجد میں جا کر نماز ادا کرتے اور وہ اتنے فلسفہ ہر کسی کے ہمدرد اور اتنے ہنس مکھ تھے کہ ہر کوئی انہیں محبت اور احترام سے ملتا اور ہر محفل میں انہیں تعظیم دی جاتی تھی۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے کہ ان کی سرگرمیاں کتنی پراسرار اور مشکوک سی تھیں کہ کچھ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ لوگ باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور ہیں۔ شہر کے بیشتر لوگ ان پر کسی قسم کا کوئی شک نہیں کرتے تھے۔ منور الدولہ کو تو آخر میں آکر یقین ہو گیا تھا کہ یہ پانچ

چھ مذہبی قسم کے آدمی باطنی ہیں اور کسی بھی وقت کوئی تباہ کاری کر سکتے ہیں لیکن قلعے کا حاکم منور الدولہ کی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

منور الدولہ اس شہر کا رئیس تھا لیکن اس میں وہ تکبر اور غرور نہیں تھا جو اس وقت رئیسوں میں ہوا کرتا تھا۔ وہ صاف ستھرا مسلمان تھا۔ صوم و صلوة اور حقوق العباد کا پابند تھا۔ عبادت کے ساتھ ساتھ وہ عسکریت پسند بھی تھا۔ اسے اپنی بہن حمیرا کے ساتھ بہت ہی پیار تھا۔ اسی پیار کا کرشمہ تھا کہ حمیرا بھی خیالات اور کردار کے لحاظ سے اپنے بھائی کے نقش قدم پر چل رہی تھی۔ اسے گھوڑ سواری کا بہت شوق تھا۔ منور نے اسے شہسوار بنادیا تھا۔ اسے تیغ اور خنجر زنی، نیزہ بازی اور تیر اندازی بھی سکھادی تھی۔ وہ آخر شہر کے رئیس کی بہن تھی اس لئے اس میں خود اعتمادی اور جرات تھی۔ وہ دوسرے تیسرے دن شام کے وقت گھوڑے پر سوار ہوتی اور شہر سے نکل جاتی تھی۔ گھوڑا دوڑاتی اور جدھر چاہتی اُدھر ہو آتی تھی۔

ایسی ہی ایک شام وہ شہر سے کچھ دور گھوڑا دوڑا رہی تھی، ایک بڑا ہی خوبو گھوڑا سوار گھوڑا دوڑاتا پھر رہا تھا۔ حمیرا نے اپنا گھوڑا اس کے قریب سے گزارا تو اس سوار نے اسے غور سے دیکھا اور فوراً ”ہی گھوڑا اس کے پیچھے دوڑا دیا۔ دونوں گھوڑے جب پہلو بہ پہلو ہوئے تو حمیرا نے اس سوار کو غصیلی نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا کہ وہ کس نیت سے اس کے پاس چلا آیا ہے۔

”گھوڑا فوراً روک لیں“ — اس سوار نے کہا — ”آپ کی زین کسی ہوئی نہیں ڈھیلی ہے اور آپ گر پڑیں گی۔“

حمیرا نے گھوڑا روک لیا اور اتر آئی۔ وہ آدمی بھی گھوڑے سے اتر ا اور حمیرا کے گھوڑے کی زین دیکھی۔ واقعی زین کسی ہوئی نہیں تھی۔ اس نے زین اچھی طرح کس دی۔

”اب جائیں“ — اس سوار نے کہا — ”بس مجھے آپ سے اتنی ہی دلچسپی تھی۔“

حمیرا کو یہ شخص شکل و صورت اور جسم کے لحاظ سے بھی اچھا لگا اور بول چال کے انداز سے بھی۔ وہ کوئی چھوٹی سی حیثیت کا آدمی نہیں لگتا تھا۔

”آپ کون ہیں؟“ — حمیرا نے پوچھا — ”کیا آپ یہیں کے رہنے والے

ہیں؟“

”میرا نام جابر بن حاجب ہے“ — اس سوار نے جواب دیا — ”پر کسی ہوں۔ بغداد سے یہاں علم کی تلاش میں آیا ہوں۔ اپنے جیسے چار پانچ آدمی مل گئے ہیں۔ ان کے ساتھ رہتا ہوں۔“

”لیکن آپ تو شہسوار معلوم ہوتے ہیں“ — حمیرا نے کہا — ”اس زین پر میں سوار تھی اور مجھے پتہ نہ چلا کہ یہ پوری طرح کئی ہوئی نہیں۔ آپ کو اتنا تجربہ ہے کہ آپ نے دُور سے دیکھ لیا اور مجھے گرنے سے بچا لیا۔“

”کیا علم کی جستجو میں مارے مارے پھرنے والے شہسوار نہیں ہو سکتے؟“ — جابر بن حاجب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہوتا تو یہی ہے“ — حمیرا نے کہا — ”عالم عموماً“ تارک الدنیا سے ہو جاتے ہیں۔“

”میں ان عالموں میں سے نہیں“ — جابر نے کہا — ”دنیا سے تعلق توڑ لیتا علم کی خلاف ورزی ہے بلکہ میں اسے علم کی توہین سمجھتا ہوں۔ میں مسلمان ہوں..... وہ مسلمان ہی کیا جو شہسوار نہ ہو اور جس کا ہاتھ تلوار، برچھی اور کمان پر صاف نہ ہو۔ میں ایک زندہ قسم کا عالم بننا چاہتا ہوں۔ اُس عالم کو میں نامکمل انسان سمجھتا ہوں جو عمل سے کتراتا ہو۔“

دونوں اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور گھوڑے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ جابر کی زبان میں اور بولنے کے انداز میں کوئی ایسا تاثر تھا کہ حمیرا کو جیسے یہ بھی یاد نہ رہا ہو کہ اسے واپس گھر بھی جانا ہے۔ گھوڑے آگے ہی آگے چلے جا رہے تھے۔ آگے دریا تھا جہاں گھوڑے رک گئے۔

وہ علاقہ بڑا ہی سرسبز تھا جس میں پیڑ پودوں کی افراط تھی۔ اس ماحول کی اپنی ایک رومانیت تھی جو حمیرا پر اثر انداز ہونے لگی۔ جابر نے حمیرا کو یاد دلایا کہ شام گہری ہو گئی ہے اس لئے اسے واپس گھر جانا چاہئے۔ حمیرا وہاں سے چل تو پڑی لیکن وہ محسوس کرنے لگی کہ اس کا دل وہیں دریا کے کنارے رہ گیا ہے۔ اس نے گھوم گھوم کے پیچھے دیکھا۔ آخر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

یہ حمیرا اور جابر کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد حمیرا گھوڑ سواری کے لئے ہر شام

باہر آنے لگی۔ اس کی نظریں جابر کو ڈھونڈتی تھیں لیکن جابر ہر روز باہر نہیں جاتا تھا۔ تیسرے چوتھے روز اسے جابر مل جاتا اور دونوں دریا کے کنارے اُس جگہ چلے جاتے جہاں انہیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ نہ جابر نے کوئی ایسی بات کی تھی نہ حمیرا نے کوئی ایسا اشارہ دیا تھا کہ ان کی محبت کا تعلق جسموں کے ساتھ ہے۔ یہ دو روحوں کی محبت تھی اور ان کی روحوں کا جسمانی آسودگی اور نفسانی خواہش کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ گھوڑوں سے اتر کر ایک دوسرے میں گم ہو جایا کرتے تھے۔

انہوں نے شادی کے عہد و پیمان کر لئے۔ حمیرا نے جابر کو بتا دیا تھا کہ اس کا بھائی شہر کار نہیں ہے اس لئے وہ اس کی شادی کسی رئیس زادے سے ہی کرے گا۔
 ”اگر تم بھائی سے کہو کہ تم میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو تو کیا وہ انکار کر دے گا؟“
 — جابر نے پوچھا۔

”ہاں!“ — حمیرا نے جواب دیا — ”میں اُس سے اجازت تو ضرور لوں گی۔ اُسے میرے ساتھ اتنا پیار ہے جو اُسے اپنے بچوں کے ساتھ بھی نہیں لیکن اُس نے انکار کر دیا تو میں تمہارے ساتھ جہاں کہو گے چلی چلوں گی۔ میرا دل کسی رئیس زادے یا کسی امیر زادے کو قبول نہیں کرے گا۔ یہ لوگ عیش پرست ہوتے ہیں۔ میں کسی کے حرم کی قیدی نہیں بنوں گی، میں ایک انسان کی رفیقہ حیات بنوں گی۔“



حمیرا کسی وقت بھی محسوس نہ کر سکی کہ یہ شخص باطنی ہے اور علم و فضل کے ساتھ اس کا دُور کا بھی تعلق نہیں اور یہ حسن بن صباح جیسے ابلیس کا پیرو کار ہے۔ پھر وہ دن آیا جس دن منور الدولہ نے حمیرا کو بتایا کہ فلاں مکان میں جو پانچ چھ آدمی رہتے ہیں وہ حسن بن صباح کے پیچھے ہوئے بڑے ہی خطرناک آدمی ہیں۔

”باطنیوں کو تم جانتی ہو نا حمیرا!“ — منور نے کہا — ”اسلام کا نام لے کر یہ فرقہ اسلام کا چہرہ مسخ کر رہا ہے اور اگر انہیں یہیں پر روکا نہ گیا تو اس اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا جو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔“

حمیرا نے وہ مکان دیکھا تھا جس میں جابر بن حباب رہتا تھا اور اس نے جابر کے ساتھی بھی دیکھے تھے۔ اپنے بھائی کی یہ بات سن کر اسے افسوس ہوا کہ جابر بھی باطنی ہے اور اس نے جھوٹ بولا ہے کہ وہ بغداد سے علم کی تلاش میں آیا ہے۔

”میرے عظیم بھائی!“ حیرانے پوچھا۔ ”کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ لوگ باطنی ہیں؟“

”ابھی یقین نہ کرو“ — منور نے جواب دیا — ”شک پکا ہے۔ کچھ لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ یہ پانچ چھ آدمی مشکوک ہیں۔“

داستان گوسنا چکا ہے کہ منور امیر شہر کے پاس گیا اور اسے بتایا تھا کہ یہ پانچ چھ آدمی ٹھیک معلوم نہیں ہوتے اور انہیں پکڑنا چاہئے لیکن امیر شہر نے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ منور مومن اور مجاہد قسم کا مسلمان تھا۔ اس نے حیرانے سے کہا کہ یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کا قلع قمع کرے لیکن یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ یہ لوگ واقعی باطنی ہیں اور تخریب کاری کی نیت سے یہاں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔

حیرانے بھائی سے کہا کہ اگر سوال اسلام کی سر بلندی اور باطنیوں کی سرکوبی کا ہے تو وہ یہ راز نکال لائے گی۔ پہلے سلیا جا چکا ہے کہ وہ ان پانچ چھ آدمیوں کی اصل حقیقت معلوم کر لائی۔ اس نے یہ راز جابر بن حجاب سے لیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جابر کو حیرانے اتنی زیادہ محبت تھی کہ اُس نے حیرانے کو اپنا راز دے دیا۔ حیرانے کے دل میں بھی جابر کی بے پناہ محبت تھی لیکن اُسے جو محبت اپنے بھائی سے اور اسلام سے تھی، اس پر اُس نے اپنی محبت قربان کر دی۔ اس راز سے اس قلعہ بند شہر کے زمین و آسمان ہی تہہ و بالا ہو گئے۔

قلعے میں خوزیز ہنگامہ شروع ہوا تو جابر حیرانے کے گھر جا پہنچا۔ اس وقت منور گھر نہیں تھا۔ وہ امیر شہر کے گھر میں تھا جہاں کچھ باطنی اس کے ساتھ تھے اور پھر امیر شہر کو قتل کر دیا گیا تھا۔ جابر نے حیرانے کو ساتھ لیا اور شہر سے نکلا۔



حیرانے اس توقع پر جاری تھی کہ جابر اسے بغداد اپنے گھر لے جا رہا ہے لیکن شام کے بعد جب وہ ایک جگہ رُکے تو حیرانے پر یہ انکشاف ہوا کہ اسے بغداد نہیں بلکہ اَلْمُوت لے جایا جا رہا ہے۔

یہ اسے اس طرح پتہ چلا کہ وہ جب اپنے شہر سے نکلی تھی تو جابر اس کے ساتھ اکیلا تھا۔ دونوں گھوڑوں پر جا رہے تھے۔ جابر بہت ہی آہستہ رفتار پر جا رہا تھا۔ حیرانے اسے کہا کہ تیز چلنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ اس کا بھائی تعاقب میں آجائے۔ جابر نے اسے بتایا کہ

وہ اپنے ساتھیوں کے انتظار میں ہے۔ وہ بھی شہر سے نکل آئے ہوں گے۔ کچھ دیر بعد جابر کے پانچ ساتھی اس سے آئے۔ قلعے پر قبضہ کرنے کے لئے دوسرے باطنی پہنچ گئے تھے۔ جابر اور اس کے ساتھیوں کا کام ختم ہو گیا تھا۔ جابر نے قلعہ سر کرنے کے علاوہ ایک بڑا خوبصورت شکار بھی مار لیا تھا۔ حسن بن صباح جن لڑکیوں کو اپنے ابلیسی مقاصد کے لئے استعمال کرتا تھا، حمیرا اگر ان سے کچھ درجے زیادہ حسین نہیں تھی تو کسی سے کم بھی نہیں تھی۔ حمیرا کو الموت پہنچ کر کچھ ٹریننگ دینی تھی اور پھر اُسے حسن بن صباح کی جنت میں حور بنا کر داخل کرنا تھا۔

سورج غروب ہو گیا اور یہ چھوٹا سا قافلہ چلا گیا اور جب رات زیادہ گہری ہو گئی تو یہ لوگ رک گئے۔ وہ کھانا اپنے ساتھ بے آئے تھے جو انہوں نے خود بھی کھایا اور حمیرا کو بھی کھلایا۔

انہوں نے حمیرا کی موجودگی میں ایسی باتیں کیں جن سے حمیرا کو یقین ہو گیا کہ اسے بغداد لے جایا جا رہا ہے جہاں جابر اس کے ساتھ شادی کر لے گا۔ کھانا کھا چکے تو انہوں نے سونے کا بندوبست اس طرح کیا کہ حمیرا کے لئے الگ چادر بچا دی اور باقی آدمی اس سے ذرا پرے ہٹ کر لیٹ گئے۔ حمیرا پختہ کردار اور ایمان والی لڑکی تھی لیکن محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ گھر سے بھاگ آئی تھی۔ اس کی جذباتی کیفیت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ وہ اپنے آپ میں بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ کبھی تو اس کو خیال آتا کہ اس نے گھر سے نکل کر کوئی غلط کام نہیں کیا۔ وہ فخر سے کہہ سکتی تھی وہ باعصمت لڑکی ہے اور محبت میں مبتلا ہو کر بھی اس نے اپنی عصمت کو داغ دار نہیں ہونے دیا۔ وہ اس خیال سے بھی خوش تھی کہ اس نے اپنے بھائی کو ناراض نہیں کیا اور اس کے آگے جھوٹ نہیں بولا لیکن "۱" ہی اس کا ضمیر لعنت ملامت کرنے لگا کہ ایک طرف تو وہ اسلام کی محبت کو دل میں لئے ہوئے ہے اور دوسری طرف اس نے ایک شر باطنیوں کے حوالے کروا دیا ہے۔ بیشک اس کے بھائی نے امیر شہر سے انتقام لیا تھا لیکن ایک شہر اور اس مسلمان شہر کی آبادی باطنیوں کے حوالے کر دینا ایک گناہ تھا۔

حمیرا کی ذات میں ایسی کشمکش پیدا ہو گئی کہ وہ بے چین ہی ہوتی چلی گئی اس کیفیت میں اسے نیند کیسے آتی!..... وہ دل ہی دل میں اللہ معافیاں مانگنے لگی۔ اپنے دل کی تسلی کے لئے اپنے آپ کو سبزیلغ بھی دکھائے۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ وہ جابر کی

بیوی بن گئی ہے اور زندگی بڑی ہی پُر سکون ہو گئی ہے۔ جابر نے اُسے یہ تو بتا دیا تھا کہ اس کے ساتھی باطنی ہیں لیکن اپنے متعلق یہ بتایا تھا کہ وہ باطنی نہیں اور وہ ان آدمیوں کے ساتھ اس لئے رہتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے عقیدے اور نظریے معلوم کرنا چاہتا ہے اور جب اسے یہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا تو پھر وہ حسن بن صباح کے عقیدوں کے خلاف تبلیغ کا فریضہ انجام دے گا۔

جابر حمیرا کے پاس آیا اور جھک کر اسے دیکھا۔ حمیرا نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ سوئی ہوئی ہے، آنکھیں بند کر لیں۔ جابر چلا گیا۔ وہ یہی دیکھنے آیا تھا کہ حمیرا سو گئی ہے یا نہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس جا بیٹھا۔ وہ حمیرا سے کوئی زیادہ دور نہیں تھے۔ یہی کوئی آٹھ دس قدموں کا فاصلہ ہو گا۔

”سو گئی ہے“ — یہ جابر کی آواز تھی جو حمیرا کو سنائی دی۔

حمیرا پہلے ہی بیدار تھی، اس نے جابر کی یہ بات سنی تو وہ بالکل ہی بیدار ہو گئی اور اُس نے کان ان لوگوں کی طرف لگا دیے۔ اسے شک اس لئے ہوا کہ جابر نے یہ بات کچھ اور ہی انداز سے کی تھی۔

”اسے شک تو نہیں ہوا کہ ہم اسے کہیں اور لے جا رہے ہیں؟“ — جابر کے ایک ساتھی نے پوچھا۔

”نہیں!“ — جابر نے جواب دیا — ”میں نے اسے شک نہیں ہونے دیا۔“

”خدا کی قسم!“ — ایک نے کہا — ”امام اسے دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ اگر یہ چل پڑی تو ہو سکتا ہے امام اسے باہر بھیج دیں۔“

”میں تمہیں ایک بات بتا دوں دوستو!“ — جابر نے کہا — ”یہ تو تم جانتے ہو کہ میں اسے کس کام کے لئے لے جا رہا ہوں لیکن میں نے اس کے ساتھ جو محبت کی ہے اس میں کوئی دھوکہ اور فریب نہیں۔ میں اسے اپنی روح میں بٹھا چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنے لئے کتنی بڑی دشواری پیدا کر لی ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو شیخ الجبل کو پتہ نہ چلنے دینا“ — ایک اور ساتھی بولا — ”شیخ الجبل کو پتہ چل گیا کہ تم اس لڑکی کے معاملے میں جذباتی ہو تو تم جانتے ہو کہ تمہیں کیا سزا ملے گی۔“

”ہاں جانتا ہوں“ — جابر نے کہا — ”امام اپنا خنجر دے کر مجھے کہے گا کہ یہ اپنے

دل میں اتار لو۔ میں محتاط رہوں گا کہ امام کو اپنی جذباتی حالت نہ بتاؤں۔“
حسن بن صباح کو اس کے پیروکار امام کہا کرتے تھے اور تاریخوں میں اسے شیخ البلیل کہا گیا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں نے حمیرا کو سویا ہوا سمجھ کر ایسی باتیں کیں جن سے حمیرا کے ذہن میں کوئی شک و شبہ نہ رہا کہ اسے دھوکے میں اُلٹ لے جایا جا رہا ہے۔ وہاں وہ اسی اہلبیت کا ایک کل پرزہ بن جائے گی جس کے خلاف اُس کے دل میں نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ پہلے ہی بے چینی میں مبتلا تھی اب وہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے اس کے اندر آگ بھڑک اٹھی ہو۔ اس نے پہلے تو یہ سوچا کہ ان لوگوں کے پاس چلی جائے اور کہے کہ وہ یہاں سے آگے نہیں جائے گی لیکن عقل نے اس کی راہنمائی کی۔ اس نے سوچا کہ یہ چھ آدمی ہیں اور یہ ان چھ آدمیوں سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ اس نے ان کے ہاتھوں مرجانے کا بھی فیصلہ کر لیا لیکن اس فیصلے پر قائم نہ رہ سکی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ جب یہ سب سو جائیں تو اٹھے اور دبے پاؤں ایک گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلے۔ اس پر اس نے غور کیا اور یہی فیصلہ کر لیا کہ یہ سو جائیں تو وہ بھاگ جائے گی۔



آدھی رات ہونے کو آئی تھی جب یہ چھ آدمی سونے لگے۔ جابر ایک بار پھر حمیرا کے قریب آیا اور جھک کر اسے دیکھا۔ حمیرا نے آنکھیں بند کر لیں۔ جابر یہ یقین کر کے کہ لڑکی سو گئی ہے اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ پھر وہ سب سو گئے۔

حمیرا تو پوری طرح بیدار اور تیار ہو چکی تھی۔ اب اسے انتظار تھا کہ یہ اور زیادہ گہری نیند میں چلے جائیں تو وہ یہاں سے اٹھے اور نکلے۔ گھوڑے پندرہ بیس قدم دور بندھے ہوئے تھے۔ زینیں ان آدمیوں نے اپنے قریب رکھی ہوئی تھیں۔

حمیرا کو ان کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ اس نے کچھ دیر اور انتظار کیا۔ آخر وہ اٹھی اور دبے پاؤں زینوں تک پہنچی۔ اس نے ایک زین اٹھالی لیکن زین وزنی تھی۔ وہ زین اٹھا کر چلی تو زمین پر پڑی ہوئی ایک زین سے اس کا پاؤں ٹکڑا گیا اور وہ گر پڑی۔ لوہے کی رکابیں آپس میں ٹکرائیں تو بڑی زور کی آواز اٹھی۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز زیادہ ہی زوردار سنائی دی۔ جابر کی آنکھ کھل گئی۔ باقی ساتھی سوئے رہے۔ ادھر حمیرا اٹھی ادھر جابر اٹھا اور حمیرا تک پہنچا۔

”کیا کر رہی ہو؟“ — جابر نے سرگوشی میں پوچھا مگر اس کے ساتھی نہ جاگ پڑیں — ”کیا تم گر پڑی تھیں؟“
 ”ہاں!“ — حمیرا نے کہا — ”میرے ساتھ آؤ۔“

حمیرا نے جابر کا بازو پکڑا اور اسے اس کے ساتھیوں سے دور لے گئی اور دونوں وہاں بیٹھ گئے۔

”مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“ — حمیرا نے پوچھا۔
 ”قلعہ الموت!“ — جابر نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔
 ”الموت؟“ — حمیرا نے پوچھا — ”کیا ہم بغداد نہیں جا رہے؟“
 ”سنو حمیرا!“ — جابر نے کہا — ”میں باطنی ہوں.....“

”اور تم مجھے اس ابلیس حسن بن صباح کے حضور پیش کرو گے“ — حمیرا نے کہا — ”اور وہ مجھے اپنی بہشت کی حور بنا دے گا..... جابر! میں نے رات تم سب کی باتیں سنی ہیں اور میں جانتی ہوں کہ باطنیوں کو مجھ جیسی خوبصورت لڑکیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے تم سب کچھ جانتی ہو“ — جابر نے کہا — ”لیکن تم مجھے پوری طرح نہیں جان سکی۔ میں اپنے امام حسن بن صباح کے اُس گروہ کا آدمی ہوں جو کسی لڑکی کو یا کسی آدمی کو پھانسنے کے لئے ایسی جذباتی اور پُر اثر باتیں کرتے ہیں کہ ان کا شکار ان کا گرویدہ ہو کر ان کے قدموں میں آگرتا ہے لیکن ان میں جذبات ہوتے ہی نہیں۔ کسی دوسرے کی جان لے لینا اور اپنی جان دے دینا میرے گروہ کے لئے ایک کھیل ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں اپنی بہنوں اور اپنی ماؤں کے لئے بھی کوئی جذبات نہیں ہوتے لیکن حمیرا! تم پہلی لڑکی اور شاید آخری بھی ہو جس نے میرے دل کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے۔ اب کوئی ایسی ضرورت نہیں کہ میں تمہیں فریب اور جھانسنے دیتا چلا جاؤں۔ اب تم پوری طرح ہمارے قبضے میں ہو۔ یہاں سے بھاگو گی تو کتنی دور تک پہنچ جاؤ گی؟..... اور پھر جاؤ گی کہاں؟..... اگر تم ہمارے قابو میں آؤ گی تو ہم تمہارے اس حسین جسم سے پورا پورا لطف اٹھا کر تمہیں قتل کر دیں گے۔“

”اور میں یہی صورت قبول کروں گی کہ اپنے آپ کو پہلے ہی ختم کر لوں“ — حمیرا نے کہا — ”میں مسلمان کی بیٹی ہوں۔ اپنا آپ کسی کے حوالے نہیں کروں گی۔“

”کیا تم میری پوری بات نہیں سنو گی؟“ — جابر نے کہا — ”میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اب میں تمہارے ساتھ محبت کی جو بات کر رہا ہوں یہ فریب نہیں۔ محبت میرے لئے ہمیشہ ایک سراب بنی رہی ہے اور میں اس سراب کے پیچھے دوڑتا اور بھٹکتا اور گرتا ہی رہا ہوں۔ میں گر کر اٹھا اور اٹھ کر محبت کے سراب کے پیچھے دوڑتا رہا ہوں حتیٰ کہ میں الموت پہنچ گیا۔ میں کوئی لمبی چوڑی، کوئی میٹھی کڑوی باتیں نہیں کروں گا۔ مجھے محبت تم سے ملی ہے۔ میرے سوئے ہوئے اور فریب خورہ جذبات کو تم نے جگایا ہے۔ تم اتنا کرو کہ خاموشی سے اور اطمینان سے میرے ساتھ چلی چلو۔ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ لڑکی کو پھانس کر لاتے ہیں اور الموت کی جنت میں داخل کر دیتے ہیں۔ ایسی لڑکیوں کو سنبھالنے اور اپنے راستے پر چلانے والے وہاں موجود ہیں۔ وہ دو تین دنوں ہی میں اس کے ذہن پر اور دل پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ پھر کوئی لڑکی وہاں سے بھاگنے کے متعلق سوچتی ہی نہیں لیکن حمیرا! میں ایسے نہیں کروں گا۔ میں اپنی روحانی محبت کا جو تم سے ہے، پورا پورا ثبوت پیش کروں گا..... دیکھ حمیرا! ہر انسان اُس عقیدے کو اور اُس مذہب کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے جو اسے باپ سے ورثے میں ملا ہے۔ عقیدے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ انسان جب سے پیدا ہوا ہے عقیدوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا چلا آیا ہے۔ میں تمہیں اسلام کے راستے سے نہیں ہٹا رہا۔ ہمارا امام حسن بن صباح اسلام کا شیدائی ہے۔ تم چل کے دیکھو۔ اگر یہ عقیدہ تمہارے دل نے قبول کر لیا تو وہاں رہنا، ورنہ مجھے اپنا قائل کر لینا اور میں تمہارے ساتھ بغداد چلا چلوں گا۔ میں تم سے محبت کے نام پر وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں الموت میں کسی کے حوالے نہیں کروں گا، اپنے پاس رکھوں گا۔“

خنک اور خاموش رات گزرتی جا رہی تھی اور جابر اپنی زبان کا جادو جگا رہا تھا۔ اس کے دل میں حمیرا کی محبت تو تھی ہی لیکن اس دل میں حسن بن صباح بھی موجود تھا۔ حمیرا پر غنودگی اور خاموشی طاری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اتنا تو تسلیم کرتی تھی کہ وہ تنہائیوں میں جابر سے ملتی رہی تھی لیکن جابر نے کبھی اشارتاً ”بھی ایسی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اس کی ساری دلچسپیاں اور چاہتیں حمیرا کے جسم کے ساتھ ہیں۔ اب آبادیوں سے دور جنگل میں جہاں حمیرا کو اس شخص سے بچانے والا کوئی بھی نہ تھا، جابر نے نفسانی خواہش کا ذرا جتنا بھی اظہار نہیں کیا تھا۔ حمیرا جابر کو ہی اپنا مسافر اور محافظ سمجھ رہی تھی

اور اُس نے اس شرط پر جابر کی ہمسفر رہنا قبول کر لیا کہ وہ الموت جا کر دیکھے گی کہ وہاں کیا ہے اور اس کا دل کیا کہتا ہے۔
اگلی صبح یہ قافلہ اپنی منزل کو روانہ ہو گیا۔



سلجوقی سلطان ملک شاہ کو دفن ہوئے دو مہینے اور کچھ دن گزر گئے تھے۔ یہی ایک طاقت تھی جو حسن بن صباح کی اہلیست کے سیلاب کو روک سکتی تھی۔ گو اس طاقت کو اب تک ناکامی کا ہی منہ دیکھنا پڑا تھا لیکن یہ طاقت ہماری نہیں تھی اور نئی تیاریوں میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس کا مقصد اور نصب العین صرف یہ تھا کہ حسن بن صباح کی جنت کو اس کے لئے اور اس کے فدائین کے لئے جہنم بنا دیا جائے لیکن ملک شاہ ایک فدائی کا شکار ہو گیا۔ اگر اس کا بڑا بیٹا برکیارق جو اس کی جگہ اس عظیم سلطنت کا سربراہ بننا تھا، اپنے باپ جیسا ہوتا تو یہ طاقت فردوس ابلیس پر بجلی بن کر گرتی لیکن برکیارق اسی قاتل کی بہن کی زلفوں کا اسیر ہو گیا تھا جس نے صرف اسے ہی نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کو بھی یتیم کر دیا تھا۔

یہ لڑکی جس کا نام روزینہ تھا، اس قاتل کی بہن نہیں تھی۔ وہ تو حسن بن صباح کی بھیجی ہوئی لڑکی تھی جس نے مرو میں خانہ جنگی کا بیج بونا تھا۔ قاتل نے اپنا کام کر دیا تھا اور روزینہ مقتول کے جانشین کو اپنے ظلماتی حسن میں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ یہ بھی اس کی کامیابی تھی کہ اس نے برکیارق کی ماں اور اس کے خاندان کے دیگر اہم افراد سے منوالیا تھا کہ وہ اس قاتل کی بہن ہے۔ داستان گو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہے کہ روزینہ نے کیسی حیران کن مہارت سے پورے خاندان کی ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں۔

وہ لوگ اس خاندان کے خون کے رشتہ دار نہیں تھے جو کہتے تھے کہ یہ لڑکی مشکوک ہے اور خطرناک بھی لیکن برکیارق کسی کی سنتا ہی نہیں تھا۔ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرے گا۔ سلطان ملک شاہ کا چہلم ہو چکا تھا۔ کئی دن گزر گئے تھے۔ اب کسی بھی دن برکیارق نے روزینہ کے ساتھ شادی کر لینی تھی۔

مزل آفتدی اور شمونہ کی محبت کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ ان کی محبت صرف اس لئے نہیں تھی کہ دونوں جوان تھے اور خوبصورت بھی تھے اور پہلی نظر میں ہی ایک دوسرے

کے ہو گئے تھے بلکہ ان کی محبت کی ایک بنیاد تھی اور اس کے پس منظر میں ایک مقصد تھا جو ان دونوں میں مشترک تھا۔ یہ تھی حسن بن صباح کی نفرت اور یہ ارادہ کہ اس ابلیس کو قتل کرنا ہے۔

شمونہ حسن بن صباح کی داشتہ اور آلہ کار رہ چکی تھی۔ اس نے حسن بن صباح کے لئے کچھ کام بڑی کامیابی سے کئے تھے لیکن اللہ نے اسے روشنی دکھائی اور وہ پھر واپس اسلام کی گود میں آگری۔ ابو مسلم رازی نے جو سلطنت سلجوقیہ کے دوسرے بڑے شہر کا امیر تھا، شمونہ کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ اس حسین و جمیل لڑکی کے دل میں انتقام کے شعلے اٹھ رہے تھے۔

مزل آفندی حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا مگر خواجہ حسن طوسی کو قتل کرنے واپس آ گیا تھا۔ یہ تو شمونہ کی محبت اور شاہی طبیب نجم مدنی کا کمال تھا کہ انہوں نے مزل آفندی کے ذہن سے حسن بن صباح کے اثرات بد نکال دیے تھے اور وہ اپنی اصلیت میں واپس آ گیا تھا۔ مزل بھی انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔

مزل اور شمونہ ملتے اور گھنٹوں اکٹھے بیٹھے رہتے تھے۔ شمونہ اور اس کی ماں کو جس کا نام میمونہ تھا، سلطان ملک شاہ نے ایک مکان دے دیا اور ان کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ مزل اپنے کاروبار میں لگ گیا تھا لیکن وہ اور شمونہ اپنے مشترک مشن کی تکمیل کے لئے تڑپتے رہتے تھے۔ ایک روز مزل شمونہ کے گھر میں آیا بیٹھا تھا۔ شمونہ کی ماں نے انہیں کہا کہ وہ شادی کر لیں۔ اس نے وجہ یہ بتائی کہ وہ دونوں جوان ہیں اور اکٹھے بیٹھے اٹھتے ہیں اور اس سے لوگ شک کرتے ہیں اور ہو سکتا ہے لوگ انہیں بدنام کر دیں اور سلطان برکیارق کے کان بھرنے شروع کر دیں جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا..... میمونہ نے دوسری دلیل یہ دی کہ وہ دونوں جوان ہیں اور ایک دوسرے کو روحوں کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جذبات سے مغلوب اور اندھے ہو کر وہ گناہ کر بیٹھیں جس کی بخشش ذرا مشکل سے ہی نہیں بلکہ ہوتی ہی نہیں۔

مزل نے کوئی بات نہ کی۔ اس نے شمونہ کی طرف دیکھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنی ماں کو شمونہ خود ہی کوئی جواب دے۔

”میری ایک بات یقین سے سنو ماں!“ — شمونہ کہا — ”اگر میری اور مزل کی محبت جسمانی ہوتی تو اب تک ہم میاں بیوی بن چکے ہوتے، اگر یہ نہ ہوتا تو ہم وہ گناہ کر

چکے ہوتے جس کا تمہیں ڈر ہے..... ہماری محبت روحوں کا عشق ہے، ہمارا نصب العین ایک اور راستہ ایک ہے۔ ہمارے سروں پر اللہ کا ہاتھ ہے اور ہم دونوں کا اللہ حامی اور ناصر ہے۔ مجھے جس روز یہ اشارہ ملا کہ منزل کو میرے حسن اور میرے جسم کے ساتھ محبت ہے تو اُسی روز میرے اور اس کے راستے الگ ہو جائیں گے۔“

”شمونہ بیٹی!“ — میمونہ نے کہا — ”میں نے دنیا دیکھی ہے۔ حسن اور جوانی میں وہ طاقت.....“

”مجھے اپنے حسن اور اپنی جوانی سے نفرت ہے ماں!“ — شمونہ نے جھنجھلا کر کہا — ”اس حسن اور جوانی نے مجھے اس ذلیل انسان کے قدموں میں جا پھینکا تھا۔ مجھے اپنے اس جسم سے نفرت ہوتی جا رہی ہے جسے لوگ اتنا زیادہ پسند کرتے ہیں..... میرے پاس روح رہ گئی ہے۔ اس کا مالک منزل ہے۔ میں جو کچھ بھی ہوں، پاک ہوں، پلید ہوں، منزل کی ہوں لیکن شادی ہمارا نصب العین نہیں۔ میں لوگوں کے لئے بڑا ہی حسین دھوکہ بنی رہی تھی۔ میں نے اللہ کو ناراض کیا۔ اللہ نے مجھے ایمان کی روشنی بخشی۔ اس کے شکرانے کے لئے یہ میرا فرض ہے کہ اللہ کو راضی کروں اور اپنی روح کو پاک کروں پھر میں اپنا آپ ایک بیوی کے طور پر منزل کو پیش کروں گی۔ کیوں منزل کیا تمہیں میری اس بات سے اختلاف ہے؟“

”نہیں شمونہ!“ — منزل نے جواب دیا — ”میں بولتا تو میں بھی یہی کہتا جو تم نے کہا ہے۔ ہم نے سب سے پہلے اپنا مقصد پورا کرنا ہے..... تم نے ماں کو یہ جواب دے کر میرے ایمان، میرے کردار اور میرے عزم کو نئی تازگی دی ہے..... حسن بن صبح کو قتل کرنا ہماری زندگی کا مقصد ہے۔“

”یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں کہہ ہی دیتی ہوں“ — شمونہ نے منزل سے کہا — ”میں اپنی ذات کو اور اپنے وجود کو منزل کے بغیر نامکمل سمجھتی ہوں۔“

دونوں نے میمونہ کو یقین دلادیا کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں کہتے رہیں لیکن وہ اس گناہ کا تصور بھی اپنے ذہن میں نہیں لائیں گے جس کی طرف میمونہ نے اشارہ کیا تھا۔

”ایک بات بتاؤ منزل“ — شمونہ نے پوچھا — ”تم نے پھر برکیارق کو نہیں کہا کہ یہ لڑکی مٹھوک ہے؟“

”ایک ہی بار کہہ کر دیکھ لیا تھا“ — منزل نے کہا — ”اس نے مجھے ڈانٹ کر

چپ کرادیا تھا۔ میں تو ابھی تک اسے دوست سمجھ رہا تھا لیکن وہ جس لہجے میں بولا اس سے مجھے یاد آگیا کہ یہ شخص اب دوست نہیں بلکہ سلطان بن گیا ہے۔

”تم رے کیوں نہیں چلے جاتے!“ — شمونہ نے کہا — ”تم ابو مسلم رازی سے بات کر کے دیکھو۔ وہ اتنے بڑے شہر اور اتنے وسیع علاقے کا حاکم ہے۔ سلطان ملک شاہ مرحوم کا وہ خاص معتمد اور مشیر تھا۔ ہو سکتا ہے وہ برکیارق کو سمجھا بجا کر اس لڑکی سے شادی کرنے سے روک دے۔“

”ابو مسلم رازی سلطان ملک شاہ مرحوم کا معتمد اور مشیر تھا“ — مزل نے کہا —

”برکیارق اس کی بھی نہیں مانے گا۔ تم شاید نہیں جانتیں کہ برکیارق روزینہ کے لئے پاگل ہوا جا رہا ہے..... ابو مسلم رازی برکیارق کی شادی پر آ رہا ہے۔ اس سے پہلے اسے ملنا بیکار ہے۔ شادی تو ہونی ہی ہے۔ میں ابو مسلم رازی سے کہوں گا کہ روزینہ کو کسی طرح غائب کیا جائے۔ ابھی تو کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ روزینہ کیا کر گزرے گی مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے ہاتھ دکھائے گی ضرور پھر برکیارق زندہ رہا تو باقی عمر بچھتا رہے گا۔“

”شادی ہو جانے دو“ — شمونہ نے کہا — ”میں روزینہ کے ساتھ دوستی لگانے کی کوشش کروں گی۔ اگر میں کامیاب ہو گئی تو اسے زہریلا دوں گی۔“

سلطان ملک شاہ مرحوم تو حسن بن صباح اور اس کے باطنی فرقے کا دشمن تھا ہی لیکن ابو مسلم رازی کی تو زندگی کا جیسے مقصد ہی یہی تھا کہ اس فرقے کا نام و نشان ہی مٹا دیا جائے۔ وہ تو صاف الفاظ میں کہا کرتا تھا کہ یہ کام تبلیغ سے نہیں ہو گا، یہ کام صرف تلوار سے ہو سکتا ہے۔ اس داستان کے آغاز میں سنایا جا چکا ہے کہ جب حسن بن صباح کو اتنی شہرت نہیں ملی تھی اور وہ ابھی اٹھ رہا تھا کہ ابو مسلم رازی نے اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا لیکن کسی طرح حسن بن صباح کو قبل از وقت پتہ چل گیا اور وہ رے سے غائب ہو گیا تھا۔

برکیارق اور روزینہ کی شادی کا دن آگیا۔ بارات نے تو کہیں جانا نہیں تھا، ولہٰذا سلطان کے محل میں موجود تھی۔ سلطان برکیارق کے حکم سے سارے شہر میں رات کو چراغاں کی گئی اور اس شادی پر جو ضیافت دی گئی اس کے چرچے تاریخ تک پہنچے اور آج تک سنائی دے رہے ہیں۔ ایک دعوت عام تھی۔ امراء اور وزراء اور دیگر رتبوں والے

افراد کے لئے الگ انتظام تھا اور شہریوں کے لئے باہر کھلے میدان میں کھانا رکھا گیا تھا۔ دور دور سے ناچنے گانے والے آئے تھے۔ ناچنے والیوں نے بھی آکر اپنے فن کے مظاہرے کئے اور سب نے سلطان سے انعام وصول کئے۔

یہ ہنگامہ خیز شادی جس پر خزانے کا منہ کھول دیا گیا تھا، یہ انداز اس خاندان کی روایت کے منافی تھے۔ سلطان ملک شاہ مرحوم ہرولعزیز سلطان تھا۔ اسے فوت ہوئے ابھی دو مہینے اور کچھ دن گزرے تھے۔ لوگ اس کے غم میں نڈھال ہوئے جا رہے تھے لیکن برکیارق کی شادی کے دن لوگ سلطان مرحوم کا غم جیسے بھول ہی گئے تھے۔ برکیارق کا مقصد ہی یہی تھا۔

جب اندر نکاح وغیرہ ہو رہا تھا، اُس وقت مزل آفندی رے کے امیر ابو مسلم رازی کے پاس جا بیٹھا۔ برکیارق کے دونوں چھوٹے بھائی، محمد اور سخر، بھی ان کے پاس آ بیٹھے۔ یہ دونوں بھائی خاصے مغموں تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ ایک تو انہیں اپنا باپ یاد آ رہا ہے اور دوسرے یہ کہ یہ اپنے بھائی کی شادی پر خوش نہیں۔

”امیر محترم!“ — مزل نے ابو مسلم رازی سے کہا — ”آپ جب سلطان مرحوم کی وفات پر یہاں آئے تھے تو مجھے آپ کے ساتھ بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب میں نے موقع نکالا ہے۔ کیا آپ کو کسی نے پہلے بتایا ہے کہ ہمارے نئے سلطان کی دلہن باطنی ہے اور یہ اپنے آپ کو سلطان مرحوم کے قاتل کی بہن ظاہر کرتی ہے؟“

”ہاں مزل آفندی!“ — ابو مسلم رازی نے جواب دیا — ”میرے مخبری کے ذرائع ایسے ہیں کہ زمین کے نیچے کی ہوئی بات بھی میرے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے۔“

”سلطان برکیارق کی دلہن سلطان مرحوم کے قاتل کی بہن نہیں“ — مزل نے کہا — ”یہ اس کے ساتھ الموت سے آئی تھی۔ کیا آپ اس کے متعلق کچھ سوچ رہے ہیں؟“

”میں سب کچھ سوچ چکا ہوں“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”اور سوچ بھی رہا ہوں۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟“

”امیر محترم!“ — مزل نے جواب دیا — ”میں یہی سوچ رہا ہوں کہ یہ لڑکی نہ جانے کیا گل کھلائے گی۔ آپ سے میں نے صرف یہ کہنا ہے کہ جہاں کہیں آپ کو میری

ضرورت پڑے مجھے فوراً بلائیں۔ آپ اس لڑکی کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں جس کا نام شمونہ ہے۔ وہ آگ بگولہ بنی بیٹھی ہے۔ آپ اسے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔“

”تم کسی بھی دن رے آ جاؤ“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”اطمینان سے بیٹھیں گے اور کچھ سوچ لیں گے۔“

”کیا یہ لڑکی ہمارے بھائی کو مار ڈالے گی؟“ — برکیارق کے بھائی محمد نے پوچھا۔

”شاید نہیں!“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”یہ لڑکی سلطان برکیارق کو اپنے قبضے میں رکھے گی اور اس کی توجہ حسن بن صباح سے ہٹا دے گی۔ مجھے اطلاعات مل رہی ہیں۔ سلطان مرحوم کی وفات کے بعد باطنیوں کی تبلیغ بہت تیز ہو گئی ہے اور ان کے اثرات دور دور تک پھیلنے شروع ہو گئے ہیں۔ میں صرف یہ دیکھ رہا ہوں کہ سلطان برکیارق کیا کرتے ہیں۔“

”ہمارا بھائی برکیارق کچھ بھی نہیں کرے گا“ — محمد نے کہا — ”ہم اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہم دونوں بھائی دیکھ رہے ہیں کہ برکیارق کارویہ ہمارے ساتھ بالکل ہی بدل گیا ہے جیسے ہم اس گھر میں مسمان آئے ہوئے ہوں اور دو چار دنوں بعد رخصت ہو جائیں گے۔“

”ایک خیال کرنا محمد!“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”اور تم بھی سنجیدہ! اگر برکیارق یا اس کی بیوی کوئی بد تمیزی یا تمہارے ساتھ برا رویہ اختیار کرے تو خاموش رہنا۔ میں ابھی ایک بات زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا مگر تم لوگوں کو ذرا سا اشارہ دے ہی دوں تو بہتر ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس لڑکی کے ذریعے حسن بن صباح ہماری سلطنت میں خانہ جنگی کرانا چاہتا ہے۔ خانہ جنگی کیسے ہوگی؟ اس پر ابھی نہ سوچو، میں موجود ہوں۔ تم دونوں بھائی چوکے رہنا..... اور تم مزمل! ادھر ادھر دھیان رکھنا۔ جو نہی کوئی بات معلوم ہو میرے پاس آ جانا۔“



اگلے روز دعوتِ ولیمہ دی گئی جو شادی کی ضیافت جیسی ہی تھی۔ امراء، وزراء اور دیگر اعلیٰ سرکاری رتبوں والے افراد فرداً فرداً سلطان برکیارق کو مبارک باد کہنے گئے۔ برکیارق نے ہر ایک سے کہا کہ یہ لوگ تین چار دن یہیں رہیں کیونکہ وہ ان سے خطاب کرے گا۔

یہ لوگ رُکے رہے۔ پانچویں روز برکیارق نے ان سب کو اکٹھا کر کے خطاب کیا۔ یہ ایک تاریخی اہمیت کا خطاب تھا۔ تاریخی اہمیت کی وجہ یہ تھی کہ نئے سلطان نے سلطنت سلجوقیہ کی گاڑی اُلٹے رخ چلا دی تھی۔ تاریخوں میں آیا ہے کہ اس نے اس خطاب میں جو نئے اعلان کئے وہ کچھ اس طرح تھے:

نیا وزیرِ اعظم عبدالرحمن سمیری ہو گا۔

انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں گی۔

حسن بن صباح کا مقابلہ تبلیغ سے کیا جائے گا کیونکہ وہ ایک مذہبی فرقہ ہے جسے فوجی طاقت سے نہیں دیا جاسکتا۔ سلطان برکیارق نے زور دے کر کہا کہ پہلے بہت زیادہ جانی نقصان کرایا جا چکا ہے جو اب ختم کیا جا رہا ہے۔
محصولات زیادہ کئے جائیں گے۔

وہاں جتنے بھی امراء، وزراء اور سالار وغیرہ بیٹھے تھے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ سب نے نمایاں طور پر محسوس کیا کہ سلطان نشے کی حالت میں بول رہا ہے۔ یہ نشہ سلطانی کا بھی تھا اور روزیہ کے حسن و جوانی کا بھی۔

”سلطان محترم!“ — ابو مسلم رازی بے قابو ہو کر بول پڑا — ”حسن بن صباح ایک خطرناک فتنہ ہے اور اسلام کا بدترین دشمن..... نظام الملک اور سلطان ملک شاہ کا قاتل حسن بن صباح ہے۔“

سلطان برکیارق نے ابو مسلم رازی جیسے عالم، مجاہد اور بزرگ کو آگے بولنے نہ دیا۔
”اب کوئی قتل نہیں ہو گا“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”یہ سوچنا میرا کام ہے..... آپ کا نہیں..... آپ رے میں امن و امان قائم رکھیں۔“

سلطان برکیارق کی اس نئی حکمت عملی سے سب کو اختلاف تھا لیکن جس طرح اس نے ابو مسلم رازی کو ٹوک کر اپنا حکم چلایا اس سے سب خاموش رہے۔ سب نے جان لیا کہ یہاں بولنا بے کار ہے۔ یہ سب چھوٹے بڑے حاکم سلطان برکیارق کے باپ کے وقتوں کے تھے اور سب کی عمریں اس کے باپ جتنی تھیں لیکن برکیارق نے کسی ایک کا بھی احترام نہ کیا اور کسی کو وہ تعظیم بھی نہ دی جو سرکاری طور پر ان کا حق تھا۔ وہ اپنا خطاب ختم کر کے وہاں سے چلا گیا۔

باہر آ کر سب نے آپس میں کھسک پھسک کی مگر اونچا کوئی بھی نہ بولا۔ بعض پر تو حیرت

کی خاموشی چھا گئی تھی۔ ابو مسلم رازی بریارق کی ماں کے پاس چلا گیا۔ اس گھر میں اس کی اتنی قدر و منزلت ہوتی تھی جیسے وہ اسی خاندان کا ایک فرد ہو۔ بریارق کی ماں اسے دیکھ کر رونے لگی۔

”مجھے غم تھا کہ میں بیوہ ہو گئی ہوں“ — ماں نے کہا — ”لیکن ایک اور غم یہ آ پڑا ہے جیسے میرا بیٹا بریارق بھی مر گیا ہو۔ روزیہ اس پر نشے کی طرح طاری ہو گئی ہے۔ دلہے کے بعد میرا بیٹا باہر نکلا ہی نہیں۔ کیا دن کیارات، وہ دلہن کے ساتھ کمرے میں بند رہا۔ کل شام دونوں کبھی پر باہر نکلے تو میں ان کی خواب گاہ میں چلی گئی۔ خاموہ برتن اٹھا رہی تھی۔ دو چاندی کے پیالے پڑے تھے۔ پاس ایک صراحی رکھی تھی۔ میں نے پیالے سونگھے تو عجیب سی بو آئی۔ یہ اگر شراب نہیں تھی تو کوئی اور مشروب نہیں بلکہ یہ کوئی اور نشہ تھا۔“

”آپ اتنے بھی پریشان نہ ہو جائیں“ — ابو مسلم رازی نے بریارق کی ماں کو جھوٹی تسلی دیتے ہوئے کہا — ”یہ آپ کے بیٹے کا نہیں یہ جوانی کا قصور ہے۔ کچھ دنوں بعد نشہ اُتر جائے گا اور مجھے امید ہے کہ لڑکا اپنے خاندان کے راستے پر آجائے گا۔“

”میں نے دنیا دیکھی ہے“ — بریارق کی ماں نے کہا — ”میں اپنے آپ کو یہ دھوکہ کس طرح دوں کہ یہ بیٹا اپنے باپ کے راستے پر واپس آجائے گا۔ ہم نے بھی جوانی دیکھی ہے۔ سلطان مرحوم کے ساتھ میری شادی ہوئی تھی تو میں اس لڑکی جیسی خوبصورت تھی اور کسن بھی تھی۔ سلطان مرحوم کبھی میرے ساتھ کمرے میں بند نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک نشہ نہیں بنایا بلکہ ایک خوبصورت بیوی سمجھ کر اس حیثیت میں رکھا جو بیوی کو اسلام نے دی ہے..... خوبصورت عورت بجائے خود ایک نشہ ہوتی ہے۔ اللہ نے مرد میں کمزوری رکھ دی ہے کہ وہ حسین عورت کے ہاتھوں میں کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ چالاک اور مطلب پرست عورت جس مرد پر بدتمتی سے یا اپنے مطلب کے لئے ہنس کرنا چاہتی ہے اس کے دل میں بلکہ روح میں اترتی چلی جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ شخص اس عورت کا زر خرید غلام ہو جاتا ہے۔ ایسی بد فطرت عورت مرد کو اس مقام تک پہنچا دیتی ہے جہاں سے اس کی واپسی ناممکن ہو جاتی ہے۔ اُس مقام پر جا کر اسے سود و زیاں کا احساس ہی نہیں رہتا۔ وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور اس احساس سے بیگانہ ہو جاتا ہے کہ اس کی تباہی کی ذمہ داری یہ عورت ہے اور وہ اس عورت کا پجاری

بن جاتا ہے..... عورت کے ہاتھوں بادشاہیاں لٹ گئی ہیں۔“

ابو مسلم رازی جانتا تھا کہ سلطان ملک شاہ مرحوم کی بیوہ جو کہہ رہی ہے ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ مشاہدے کی باتیں تھیں لیکن اب تو یہ سوچنا تھا کہ بریاری کو کس طرح اس لڑکی کے نشے سے نکالا جائے۔ ابو مسلم نے اس خاتون کو جھوٹی چچی تسلیم دیں اور کہا کہ وہ نظر رکھے گا اور کوشش کرے گا کہ سلطنت کا وقار قائم رہے۔



اس سے کچھ عرصہ پہلے حمیرا جابر کے ساتھ قلعہ الموت پہنچ گئی تھی۔ ان لوگوں کا طریقہ کار یہ تھا کہ کوئی آدمی کسی لڑکی کو ورغلا کر الموت لاتا تو اس لڑکی کو لڑکیوں کے گروہ کے نگران کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی لڑکی اکھڑپن پر اتر آتی اور ان لوگوں کی بات پر آنے سے انکار کر دیتی تو ان کے پاس اس کا بھی علاج موجود تھا۔ ایک علاج تو تشدد اور زبردستی تھی لیکن یہ علاج کم سے کم استعمال کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کے پاس بڑے ہی پیارے اور دل کو لبھانے والے طریقے تھے جو بڑی اکھڑ لڑکیوں کو بھی موم کر لیتے تھے۔ جابر کو یہی کرنا چاہئے تھا کہ وہ حمیرا کو متعلقہ گروہ کے نگران کے حوالے کر دیتا۔ اس کا کام ہو گیا تھا لیکن جابر نے اس مروجہ طریقہ کار سے انحراف کیا اور حمیرا کو اپنے ایک دوست کے گھر لے گیا۔

اس کا یہ دوست تھا تو باطنی لیکن وہ فدائین میں سے نہیں تھا نہ کبھی اسے ذمہ داری کا کوئی کام سونپا گیا تھا۔ اس دوست نے جابر سے کہا کہ وہ کیوں اس لڑکی کو ساتھ لئے اور چھپائے پھرتا ہے۔ اسے ان کے حوالے کیوں نہیں کر دیتا جو نئی آنے والی لڑکیوں کو اپنے ابلیسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں!

”نہیں بھائی!“ — جابر نے اپنے دوست سے کہا — ”اس لڑکی کے ساتھ میرا کچھ جذباتی سا تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ اسے آخر اسی جگہ بھیجنا ہے جس جگہ کے لئے میں اسے ساتھ لایا ہوں لیکن اس سے مجھے ایسی محبت ہو گئی ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میں اسے کسی اور کے حوالے کروں۔ میں اسے خود تیار کروں گا۔“

دراصل جابر کو حمیرا سے محبت ہی اتنی زیادہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ اسے باطنیوں کے مقاصد کے لئے تیار بھی کر لے اور یہ لڑکی اس سے متنفر بھی نہ ہو۔ دوست نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ حمیرا کو ایک بار حسن بن صباح کے سامنے لے جائے اور اس سے

درخواست کرے کہ وہ اس لڑکی کو خود تیار کرنا چاہتا ہے۔ دوست نے اسے یہ مشورہ اس لئے دیا تھا کہ وہ کبھی اس لڑکی کے ساتھ پکڑا گیا یا کسی کو پتہ چل گیا کہ جابر نے ایک لڑکی کو اپنے قبضے میں رکھا ہوا ہے تو اسے موت سے کم سزا نہیں ملے گی۔

جابر نے اس مشورے کو بڑا قیمتی مشورہ جانا اور ایک روز حمیرا کو حسن بن صباح کے پاس لے گیا۔ حمیرا جانا تو نہیں چاہتی تھی لیکن اس نے سوچا کہ اس انسان کو ایک بار دیکھ تو لے جس نے ایک باطل عقیدے کو اتنی جلدی اور اتنی دور دور تک پھیلادیا ہے۔ حمیرا نے یہ بھی سنا تھا کہ حسن بن صباح اپنے کسی فدائی سے کہتا ہے کہ اپنی جان لے لو تو وہ فدائی اپنے آپ کو مار دینے میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ نہیں دکھاتا اور وہ فوراً "خنجر اپنے سینے میں اتار لیتا ہے۔ حمیرا نے سوچا دیکھوں تو سہی کہ وہ انسان کیسا ہے۔

جابر اسے سیدھا حسن بن صباح کے پاس نہ لے گیا بلکہ اسے ایک جگہ چھوڑ کر پہلے خود حسن بن صباح کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ وہ اس لڑکی کو لایا ہے جس کے بھائی نے انہیں قستان جیسا اہم قلعہ دلایا ہے۔ حسن بن صباح کو معلوم تھا کہ یہ قلعہ بند شہر کس طرح اس کے قبضے میں آیا ہے۔ جابر نے حسن بن صباح کو پوری تفصیل سنائی۔

”تم اب چاہتے کیا ہو!“ — حسن بن صباح نے پوچھا۔

”یا شیخ الجبل!“ — جابر نے کہا — ”میں اس لڑکی کو کچھ انعام دینے کی درخواست

کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اسے خود تیار کروں۔ اس پر تشدد نہ ہو یا اسے حشیش نہ پلائی جائے اور اسے دھوکے میں بھی نہ رکھا جائے۔ اگر میں اسے بقائمی ہوش و حواس تیار کر لوں تو یہ لڑکی پہاڑوں کو آپ کے قدموں میں جھکا دے گی۔“

”میرا خیال ہے کہ تم خود انعام لینا چاہتے ہو“ — حسن بن صباح نے کہا —

”ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی سے بڑھ کر اور انعام کیا ہو سکتا ہے..... کیا تم انعام کے طور پر اس لڑکی کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو؟“

”یا شیخ الجبل!“ — جابر نے سر جھکا کر کہا — ”جس روز میرے دل میں یہ آئی کہ

میں اپنے امام کو دھوکہ دوں اُس روز میں اپنے خنجر سے اپنے آپ کو ختم کر لوں گا.....

میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ کے پاس تھوڑی سی دیر

بیٹھی تو اس کا اکھڑ بن ختم ہو جائے گا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس لڑکی کے دل میں

آپ کی اور ہم سب کی نفرت بھری ہوئی ہے۔ میں یہ بھی عرض کر دیتا ہوں کہ اس کے

دل میں میری محبت موجزن ہے۔ آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔“

حسن بن صباح کے اشارے پر جابر اٹھا اور باہر جا کر حمیرا کو اپنے ساتھ لے آیا۔ حمیرا حسن بن صباح کے سامنے بیٹھ گئی۔ حسن بن صباح کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اس شخص کی آنکھیں بھی مسکرا رہی ہوں۔ ان مسکراتی آنکھوں نے حمیرا کو جیسے جکڑ لیا ہو اور حمیرا کی آنکھوں میں پلک جھپکنے کی بھی سکت نہ رہی ہو۔ حمیرا نے محسوس کیا کہ جیسے حسن بن صباح کی آنکھوں سے غیر مرئی اور بڑے پیارے رنگوں والی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں اور شعاعیں حمیرا کی آنکھوں کے ذریعے اس کے جسم میں داخل ہو رہی ہوں۔ حمیرا اپنی ذات میں تبدیلی سی محسوس کرنے لگی۔ اس کے اندر ایسا احساس بیدار ہونے لگا جیسے حسن بن صباح اتنا قابل نفرت نہیں ہے جتنا وہ سمجھتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ حسن بن صباح نے یہ چر اسرار طاقت بڑی محنت سے اور استادوں کے قدموں میں سجدے کر کر کے حاصل کی ہے۔

”ایک بات بتاؤ لڑکی!“ — حسن بن صباح نے مسکراتے ہوئے پوچھا —
”تمہارے دل میں کسی کی محبت تو ضرور ہوگی!“

”ہاں!“ — حمیرا نے کہا — ”میرے دل میں اپنے اللہ کی محبت ہے۔“
”اس کے بعد کون؟“

”اللہ کے آخری رسول!“ — حمیرا نے جواب دیا۔
”اس کے بعد؟“

”اپنے بھائی منور الدولہ کی محبت میرے دل میں رچی بسی ہوئی ہے۔“ — حمیرا نے جواب دیا۔

”اور اس کے بعد؟“

حمیرا نے جابر کی طرف دیکھا اور زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔

”ایک بات بتاؤ لڑکی!“ — حسن بن صباح نے کہا — ”جس دل میں محبت کا سمندر موجزن ہے اس میں نفرت کہاں سے آگئی؟“

حمیرا نے چونک کر حسن بن صباح کی طرف دیکھا لیکن کہہ کچھ بھی نہ سکی۔

”جاؤ لڑکی!“ — حسن بن صباح نے کہا — ”تم قدرت کے حسن کا شاہکار ہو۔“

تم پھول ہو جو خوشبو دیا کرتے ہیں۔ اپنے پھول جیسے حسن میں نفرت کی بدبو نہ بھرو.....

جاؤ۔ جابر کے ساتھ رہو۔ جب تمہارے دل سے نفرت نکل جائے گی اور ضرور نکلے گی، پھر تمہارا دل تمہیں کہے گا کہ چلو اسی شخص کے پاس..... پھر تم خود میرے پاس آؤ گی۔“

حمیرا آنکھیں حسن بن صباح کی آنکھوں سے آزاد نہ کر سکی۔ اسے اٹھنا تھا لیکن نہ اٹھی اس پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور وہ اپنی ذات میں کوئی ایسا تاثر محسوس کر رہی تھی جیسے وہ یہاں سے اٹھنا نہیں چاہتی۔ اگر جابر اس کا بازو پکڑ کر نہ اٹھاتا وہ تو وہیں بیٹھی رہتی۔ جابر حمیرا کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل آیا۔



جابر کے دوست کے گھر پہنچنے تک حمیرا نے کوئی بات نہ کی۔ وہ اپنے آپ میں کوئی تبدیلی محسوس کر رہی تھی جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ انسان اور ابلیس کے اس پہلو سے ناواقف تھی کہ جب کوئی انسان اپنے آپ میں ابلیسی اوصاف پیدا کر لیتا ہے تو اس میں ایسی کشش پیدا ہو جاتی ہے کہ خام کردار والے لوگ اس کی طرف کھنچے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اگر وہ بد صورت ہو تو بھی دیکھنے والوں کو خوبصورت لگتا ہے۔ اس کی زبان میں ایسا طلسماتی تاثر پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ جب بات کرتا ہے تو سننے والوں کے دلوں میں اس کا ایک ایک لفظ اترتا چلا جاتا ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ جو انسان میرے راستے سے ہٹ کر ابلیس کا گرویدہ ہو جاتا ہے اس پر میں ایک ابلیس مسلط کر دیا کرتا ہوں۔

حمیرا اس لئے بھی حسن بن صباح کا اچھا تاثر لے کر آئی تھی کہ وہ تو اپنی دنیا کا بادشاہ تھا۔ اس کے پیروکار اسے نبی بھی مانتے تھے۔ وہ جسے چاہتا ایک اشارے پر قتل کروا دیا کرتا تھا۔ یہ شخص کہہ سکتا تھا جابر تم جاؤ اور اس لڑکی کو میرے پاس رہنے دو لیکن حسن بن صباح نے جیسے حمیرا کے حسن و جوانی کی طرف توجہ دی ہی نہیں تھی۔ اس لحاظ سے وہ جابر کے کردار کی بھی قائل ہو گئی تھی۔ اتنے دن اور اتنی راتیں جابر کے ساتھ رہ کر اس نے دیکھا کہ جابر نے کبھی اس سے پیار اور محبت کی باتوں کے سوا کوئی بیہودہ بات یا حرکت نہیں کی تھی۔

حمیرا کو اپنا بھائی، ماں اور چھوٹے بہن بھائی یاد آتے تھے۔ اسے اپنے بھائی کی بیوی اور اس کے بچے بھی یاد آتے تھے لیکن وہ گھر سے کبھی واپس نہ جانے کے لئے نکلی تھی۔ وہ اس کوشش میں لگی رہتی تھی کہ ان سب کو دل سے اتار دے۔

ایک دو دنوں بعد جابر نے حمیرا سے کہا کہ آؤ تمہیں یہاں کا قدرتی حسن دکھاؤں۔
 تم کہہ اٹھو گی کہ اگلے جہان کی جنت اس سے خوبصورت کیا ہو گی..... وہ دونوں شر سے
 باہر نکل گئے۔ قلعہ اور یہ شہر پہاڑی کے اوپر تھے۔ دور جا کر وہ اس پہاڑی سے اترے۔
 آگے دریا تھا، دریا اور پہاڑی کے درمیان ذرا کشلوہ میدان تھا جس میں بڑے خوبصورت
 اور دلنشین پودے تھے، درخت تھے اور گھاس تھی۔ حمیرا کو یہ جگہ بہت ہی اچھی لگی۔
 اس کے دل پر جو بوجھ سا اور گرفت ہی رہتی تھی وہ کم ہونے لگی۔ اس نے محسوس کیا
 جیسے وہ یہاں سے واپس نہیں جاسکے گی۔ جابر اسے دریا کے کنارے لے گیا۔ یہ کنارہ
 بہت ہی اونچا تھا۔ دریا بہت نیچے بہتا چلا جا رہا تھا۔ وہاں دریا کا پاٹ تنگ تھا۔ سامنے والا
 کنارہ ابھی اونچا تھا۔ وہاں سے دریا مڑتا بھی تھا اس لئے وہاں پانی کا جوش بڑا ہی زیادہ تھا اور
 بھنور بھی پیدا ہو رہا تھا۔ یہ دراصل پہاڑی تھی جسے کاٹ کر دریا گزر رہا تھا۔

جابر اور حمیرا اس کنارے پر کھڑے ہو کر نیچے دیکھنے لگے۔

”یہاں سے دریا میں کوئی گر پڑے تو کیا وہ بچ کے نکل آئے گا؟“ — حمیرا نے

پوچھا۔

”ناممکن!“ — جابر نے جواب دیا — ”کوئی تیرا ک بھی نہیں نکل سکے گا کیونکہ
 پاٹ تنگ ہے اور پانی زیادہ اور تیز بھی ہے اور دریا یہاں سے مڑتا بھی ہے..... یہ دریا
 یہاں سے کھڑے ہو کر دیکھو تو ہی اچھا لگتا ہے۔“

”اپنے امام کے پاس پھر کبھی لے چلو گے؟“ — حمیرا نے پوچھا۔

”کیا تم اُس کے پاس جانا چاہو گی؟“ — جابر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں محسوس کرتی ہوں کہ مجھے اس کے پاس ایک بار پھر جانا چاہئے“ — حمیرا نے
 کہا اور پھر آہ بھر کر بولی — ”اپنے بھائی کو، ماں کو اور بھائی کے بچوں کو دل سے اتارنے
 کی کوشش کر رہی ہوں لیکن وہ سب بہت یاد آرہے ہیں۔“

”میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں!“ — جابر نے کہا اور کچھ توقف کے بعد بولا —

”تم ان سب کو بھول ہی جاؤ تو بہتر ہے..... تمہارا بھائی اس دنیا میں نہیں رہا.....“

”کیا کہا؟“ — حمیرا نے تڑپ کر پوچھا — ”وہ اس دنیا میں نہیں رہا؟ کیا ہوا

اسے؟“

”اُسے قتل کر دیا گیا تھا“ — جابر نے کہا — ”اُس کے بیوی بچوں کا اور تمہاری

ماں اور بہن بھائیوں کا بھی یہی انجام ہوا۔

”میرے بھائی کو کس نے قتل کیا تھا؟“

”میرے ساتھیوں نے!“ — جابر نے جواب دیا۔

”تمہارے ساتھیوں نے!“ — حمیرا نے چلا کر کہا اور جابر پر جھپٹ پڑی۔

اُس وقت جابر دریا کے کنارے پر کھڑا تھا۔ حمیرا نے اُس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر پوری طاقت سے دھکا دیا۔ پیچھے ہٹنے کو جگہ تھی ہی نہیں۔ پیچھے دریا تھا۔ جابر اتنے اونچے کنارے سے گرا۔ اس کی چیخیں سنائی دیں اور جب وہ دریا میں گرا تو اس کی چیخیں گرنے کی آواز میں دب گئیں۔ حمیرا نے اوپر سے دیکھا جابر ہاتھ مار رہا تھا۔ دریا اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا لیکن موڑ پر بھنور تھا۔ جابر اس بھنور میں آگیا اور ایک ہی جگہ لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ حمیرا نے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک بڑا ہی وزنی پتھر پڑا تھا۔ حمیرا نے پتھر اٹھایا جو اُس سے ذرا مشکل سے ہی اٹھا۔ جابر اس کے بالکل نیچے پھنسا ہوا تھا۔ حمیرا نے اوپر سے پتھر پھینکا جو جابر کے سر پر گرا۔ اس کے بعد جابر پانی سے ابھر نہ سکا۔

جابر ڈوب گیا تو حمیرا نے توجہ اپنی طرف کی۔ اس حقیقت نے اُس کے دل کو مٹھی میں لے لیا کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ اب وہ واپس جابر کے دوست کے پاس نہیں جاسکتی تھی۔ اسے اب وہاں سے فرار ہونا تھا۔ اس کی خوش نصیبی تھی کہ سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ آگے کو چل پڑی۔ اس نے رو رو کر اللہ کو یاد کیا اور تیز ہی تیز چلتی چلی گئی اور جب سورج غروب ہو گیا تو وہ گھنے جنگل میں پہنچ چکی تھی۔

وہ اس خیال سے دوڑ پڑی کہ رات ہی رات وہ اتنی دور نکل جائے کہ کوئی اس کے تعاقب میں نہ آسکے۔ رات تاریک ہوتی چلی گئی۔ حمیرا کو راستے کا کچھ اندازہ تھا۔ وہ اس راستے پر ہوئی۔

الموت کا قلعہ اور شہر اندھیرے میں چھپ گئے تھے۔ حمیرا نے اللہ کا نام لے کر اپنے حوصلے مضبوط کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ چلتی چلی گئی۔ رات کی تاریکی اسے دنیا سے چھپائے ہوئے تھی۔ وہ بہت دور نکل گئی اور اسے یوں سنائی دیا جیسے کوئی گھوڑا آ رہا ہو۔ وہ راستے سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔ اندھیرے میں ذرا ذرا نظر پام کرتی تھی۔

گھوڑا قریب آگیا۔ اس پر ایک آدمی سوار تھا۔ حمیرا ڈرپوک لڑکی نہیں تھی۔ اس

کے دماغ نے ایک ترکیب سوچ لی۔ جوں ہی گھوڑا قریب آیا، حمیرا تیزی سے گھوڑے کے راستے میں جا کھڑی ہوئی۔ اس نے بازو پھیلا دیے اور بڑی زور سے چیخیں مارنے لگی۔ یہ چیخیں اس طرح کی نہیں تھیں جو خوف یا تکلیف کی حالت میں منہ سے نکلا کرتی ہیں۔ حمیرا نے چڑیلوں کے قصے سنے تھے۔ وہ چڑیلوں کی طرح چیخ رہی تھی اور بڑی بھدی سی آواز میں بولی — ”مسافر گھوڑے سے اتر اور پیدل چل نہیں تو کلیجہ نکل لوں گی۔“

لوگ چڑیلوں کے وجود کو مانتے تھے۔ سوار اسے چڑیل نہ سمجھتا تو اور کیا سمجھتا..... رات کو اس ویرانے میں کوئی عورت اور وہ بھی اکیلی جا ہی نہیں سکتی تھی۔ حمیرا ایسے خوفناک طریقے سے چیخی تھی کہ گھوڑا بھی بدک گیا تھا۔ سوار کو دگر گھوڑے سے اتر اور حمیرا کے آگے گھٹنے زمین پر ٹیک کر ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ وہ چڑیل سے اپنی جان کی بخشش مانگ رہا تھا۔ حمیرا اسے نظر انداز کر کے گھوڑے کے پاس گئی۔ رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس نے گھوڑا موڑا اور ایڑ لگا دی وہ شہسوار تھی اور مضبوط دل والی لڑکی تھی۔

اچھی نسل کا گھوڑا دوڑا تو بہت تیز لیکن حمیرا کو خیال آ گیا کہ وہ جائے گی کہاں؟..... اس کا بھائی قتل ہو چکا تھا اور گھر کے باقی افراد کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ بیچارے کس انجام کو پہنچے۔ وہ گھوڑا دوڑاتی گئی اور سوار پیدل بھاگ اٹھا۔

ایسے شدید اور تیز و تند بھنور میں آیا ہوا جابر بن حباب اس میں سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا وہ اس میں سے نکل نہیں سکتا تھا لیکن حمیرا نے اوپر سے اُس کے سر پر بڑا وزنی پتھر گرایا تو وہ پانی کے نیچے چلا گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ سر پر اتنا وزنی پتھر گرنے سے ۴۰ بڑی جلدی مر گیا ہو گا۔ حمیرا وہاں سے بھاگ گئی تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ پیچھے کیا ہوا ہے۔

جابر جب دریا کے نیچے سے اُبھرا تو بھنور نے اُسے دور پھینک دیا یا اگل دیا۔ وہ مر چکا تھا۔ وہاں سے کوئی ایک میل آگے دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو جاتا تھا۔ وہاں کنارے پر پکی گھاٹ بنی ہوئی تھی۔ دریا میں تیراکی کے شوقین آکر تیرتے اور نہلیا کرتے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا اس لئے وہاں چار پانچ ہی آدمی تھے جو گھاٹ سے دریا میں کود کود کر ہنس کھیل رہے تھے۔ یہ سب حسن بن صباح کے فدائین تھے۔ ان میں سے ایک نے ڈبکی لگائی اور جب وہ پانی میں سے اُبھرا تو اس کا سر ایک انسانی جسم کے ساتھ لکرایا جسے وہ اپنے کسی ساتھی کا جسم سمجھا۔ اس نے پھر ڈبکی لگائی اور ذرا ایک طرف ہو کر پانی سے اُبھرا۔ تب اُس کے کانوں میں اپنے ساتھیوں کی آوازیں سنائی دیں — ”لاش ہے.....“ ڈوب کر مرا ہو گا..... اسے پکڑو اور باہر گھسیٹ لو“ — اس فدائی نے دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ اس کا سر اسی لاش کے ساتھ لکرایا تھا۔

”یہ تو جابر بن حباب ہے“ — ایک فدائی نے لاش کو پہچانتے ہوئے کہا — ”یہ کیسے ڈوب گیا ہے؟“

ان میں سے دو فدائین جابر کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ

جابر ایک نئی لڑکی کو ساتھ لایا تھا اور حسن بن صباح نے اس کی درخواست پر اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ تھوڑا عرصہ اس لڑکی کو اپنے پاس رکھے اور خود اسے اصل کام کے لئے تیار کرے۔

یہ فدائین اپنا شغل میلہ بھول گئے اور وہ جابر کی لاش اٹھا کر قلعے میں لے گئے۔

”شیخ الجبل کو اطلاع کر دینی چاہئے“ — ایک نے کہا۔

”لاش وہیں اٹھالے چلو“ — دوسرے نے کہا۔

وہ لاش اٹھا کر حسن بن صباح کی رہائش گاہ میں لے گئے اور لاش برآمدے میں رکھ کر اندر اطلاع بھجوائی۔ حسن بن صباح جسے لوگ امام بھی کہتے تھے اور شیخ الجبل بھی، خود باہر آگیا اور اُس نے جابر کی لاش دیکھی۔

”یہ ایک لڑکی کو ساتھ لایا تھا“ — حسن بن صباح نے کہا — ”یہ جہاں رہتا تھا وہاں جاؤ اور اُس لڑکی کو ساتھ لے آؤ“۔

ایک فدائی دوڑا گیا اور کچھ دیر بعد دوڑا ہوا ہی آیا اور اُس نے بتایا کہ لڑکی وہاں نہیں ہے۔

”وہ بھی اس کے ساتھ ڈوب گئی ہوگی“ — حسن بن صباح نے کہا — ”اُس کی لاش دریا کے تیز بہاؤ میں چلی گئی ہوگی“۔

جابر کی لاش دریا کے کنارے کنارے ہی جا رہی تھی جہاں پانی کا بہاؤ تیز نہیں تھا۔ یہ تو کسی کے ذہن میں آئی ہی نہیں اور آسکتی بھی نہیں تھی کہ حمیرا نے جابر کو اونچے کنارے سے دھکا دے کر دریا میں پھینکا تھا۔ رات گہری ہو گئی تھی اس لئے یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا تھا کہ حمیرا کہاں غائب ہو گئی ہے یا یہی یقین کر لیا جاتا کہ وہ بھی ڈوب کر مر گئی ہے۔

”اسے لے جاؤ“ — حسن بن صباح نے کہا — ”اس کے کفن و دفن کا انتظام کرو اور منادی کرادو کہ اس کا جنازہ کل دوپہر کے وقت ہو گا اور جنازہ میں پڑھاؤں گا..... لڑکی کا سراغ لگانے کی بھی کوشش کی جائے“۔



صبح قلعہ الموت میں یہ منادی کرادی گئی کہ جابر بن حاجب دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ اس کا جنازہ دوپہر کے وقت اٹھے گا۔

جابر کو جاننے والے اور اس کے دوست دوڑے آئے اور جابر کا آخری دیدار کیا۔ لوگ وہاں اکٹھے ہوتے گئے اور خلاصہ جوم ہو گیا۔ لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ ایک سوال ہر کسی کی زبان پر تھا کہ جابر ڈوبا کیسے؟

”میں نے اسے ایک لڑکی کے ساتھ دریا کی طرف جاتے دیکھا تھا“ — ایک فدائی نے کہا — ”میں اُس وقت قلعے کی دیوار پر ویسے ہی ٹھل رہا تھا۔ دونوں قلعے کی پہاڑی سے اتر کر خاصی دور چلے گئے تھے، پھر میں نے دونوں کو دریا کے اُس کنارے کی طرف جاتے دیکھا جو بہت اونچا ہے۔ وہاں ایک ٹیکری ہے جس نے ان دونوں کو میری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ میں اُدھر ہی دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے لڑکی کو وہاں سے واپس آتے دیکھا۔ وہ سامنے آئی اور اُدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر ایک طرف کو دوڑ پڑی۔ اب جابر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ میں نے جابر کو وہاں سے واپس آتے نہیں دیکھا تھا۔ لڑکی وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔ میں بہت دیر وہاں کھڑا رہا۔ مجھے جابر نظر نہ آیا، پھر سورج غروب ہو گیا اور میں نے دوسری طرف دیکھا جدھر گھاٹ ہے لیکن میری نظروں کو اُن چٹانوں نے روک لیا تھا جو وہاں سے دور آگے تک دریا کے کنارے کھڑی ہیں۔“

پھر لوگوں میں ایک اور خبر پھیل گئی جو یوں تھی کہ آج علی الصبح ایک آدمی سرائے میں آیا اور اس نے بتایا ہے کہ راستے میں گزشتہ رات اسے ایک چڑیل نے روک لیا تھا اور اسے گھوڑے سے اتار کر اس پر خود سوار ہوئی اور گھوڑا لے کر غائب ہو گئی..... یہ خبر حسن بن صباح کے اُس گروہ کے ایک دو آدمیوں تک پہنچی جو جاسوسی اور سراغ رسانی میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے اس آدمی کو ڈھونڈ نکالا اور اس سے پوچھا کہ وہ چڑیل کیسی تھی اور کس روپ میں اس کے سامنے آئی تھی۔

”چاندنی دھوپ جیسی شفاف تھی“ — اس شخص نے کہا — ”چڑیل بڑی ہی حسین اور نوجوان لڑکی کے روپ میں تھی۔ وہ اچانک میرے راستے میں نمودار ہوئی اور اس قدر زور سے اس نے چیخ ماری کہ میرا گھوڑا بدک گیا۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ میرا دل اس کی مٹھی میں آ گیا ہے۔ اُس نے کہا، اے مسافر، گھوڑے سے اتر اور پیدل چل نہیں تو کلیجہ نکال لوں گی..... میں ڈرتا کانپتا گھوڑے سے اتر اور اس کے قریب جا کر گھٹنوں کے بل ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر جان کی امان مانگی۔ اُس نے اور کچھ بھی نہ کہا۔ میرے گھوڑے کی طرف مٹی اور پلک جھپکتے گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑے کو

پیچھے موڑا اور گھوڑا سرپٹ دوڑ پڑا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گھوڑا گیا ہے میری جان ہی نہیں چلی گئی۔ میں الموت کی طرف دوڑ پڑا۔ صبح یہاں پہنچا اور سرائے میں ٹھہرا۔ وہاں جو چند ایک آدمی تھے انہیں یہ بات سنائی۔“

اس سے پوچھا گیا کہ لڑکی یا چڑیل بنے کپڑے کیسے پہنے ہوئے تھے اور اُس کے چہرے کے نقش و نگار کیسے تھے..... اُس نے حمیرا کے کپڑوں کا رنگ، بناوٹ وغیرہ اور چہرے کا حلیہ بتایا۔

حسن بن صباح جب جنازے کے لئے آیا تو اُس کے جاسوسوں نے اسے بتایا کہ انہیں کیا کیا سراغ ملے ہیں۔ ایک تو اس آدمی کو حسن بن صباح کے سامنے لایا گیا جس نے جابر اور حمیرا کو دریا کے اونچے کنارے کی طرف جاتے دیکھا تھا پھر اُس آدمی کو حسن بن صباح کے آگے کھڑا کیا گیا جس نے کہا تھا کہ رات ایک چڑیل اُس سے گھوڑا چھین کر لے گئی ہے۔

حسن بن صباح نے دونوں کے بیان سن کر ان پر جرح کی اور اُس کا دُور رس دماغ اس یقین پر پہنچ گیا کہ لڑکی اُس کے فدائی جابر بن حاجب کو دریا میں ڈبو کر بھاگ گئی ہے۔ اگر جابر خود ہی پھسل کر گر پڑا ہو تا تو حمیرا بھاگ نہ جاتی بلکہ وہیں شور شرابا کرتی کہ کوئی مدد کو پہنچ جائے یا واپس قلعے میں آجاتی۔

”وہ آدمی ابھی قسطنطنیہ چلے جائیں“ — حسن بن صباح نے حکم دیا — ”وہ وہیں گئی ہوگی..... یہ لڑکی مل گئی تو اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ ہمیں ایسی ہی لڑکیوں کی ضرورت ہے..... اسے ہر جگہ اور ہر طرف تلاش کیا جائے۔ ہو سکتا ہے وہ مرو یا رے چلی گئی ہو۔“

حسن بن صباح کے حکم کے مطابق اُسی وقت آدمی روانہ ہو گئے۔



جس وقت وہ آدمی قلعہ الموت کی ایک سرائے میں اپنی آپ بیتی سنا رہا تھا کہ رات اُسے ایک چڑیل نے روک لیا تھا، اُس وقت حمیرا چند گھروں کی ایک بستی میں جا پہنچی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بستی کے اندر جاؤں یا آگے نکل جاؤں۔ ابھی پو پھٹ رہی تھی۔ صبح کا اُجالا ابھی دُھندلا تھا۔ رات نے اسے اس طرح چھپائے رکھا تھا جس طرح ماں اپنے بچے کو آغوش میں چھپا لیا کرتی ہے۔ اسے ذرا سا بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ

فاتحانہ مسرت سے سرشار تھی کہ شیطانوں کے چنگل سے نکل آئی تھی۔ اُسے جب اپنا بھائی منور الدولہ یاد آتا تو اس کا دل بیٹھ جاتا اور آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ ایسے میں اُس کے وجود میں انتقام کے شعلے بھڑک اٹھتے تھے۔ الموت سے بچ کر نکل آنے کی خوشی اس کے غمگین دل کو سہلا دیتی تھی۔ وہ اسی رنگ بدلتی کیفیت میں گھوڑے پر سوار سفر طے کرتی گئی لیکن رات نے اپنے پردے سمیٹے اور رخصت ہو گئی۔

صبح کی پہلی دھندلی دھندلی کرغیں نمودار ہوئیں تو حمیرا کا دل یک لخت ایک خوف کی گرفت میں آگیا۔ وہ اگر مرد ہوتی تو کوئی ڈرنے والی یا خطرے والی بات نہیں تھی۔ خطرہ یہ تھا کہ وہ نوجوان تھی اور بہت ہی حسین اور نظروں کو گرفتار کر لینے والی لڑکی تھی۔ کوئی بھی اُسے دیکھ لیتا تو کبھی نظر انداز نہ کرتا۔ وہ اُس ویران علاقے میں تھی جہاں ابلیس کا قانون چلتا تھا۔ اُسے اپنے سامنے چند گھروں کی ایک بستی نظر آرہی تھی۔

اُس نے گھوڑے کی رفتار کم اور سوچنے کی رفتار تیز کر دی۔ اُس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ رُکے یا آگے نکل جائے لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ اُس نے یہ بھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ جائے کہاں۔ اُسے جابر نے بتایا تھا کہ اُس کا بھائی مارا جا چکا ہے اور گھر کے باقی افراد کا کچھ پتہ نہیں، شاید وہ بھی قتل کر دیئے گئے تھے۔ یہ تو حمیرا کو معلوم تھا کہ قسطنطنیہ میں اب اُس کا کوئی نہیں رہا اور وہاں اب باطنیوں کا قبضہ ہے۔

وہ تذبذب کے عالم میں آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور بستی کے قریب رک گئی۔ یہ چند ایک مکان تھے جو معمولی سے لوگوں کے معلوم ہوتے تھے۔ ایک مکان باقی سب سے بہت مختلف تھا۔ وہ کسی امیر آدمی کا مکان معلوم ہوتا تھا۔ اس کا دروازہ بڑا خوبصورت اور اونچا تھا۔ حمیرا اس دروازے سے پندرہ بیس قدم دور گھوڑا روکے کھڑی تھی۔

دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک سفید ریش بزرگ باہر آیا۔ اُس نے لمبا سفید چغہ پہن رکھا تھا جو اُس کے ٹخنوں تک چلا گیا تھا۔ اُس کے سر پر کپڑے کی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں پھوٹے سے فرائی پین کی شکل کا ایک برتن تھا جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے حمیرا کو دیکھا تو آہستہ آہستہ چلتا اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس بزرگ کی داڑھی دودھ جیسی سفید تھی اور اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر نورانی سی رونق تھی۔ وہ حمیرا کے سامنے کھڑا اُس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ حمیرا نے اپنا چہرہ اس طرح چھپا لیا تھا کہ اس کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ اپنا چہرہ اس نے اس خیال سے ڈھانپ لیا تھا کہ

کوئی اس کی عمر کا اندازہ نہ کر سکے اور کوئی یہ نہ دیکھ سکے کہ یہ تو بہت ہی خوبصورت ہے۔

”آؤ خاتون!“ — بزرگ نے کہا — ”مسافر ہو تو رکو اور ذرا سستالو، راستہ بھول گئی ہو تو اپنی منزل بتاؤ، کوئی اور مشکل آ پڑی ہے تو زبان پر لاؤ..... یہ ہمارا مندر ہے جہاں ہم اُس کی عبادت کرتے ہیں جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔“

”آپ یقیناً راہب ہیں.....“ حمیرا نے کہا — ”لیکن میں کیسے یقین کر لوں کہ میں آپ کے مندر میں محفوظ رہوں گی!“

سفید ریش راہب نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا دھونی دان آگے کیا اور اُسے ذرا سا ایک دائرے میں گھمایا۔ اس میں سے اٹھتا ہوا دھواں حمیرا کے گھوڑے کے منہ کو چھونے لگا پھر یہ دھواں حمیرا تک پہنچا۔ حمیرا نے دھواں میں بڑی پیاری خوشبو سونگھی۔

”تم شاید مسلمان ہو“ — راہب نے کہا — ”آؤ..... ہمارے مندر میں تم وہی روحانی سکون پاؤ گی جو تم اپنے خدا کے حضور جھک کر پایا کرتی ہو۔ گھوڑے سے اُترو اور مجھے امتحان میں نہ ڈالو۔“

”صرف ایک بات بتا دو مقدس راہب!“ — حمیرا نے کہا — ”کیا انسان اندر سے بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا وہ چہرے سے نظر آتا ہے؟..... میرا تجربہ کچھ اذرا ہے۔“

راہب نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آگے بڑھا اور گھوڑے کے پہلو میں رک کر اپنا ایک ہاتھ حمیرا کی طرف بڑھایا کہ وہ اُس کا ہاتھ تھام کر گھوڑے سے اُتر آئے۔ حمیرا اس کی خاموشی سے کچھ ایسی متاثر ہوئی کہ وہ راہب کا ہاتھ تھامے بغیر گھوڑے سے اُتر آئی۔ راہب نے اسے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

”میرا گھوڑا ایسی جگہ باندھ دیں جہاں کوئی دیکھ نہ سکے“ — حمیرا نے کہا — ”وہ میرے تعاقب میں آرہے ہوں گے۔“

”کون؟“

”باطنی!“ — حمیرا نے جواب دیا — ”تعاقب سے یہ نہ سمجھنا کہ میں کوئی جرم کر کے بھاگی ہوں، میں اپنی سب سے زیادہ قیمتی متاع لے کر ان ظالموں کے جال سے نکلی اور یہاں تک پہنچی ہوں۔ میری متاع میری عصمت ہے اور میرا دینی عقیدہ!“

اتنے میں ایک اور آدمی مندر سے باہر آیا۔ راہب نے اُسے کہا کہ وہ گھوڑا لے جائے اور ایسی جگہ باندھے جہاں کسی کو نظر نہ آ سکے۔ راہب حمیرا کو مندر میں لے گیا اور دائیں کو مڑا، ایک دروازہ کھولا۔ یہ ایک کمرہ تھا جو عبادت گاہ نہیں تھی بلکہ رہائشی کمرہ تھا۔ راہب نے حمیرا کو پلنگ پر بٹھا دیا اور پوچھا کہ وہ کچھ کھانا پینا چاہتی ہوگی!

”میں بھوکی نہیں!“ — حمیرا نے کہا — ”اور میں پیاسی بھی نہیں۔ گھوڑے کے ساتھ پانی بھی تھا اور ایک تھیلی میں کھانے کا سامان بھی تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے میں نے پیٹ بھر لیا تھا۔“

حمیرا نے اپنا چہرہ بے نقاب کر دیا۔ راہب نے اُس کا چہرہ دیکھا تو یوں چونک پڑا جیسے حمیرا نے اسے قتل کرنے کے لئے خنجر نکال لیا ہو۔ راہب کچھ دیر حمیرا کے چہرے کو دیکھتا ہی رہا۔

”تم یقین کرنا چاہتی ہو کہ یہاں محفوظ رہو گی یا نہیں“ — راہب نے کہا —

”لیکن اب میں شک میں پڑ گیا ہوں کہ میری ذات اور یہ مندر تم سے محفوظ رہے گا یا نہیں!“

”کیا میرے چہرے پر بدی کا کوئی تاثر نظر آتا ہے؟“ — حمیرا نے پوچھا۔

”بامنیوں کے امام شیخ الجبل حسن بن صباح کے پاس تم جیسی بے شمار لڑکیاں موجود ہیں“ — راہب نے کہا — ”میں ان میں سے آج پہلی لڑکی دیکھ رہا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ ان بامنیوں کا امام کسی کو اپنے جال میں پھانسنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ تم جیسی لڑکی کو بھیجتا ہے اور وہ لڑکی تمہاری طرح مظلوم بن کر اپنی مظلومیت کی کوئی کمائی سناتی ہے....“

حمیرا اسے بڑی غور سے دیکھ رہی تھی۔

”مقدس راہب!“ — حمیرا نے اُس کی بات گانتے ہوئے کہا — ”مجھے ایسی ہی لڑکی بنانے کے لئے دھوکے سے قلعہ الموت لے جایا گیا تھا لیکن میں آپ کو سناؤں گی کہ میں وہاں سے کس طرح نکل بھاگی۔ پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں قستان کے رئیس منور الدولہ کی بہن ہوں۔ امیر قستان کو بامنیوں نے قتل کر دیا اور میرے بھائی کو بھی قتل کر دیا گیا.....“

”ہاں، میں سن چکا ہوں“ — راہب نے کہا — ”قستان پر باطنی قابض ہو چکے

ہیں اور منور الدولہ ان کے ہاتھوں دھوکے سے قتل ہوا ہے۔ وہاں کا امیر شہر بڑا ہی بد
طینت انسان تھا..... اب تم سناؤ تم پر کیا ہوتی ہے۔“

حمیرا نے اسے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ یہ بھی بتایا کہ وہ ایسے شخص سے محبت کر بیٹھی
تھی جو درپردہ باطنی تھا ورنہ وہ کبھی الموت تک نہ پہنچتی۔ اس نے یہ بھی سنایا کہ اس
شخص کو اس نے کس طرح دریا میں پھینکا اور خود بھاگ آئی اور پھر یہ گھوڑا اسے کس
طرح ملا۔

اس دور ان مندر کا ایک آدمی ان کے آگے ناشتہ رکھ گیا تھا۔

”تم اب یقیناً“ قستان جانے کی نہیں سوچو گی“ — راہب نے کہا — ”قستان
کو اب دل سے اُتار دو۔“

”پھر میں کہاں جاؤں؟“ — حمیرا نے پوچھا۔

”سلجوق سلطان کے پاس!“ — راہب نے جواب دیا — ”وہی ایک ٹھکانہ ہے
جہاں تم جا سکتی ہو اور جہاں تمہیں پناہ مل سکتی ہے..... مَروُیا رے..... میں یہ نہیں بتا
سکتا کہ نیا سلجوق سلطان کیسا آدمی ہے۔ وہ جو نیک آدمی تھا اور جس نے بائیسوں کو ہمیشہ
کے لئے ختم کرنے کا عزم کر رکھا تھا، وہ مرجکا ہے۔ اس کا نام سلطان ملک شاہ تھا۔ اب
اس کا بیٹا برکیارق سلطان ہے..... بہتر یہ ہو گا کہ تم رے چلی جاؤ۔ وہاں کا حاکم ابو مسلم
رازی بڑا ہی نیک، بزرگ اور عالم دین ہے۔ اس کے پاس چلی جاؤ تو نہ صرف یہ کہ
محفوظ رہو گی بلکہ وہ تمہیں اُسی حیثیت سے اپنے پاس رکھے گا جو تمہیں قستان میں
حاصل تھی۔“

”کیا میں وہاں تک اکیلی جاؤں گی؟“ — حمیرا نے پوچھا اور کہا — ”اگر اکیلی جانا
ہے تو پھر مجھے رات کو سفر کرنا چاہئے۔“

”تم اس وقت میری نگاہ میں اس مندر کی طرح مقدس ہو۔ میں تمہیں اکیلا بھیج کر
اپنے دیوتاؤں کو ناراض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا..... میرے دو آدمی تمہارے ساتھ
جائیں گے اور تمہیں کسی اور بھیس میں بھیجا جائے گا۔“

حمیرا نے ایسا سکون محسوس کیا جیسے اُس پر کسی نے پہاڑ جیسا بوجھ ڈال دیا تھا اور یہ
بوجھ یک لخت ہٹا دیا گیا ہو۔

”مقدس راہب!“ — حمیرا نے پوچھا — ”میرا مستقبل کیا ہو گا؟..... کیا وہ

اجنبی لوگ مجھے کسی اور دھوکے میں نہیں ڈال دیں گے؟“

”تم کون ہو؟..... کچھ بھی نہیں!“ — راہب نے کہا — ”میں کیا ہوں؟..... کچھ بھی نہیں..... تم یہ پوچھو کہ اسلام کا مستقبل کیا ہو گا..... اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرے مذہب کا مستقبل کیا ہو گا..... تمہیں اور مجھے اُس اللہ نے دنیا میں بھیجا ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خدا نے جس مقصد کے لئے ہمیں پیدا کیا ہے ہم پورا کر رہے ہیں یا نہیں..... وہ مقصد کیا ہے؟..... بنی نوع انسان کی محبت!“

”اسلام کا مستقبل آپ کو کیا نظر آتا ہے؟“ — حمیرا نے پوچھا۔

”کچھ اچھا نظر نہیں آتا“ — راہب نے جواب دیا — ”اس وقت سب سے بڑا مذہب اسلام ہے لیکن اس کی جو بڑائی ہے وہ چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ باطنی اسلام کے لئے بہت بڑا خطرہ بن گئے ہیں۔ جھوٹ موٹ کا یہ عقیدہ بڑی ہی تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے۔ حسن بن صباح نے اہلسیست کو جائز قرار دے کر رائج کر دیا ہے۔ انسان لذت پرستی کی طرف مائل ہوتا جا رہا ہے۔ عورت اور شراب میں اسے جو لذت ملتی ہے وہ خدا پرستی میں نہیں مل سکتی..... تم نے مستقبل کی بات کی ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ حسن بن صباح دنیا میں نہیں ہو گا اور اس کا عقیدہ آہستہ آہستہ مٹ جائے گا لیکن لوگ عیش و عشرت کو نہیں مٹنے دیں گے۔ حسن بن صباح کسی نہ کسی روپ میں زندہ رہے گا۔ لذت پرستی کا یہ رجحان مسلمانوں کو دیمک کی طرح چاٹتا رہے گا اور ایک وقت آئے گا کہ مسلمان برائے نام مسلمان رہ جائیں گے۔ ان میں وہ طاقت نہیں رہے گی جو ہوا کرتی تھی۔“

”مجھے آپ کس وقت پہاں سے روانہ کریں گے؟“ — حمیرا نے پوچھا۔

”سورج غروب ہونے کے بعد!“ — راہب نے جواب دیا۔



سلطان برکیارق کا وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری برکیارق کی ماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ماں کے آنسو بہہ رہے تھے۔

”کیا اپنے بیٹے برکیارق پر آپ کا کچھ اثر نہیں رہا؟“ — عبدالرحمن سمیری نے پوچھا۔

”تم اثر کی بات کرتے ہو!“ — برکیارق کی ماں نے جواب دیا — ”وہ تو یہ بھی

بھول گیا ہے کہ میں اس کی ماں ہوں۔ کئی دنوں سے میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ البتہ اس کی ملکہ روزینہ کبھی نظر آتی ہے تو وہ میرے ساتھ کوئی بات نہیں کرتی۔ اگر کوئی بات کرتی بھی ہے تو وہ حکم کے لہجے میں کرتی ہے۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ برکیارق کا سلوک اور برتاؤ دن بدن خراب ہوتا جا رہا ہے۔ میں ڈرتی ہوں کہ بھائی ہی کہیں آپس میں نہ ٹکرا جائیں۔“

”میں آپ کے ساتھ یہی بات کرنے آیا ہوں۔“ عبدالرحمن سمیری نے کہا۔
 ”سلطان برکیارق کاروبارِ سلطنت میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے..... فوج کو ابھی تک تنخواہ نہیں ملی۔ سلطان ملک شاہ مرحوم کے دورِ حکومت میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ فوج برکیارق سے بیزار ہوتی جا رہی ہے۔ ادھر باطنی پھیلنے اور غالب آتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر ہم نے فوج میں بیزاری اور مایوسی پیدا کر دی تو سلجوقی سلطنت کا اللہ ہی حافظ ہے۔“
 ”کیا تم نے اسے یہ بات بتائی ہے؟“ — ماں نے پوچھا۔

”نہیں!“ — عبدالرحمن سمیری نے جواب دیا — ”بات کہاں کروں، وہ تو باہر نکلتے ہی نہیں۔“

”تم یہیں بیٹھو“ — ماں نے اٹھتے ہوئے کہا — ”میں اسے باہر نکالتی ہوں۔ میں آخر ماں ہوں۔“

”نہیں!“ — عبدالرحمن سمیری نے اٹھ کر برکیارق کی ماں کو روکتے ہوئے کہا۔
 ”آپ اس کے پاس نہ جائیں وہ بد تمیزی پر اُتر سکتا ہے۔ اگر اُس نے آپ کے ساتھ بد تمیزی کی تو میں بتا نہیں سکتا کہ میں کیا کر گزروں گا۔“

برکیارق کی ماں نے اُس کی نہ سنی اور ہاتھ سے اُسے ایک طرف کر کے باہر نکل گئی۔ اس نے برکیارق کی خواب گاہ کے بند دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور روزینہ باہر آئی۔

”کیا بات ہے؟“ — روزینہ نے پوچھا۔

ماں اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے کواڑ دھکیل کر اندر چلی گئی۔ برکیارق پلنگ پر نیم دراز تھا۔

”کیا ہو گیا ہے ماں؟“ — برکیارق نے غنودگی کے عالم میں پوچھا۔

”کیا باہر نکل کر یہ دیکھنا تمہارا کام نہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟“ — ماں نے غصیلے لہجے

میں کہا — ”کیا باپ کو تم نے اس وقت کبھی اپنی خواب گاہ میں دیکھا تھا؟ تم خارش کے مارے ہوئے کتے کی طرح اس وقت بھی خواب گاہ میں پڑے ہوئے ہو!“

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں“ — روزینہ نے کہا — ”آپ یہاں سے چلی جائیں اور وزیراعظم سے کہیں کہ وہ اپنا کام کرے۔“

”میں تم سے مخاطب ہوں برکیارق!“ — ماں نے اپنا لرزتا کانپتا ہاتھ برکیارق کی طرف بڑھا کر کہا — ”سلطان تم ہو“ تمہاری یہ چیت بیگم نہیں..... تمہارے باپ نے یہ فوج بانیوں کو ختم کرنے کے لئے تیار کی تھی اور آج تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس فوج کو اس مہینے کی تنخواہ بھی نہیں دی گئی۔“

”تو پھر کیا قیامت آگئی ہے!“ — برکیارق نے خفگی اور بے رخی سے کہا — ”میں اتنی زیادہ فوج رکھوں گا ہی نہیں۔ میں سالاروں کو بلا کر کہہ رہا ہوں کہ آدمی فوج کو چھٹی دے دیں۔“

”پھر اپنی ملکہ کو ساتھ لے کر تیار ہو جاؤ“ — ماں نے کہا — ”تم فوج کی چھٹی کرواؤ اور کچھ ہی دنوں بعد باطنی آکر تمہاری چھٹی کرا دیں گے..... ہوش میں آ برکیارق، ہوش میں آ..... اپنے باپ کی قبر کی یوں توہین نہ کر۔ یاد کریں سلطنت کیسی کیسی قربانیاں دے کر قائم کی گئی تھی۔ اپنے آباؤ اجداد کی روحوں کو یوں اذیت نہ دے۔ یہ جوانی چند دنوں کا میلہ ہے۔ ہمیشہ قائم و دائم رہنے والا صرف اللہ ہے۔“

”آپ انہیں اتنا پریشان تو نہ کریں ماں!“ — روزینہ نے بیزارگی کے سے لہجے میں کہا۔

”تو خاموش رہ لڑکی!“ — ماں نے روزینہ سے کہا — ”اور مجھے ماں نہ کہہ..... میں اس کی ماں ہوں اور میں ماں ہوں اس سلطنت کی جو ہمارے بڑے بزرگوں نے اسلام کا پرچم اونچا رکھنے کے لئے بنائی تھی۔ تجھے اس کے ساتھ روحانی دلچسپی ہوتی تو اسے یوں مدد ہوش کر کے کمرے میں قید نہ رکھتی۔“

”اچھا ماں اچھا!“ — برکیارق نے اٹھتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ تھکن سے چور تھا — ”تم جاؤ میں تیار ہو کر باہر نکلتا ہوں۔“

”میں تمہیں ابھی باہر نکلتا دیکھنا چاہتی ہوں“ — ماں نے کہا — ”ابھی اٹھ!“

برکیارق آہستہ آہستہ اٹھنے لگا اور ماں کمرے سے نکل آئی۔ روزینہ نے بڑے غصے

سے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی اور برکیارق کے پاس گئی۔

”کچھ دیر اور لیٹے رہیں“ — روزینہ نے برکیارق کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے ذرا سادھکیلا اور لٹا کر بولی — ”ماں قابلِ احترام ہی سہی لیکن ماں کو یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ بیٹا کس حال میں ہے۔ ان لوگوں کو آپ کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں۔ آپ کی ماں کو اور دونوں بھائیوں کو صرف سلطنت کا غم کھا رہا ہے۔ معلوم نہیں انہیں یہ خطرہ کیوں نظر آنے لگا ہے کہ ان سے یہ سلطنت چھین جائے گی۔ یہ لوگ بادشاہی چاہتے ہیں۔“

روزینہ ابھی تک شبِ خوابی کے لباس میں تھی۔ اس کے ریشم جیسے نرم و ملائم بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بلاشبک و شبہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی لیکن اس کے جو انداز تھے ان میں طلسماتی سا تاثر تھا اور یہ برکیارق کو مدہوش کر دیا کرتے تھے۔ گھروں میں بند بعض بیویاں روزینہ سے بھی زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں لیکن ان میں چونکہ روزینہ والے ناز و انداز، مکاری اور عیاری نہیں ہوتی اس لئے خاوندوں کو وہ اتنی خوبصورت نظر نہیں آتیں جتنی کوئی پیشہ ور عورت دل پر غالب آ جاتی ہے۔ روزینہ تربیت یافتہ لڑکی تھی۔ اسے ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ مرد کی کون کون سی رگ کمزور ہوتی ہے۔ ایسی لڑکیاں ان رگوں کو مٹھی میں لے لیتی ہیں۔

روزینہ نے برکیارق کو لٹا کر اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں اور اُس پر اس طرح جھکی کہ اُس کے بکھرے ہوئے نرم و گداز بال اس کے چہرے کو چھونے لگے پھر اس نے برکیارق کے عیاں سینے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا اور دو تین بار اپنے گال اس کے سینے سے لگائے پھر اس کی ٹانگیں دبانی شروع کر دیں۔

برکیارق جو ماں کی باتوں سے بیدار ہو گیا تھا، پھر مدہوش ہو گیا۔ روزینہ انھی اور صراحی میں سے ایک مشروب پیالے میں ڈال کر برکیارق کو پلا دیا۔ اس سارے عمل کے دوران وہ بڑے ہی اداس اور پُر اثر لہجے میں برکیارق کو یقین دلاتی رہی کہ وہ مظلوم اور تنہا ہے اور اس کے خاندان کا ہر فرد اسے انسان سمجھتا ہی نہیں۔ روزینہ کا ایک تو خدا داد حسن تھا اور پھر اس حُسن کو ایک نشے اور ایک طلسم کی طرح استعمال کرنے کا سلیقہ تھا اور اس کے ساتھ برکیارق کو وہ جو مشروب پلا رہی تھی، اس کا اثر الگ تھا، برکیارق بھول ہی گیا کہ اس کی ماں اس کے کمرے میں آئی تھی اور کچھ کہہ کر چلی گئی تھی۔

یہ وہی داستان تھی جو حضرت آدم اور حوا سے شروع ہوئی تھی۔ اُس پہلے آدمی نے عورت کی بات مانی اور جنت سے نکالا گیا تھا۔ یہ کہانی ہر دور میں اور ہر جگہ دہرائی جاتی رہی ہے اور دہرائی جا رہی ہے اور دہرائی جاتی رہے گی۔ برکیارق تو بڑا ہی کمزور آدمی تھا۔ اگر وہ کمزور نہیں تھا تو روزینہ کا جادو بہت تیز تھا۔



دن کے کچھے پہر برکیارق اُس کمرے میں بیٹھا تھا جہاں وہ وزیر اعظم اور دیگر اہلکاروں سے امور سلطنت کی باتیں سنتا اور حکم جاری کیا کرتا تھا۔ وہاں جاتے ہی اس نے اپنے وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری کو بلالیا تھا۔

”آپ میرے بزرگ ہیں اور میں آپ کا احترام کرتا ہوں“ — اس نے وزیر اعظم سے کہا — ”آپ کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ایسی کوئی بات نہ ہو کہ میرے دل میں آپ کا احترام کم ہو جائے۔ فوج کو تنخواہ میری ماں نے نہیں بلکہ میں نے دینی ہے۔ آپ کو یہ بات میرے ساتھ کرنی چاہئے تھی۔ آپ نے میری ماں کو بلا وجہ پریشان کیا اور انہوں نے غصے میں آکر میری بیوی کے سامنے میری بے عزتی کر دی..... میں آپ سے توقع رکھوں گا کہ آئندہ آپ کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے۔“

”میں معافی کا خواستگار ہوں سلطان محترم!“ — وزیر اعظم نے کہا — ”میں دو مرتبہ آپ سے درخواست کر چکا ہوں کہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ فوج کو بروقت تنخواہ نہ ملی ہو۔ میں ادائیگی کی اس تاخیر سے ڈرتا ہوں کہ فوج میں ذرا سی بھی مایوسی اور بیزاری پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ سلطان ملک شاہ مرحوم نے یہ فوج کس مقصد کے لئے تیار کی تھی۔ زندگی نے وفانہ کی۔ اگر وہ زندہ رہتے تو ملکہ المومت پر حملہ کر کے حسن بن صباح کی اہلیست کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتے۔ مجھے جاسوس اور مخبر روز بروز اطلاعیں دے رہے ہیں کہ باطنی عقیدے بڑی تیزی سے پھیلتے چلے جا رہے ہیں اور یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ ہمارے شہر میں اور دوسرے شہروں میں بھی باطنی آکر آباد ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے عقیدے مسلمانوں میں پھیلا رہے ہیں۔“

”آپ میرے وہ احکام غالباً بھول گئے ہیں جو میں پہلے دے چکا ہوں“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”مرحوم سلطان نے فوج کو تیار کر لی تھی لیکن یہ نہ سوچا کہ اس فوج

کو ہم کب تک پالتے رہیں گے۔ محصولات کا زیادہ تر حصہ یہ فوج کھا رہی ہے۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں حسن بن صباح کی طرف ایک وفد بھیجوں گا اور اُس کے ساتھ امن اور دونوں کا معاہدہ کروں گا۔ وہ میری یہ شرط مان لے گا کہ وہ اپنے علاقے میں محدود رہے اور انیس اپنے علاقے میں محدود رہنے دے۔۔۔۔۔ اس بار تو آپ فوج کو تنخواہ دے دیں۔ حسن بن فوج کی آدمی نفری کو بکدوش کر دیں۔ جو گھوڑے فالتو ہو جائیں وہ فروخت کر کے رقم سرکاری خزانے میں جمع کرا دیں۔ میں اپنے سپہ سالار اور دوسرے سالاروں کو حکم دے رہا ہوں کہ وہ فوج کی چھانٹی کر کے نصف فوج کو ختم کر دیں۔“

”سلطان عالی مقام!“ — وزیر اعظم نے کہا — ”آپ کے والد مرحوم نے وفد بھیجا تھا جس کا حسن بن صباح نے مذاق اڑایا تھا اور کہا تھا کہ تمہارے پاس وہ طاقت نہیں جو میرے پاس ہے۔ اس نے ہمارے وفد کے سامنے اپنے تین آدمیوں کو باری باری حکم دیا تھا کہ اپنے آپ کو قتل کر دیں۔ ان آدمیوں نے فوراً اپنے خنجروں سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ حسن بن صباح نے ہمارے وفد سے کہا تھا کہ تمہاری فوج میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں ملے گا جو اس طرح اپنی جان قربان کر دے۔“

”مجھے وہ باتیں یاد نہ دلائیں“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”وہ میرے والد مرحوم کے دور کی باتیں ہیں۔ میں اپنا راستہ خود بنا رہا ہوں۔ میں حکم دے رہا ہوں کہ فوج کی آدمی نفری کو ہر بھیج دیا جائے۔“

جس وقت سلطان برکیارق اپنے وزیر اعظم کو یہ احکام دے رہا تھا، اُس وقت اس کی بیوی روزینہ کے پاس ایک ادھیر عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ یہ عورت روزینہ کی خاص نازمہ تھی۔ اس عورت کو روزینہ نے قابل اعتماد کنیز کا درجہ دے رکھا تھا۔

”..... اور اُسے یہ کہنا“ — روزینہ اس کنیز سے کہہ رہی تھی — ”امام تک یہ خبر جلدی پہنچا دے کہ میں نے بہت کامیابیاں حاصل کر لی ہیں۔ سب سے زیادہ اہم فیصلہ یہ کروا لیا ہے کہ فوج کی نفری آدمی کر دی جائے گی۔ سلطان برکیارق نے اپنے وزیر اعظم کو یہ حکم دے دیا ہے اور سالاروں کو بلا کر کہہ دے گا کہ آدمی فوج کی چھانٹی کر دو۔۔۔۔۔ پھر امام تک یہ خبر پہنچ دینا کہ سلطان پوری طرح میری مُٹھی میں آگیا ہے۔ اس کی ماں، وزیر اعظم اور اس کا بھائی محمد اسے مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن

میں اسے ان سب سے متفرک کر دوں گی۔ یہاں فوج میں ہزاری اور مایوسی پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ فوج کو ابھی تک تنخواہ نہیں ملی۔ تنخواہ میں اس تاخیر کے پیچھے بھی میرا ہی ہاتھ ہے..... امام سے کہنا کہ اب اپنے آدمی بھیج دے کیونکہ فوج میں چھانٹی ہو گی تو جنہیں نکالا جائے گا انہیں بھڑکانا اور سلطان کے خلاف مشتعل کرنا ضروری ہو گا.... پیغام میں یہ بھی کہنا کہ ابھی میں رے کے حاکم ابو مسلم رازی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اتنا ہی بتا سکتی ہوں کہ وہ سلطان برکیارق کے فیصلوں کے خلاف ہے لیکن یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ اس سلسلے میں وہ کیا عملی کارروائی کرے گا..... تم ابھی چلی جاؤ اور یہ پیغام ان لوگوں کو اچھی طرح سنا دینا اور انہیں کہنا کہ آج ہی ایک آدمی الموت روانہ ہو جائے۔“

یہ حسن بن صباح کا زمین دوز انتظام تھا جس کے تحت سلطنت سلجوقیہ کی بنیادوں میں بارود بھرا جا رہا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد اس بارود میں ذرا سی چنگاری پھینک دینی تھی..... قومیں اور ملک حکمرانوں کے ہاتھوں ہی تباہ ہوتے چلے آئے ہیں۔ حکمران جب اپنی سوچنے کی صلاحیتیں اور اپنا وقار کسی دوسرے کے حوالے کر دیں تو اس کا نتیجہ سوائے تباہی کے کچھ نہیں ہوتا۔ روزیہ سلطان برکیارق کی سلطنت میں تاریخ کو دہرا رہی تھی۔ برکیارق کے ذہن میں وہ یہ بات نقش کر رہی تھی کہ اس سلطنت کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ سلطنت برکیارق کی ذاتی ملکیت ہے۔ تباہی کے عمل کو تیز کرنے کے لئے روزیہ سلطنت سلجوقیہ کو اس تلوار سے محروم کر رہی تھی جسے فوج کہتے ہیں۔

سلطان برکیارق نے وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری کو احکام دے کر فارغ کر دیا اور اپنے سپہ سالار ابو جعفر حجازی اور اُس کے نائب سالار اور یزی کو بلایا۔ وہ فوراً پہنچ گئے۔ ”فوج کو ابھی تک تنخواہ نہیں ملی“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”کل خزانے سے رقم نکلوا کر فوج میں تقسیم کر دیں..... اب میرے اس فیصلے پر عمل شروع کر دیں کہ فوج کی آدمی نفری کو فوج سے نکال دیں۔ میں اب اتنی زیادہ فوج کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ آپ دونوں نے خود فیصلہ کرنا ہے کہ کسے فوج میں رکھنا اور کسے نکالنا ہے۔“

”ہاں سلطان محترم!“ — سپہ سالار ابو جعفر حجازی نے کہا — ”فوج آدمی ہو جانی چاہئے۔ ہم آپ کے حکم کی تعمیل بہت جلد کر دیں گے۔“

”سلطان محترم!“ — سالار اوریزی نے کہا — ”بصد معذرت عرض کرتا ہوں کہ فوج میں کمی نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ مرحوم سلطان نے یہ فوج کیوں تیار کی تھی.....“

”مجھے اور بھی بہت کچھ معلوم ہے“ — سلطان برکیارق نے سالار اوریزی کی بات کاٹ کر کہا — ”یہ صرف مجھے معلوم ہے کہ اتنی زیادہ فوج کو تنخواہ کس طرح دی جاتی ہے.. ... میں جو کہہ رہا ہوں سوچ اور سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ اس پر عمل درآمد ہونا چاہئے۔“

”سلطان ٹھیک فرما رہے ہیں اوریزی!“ — سپہ سالار ابو جعفر حجازی نے کہا — ”اتنی زیادہ تنخواہ پوری کرنا بہت مشکل ہے اور خزانے پر بلاوجہ بوجھ پڑا ہوا ہے۔ ہمیں سلطان محترم کے حکم پر فوراً عمل کرنا چاہئے۔“

”حکم کی تعمیل ہمارا فرض ہے“ — سالار اوریزی نے کہا — ”لیکن میں یہ نہیں بھول سکتا کہ یہ ملک ہمارا اپنا ہے اور یہ اسلامی سلطنت ہے۔ یہ فوج اسلام کی بقاء اور فروغ کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اس سے ہم نے باطل کی قوتوں کو اُسی طرح ختم کرنا ہے جس طرح آتش پرستوں اور رومیوں کی جنگی طاقتوں کو ختم کیا گیا تھا۔ اگر ہم نے حسن بن صباح کو ختم نہ کیا.....“

”میں اس نام سے تنگ آ گیا ہوں“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”حسن بن صباح کا نام سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں۔ میں نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ ہم بائنیوں کے خلاف فوج استعمال نہیں کریں گے۔“

”یہ بھی سوچ لیں سلطان عالی مقام!“ — سالار اوریزی نے کہا — ”اگر آپ نے فوج میں سے آدمی نفری نکال دی تو فوج میں ‘اور قوم میں بھی‘ آپ کے خلاف بد اعتمادی پیدا ہو جائے گی۔ اس کے نتائج کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں۔ میں ابھی کوئی اور بات نہیں کہنا چاہتا سوائے اس کے کہ یہ نتائج بڑے ہی خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔“

”ہم آپ کو نہیں نکال رہے سالار اوریزی!“ — ”سپہ سالار نے کہا — ”آپ ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔“

”میں سب سے پہلے فوج سے نکلوں گا“ — سالار اوریزی نے کہا — ”میں مجاہد ہوں اور اسلام کے دشمنوں کے خلاف جہاد کے لئے فوج میں شامل ہوا تھا‘ سلطان کی خوشامد کے لئے نہیں جیسا آپ کر رہے ہیں۔“

”آپ میری توہین کر رہے ہیں اور یزی!“ — سپہ سالار نے کہا — ”میں بھی مجاہد ہوں خوشامدی نہیں!“

”دونوں خاموش ہو جاؤ“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”میں نے تمہیں آپس میں لڑنے کے لئے نہیں بلایا۔“

”سلطان عالی مقام!“ — سالار اور یزی نے کہا — ”آپ میری صاف گوئی برداشت کریں یا نہ کریں، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں وہ اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ آپ کی سلطنت کی سلامتی کے لئے کہہ رہا ہوں..... یہ سلطنت آپ کی ہی نہیں..... یہ میری بھی ہے..... یہ اللہ کی سلطنت ہے۔ اگر آپ فوج کے متعلق غلط فیصلے کریں گے تو اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ جو سالار ان فیصلوں کو غلط سمجھے گا وہ ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہو گا اور ہمارے سپہ سالار ابو جعفر حجازی کا حکم نہیں مانے گا۔ سپہ سالار حجازی آپ کو خوش کرنا چاہتے ہیں لیکن میں اپنے اللہ کو خوش کر رہا ہوں اور یہی میرا فرض ہے۔“

تقریباً ”تمام مستند تاریخوں میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ سپہ سالار ابو جعفر حجازی سلطان کا خوشامدی تھا اور سلطان ابلیسی اثرات کے تحت فیصلے کر رہا تھا۔ ایک بیدار مغز اور دیانت دار سالار نے ان کی مخالفت کی تو آگے چل کر یہی اختلاف خانہ جنگی کا بنیادی پتھر بن گیا۔ سلطان برکیارق نے جب ان دونوں سالاروں کو فارغ کیا تو باہر آ کر سپہ سالار ابو جعفر حجازی نے سالار اور یزی کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ جانتا ہے کہ سلطان کا یہ حکم سلطنت کے لئے اچھا نہیں لیکن ہمیں کیا، ہمیں سلطان کے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہے لیکن سالار اور یزی اس قدر بگڑ گیا تھا کہ اُس نے سپہ سالار کے ساتھ بحث بے معنی سمجھی۔



ایک روز رے میں امیر شہر ابو مسلم رازی اپنے دفتر میں امور سلطنت میں الجھا ہوا تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ دو آدمی آئے ہیں اور ان کے ساتھ ایک لڑکی ہے۔ ابو مسلم رازی نے انہیں فوراً اندر بلا لیا۔

”ہم اس لڑکی کو آپ کے حوالے کرنے آئے ہیں“ — دونوں میں سے ایک آدمی نے کہا — ”ہم مسلمان نہیں، یہ لڑکی مسلمان ہے۔“

”کون ہے یہ لڑکی؟“ — ابو مسلم رازی نے پوچھا — ”اسے کہاں سے لائے ہو؟“
..... میرے حوالے کرنے کا مقصد کیا ہے؟“

”میرا نام حمیرا ہے“ — لڑکی بولی — ”میں قستان کے ایک رئیس منور الدولہ کی بہن ہوں۔“

”قستان پر تو باطنی قابض ہو گئے ہیں“ — ابو مسلم رازی نے کہا اور پوچھا —
”تم کس طرح بچ نکلے ہو؟“

”اگر آپ اجازت دیں گے تو میں اپنی داستان سناؤں گی“ — حمیرا نے کہا —
”سب سے پہلے تو میں ان دونوں کی تعریف کروں گی کہ یہ مسلمان نہیں اور یہ مجھے یہاں
تک لے آئے ہیں۔“

ابو مسلم رازی کے کہنے پر حمیرا نے وہ سب کہ سنائی جو اُس پر بیتی تھی۔ اُس نے
اپنی محبت کی بات بھی نہ چھپائی اور سفید ریش راہب کے مندر تک پہنچنے کا ایک ایک
تفصیل سنائی۔

”میں کس طرح یقین کر سکتا ہوں کہ تم نے جو بات سنائی ہے وہ بالکل سچ ہے؟“
— ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

”آپ کا شک بجا ہے“ — حمیرا نے کہا — ”ان کے بزرگ راہب نے بھی یہی
شک کیا تھا..... میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ میں ثابت کر سکوں کہ میں نے جو بات
کہی ہے یہ سچ ہے۔“

”ہمارے راہب نے اس لڑکی کو اپنی ذمہ داری میں لے لیا تھا“ — ایک آدمی نے
کہا — ”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم غلط بیانی کر رہے ہیں اور یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے
تو آپ ہم دونوں کو قید خانے میں بند کر دیں اور جب آپ کو یقین آجائے گا تو ہمیں رہا کر
دیں۔“

ابو مسلم رازی نے ان دونوں آدمیوں اور حمیرا کو کھانا کھلایا اور مشروبات پلائے اور
پھر ان کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں۔

”میں تمہیں اپنی پناہ میں رکھوں گا حمیرا!“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”تمہارا
کوئی اور ٹھکانا ہوتا تو میں تمہیں وہاں بھیج دیتا۔“

”میری ایک بات ذہن میں رکھ لیں محترم!“ — حمیرا نے کہا — ”میں یہاں آپ

کی پناہ میں محتاجوں کی طرح بیٹھی نہیں رہوں گی۔ میں نے ان باطنیوں سے اپنے گھر کے ایک ایک فرد کے خون کا انتقام لیتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ باطنیوں کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ آپ مجھے اس جہاد میں جس طرح بھی استعمال کریں گے میں اپنی جان بھی پیش کر دوں گی۔“

ابو مسلم رازی نے حمیرا کے ساتھ آئے ہوئے دونوں آدمیوں کا شکریہ ادا کیا، انہیں کچھ تحفے دیئے اور رخصت کر دیا۔

رے سلطنت سلجوقیہ کا ایک بڑا شہر تھا اور یہ دونوں آدمی دیہاتی علاقے میں سے آئے تھے۔ دونوں جب بازار سے گزرے تو گھوڑوں سے اتر آئے۔ انہیں اس شہر کی دکانیں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ ایک دکان کے سامنے رک گئے۔ دکان میں سجا ہوا سامان انہیں اچھا لگ رہا تھا۔

”تم اجنبی معلوم ہوتے ہو“ — انہیں ایک آواز سنائی دی۔ انہوں نے دیکھا ایک آدمی جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، ان سے مخاطب تھا — ”معلوم ہوتا ہے بڑے لمبے سفر سے آئے ہو“ — اس آدمی نے کہا۔

”ہاں بھائی!“ — ایک نے کہا — ”ہم بہت دور سے آئے ہیں اور اب واپس جا رہے ہیں۔“

”اس دکان سے کچھ خریدنا چاہتے ہو؟“ — اس آدمی نے پوچھا۔

”ویسے ہی یہ چیزیں اچھی لگ رہی ہیں“ — ان دونوں میں سے ایک نے کہا — ”ہم جنگلوں میں رہنے والوں نے کیا خریدنا ہے!“

”تمہیں کوئی چیز اچھی لگے تو بتاؤ“ — اس شخص نے کہا — ”تم پر دہلی ہو۔ میں تمہیں کوئی تحفہ دینا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“ — ایک مسافر نے پوچھا — ”تم ہمیں تحفہ کیوں دینا چاہتے ہو؟“

”میں نے تم سے کیا لیتا ہے!“ — اس شخص نے کہا — ”یہ میری عادت ہے کہ کسی سیدھے سادے اجنبی کو دیکھتا ہوں تو اس سے ضرور پوچھتا ہوں کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ پوچھنے سے میرا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے اسے کسی چیز کی کھانے پینے کی یا کسی طرح کی بھی مدد کی ضرورت ہو اور یہ بے چارہ کسی سے کچھ کہتا نہ ہو۔“

”ہمیں کچھ نہیں چاہئے دوست!“ — ایک نے کہا — ”یہی کافی ہے کہ تم نے ہمارے ساتھ پیار اور محبت سے بات کی ہے۔“

”پھر میری خوشی کی خاطر میرے ساتھ آؤ“ — اس شخص نے کہا — ”میں تمہیں اس شہر کا ایک خاص شہرت پلا کر رخصت کرنا چاہتا ہوں۔“

اس شخص نے ایسی اپنائیت کا اظہار کیا کہ وہ دونوں اس کے ساتھ چل پڑے۔ ذرا ہی آگے مشروبات کی ایک دکان تھی جس میں بیٹھنے کا بڑا ہی اچھا انتظام تھا۔ یہ شخص دونوں کو اندر لے گیا اور ان کے لئے شہرت منگوایا۔ وہ ایسی باتیں کرتا رہا جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے دنیا کی کسی اور چیز کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں سوائے اس کے کہ دوسروں کی خدمت کرے۔

”تمہارے ساتھ ایک لڑکی تھی“ — اس شخص نے پوچھا — ”اور تم امیر شہر کے ہاں گئے تھے۔ وہ لڑکی شاید شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔“

سفید ریش راہب نے اپنے ان دو آدمیوں کو حمیرا کے ساتھ بھیجا اور صرف یہ کہا تھا کہ اسے رے کے امیر شہر ابو مسلم رازی کے حوالے کر کے واپس آجائیں۔ انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ کوئی اور پوچھ بیٹھے کہ یہ لڑکی کون ہے تو اسے لڑکی کی اصلیت نہ بتائیں۔ یہ دونوں آدمی حمیرا کی پوری داستان سن چکے تھے۔ انہوں نے حمیرا کے ساتھ اتنا لباس سفر کیا تھا۔ حمیرا نے خود بھی انہیں سنائی تھی کہ اس پر کیا بیتی ہے اور وہ کس طرح الموت سے نکلے ہے۔

اب رے سے رخصت ہوتے وقت ان دونوں کو یہ اجنبی میزبان مل گیا تو اس کی باتوں میں آگئے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے جسے وہ امیر شہر کے ہاں چھوڑ چلے ہیں۔ ان دونوں نے بڑے فخر اور خوشی سے حمیرا کی ساری داستان اس آدمی کو سنا ڈالی۔ اس آدمی نے حمیرا کے اس کارنامے پر دل کھول کر واہ واہ کی اور پھر ان دونوں آدمیوں کے خلوص اور دیانت داری اور پھر ان کے کردار کی بے پناہ تعریف کی۔ اس کے بعد دونوں رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد یہ شخص بہت ہی تیز چلتا ایک مکان میں چلا گیا۔ وہاں تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

”لو بھائیو!“ — اُس نے کہا — ”وہ مل گئی ہے۔“

”کون؟“

”حمیرا!“ — اس نے جواب دیا — ”اس شہر کے حاکم ابو مسلم رازی کے گھر پہنچ گئی ہے۔ ابھی ابھی دو آدمی اُسے اپنے ساتھ لائے تھے اور وہاں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔“
اُس نے اپنے ساتھیوں کو سنایا کہ کس طرح اُس نے ان دونوں آدمیوں کو گھیرا اور ان سے یہ راز لیا ہے۔ یہ سب باطنی تھے اور حسن بن صباح کے جاسوس تھے جو کچھ عرصے سے رے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہیں دو ہی روز پہلے الموت سے اطلاع ملی تھی کہ حمیرا نام کی ایک لڑکی الموت سے لاپتہ ہو گئی ہے۔ اسے تلاش کیا جائے۔
”الموت کون جائے گا!“ — ان میں سے ایک نے پوچھا اور کہا — ”اگر آج ہی کوئی روانہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ امام خوش ہو جائے گا۔“

”وہ صرف اتنی سی بات پر خوش نہیں ہو گا کہ لڑکی کا سراغ مل گیا ہے۔“ — ان میں سے ایک نے کہا — ”اب یہ حکم آئے گا کہ لڑکی کو اغوا کر کے الموت پہنچاؤ۔“
ایک آدمی اٹھا اور سفر کی تیاری کرنے لگا۔



چند دن گزرے تھے کہ ایک روز سلطان برکیارق کا چھوٹا بھائی محمد رے آگیا اور ابو مسلم رازی کے ہاں پہنچا۔ ابو مسلم اسے اس طرح شفقت اور پیار سے ملا جیسے باپ اپنے پچھڑے ہوئے بیٹے سے ملتا ہے۔ محمد بڑا خوبصورت اور قد آور جوان نکلا تھا۔ اس میں اپنے باپ ملک شاہ والا جذبہ تھا۔

”کو محمد!“ — ابو مسلم رازی نے اُس سے پوچھا — ”مرو کے حالات کیسے ہیں اور تم کیسے آئے؟“

”بہت بُرے!“ — محمد نے جواب دیا — ”آپ کے پاس مجھے ماں نے اور وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری نے بھیجا ہے۔ میں بھائی برکیارق کو بتائے بغیر آیا ہوں۔....
برکیارق پوری طرح اپنی بیوی کے قبضے میں آچکا ہے۔ وہ اُس کے دماغ میں جو کچھ بھی ڈالتی ہے وہ سلطنت کے لئے حکم بن جاتا ہے۔ مجھے اور سنجر کو برکیارق نے بھائی سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے کہتا ہے کہ میں تمہیں کسی اچھے عہدے پر لگا دوں گا لیکن کسی بھی وقت میرے راستے میں نہ آنا۔.... یہ تو ہماری گھریلو باتیں ہیں۔ اُس نے ایک بڑا ہی خطرناک حکم دے دیا ہے جس کے تحت فوج کی آدمی، نفری کو گھر بھیجا جا رہا ہے۔.... فوج

آدھی رہ جائے گی۔“

”کیا کہا؟“ — ابو مسلم نے چونک کر کہا — ”کیا وہ اتنی خطرناک حماقت پر اتر آیا ہے کہ فوج آدھی کر کے سلطنت کو خطرے میں ڈال رہا ہے؟..... کیا وزیر اعظم اور تمہاری ماں نے اسے روکا نہیں؟“

”سب نے روکا ہے“ — محمد نے جواب دیا — ”وہ کسی کی سنتا ہی نہیں۔ اصل خطرہ جو سامنے آگیا ہے اس سے وہ بے خبر ہے لیکن میں آپ کو خبردار کرنے آیا ہوں اور میرے آنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہمیں کچھ مشورہ دیں۔“

”ہاں محمد!“ — ابو مسلم نے کہا — ”یہ تو تم نے بڑی تشویشناک خبر سنائی ہے۔“

”وہاں تو خانہ جنگی کی صورت پیدا ہوتی جا رہی ہے“ — محمد نے کہا — ”فوج میں سے ان آدمیوں کو الگ کیا جا رہا ہے جنہیں فوج سے نکالنا ہے۔ ان لوگوں نے کتنا شروع کر دیا ہے کہ انہیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ بے روزگار ہو جائیں گے بلکہ وہ سلطنت اور سلامتی کی باتوں کو ختم کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں یہ بتا کر فوج میں شامل کیا گیا تھا کہ بائنیوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے اسلام کے فروغ کے راستے کھولنے ہیں..... پھر خطرہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ نائب سالار اور یزی بگڑ گیا ہے۔ اس نے وزیر اعظم سے کہا ہے کہ وہ سپہ سالار ابو جعفر حجازی کے خلاف باقاعدہ لڑائی لڑے گا اور فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔“

”میں سپہ سالار حجازی کو اچھی طرح جانتا ہوں“ — ابو مسلم رازی نے کہا —

”خوشامدی آدمی ہے۔ معلوم نہیں سلطان ملک شاہ مرحوم نے اسے سپہ سالار کیسے بنا دیا تھا۔ وہ سوائے خوشامد کے کچھ بھی نہیں جانتا۔“

”وہ ہمارے بھائی برکیارق کا ہر غلط حکم بسرو چشم مانتا ہے..... اور دوسروں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی یہ حکم مانیں..... اس میں اور سالار اور یزی میں باقاعدہ دشمنی پیدا ہو گئی ہے۔“

”اور یزی صحیح معنوں میں مجاہد آدمی ہے“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”اس نے جو کہا ہے وہ کر کے بھی دکھا دے گا لیکن یہ صورت حال خطرناک ہو سکتی ہے۔“

”وہ خطرہ سامنے آگیا ہے“ — محمد نے کہا — ”وزیر اعظم عبدالرحمن سیمری کے مخروں نے انہیں بتایا ہے کہ باطنی تخریب کار دونوں طرف کے فوجیوں کو ایک دوسرے

کے خلاف مشتعل کر رہے ہیں۔ نظر ہی آرہا ہے کہ وہ فوجی جنہیں نکالا جا رہا ہے، ان فوجیوں سے ٹکرا جائیں گے جنہیں فوج میں رکھا جا رہا ہے۔ شہری بھی دو مخالف گروہوں میں بٹتے جا رہے ہیں۔ اس میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ باطنی شہریوں میں شامل ہو کر انہیں بھڑکار رہے ہیں۔ کسی بھی روز یہ آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔

”مجھے سوچنے دو“۔ ابو مسلم نے کہا۔ ”یہ صورتِ حال ایسی نہیں کہ میں فوراً ہی کوئی مشورہ دے دوں۔ اس وقت میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ تمہیں یقین دلا دوں کہ میں ہر طرح تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں اُس نفری کو جسے نکالا جا رہا ہے یہاں بلا لوں گا اور فوج تیار کر کے سلطان برکیارق کا تختہ الٹ دوں گا۔ بہر حال صورتِ حال بہت ہی خطرناک ہے۔ تم کچھ دن یہیں ٹھہرو، میں کچھ نہ کچھ سوچ لوں گا۔“

وہ اس مسئلے اور اس صورتِ حال پر باتیں کرتے رہے اور حسد، ہرجا، صبح کا ذکر آگیا۔ اس ذکر کے ساتھ ابو مسلم رازی نے حمیرا کا نام لیا اور مختصراً ”محمدؐ و ستایا کہ یہ لڑکی کس طرح اس کے پاس پہنچی ہے اور حسن بن صباح سے انتقام لینے کے لئے بے تاب ہے۔“

ابو مسلم رازی نے حمیرا کو بلا لیا۔ وہ آئی تو اس کا تعارف محمدؐ سے کرایا اور اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

”حمیرا!“۔ ابو مسلم نے کہا۔ ”محمدؐ کچھ دن یہاں رہے گا۔ اس میں وہی جذبہ اور وہی خیالات ہیں جو تمہارے ہیں۔ اس کی میزبانی تم نے کرنی ہے۔ اسے اس کے کمرے میں لے جاؤ اور اس کا خیال رکھنا۔“

محمدؐ اور حمیرا اٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔ دونوں کو معلوم نہ تھا کہ وہ کیسی سنسنی خیز کہانی کے کردار بننے جا رہے ہیں۔

ابو مسلم رازی نے محمد اور حمیرا کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور خود گہری سوچ میں کھو گیا۔ محمد محسوس نہ کر سکا تھا کہ اُس نے ابو مسلم رازی کو مَرُو کی جو خبر سنائی ہے، اس خبر نے اس جہاندیدہ امیر اور حاکم کی ذات میں کیسا تیز و تند طوفان ہپا کر دیا ہے۔ ابو مسلم رازی اس قدر بے چین اور پریشان ہو گیا تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ رکتا اور ایک ہاتھ کا گھونسہ دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتا اور پھر ٹہلنے لگتا۔ وہ سلطان ملک شاہ کا دستِ راست تھا۔ دونوں کا جذبہ ایک اور ایمان ایک تھا۔ دونوں بانیوں کے معاملے میں اتنے حساس تھے کہ حسن بن صباح کا نام آجاتا تو دونوں کا خون کھولنے لگتا تھا..... سلطان ملک شاہ دنیا سے اٹھ گیا تو اُس کے بیٹے نے اُس کی گدی پر بیٹھ کر اسی حسن بن صباح اور اس کے فرقتے کے ساتھ اپنا رویہ دوستانہ کر لیا تھا۔ ابو مسلم رازی نے دروازے پر کھڑے دربان کو بلایا اور اُسے کہا کہ مجید فاضل صاحب کو اپنے ساتھ لے آؤ۔

مجید فاضل ایک بہت بڑا عالم دین فحخص تھا جو دین کے علاوہ سیاست اور امورِ سلطنت کو بھی خوب سمجھتا اور ان سے متعلق مسائل اور مشکلات کا حل اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں نکال لیا کرتا تھا۔ اُس کا پورا نام جو تاریخوں میں آیا ہے، وہ ابو المنظر مجید فاضل اصفہانی تھا۔ اُس نے علم، دانش اور تجربے کی تلاش میں کئی ملکوں کا سفر کیا تھا اور اب وہ رے میں رہتا تھا۔ ابو مسلم رازی خود بھی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ گیا تھا اور اپنے علم و فضل سے اس نے بڑا اونچا مقام حاصل کر لیا تھا لیکن مجید فاضل کو اپنا استاد اور بہترین مشیر سمجھتا تھا۔ کوئی مسئلہ پیش آجاتا تو اُسے بلا لیتا یا خود اُس کے ہاں چلا جاتا تھا۔

اُس نے دربان سے اتنا ہی کہا تھا کہ مجید فاضل کو اپنے ساتھ لے آؤ۔ دربان جانتا تھا کہ اس شخصیت کے لئے بکھی لے کر جانا ہے اور اسے اس سواری پر لانا ہے۔

کچھ دیر بعد بکھی مجید فاضل کو لے آئی۔ ابو مسلم رازی اُس کے استقبال کے لئے باہر نکلا اور اسے بڑے احترام اور تعظیم سے اندر لے آیا۔

”کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہے ہو!“ — مجید فاضل نے اندر آ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا — ”کوئی پیچیدہ مسئلہ آن پڑا ہے؟“

”پیچیدہ نہ ہوتا تو میں آپ کو زحمت نہ دیتا“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”وہ خطرہ جس کے متعلق ہم کئی بار بات کر چکے ہیں، ایک سیاہ کالی گھٹا کی طرح سلطنت سلجوقیہ پر چھا گیا ہے۔ اس گھٹا کے اندر بجلیاں جھمبھ ہوئی ہیں، وہ آپ خود جانتے ہیں کہ اب یہ گھٹا خون کا مینہ برسائے گی۔“

”کوئی اور اطلاع آئی ہے؟“ — مجید فاضل نے پوچھا۔

ابو مسلم رازی نے وہ ساری صورت حال بیان کر دی جو کچھ دیر پہلے محمد نے اسے سنائی تھی۔

”کیا برکیارق کچھ بھی نہیں سمجھ رہا؟“ — مجید فاضل نے پوچھا۔

”نہیں!“ — ابو مسلم رازی نے جواب دیا — ”میں خود اُس کے ساتھ بات کر چکا ہوں محترم! جس نے اپنی عظیم ماں کی بات نہیں سنی اور اپنی بیوی کو برتر سمجھا ہے، اُس پر میری باتوں کا کیا اثر ہو سکتا ہے!..... یہ تو وہی باتیں ہیں جو ہم کئی بار کر چکے ہیں۔ اب برکیارق فوج کی آدمی نفری نکال رہا ہے۔ کچھ دنوں بعد باقی فوج میں سے آدمی نفری کو بھی گھر بھیج دے گا۔ محمد بتاتا ہے کہ ان لوگوں میں جنہیں فوج سے نکالا جا رہا ہے اور شہریوں میں بھی غم و غصہ پھیلتا چلا جا رہا ہے اور ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں جو قوم کو خانہ جنگی کی طرف گھسیٹ لیں گے۔“

”تم نے کیا سوچا ہے؟“ — مجید فاضل نے پوچھا۔

”یہی میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”آپ کو زحمت دینے سے میرا مطلب یہی تھا کہ میں غلط سوچ رہا ہوں تو مجھے روکیں اور اگر میں صحیح بات تک پہنچ رہا ہوں تو میری حوصلہ افزائی کریں یا مجھے کوئی راستہ دکھائیں۔“

”کیا سوچا ہے؟“

”خانہ جنگی!“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”میں نے محمد سے کہا ہے کہ جن افراد کو فوج سے نکالا جا رہا ہے اگر انہوں نے کسی شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کیا اور انہیں طاقت اور تشدد سے دبانے کی کوشش کی گئی تو میں ان نکالے جانے والوں کو یہاں لے آؤں گا اور ان کی ایک فوج بنالوں گا پھر میں برکیارق کی فوج کے مقابلے میں جاؤں گا۔“

”میں تمہاری سوچ کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں“ — مجید فاضل نے کہا — ”لیکن میں تمہیں پہل کرنے سے روکوں گا۔ یہ دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ اگر وہ تشدد اور فوجی کارروائی پر اتر آتے ہیں تو پھر تم اپنا فرض اس طرح ادا کرنا کہ اس سرکاری فوج کا خاتمہ نہ ہو۔ تمہارا مقصد صرف یہ ہو کہ برکیارق کو معزول کر کے محمد کو باپ کی گدئی پر بٹھایا جائے۔“

”میرا مقصد یہی ہے محترم!“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”میں یہ تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایک بیٹے کو معزول کر کے اس گدئی پر خود بیٹھ جاؤں گا اور دوسرے بیٹوں کو ان کے حق سے محروم کر دوں گا۔ محمد اور اس کا بھائی سبخر بڑے ہی عظیم باپ کے بیٹے ہیں۔ سلطان ملک شاہ اوز میں ایک ہی منزل کے مسافر تھے۔“

ابو مسلم رازی کی آواز رقت میں دب گئی اور اس کے آنسو پھوٹ آئے۔

”خانہ جنگی ہو کر رہے گی“ — مجید فاضل نے کہا — ”مجھے خبریں مل رہی ہیں۔ میرے شاگرد میرے جاسوس ہیں۔ مڑو سے مجھے خبریں ملتی رہتی ہیں۔ حسن بن صباح کے دہشت گرد باطنی شہروں میں بھرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ تو یقینی امر ہے کہ سلطان برکیارق کی بیوی روزینہ حسن بن صباح کی بیٹی ہوئی ہے۔ اتنی لمبی عمر کا تجربہ مجھے بتاتا ہے کہ دنیا میں جتنی تباہی عورت لائی ہے، اتنی تباہی ایک دوسرے کے ملکوں پر حملے کرنے والے بادشاہ بھی نہیں لاسکے۔ میں ہر عورت کی بات نہیں کر رہا۔ عورت وفادار بیوی بھی ہوتی ہے اور عورت عظیم ماں بھی ہوتی ہے اور اپنے دودھ کی دھاروں میں اپنی عظمت اپنے بچوں کی روح میں ڈال دیتی ہے۔ عورت بہن بھی ہوتی ہے جو اپنے بھائیوں کو جہاد پر رخصت کر دیتی ہے۔ میں اس عورت کی بات کر رہا ہوں جسے تربیت ہی یہ ملتی ہے کہ جس کے پاس دھن دولت ہے، تخت و تاج ہے اُسے پھانس لو اور کنگال کر کے باہر پھینک دو۔ حسن بن صباح اپنی تربیت یافتہ لڑکیوں کو اسی طرح استعمال کرتا ہے۔ یہ تو تم خود جانتے ہو کہ حسین و جمیل نوجوان لڑکی بجائے خود جاذو کا اثر رکھتی ہے۔ میں

نئی بات نہیں کہہ رہا۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ برکیارق کو اس لڑکی کے جال سے نہیں نکالا جاسکتا۔

”ایک بات اور ذہن میں آتی ہے“ — ”ابو مسلم رازی نے کہا — ”اگر اس لڑکی روزینہ کو قتل کروادیا جائے تو آپ کیا مشورہ دیں گے؟“

”برکیارق کا ردِ عمل وحشیوں اور درندوں جیسا ہوگا“ — مجید فاضل نے کہا۔

”وہ پاگل ہو جائے گا۔ اپنی ماں تک کو قتل کروادے گا۔ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو قید خانے میں پھینک دے گا۔ اسے معلوم ہے کہ آپ بھی اس لڑکی کے خلاف ہیں۔ وہ آپ کو اس رتبے سے معزول کر کے قتل کروادے گا یا قید خانے میں ڈال دے گا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس کی گمراہی کے نتائج سامنے آنے دیں۔ خون بے گناہ بنے دیں ماکہ وہ دیکھے کہ اس نے کیا کُل کھلائے ہیں اور یہ جو خون بے گناہوں کا بہہ گیا ہے یہ اُس کے کروت کا نتیجہ ہے اور وہ اپنے خاندان اور پوری سلطنت کی تباہی کا اکیلا ذمہ دار ہے“ اس کی بیوی نہیں۔ بیوی تو آئی ہی اسی مقصد کے لئے تھی۔“

”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ لڑکی جو اس سلطنت کی ملکہ بن بیٹھی ہے خزانہ خالی کر رہی ہے“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”اور یہ خزانہ قلعہ الموت میں جا رہا ہے۔ ہمیں بہت جلدی کوئی کارروائی کرنی پڑے گی۔“

”آپ یہ لعنت اپنے سر نہ لیں“ — مجید فاضل نے کہا — ”حسن بن صباح زیادہ جلدی میں ہے۔ وہ جو چال ایک لڑکی کے ذریعے چل رہا ہے وہ بہر حال کامیاب ہوگی۔ اسے کامیاب ہونے دیں۔ اس کے بعد آپ اپنی چال چلیں۔ یہ ہوگی خانہ جنگی ہی۔ باطنی خانہ جنگی کے لئے زمین ہموار کر چکے ہیں۔ آدمی فوج کو نکلوادینا ان کی پہلی چال ہے۔ نائب سپہ سالار اور یزی جو سوچ رہا ہے اور کر رہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ آپ تیار رہیں۔ جو نہی کوئی اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو دیکھ لیں کہ آپ یہاں کچھ کر سکتے ہیں یا آپ کو وہاں پہنچنا چاہئے۔ خانہ جنگی سے نہ ڈرو۔ یہ میں بتا چکا ہوں کہ خانہ جنگی ہو کر رہے گی۔ آپ اسے روکنے کی کوشش کریں گے تو اس کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا کہ آپ اپنی توانائی اور اپنے وسائل ضائع کریں گے اور آپ دشمنوں کی نظر میں آجائیں گے اور ایک روز یہ خبر ملے گی کہ رے کا امیر ابو مسلم رازی قتل ہو گیا ہے۔ محمد یہاں آیا ہے۔ اسے جلدی واپس بھیج دیں اور اسے یہ کہہ دیں کہ مرز میں کسی کو پتہ

نہ چلنے دے کہ وہ یہاں آیا تھا۔

”ہم اسلام کی سر بلندی اور فروغ میں مصروف تھے“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھلایا ہے کہ اس سلطنت کو شکست و ریخت سے بچانا ایک مسئلہ بن گیا ہے۔“

”یہ سارا فتنہ اسلام کی تباہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے“ — مجید فاضل نے کہا — ”اسلام ایک مکمل دین ہے اور یہ اللہ کا اپنا دین ہے اور یہ ہمیشہ قائم رہے گا اور باطل کی قوتیں اسے کمزور کرتی رہیں گی۔ یہ نہ سمجھو کہ حسن بن صباح کے پاس جو تربیت یافتہ لڑکیاں ہیں، وہ صرف اغوا کی ہوئی ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کم بن اور انتہائی خوبصورت بچیاں حسن بن صباح کے حوالے کر رکھی ہیں۔ وہ اس باطنی ابلیس کی یہ ضرورت پوری کرتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کو تم ہر دور میں اسلام کی بیخ کنی کے لئے سرگرم دیکھو گے۔ خطرہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ خود مسلمان اسلام کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ ان کے دماغوں میں حکمرانی کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ حکمرانی اور اقتدار اعلیٰ کی ہوس ایسی خطرناک چیز ہے جو کسی میں داخل ہو جائے تو وہ اس کی خاطر اپنے دشمن کے ساتھ بھی دوستی کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ خلافت اسلام کی مرکزیت کی نشانی تھی لیکن کہاں ہے ہمارا خلیفہ؟..... برائے نام ایک آدمی خلافت کی گدڑی پر بیٹھا ہے اور وہ ایسے حالات پیدا کر لیتا ہے کہ وہ مرجائے تو یہ گدڑی اس کے خاندان میں ہی رہے۔ شریعت ختم ہو چکی ہے۔ یہی ایک پابندی تھی۔ حسن بن صباح نے یہی کمال کیا ہے کہ شرعی پابندیوں کو ختم کر کے یہ کہا ہے کہ یہ ہے اصل اسلام۔ انسان کی فطرت کسی پابندی کو قبول نہیں کرتی۔ یہ ابلیسی طرز فکر ہے جو انسان کو اچھا لگتا ہے کیونکہ اس میں لذت ہے، نشہ ہے اور اس میں کوئی روک نہیں کوئی ٹوک نہیں..... بہر حال آپ مروجہ حالات پر نظر رکھیں اور تیار رہیں۔ میں آپ کے ساتھ رابطہ رکھوں گا اور مجھے ہر حال میں اور ہر وقت اپنے ساتھ سمجھیں۔“

جب ابوالمنظر مجید فاضل اصفہانی ابو مسلم رازی کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس وقت سلطان ملک شاہ مرحوم کا بیٹا، سلطان کا برکیارق کا چھوٹا بھائی محمد حمیرا کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھا باتیں کر بھی رہا تھا اور سن بھی رہا تھا۔ محمد خوبرو جوان اور خوش گفتار تھا اور وہ سلطان کا بیٹا اور موجودہ سلطان کا چھوٹا بھائی تھا۔ حمیرا جب اس کے ساتھ اس

کمرے میں آئی تھی تو اُس پر مرعوبیت طاری تھی اور وہ جھینپی ہوئی تھی۔ وہ خاص طور پر حسین اور دلکش لڑکی تھی لیکن اسے بائنیوں کی تربیت حاصل نہیں تھی کہ وہ محمد کو مرعوب کرتی۔

”محترم رازی نے تمہارے متعلق بہت ہی مختصر بات کی ہے“ — محمد نے حمیرا سے کہا — ”میں ساری بات تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“

حمیرا پر جو بیتی تھی وہ اُس نے ہر ایک تفصیل کے ساتھ سنا دی۔ اُس کے آنسو بھی نکلے اُس نے آہیں بھی بھریں اور جب اس پر انتقام کے جذبے کا غلبہ ہوا تو اُس کے چہرے پر سرخی آگئی اور اس کے دانت پسنے لگے۔

”اسلام کو تم جیسی بیٹیوں کی ضرورت ہے“ — محمد نے کہا — ”اگر انتقام لینا چاہتی ہو تو مردوں کی طرح حوصلہ مضبوط کرو عورتوں کی طرح روؤ نہیں۔“

”لیکن میں اکیلی کیا کر سکتی ہوں؟“ — حمیرا نے کہا۔

”بہت کچھ کر سکتی ہو“ — محمد نے کہا — ”تم میں مردوں والی ہمت ہے لیکن ہم مرد جب تک زندہ و بیدار ہیں تو کسی عورت کو خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ تم نے میری باتیں سنی ہیں جو میں محترم رازی کو سنانے آیا تھا۔ تم نے محسوس کیا ہو گا کہ میرا اور تمہارا جذبہ ایک ہے۔ اسلام کو اور اس سلطنت کو میرا بڑا بھائی نقصان پہنچا رہا ہے۔ اسی لئے میں اپنے سگے بھائی کو دشمن کہہ رہا ہوں۔ ہم اس سلطنت کو اسلام کا قلعہ بنا چکے تھے۔ میرے والد مرحوم کا مقصد ہی یہی تھا مگر ان کی وفات کے بعد حالات نے کچھ اور ہی پلٹا کھلایا ہے..... میری عمر ابھی اتنی نہیں ہوئی کہ میں دانشوروں اور عالموں کی طرح بات کر سکوں۔ میں تمہیں صرف یہ کہوں گا کہ جس طرح تم نے خوف کو قبول نہیں کیا اسی طرح اپنے آپ کو ہمیشہ بے خوف اور نڈر رکھنا۔ اگر تم پر خوف کا غلبہ ہوتا تو اَلْمَوْتُ سے تم کبھی نہ نکل سکتیں۔ تم اُس باطنی کو دریا میں پھینک کر ہلاک نہ کر سکتیں اور پھر تنہا سفر کا تو تمہارے ذہن میں خیال بھی نہ آتا لیکن تم نے خوف کو قبول نہیں کیا تھا اس لئے تمہارے دماغ نے تمہاری راہنمائی کی اور تم ایک آدمی سے گھوڑا لے کر یہاں تک پہنچ گئیں۔“

”کیا یہ سلطنت بائنیوں کو ختم کر سکے گی؟“ — حمیرا نے پوچھا۔

”کر سکتی تھی“ — محمد نے جواب دیا — ”میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میرے والد

مرحوم کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا..... بائنیوں کا خاتمہ..... مگر میرا بڑا بھائی باپ کی گدی پر بیٹھا تو اُس نے بائنیوں کے خاتمے کی بجائے اپنے باپ کے مقصد کا خاتمہ کر دیا۔
”وہ کیسے؟“

”وہ اس طرح“ — محمد نے جواب دیا — ”کہ وہ بائنیوں کی گود میں جا کر رہے۔ اُس نے سب کی مخالفت کے باوجود ایک باطنی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی ہے..... اُس کی بیوی کا نام روزینہ ہے..... وہ تم سے زیادہ خوبصورت نہیں لیکن اُس کے ہاتھ میں جو جادو ہے اس کو اسے چلانے کی تربیت ملی ہوئی ہے۔“

”کیا ہم اس لڑکی کو ختم نہیں کر سکتے؟“ — حمیرا نے کہا — ”اگر کوئی اور نہ کر سکے تو یہ کام میرے سپرد کریں..... میں جب تک چند ایک بائنیوں کا خون اپنے ہاتھوں بہانہ لوں گی مجھے چین نہیں آئے گا۔ میں نے اپنے بڑے بھائی، ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کے خون کا انتقام لینا ہے۔“

”اور میں نے اپنے باپ کے خون کا انتقام لینا ہے“ — محمد نے کہا — ”میرے باپ کو بائنیوں نے دھوکے میں زہر پلا کر مار ڈالا ہے۔ میں بھی تمہاری طرح سوچا کرتا ہوں لیکن ایک دو آدمیوں کو قتل کر دینے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ کسی کو قتل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ روزینہ کو میں خود قتل کر سکتا ہوں، کروا بھی سکتا ہوں مگر ہم نے اس کے نتائج دیکھنے ہیں۔ میرا بھائی برکیارق ہمیں قتل کروا دے گا۔ وہ اپنے آپ میں ہے ہی نہیں۔“

”میں سوچ رہی تھی کہ روزینہ کی کنیز بن جاتی ہوں“ — حمیرا نے کہا — ”میں ایک غریب لڑکی بن کر اُس کے پاس جاؤں اور اُس سے کہوں کہ وہ مجھے اپنی کنیز بنالے تو میرا خیال ہے کہ میری بات مان جائے گی۔ پھر میں اُسے آسانی سے زہر دے سکتی ہوں لیکن آپ نے جو بات کہی ہے وہ میں سمجھ گئی ہوں۔“

”تم یہیں انتظار کرو“ — محمد نے کہا — ”اپنا خون نہ جلاؤ۔ ہمیں جہاں نہیں تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تمہیں بلا لیں گے۔“

”میں یہاں کب تک پڑی رہوں گی!“ — حمیرا نے کہا — ”اچھا نہیں لگتا کہ امیر شہر کے ہاں مہمان ہی بنی رہوں، آخر ایک دن یہ مجھ سے تنگ آ جائیں گے۔ میرا تو کوئی گھر ہے ہی نہیں، نہ کوئی ٹھکانہ نہ کوئی پناہ!“

”ایسا نہ سوچو“ — محمد نے کہا — ”یہاں عموماً“ تم جیسی لڑکیاں اور مظلوم آدمی آتے ہی رہتے ہیں۔ تمہیں یہاں سے کوئی نکال نہیں دے گا۔“

”جذباتی سہارا تو مجھے کوئی نہیں دے سکتا“ — حمیرا نے کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے — ”میرا بھائی شہر کار نہیں تھا۔ میں نے اچھے خاندان میں پرورش پائی اور اچھی زندگی دیکھی تھی۔“

”تمہیں اس سے زیادہ اچھی زندگی ملے گی انشاء اللہ!“ — محمد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا — ”اپنی ذات کے متعلق تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔“

”میری عمر دیکھیں“ — حمیرا نے کہا — ”میں تو کہوں گی کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی اچھی شکل و صورت دے کر مجھ پر کوئی کرم نہیں کیا۔ مجھ جیسی بے آسرا لڑکیوں کے لئے خوبصورتی مصیبت بھی بن جایا کرتی ہے۔ آپ یقیناً شادی شدہ ہیں.....“

”نہیں حمیرا!“ — محمد نے مسکراتے ہوئے کہا — ”میں نے ابھی شادی کی سوچی بھی نہیں۔ میں کو میرا فکر لگا رہتا ہے لیکن سلطنت کے بگڑتے ہوئے حالات نے میری توجہ ادھر سے ہٹا رکھی ہے۔“

حمیرا فوراً ”کچھ بھی نہ بولی۔ اس کی نظریں محمد کے چہرے پر جم کر رہ گئیں اور پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہنے کی جرأت نہیں رکھتی۔“

”ایک بات پوچھوں حمیرا!“ — محمد نے کہا — ”کیا اپنی پسند کا کوئی آدمی تمہاری زندگی میں آیا ہے؟“

”یہی تو غلطی کر بیٹھی تھی“ — حمیرا نے کہا — ”آپ کو سنایا ہے کہ ایک آدمی کو دل میں بٹھایا تھا اور اسی آدمی کو اپنے ہاتھوں دریا میں دھکیل کر اور ڈبو کر مار ڈالا ہے..... اُس کا نام جابر بن حاسب تھا..... اب تو میں محبت کے نام سے بھی ڈرتی ہوں۔ آنکھیں انسان کو باہر سے دیکھتی ہیں اندر سے نہیں دیکھ سکتیں۔ میری آنکھوں نے اور میرے دل نے مجھے دھوکا دیا۔“

”میری آنکھیں مجھے دھوکہ نہیں دے رہیں“ — محمد نے بڑے ہی خوشگوار لہجے میں کہا — ”میری آنکھیں تمہارا ضمیر اور تمہاری روح بھی دیکھ رہی ہیں۔ میں نہیں بتا سکتا کہ میں تمہارے اس ظاہری حسن اور پُرکشش جسم سے متاثر ہوا ہوں یا اس

کارنامے سے جو تم نے کر دکھایا ہے یا اس جذبے سے جو تمہیں بے چین اور بے قرار کئے ہوئے ہے یا ان ساری چیزوں نے مل ملا کر ایسا اثر کیا ہے کہ میں تمہیں یہاں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا۔

”آپ کی یہ بات سن کر میری روح کو تسکین ہوئی ہے۔“ — حمیرا نے سر جھکا کر کہا — ”اگر آپ نے مجھے دلی طور پر قبول کر لیا ہے تو میں اپنے آپ کو یقین دلا سکتی ہوں کہ میری زندگی کے خلا کو صرف آپ کی محبت پُر کر سکتی ہے۔“

دونوں کے ہاتھ آگے بڑھے اور ان ہاتھوں نے ایک دوسرے کو پکڑ لیا اور پھر ان ہاتھوں نے محمد اور حمیرا کو اتنا قریب کر دیا کہ ان کے درمیان سے ہوا کا گزر بھی ممکن نہ رہا۔

”محترم ابو مسلم رازی دانشمند اور دور اندیش ہیں۔“ — محمد نے مسکراتے ہوئے کہا — ”انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ اس کمرے میں بلا مقصد نہیں بھیجا تھا۔ میری ماں نے انہیں دو تین مرتبہ کہا تھا کہ میرے اس بیٹے کے لئے ہمارے خاندان کے مطابق موزوں دلہن تلاش کریں..... لیکن حمیرا محبت اپنی جگہ، اُس جذبے اور مقصد کو جو ہم دونوں میں مشترک ہے اولیت حاصل ہونی چاہئے۔“

”اس مقصد پر تو میں اپنی محبت بھی قربان کر دوں گی۔“ — حمیرا نے کہا۔ وہ ایک دوسرے میں گم ہو گئے تھے کہ انہیں دربان کی آواز سنائی دی — ”امیر محترم یاد فرما رہے ہیں!“

محمد فوراً اٹھا اور ابو مسلم رازی کے کمرے میں چلا گیا۔
 ”محمد بیٹا!“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”تم کل علی الصبح مَرُو کے لئے روانہ ہو جانا۔ مجھے وہاں کی خبریں بھیجتے رہنا، خود آنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اپنے آپ کو تھانہ سمجھنا میں پہنچوں گا..... اور نائب سپہ سالار اور یزی کے ساتھ رابطہ رکھنا..... اب یہ بتاؤ کہ اس لڑکی حمیرا کے متعلق کیا خیال ہے!“
 ”انتقام کا جذبہ اسے پریشان کر رہا ہے۔“ — محمد نے جواب دیا — ”اچھی لڑکی ہے لیکن تملائی محسوس کرتی ہے۔“

”وہ تو میں نے دیکھ لیا ہے کہ لڑکی بڑے کلم کی ہے۔“ — ابو مسلم رازی نے ذرا تبسم سے کہا — ”جہاں تک اس کی تملائی کا تعلق ہے اس کا علاج تمہارے پاس ہے۔“

تم ابھی جاؤ اور یہ ذہن میں رکھنا کہ میں اس لڑکی کو ضائع نہیں ہونے دوں گا۔



جس وقت محمد اور حمیرا کی ملاقات ہوئی تھی اس سے بہت پہلے حسن بن صبح کو یہ اطلاع پہنچادی گئی تھی کہ ایک فدائی جابر بن حاجب کی قاتل حمیرا کے امیر ابو مسلم رازی کی پناہ میں پہنچ گئی ہے۔ حسن بن صبح نے بد ساخت حکم دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس لڑکی کو اغوا کر کے الموت لایا جائے اور پھر اسے گھٹنوں سے اوپر تک زمین میں گاڑ کر اس کے جسم پر اور منہ پر شمد مل دیا جائے۔

یہ بڑی ہی ظالمانہ سزا تھی جو حسن بن صبح نے سنائی تھی۔ شمد مل دینے سے چھوٹی بڑی چیونٹیوں اور کیڑے مکوڑوں نے اور دیگر حشرات الارض نے حمیرا کے جسم کا گوشت آہستہ آہستہ کھا جانا تھا۔ اس نے آخر مرنا ہی تھا لیکن ایسی اذیت میں مرنا تھا جو پانچ چھ دن اسے ملتی رہتی۔ حسن بن صبح نے کہا تھا کہ اُس کی جنت کی تمام لڑکیوں کو یہ منظر اور حمیرا کا حشر دکھایا جائے تاکہ کوئی لڑکی فرار کی یا کسی غلط حرکت کی جرات نہ کرے۔

حسن بن صبح کو روزینہ کی رپورٹ بھی مل گئی تھی کہ اُس نے سلطان برکیارق کو پوری طرح مٹھی میں لے لیا ہے اور اس سے یہ فیصلہ کروا لیا ہے کہ فوج کی نفری آدمی کر دی جائے۔ روزینہ نے اپنی اس رپورٹ میں کہا تھا کہ اب آدمی بھیجے جائیں جو اس نفری میں اشتعال پیدا کریں جسے فوج میں سے نکالا جا رہا ہے۔ حسن بن صبح کو اس قسم کی رپورٹیں اور اطلاعات دینے والی ایک روزینہ ہی نہیں تھی، یہ تو اُس کا ایک مکمل نظام تھا جو سلطنت سلجوقیہ میں پھیلا ہوا تھا اور اس سلطنت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہا تھا۔

مرؤ میں سپہ سالار ابو جعفر حجازی اپنے سلطان برکیارق کے حکم کے مطابق فوج کی چھانٹی کر رہا تھا۔ یہ وہ فوج تھی جسے سلطان ملک شاہ مرحوم نے باغیوں کی سرکوبی کے لئے تیار کیا تھا اور اس فوج میں وہ اضافہ کر رہا تھا۔

سپہ سالار حجازی جس نفری کو فارغ کر رہا تھا اسے بارکوں میں سے نکل کر الگ کرتا جا رہا تھا۔ اس نفری کے لئے خیمے لگا دیئے گئے تھے۔ اسے فوری طور پر فارغ نہیں کیا جا رہا تھا کیونکہ ان کا حسب کتب بھی کرنا تھا اور آخر میں یہ ساری نفری سلطان برکیارق کو دکھانی تھی تاکہ اُس کا آخری حکم لیا جاسکے۔ اس طرح ایک وسیع میدان میں خیموں کا

ایک شہر آباد ہو گیا تھا۔ فارغ کی جانے والی نفری کی تعداد پندرہ ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس نفری سے گھوڑے اور ہتھیار لے لئے گئے تھے۔

فوج کی ملازمت بیشتر لوگوں کا ذریعہ معاش بن گیا تھا۔ اُس وقت کے فوجیوں کو یہ فائدہ بھی نظر آتا تھا کہ مفتوحہ علاقے سے مال غنیمت بھی ملتا تھا۔ اب ان پندرہ سولہ ہزار آدمیوں سے ذریعہ معاش چھن رہا تھا۔ قدرتی طور پر ان میں مایوسی اور بے زاری پیدا ہو گئی تھی۔ اس بے زاری میں غصے کا عنصر بھی موجود تھا۔ وہ جب آپس میں بیٹھ کر باتیں کرتے تھے تو ہر فوجی یہ ضرور کہتا تھا کہ ہمیں کیوں نکالا گیا ہے، ہماری جگہ دوسروں کو کیوں نہیں نکالا گیا۔ انہیں اپنے آپ میں کوئی خامی یا کوئی نقص نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی ان میں کوئی خوبی نظر آتی تھی جنہیں فوج میں ہی رکھا جا رہا تھا۔ ان آدمیوں کی جذباتی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتے تھے۔ غصے اور احتجاج سے وہ بارود کی مانند ہوتے جا رہے تھے۔

”ہمیں تو کہتے تھے کہ باطنیوں کو ختم کرنا ہے۔“

”اب ہمیں ہی ختم کیا جا رہا ہے۔“

”نئے سلطان کی بیوی باطنی ہے۔“

”نئے سلطان نے حسن بن صباح کا عقیدہ قبول کر لیا ہے۔“

اور ایسی ہی باتیں تھیں جو خیموں کی اس بستی میں سنی اور سنائی جاتی تھیں چونکہ یہ سب فوجی تھے اس لئے کئی باتیں اخلاق سے گری ہوئی بھی کہتے تھے۔ فارغ کئے جانے والے ان پندرہ سولہ ہزار فوجیوں میں سالار بھی تھے اور عمدے داروں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی، باقی سب سپاہی تھے۔ مَرُو میں جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی، اس کے متعلق زیادہ تر یورپی مؤرخوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ہزاروں فوجی سرپا احتجاج بن گئے تھے۔ ایک وجہ تو سب کو نظر آرہی تھی۔ وہ یہ کہ ان کی چھانٹی کی جا رہی تھی لیکن ایک وجہ اور بھی تھی کہ وہ آگ بگولہ ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے پاس ان کے رشتہ دار، دوست اور دوسرے شہری بھی ازراہ ہمدردی آتے رہتے تھے۔ ان میں حسن بن صباح کے تخریب کار بھی شامل ہوتے تھے جن کی اصل حقیقت سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ ان فوجیوں کو خوب بھڑکاتے اور ان میں طرح طرح کی افواہیں پھیلاتے تھے۔

ان ہی خفیہ تحریب کاروں نے فارغ کئے جانے والے فوجیوں میں یہ افواہ پھیلا دی کہ جن فوجیوں کو فوج میں ہی رکھا جا رہا ہے وہ کہتے پھرتے ہیں کہ جنہیں نکالا گیا ہے وہ بزدل اور بد اخلاق ہیں اور ان میں ایسے آدمی بھی ہیں جو چٹھی پر جاتے ہیں تو راہزنی اور ڈکیتی کی وارداتیں کرتے ہیں۔ یہ افواہ خیموں کی ساری بستی میں پھیل گئی اور یہ تمام فوجی اتنے مشتعل ہوئے کہ ان کے پاس ہتھیار ہوتے تو فوج پر حملہ کر دیتے۔

سپہ سالار ابو جعفر حجازی تو بلا شک و شبہ خوشامدی آدمی تھا اور وہ سلطان کا ہر ناجائز حکم بھی ماننے کو تیار رہتا تھا۔ نکلے جانے والے فوجیوں کا کوئی ہمدرد تھا تو وہ نائب سپہ سالار اوریزی تھا۔ اُس نے سلطان برکیارق کو برملا کہہ دیا تھا کہ وہ فوج کی چھانٹی کے حق میں نہیں ہے۔ اس کا رویہ اب یہ ہو گیا تھا کہ سپہ سالار حجازی کی بات سن لیتا لیکن اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ اوریزی خیموں میں گیا تو وہاں رہنے والے سابق فوجی اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ غصے اور عتاب سے وہ پٹھے جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ایک تو انہیں بے گناہ اور بلا وجہ فوج سے نکالا جا رہا ہے اور دوسرے یہ کہ سارے شہر میں مشہور کر دیا گیا ہے کہ انہیں اس لئے نکالا جا رہا ہے کہ یہ بزدل اور بد معاش ہیں۔ اوریزی نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ لوگ بہت ہی مشتعل تھے۔ اوریزی نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ سپہ سالار حجازی کے ساتھ بات کرے گا اور ابھی وہ ٹھنڈے رہیں۔

اس نے وہیں سے جا کر سپہ سالار حجازی کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ”اوریزی بھائی!“ — سپہ سالار حجازی نے اصل بات سمجھنے کی بجائے یوں کہا — ”میں جانتا ہوں کہ تم اس کے حق میں نہیں کہ فوج کم کی جائے۔ تمہاری موجودگی میں سلطان نے حکم دیا تھا کہ فوج کی نفری آدمی کر دو۔ میں حیران ہوں کہ تم مجھ پر اور اس نفری پر جسے ہم فوج میں ہی رکھ رہے ہیں ایسے بے بنیاد الزام کیوں عائد کر رہے ہو۔“

”محترم سپہ سالار!“ — نائب سپہ سالار اوریزی نے کہا — ”آپ سلطان کو ضرور خوش کریں لیکن اپنی عقل پر ایسا پردہ بھی نہ ڈالیں کہ کسی اچھی بُری بات پر آپ غور بھی نہ کر سکیں۔ میں الزام عائد نہیں کر رہا۔ میں آپ کو خبردار کرنے آیا ہوں کہ ہمارے دشمن خیموں میں بھیجے جانے والے فوجیوں میں افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جنہیں آپ فوج میں رکھ رہے ہیں انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی۔ میں اس

فوج کا سالار ہوں اور میرے ذاتی خفیہ ذرائع بھی ہیں۔ ان سے مجھے سب کچھ معلوم ہوتا رہتا ہے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ باطنی تخریب کار ہیں جو فوج کے ان دونوں دھڑوں کو آپس میں لڑانے کے لئے وجوہات پیدا کر رہے ہیں۔“

”تو پھر یہ کام تم خود کیوں نہیں کرتے!“ — سپہ سالار حجازی نے کہا — ”انہیں بتاؤ کہ یہ افواہ ہے اس پر یقین نہ کریں لیکن اوریزی بھائی! یہ کوئی افواہ نہیں۔ یہ خود اپنے پاس سے باتیں گھڑ رہے ہیں کیونکہ انہیں فوج سے نکالا جا رہا ہے۔ اب میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ یہ لوگ جنہیں میں نے فوج سے الگ کر دیا ہے، جو ابی کارروائی کی دھمکی دے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ان لوگوں کو بھی فوج میں رہنے کے کھل نہیں چھوڑیں گے جنہیں رکھا جا رہا ہے۔“

نائب سپہ سالار اوریزی نے سپہ سالار حجازی کو سمجھانے کی بہت ہی کوشش کی کہ یہ افواہ بھی دشمن کی اڑائی ہوئی ہے۔ حقیقتاً ”خیموں میں رہنے والوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ سپہ سالار حجازی نے اپنے نائب اوریزی کی بات سمجھنے کی بجائے اس پر طنز کی اور اس پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ یہ ساری باتیں خود گھڑ رہا ہے۔

حسن بن صباح کے باطنیوں کا پروپیگنڈا اور افواہ بازی پورا پورا کام کر رہی تھی۔ یہی افواہیں شہریوں میں بھی پھیلائی جا رہی تھیں جس کا نتیجہ یا اثرات یوں سامنے آنے لگے کہ شہری بھی دو حصوں میں بٹنے لگے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب حکمران طوائف الملوکی شروع کر دیتے ہیں تو خوشامد کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ انتظامی امور خوشامد پرستی اور مفاد پرستی کی نظر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں دشمن بلا خوف و خطر اپنی تخریبی کارروائیاں کرتا ہے۔ یہ فضا سلطنت سلجوقیہ کے دارالحکومت میں پیدا ہو گئی تھی جو باطنیوں نے پیدا کی تھی۔



ایک دو دنوں بعد ایک حادثہ ہو گیا۔ ایک رات ایک فوجی عہدے دار اپنے رہائشی کمرے میں قتل ہو گیا۔ وہ اُس فوج میں شامل تھا جسے رکھا جا رہا تھا۔ صبح اسے دیکھا گیا۔ اس کی لاش فرش پر پڑی تھی۔ اس کے پیٹ میں اور سینے میں خنجر مارے گئے تھے۔ اس کے بستر پر بھی خون تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے سوتے میں خنجر مارے گئے اور وہ تڑپتے ہوئے فرش پر گر گیا اور اس کے بعد اس کی موت واقع ہوئی۔

تمام فوج میں یہ خبر پھیل گئی کہ فلاں عہدے دار کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس خبر کے ساتھ یہ افواہ بھی پھیلتی گئی کہ اسے اُن فوجیوں میں سے کسی نے قتل کیا ہے جنہیں فوج میں سے نکالا جا رہا ہے۔ یہ افواہ بھی پھیلائی گئی کہ نکالے جانے والے فوجی کہتے ہیں کہ وہ اب اسی طرح قتل کی وارداتیں کرتے رہیں گے۔ ان افواہوں میں تاثر یہ پیدا کیا گیا تھا کہ نکالے جانے والے فوجیوں کو رکھے جانے والے فوجیوں نے بزدل اور بد اخلاق کہا ہے اسی لئے نکالے گئے فوجیوں نے اپنی توہین کا انتقام لیا ہے۔ اس طرح فوج میں اچھی خاصی کشیدگی پیدا ہو گئی۔ بعض فوجیوں نے یہ بھی کہا کہ وہ نکالے جانے والوں کے ساتھ یہی سلوک کریں گے اور ان کی لاشیں ان کے گھروں تک پہنچیں گی۔

کسی فوجی کا یوں قتل ہو جانا بڑا ہی عجیب واقعہ تھا۔ ایسا واقعہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ سپہ سالار ابو جعفر حجازی اپنے نائب سپہ سالار اور یزی کو ساتھ لے کر سلطان برکیارق کے ہاں چلا گیا۔ برکیارق اسی وقت جاگا تھا۔ روزینہ اُسے اتنی جلدی بستر سے نہیں نکلنے دیتی تھی جتنا جلدی سلطان ملک شاہ انہیں اٹھا دیا کرتا تھا۔

برکیارق کو اطلاع دی گئی کہ دونوں سپہ سالار آئے ہیں تو روزینہ باہر آئی اور ان سے پوچھا کہ وہ اتنی جلدی کیوں آئے ہیں؟

”ہم اتنی جلدی آنے کی معافی چاہتے ہیں“ — سپہ سالار حجازی نے غلاموں کے سے لہجے میں کہا — ”ایک عہدے دار قتل ہو گیا ہے۔ اس کی اطلاع سلطان محترم کو اپنی ضروری ہے اور ان سے حکم لیتا ہے۔“

روزینہ اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی اور دونوں سپہ سالاروں کو اندر سونے کے کمرے میں ہی لے گئی۔ سلطان برکیارق ابھی پلنگ پر ہی نیم دراز تھا۔

”کون بد بخت قتل ہو گیا ہے؟“ — برکیارق نے مخمور سی آواز میں پوچھا۔

”ہمارا ایک عہدے دار تھا سلطان محترم!“ — سپہ سالار حجازی نے جواب دیا اور بیان کیا کہ وہ کس طرح مردہ پایا گیا، لاش کس حالت میں تھی اور لاش فرش پر پڑی تھی۔

”تو پھر قاتل کو ڈھونڈو“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”وہ مل جائے تو اس کا سر اُڑادو۔“

”سلطان عالی مقام!“ — سپہ سالار حجازی نے کہا — ”قاتل اُن خیموں میں ہے جن میں نکالے جانے والے فوجیوں کو رکھا گیا ہے۔“

”سلطان محترم!“ — نائب سالار اور یزی بولا ”یہ باغیوں کی دہشت گردی ہے اور اگر مجھے اجازت دیں تو میں بیان کروں کہ اس وقت دونوں دھڑوں کے فوجیوں کے درمیان کس قسم کی کشیدگی پیدا کر دی گئی ہے اور اسی طرح شہر کے لوگ بھی دو دھڑوں میں بٹتے جا رہے ہیں۔“

سپہ سالار حجازی نے اور یزی کی مخالفت شروع کر دی۔ سلطان برکیارق کے چہرے پر اکتاہٹ کے تاثرات نمایاں ہوئے جا رہے تھے۔ وہ تو جیسے کوئی بات بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ نائب سپہ سالار اور یزی نے سپہ سالار حجازی کو ٹوک کر اپنی بات شروع کر دی۔ روزینہ پاس بیٹھی سن رہی تھی۔

اس باطنی حسینہ نے سلطان برکیارق کو ذہنی طور پر اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی اہلیت سے ہی محروم ہو گیا تھا۔ یہ اثرات تھے اُس نشے کے جو وہ اُسے پلاتی رہتی تھی اور وہ خود بھی اس کے لئے ایک نشہ بن گئی تھی۔ اس کا ذہن مکمل طور پر روزینہ کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ سوچتی روزینہ تھی اور بولتا سلطان برکیارق تھا۔

”سلطان!“ — روزینہ نے کہا — ”ان دونوں کی باتیں آپ کو کسی فیصلے تک نہیں پہنچنے دیں گی۔ دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ قاتل کو پکڑیں جو ممکن نظر نہیں آتا۔ دوسرا اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُن فوجیوں میں سے جنہیں نکالا جا رہا ہے، کوئی دو آدمی پکڑ لئے جائیں اور فوج کے دونوں دھڑوں کو آمنے سامنے کھڑا کر کے ان کے درمیان ان دونوں آدمیوں کے سراڑا دیئے جائیں۔ اعلان کیا جائے کہ ان دونوں نے اس عہدے دار کو قتل کیا ہے۔ اس سے یہ ہو گا کہ آئندہ کوئی اتنی سنگین واردات کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اگر واقعی اس فوج کے ان دھڑوں میں کشیدگی اور دشمنی پیدا ہو گئی ہے تو وہ اسی طرح ختم کی جاسکتی ہے۔ اگر خیموں میں رہنے والا کوئی فوجی قتل ہو جائے تو دو فوجی اُدھر سے پکڑ کر انہیں سب کے سامنے جلاد سے قتل کروادیا جائے۔“

”سن لیا تم دونوں نے!“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”جاؤ اور اس حکم پر عمل کرو۔“

”بہت اچھا فیصلہ ہے سلطان محترم!“ — سپہ سالار حجازی نے کہا — ”میں آج

دو آدمی پکڑ کر قید خانے میں بند کروں گا اور کل صبح دونوں کو قتل کروادیا جائے گا۔“

نائب سپہ سالار اور یزی نے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہاں کوئی اس کی سننے

والا نہیں اور تباہی سلطنتِ سلجوقیہ کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔
دونوں سپہ سالار وہاں سے آگئے۔



اگلے روز سپہ سالار ابو جعفر حجازی خیموں کی طرف گیا۔ کچھ سپاہی جنہیں فوج سے نکالا جا رہا تھا ہا ہر بیٹھے تھے۔ سپہ سالار حجازی کے ساتھ بارہ چودہ فوجی تھے جو برہمچیوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔ سپہ سالار حجازی نے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔
”انہیں پکڑ کر لے چلو“ — اُس نے حکم دیا — ”یہی ہیں اس کے قاتل!“
مسلح فوجی ان دو آدمیوں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں گھسیٹتے دھکیلتے اپنے ساتھ لے گئے۔

یہ خبر خیموں کی ساری بستی میں پھیل گئی۔ پندرہ سولہ ہزار سابق فوجیوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ سب جانتے تھے کہ جنہیں پکڑ کر لے گئے ہیں، وہ بڑے ہی خوش اخلاق اور شریف سپاہی تھے۔ وہ سب اکٹھے ہو گئے اور شور شرابا کرنے لگے لیکن ان کی سننے والا سوائے نائب سالار اور یزی کے اور کوئی نہ تھا۔

سپہ سالار حجازی کے حکم سے ان دونوں آدمیوں کو قید خانے میں بند کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ ان پندرہ سولہ ہزار فوجیوں میں دو سالار بھی تھے جنہیں فوج سے نکال جا رہا تھا۔ وہ دو تین عمدے داروں کو ساتھ لے کر نائب سپہ سالار اور یزی کے ہاں چلے گئے۔ اسے بتایا کہ سپہ سالار نے دو آدمیوں کو یہ کہہ کر پکڑ لیا ہے کہ مقتول عمدے دار کو انہوں نے قتل کیا ہے۔ اور یزی نے یہ خبر سنی تو وہ بھڑک اٹھا۔ وہ اُسی وقت سپہ سالار حجازی کے پاس چلا گیا۔

”میں جانتا ہوں تم کیوں آئے ہو“ — سپہ سالار حجازی نے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں کہا — ”تم کہو گے کہ دو بے گناہوں کو کیوں پکڑ لیا ہے۔ اور یزی بھائی! تمہارے سامنے سلطان نے حکم دیا تھا۔“

”اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو ایسا ظالمانہ حکم کبھی نہ مانتا“ — نائب سالار اور یزی نے کہا — ”محترم حجازی! آپ کس کے غلام بن گئے ہیں؟ آپ کیوں نہیں سمجھتے کہ طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے؟ سلطان کی طاقت کو ہم احتراماً مانتے ہیں۔ یہ اسلام کا حکم ہے کہ اپنے امیر کی اطاعت کرو اور اسلام کا حکم یہ بھی ہے کہ امیر کوئی غلط حکم خصوصاً“

اس قسم کا ظلمانہ حکم دیتا ہے تو وہ حکم نہ مانو۔“

”خدا کے لئے اور یزی بھائی!“ — سپہ سالار حجازی نے بے تکلف دوستوں جیسے لہجے میں کہا — ”اگر ہم ان دو ادنیٰ سپاہیوں کے سر نہیں کاٹیں گے تو ہم دونوں کے سر کاٹ جائیں گے۔“

”میں ان ادنیٰ سپاہیوں کی خاطر اپنا سر کٹوانے کے لئے تیار ہوں۔“ — اور یزی نے کہا — ”میرا خیال ہے کہ میں آپ کے پاس آکر جھک مار رہا ہوں۔ مجھے یہ بتادیں کہ آپ واقعی ان دو بے گناہ سپاہیوں کے سر کاٹ دیں گے؟“

”تو اور کس لئے انہیں قید خانے میں بھیجا ہے؟“ — سپہ سالار حجازی نے جواب دیا — ”کل سب کے سامنے ان کی گردنوں پر تلواریں چل جائیں گی۔“

”میں آپ کو ایک مشورہ دیتا ہوں۔“ — نائب سپہ سالار اور یزی نے کہا — ”یہ آخری بات ہوگی جو میں آپ سے کروں گا۔ اس کے بعد میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ حالات کیا کروٹ بدلیں گے۔ آپ یوں کریں کہ کل ان دونوں سپاہیوں کو قید خانے سے نکال کر ادھر سے ہی انہیں گھروں کو بھیج دیں۔ فوج سے تو وہ نکل ہی دیئے گئے ہیں۔ پھر میں آپ کے ساتھ سلطان تک چلوں گا اور کہوں گا کہ ہم دونوں کی موجودگی میں قید خانے میں ان کے سر کاٹ دیئے گئے ہیں اور انہیں دفن بھی کر دیا گیا ہے۔“

”پھر جانتے ہو سلطان کیا کہے گا؟“ — سپہ سالار حجازی نے کہا — ”وہ کہے گا کہ میرے حکم کے مطابق ان کی گردنیں سرعام فوج کے دونوں دھڑوں کے سامنے کیوں نہیں کلنی گئیں؟“

”اس کا جواب میں دوں گا۔“ — نائب سپہ سالار اور یزی نے کہا — ”میں کہوں گا کہ سب کے سامنے انہیں قتل کیا جاتا تو فوج کے دونوں دھڑوں میں فساد کا خطرہ تھا کیونکہ سب جانتے تھے کہ یہ دونوں سپاہی بے گناہ ہیں۔“

”اور یزی بھائی!“ — سپہ سالار حجازی نے کہا — ”حکم سلطان کا نہیں، سلطان کی بیگم کا ہے۔ وہ قید خانے سے معلوم کروالے گی کہ اس کے حکم کی واقعی تعمیل ہوئی ہے یا نہیں۔ تم خاموش رہو تو ہم دونوں کے لئے بہتر ہے۔“

اور یزی خاموش رہا اور سر جھکا کر گہری سوچ میں کھو گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ ایک پتھر سے ہمکلام ہے۔

”انہیں کل کس وقت اور کہاں سزائے موت دی جائے گی؟“ — نائب سپہ سالار اوریزی نے بدلے ہوئے سے لہجے میں پوچھا اور ذرا سوچ کر کہا — ”مجھے آپ کا ساتھ دینا پڑے گا ورنہ آپ مارے جائیں گے!“

”زندہ باد اوریزی!“ — سپہ سالار حجازی نے خوش ہوتے ہوئے اوریزی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا — ”مجھے تم سے یہی توقع تھی۔ میں تمہارے اس تعاون کے لئے ساری عمر ممنون رہوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے ہاتھوں کیا گناہ کر دیا جا رہا ہے۔“

”اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“ — اوریزی نے کہا — ”آپ مجبور ہیں۔ اللہ آپ کو معاف کر دے گا۔۔۔۔۔ انہیں کون سی جگہ یہ سزا دی جائے؟“

”وقت اور جگہ تم خود مقرر کر لو“ — سپہ سالار حجازی نے اوریزی کو خوش کرنے کے لئے کہا — ”تم جو جگہ مقرر کرو گے میں اسی کو مان لوں گا۔“

اوریزی اٹھا، سپہ سالار حجازی سے ہاتھ ملایا اور وہاں سے اُگیا۔



اگلے روز کے سورج نے طلوع ہوتے ہی یہ ظالمانہ منظر دیکھا کہ ایک طرف نکالی جانے فوج کے پندرہ سولہ ہزار آدمی کھڑے تھے۔ ان کے سامنے خاصے فاصلے پر وہ فوج کھڑی تھی جسے رکھا جا رہا تھا۔ ان کے درمیان دو سپاہی کھڑے تھے جن کے ہاتھ پٹنوں کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ دونوں کے قریب ایک ایک آدمی چوڑے پھل والی تلواریں لئے کھڑے تھے۔ اس جگہ درختوں کی بہتات تھی۔ بالکل قریب بڑی قسم کے دو گھنے درخت تھے۔ منظر خاصا خوبصورت تھا لیکن خوبصورتی میں موت کی سانس صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ان دو سپاہیوں میں جہنمیں کچھ دیر بعد سزائے موت دینی تھی، ایک نوجوان تھا اور دوسرا ادھیڑ عمر۔ یہ بد نصیب اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ کچھ دور شہر کے لوگ کھڑے تھے۔ یہ خبر ان تک بھی پہنچ گئی تھی۔ ان لوگوں میں اس ادھیڑ عمر سپاہی کی بیوی اور چھوٹے چھوٹے دو بچے بھی کھڑے تھے۔ بیوی بھی رو رہی تھی اور بچے بھی۔ بیوی نے ایک بار سپہ سالار حجازی تک رحم کے لئے پہنچنے کی کوشش کی تھی لیکن فوجیوں نے اُسے دھکے دے کر پیچھے کر دیا تھا۔ شہریوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

سپہ سالار حجازی گھوڑے پر سوار وہاں آیا اور دونوں بے گناہ سپاہیوں کے پاس گھوڑا

روک کر اعلان کیا کہ فوج کا جو عہدیدار قتل ہوا ہے، اُس کے قاتل یہ دونوں ہیں اور مصدقہ شہادت ملی ہے کہ قاتل یہی ہیں۔

”یہ سپہ سالار جھوٹ بول رہا ہے“ — اوجیز عمر سپاہی نے چلا کر کہا — ”اس سے پوچھو یہ کون سے قاضی کا فیصلہ ہے۔“

ایک جلاؤ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کر دیا۔

سپہ سالار حجازی نے اپنا اعلان یہ کہہ کر مکمل کیا کہ ان دونوں کو تم سب کے سامنے سزائے موت دی جا رہی ہے۔

سپہ سالار ایک طرف چلا گیا۔ دونوں جلاؤں نے دونوں فوجیوں کو دو زانو بٹھادیا اور ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر سر نیچے کر دیئے۔ پھر دونوں نے اپنی تلواریں اوپر اٹھائیں۔ دو بے گناہوں کی زندگی اور موت کے درمیان صرف دو یا تین لمحے رہ گئے تھے۔ تلواریں کا ایک ایک وار ہی کافی تھا۔

تلواریں اور اوپر اٹھیں تو تماشا یوں کے اتنے بڑے ہجوم پر سناٹا طاری ہو گیا جیسے وہاں کوئی انسان موجود ہی نہ ہو۔ تلواریں اور اوپر اٹھیں۔ اب! نہیں زناتے سے نیچے آتا تھا۔ زناتے تو سنائی دیئے لیکن وہ تلواریں کے نہیں بلکہ دو تیروں کے تھے۔ ایک تیر ایک جلاؤ کے سینے میں اور دو سرے جلاؤ کے سینے میں اتر گیا تھا۔.... دو بیگناہوں کی جانیں لینے والے اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔

”یہ تیر کس نے چلائے ہیں؟“ — سپہ سالار حجازی نے ایسی آواز میں کہا جس میں گھبراہٹ بھی تھی غصہ بھی — ”فورا“ پکڑو انہیں!“

فوج میں کچھ حرکت ہوئی۔ نائب سپہ سالار اور یزی گھوڑا دوڑاتا آیا اور بیگناہ سپاہیوں اور مرے ہوئے جلاؤں کے پاس آ رکا۔

”خبردار!“ — اور یزی نے بلند آواز سے کہا — ”کوئی حرکت نہ ہو۔ اللہ نے انصاف کر دیا ہے۔ یہ دونوں بیگناہ ہیں۔ سپہ سالار سے پوچھو انہیں کون سے قاضی نے سزائے موت دی ہے اور کس کس کی شہادت پر سزا دی ہے؟..... کیا تم مسلمان ہو؟ کیا اسلام اجازت دیتا ہے کہ جسے چاہو پکڑ کر اس پر قتل کا الزام لگا دو اور اس کی گردن مار دو؟ کیا تم سب کافر ہو کر مرنا چاہتے ہو؟“

ہر طرف خاموشی طاری رہی۔ اور یزی نے ان فوجیوں کی طرف دیکھا جنہیں فوج

سے نکلا جا رہا تھا۔

”کچھ آدمی آگے آؤ“ — اس نے کہا — ”اپنے ساتھیوں کو لے جاؤ“۔

چار آدمی دوڑے آئے اور وہ اپنے بیگناہ ساتھیوں کے ہاتھ کھول کر انہیں ساتھ لے گئے۔ اُدھر سے اُدھڑ عمر سپاہی کی بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ دوڑتی آئی۔ باپ نے اپنے دونوں بچوں کو اٹھالیا اور انہیں پیار کرنے لگا۔

فوج میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ سپہ سالار ابو جعفر حجازی وہاں سے چلا گیا۔ وہ سلطان برکیارق کو بتانے جا رہا تھا کہ اس کے حکم کی تعمیل نہیں ہو سکی اور اس کا ذمہ دار اوریزی ہے۔

سپہ سالار حجازی کو تو معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ دو تیر کہاں سے آئے تھے۔ یہ اوریزی کا انتظام تھا۔ ان بیگناہ سپاہیوں کو سزا دینے کی جگہ کا اُسی نے انتخاب کیا تھا۔ وہاں قریب ہی بڑے دو گھنے درخت تھے۔ ان کے چوڑے پتوں میں بیٹھا ہوا آدمی کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ اوریزی نے رات کو دو تجربہ کار تیر انداز تیار کر دیئے تھے اور انہیں یہاں لا کر اچھی طرح بتا دیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ دونوں تیر انداز صبح طلوع ہونے سے کچھ دیر پہلے ایک درخت پر اور دوسرا دوسرے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔

سپہ سالار حجازی جا چکا تھا۔ فوج حکم کی منتظر کھڑی تھی۔ نائب سالار اوریزی نے فوج کو بارکوں میں چلے جانے کا حکم دیا اور خود اس انتظار میں اپنے ٹھکانے پر چلا گیا کہ ابھی سلطان کا بلاوا آئے گا۔

اوریزی کی یہ کارروائی بڑا ہی سنگین جرم تھا۔ سلطان نے دو سپاہیوں کو سزائے سالار موت دی تھی لیکن سالار اوریزی نے جلاؤں کو مروادیا اور سپاہیوں کو رہا کرا لیا۔ اس نے دوسرا جرم یہ کیا کہ سپہ سالار ابو جعفر حجازی نے یہ حکم دیا ان تیر اندازوں کو ڈھونڈو اور پکڑو لیکن سالار اوریزی نے اس کے قریب آکر للکارا اور کہا، خبردار کوئی آگے آنے کی جرات نہ کرے۔ یہ حکم عدولی نہیں بلکہ غداری تھی۔

یہ الگ بات ہے کہ سپہ سالار حجازی کو سالار اوریزی کی یہ باغیانہ کارروائی اچھی لگی تھی یا بُری لگی تھی، اسے دراصل خوشی اس بات پر ہوئی تھی کہ اسے سلطان برکیارق کے پاس جانے کا ایک بڑا ہی معقول بہانہ مل گیا تھا اور اس کے ساتھ سالار اوریزی کو سالاری سے معزول کرانے کا موقع بھی مل گیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ سلطان سالار اوریزی کو صرف معزول نہیں کرے گا بلکہ اسے کوئی اور سزا بھی دے گا..... پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سپہ سالار حجازی سلطان برکیارق کا خوشامدی تھا اور وہ سلطان کے آگے زر خرید غلاموں کی طرح حرکتیں کر کے بہت خوش ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں سالار اوریزی خوددار اور بلاوقار سالار تھا جس کی اپنی ایک آزاد شخصیت تھی۔ وہ سلطان کا ہر حکم صرف اس لئے نہیں مانتا تھا کہ یہ سلطان کا حکم ہے بلکہ وہ دیکھتا تھا فوجی نقطہ نگاہ سے یہ حکم سلطنت کے لئے نقصان دہ تو نہیں! یہ سالار اوریزی کا ایمان تھا لیکن سپہ سالار حجازی اسے اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتا تھا۔

سپہ سالاری حجازی وہاں سے سلطان برکیارق کے ہاں گیا اور اپنے آنے کی اطلاع دی۔ سلطان نے اسے اُسی وقت اندر بلا لیا۔ وہ اندر گیا اور رکوع میں جا کر سلطان کو سلام

کیا۔

”کام کر آئے حجازی؟“ — سلطان برکیارق نے پوچھا — ”دیکھنے والوں پر دہشت تو طاری ہو گئی ہوگی..... اب کوئی کسی کو قتل نہیں کرے گا۔“

”گستاخی مُعاف سلطان محترم!“ — سپہ سالار حجازی نے سلطان کے اشارے پر بیٹھے ہوئے کہا — ”آپ کے حکم کی تعمیل نہیں ہو سکی۔“

”کیوں؟“ — سلطان نے بدک کر پوچھا — ”حکم کی تعمیل کیوں نہیں ہو سکی؟“

”دونوں جلاوطنیوں سے مارے گئے ہیں“ — سپہ سالار حجازی نے کہا۔

”کس نے مارے ہیں؟“ — سلطان برکیارق نے پوچھا — ”کون تھے وہ تیر انداز؟ کیا انہیں آپ نے پکڑ لیا ہے؟“

سپہ سالار حجازی نے سلطان کو پورا واقعہ تفصیل سے سنا دیا اور سالار اور یزی کے خلاف بغاوت کا جرم ثابت کرنے کے لئے اور بھی بہت کچھ کہا۔

”سلطان عالی مقام!“ — حجازی نے کہا — ”وہ تو کبھی کامیرے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ میں سلطان کا یہ حکم نہ مانوں کہ فوج کی آدمی نفری کو گھر بھیج دیا جائے۔ یہ دونوں تیر انداز اسی کے تھے۔“

”یہ جرات؟“ — سلطان برکیارق نے لال پیلا ہوتے ہوئے کہا — ”یہ مجال؟.. ... اسے قید خانے کے تہ خانے کی اُس کوٹھڑی میں بند کر دو جس میں سب سے زیادہ کیرے مکوڑے ہوتے ہیں۔“

”اس نے سلطان کی توہین کی ہے“ — روزینہ نے کہا — ”اسے عبرت کا نشان بنا دو..... ہم یہاں بلا کر اسے سزا دلائیں گے۔ اسے زنجیروں میں باندھ کر یہاں سے بھیجیں گے۔ آپ اسے بازار میں سے گذارنا اور کسی چوک میں کھڑا کر کے لوگوں کو اکٹھا کر لینا اور اعلان کرنا کہ یہ سلطان کا باغی اور غدار ہے۔ اسے ابھی بلایا جائے۔“

”ہاں“ اسے ابھی بلایا جائے — سلطان برکیارق نے اپنی بیوی کا حکم دہرایا۔



جس وقت سپہ سالار حجازی سلطان برکیارق کی طرف چلا تھا اُس وقت نائب سپہ سالار اور یزی اپنے ٹھکانے کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نے فوج کو واپس بارکوں میں بھیج دیا تھا۔ وہ جب وہاں سے چلا تو اس کے ساتھ چار پانچ آدمی اُس نفری میں سے تھے جسے فوج

میں سے نکل جانے کا حکم ملا تھا اور وہ ابھی تک خیموں میں رہتے تھے۔

”میرے رفیقو!“ — سالار اور یزی نے ان چار پانچ آدمیوں سے کہا — ”توقع تو یہ ہے کہ مجھے جلاؤ کے حوالے کیا جائے گا یا عمر بھر کے لئے قید خانے میں پھینک دیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں مجھے پہلے قید خانے میں لے جائیں گے۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ تم نے کیا کرنا ہے۔ میں تمہیں یہ بھی بتاؤں گا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا تو تم نے ان سابق فوجیوں کو اور شہر کے ہم خیال لوگوں کو اپنے ساتھ کس طرح ملانا ہے۔ ہم بہت سا کام تو کر ہی چکے ہیں لیکن میں ڈرتا ہوں کہ تم میری قیادت سے محروم ہو جاؤ گے تو حوصلہ ہی نہ ہار بیٹھو۔“

”ہم آپ کی قیادت سے محروم نہیں رہیں گے“ — ایک ادھیڑ عمر فوجی نے کہا — ”ہمیں پوری امید ہے کہ ہم آپ کو جلاؤ تک پہنچنے ہی نہیں دیں گے۔“

سالار اور یزی نے انہیں کچھ ہدایات دینی شروع کر دیں۔

”میں راز کی ایک بات تمہیں آج بتا دیتا ہوں“ — سالار اور یزی نے کہا —

”سلطان ملک شاہ مرحوم کا دو سرا بیٹا محمد اور اس سے چھوٹا بھائی ہمارے ساتھ ہیں۔ اب میری گرفتاری کے بعد جو کچھ بھی ہو گا اس کی اطلاع محمد رے کے امیر ابو مسلم رازی تک پہنچائے گا۔ میں نہ ہوا تو ابو مسلم رازی تمہارا سالار اور قائد ہو گا۔“

سالار اور یزی اپنی ہدایات مکمل کر چکا تھا کہ اطلاع ملی کہ سلطان کا بلاوا آیا ہے۔

”میں جاتا ہوں“ — سالار اور یزی نے اپنے آدمیوں سے کہا — ”گھوڑے تیار کرو اور دو آدمی میرے محافظ بن کر میرے ساتھ چلو۔ سالار اپنے محافظ ساتھ لے جاسکتا ہے۔ مجھے اب سزا سنائی جائے گی جس کا دونوں محافظوں کو وہیں پتہ چل جائے گا۔ وہ وہاں سے کھسک آئیں گے اور یہاں بتائیں گے کہ مجھے کیا سزا سنائی گئی ہے، پھر تم لوگوں نے اپنی کارروائی کرنی ہے..... میں جا رہا ہوں، اللہ تمہارا مددگار ہے۔“

سالار اور یزی اپنے ان آدمیوں سے ہاتھ ملا کر باہر نکلا۔ دو محافظ تیار ہو چکے تھے۔ سالار اور یزی گھوڑے پر سوار ہوا۔ جب وہ حویلی کے بڑے دروازے کے سامنے سے گزرنے لگا تو اس کی بیوی اور ایک جوان بیٹی اس کے راستے میں آگئیں۔ بیٹی نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

”نہ جائیں!“ — بیٹی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — ”ہمیں پتہ چل چکا ہے کہ

آپ کیا کر آئے ہیں۔ سلطان آپ کی جان بخشی نہیں کرے گا۔ یہیں سے کسی طرف بھاگ جائیں۔ ہم آپ کے پیچھے پہنچ جائیں گی۔“

”میں آپ کو یہاں سے نکلا دیتی ہوں“ — بیوی نے کہا — ”سلطان کے سامنے نہ جائیں۔ وہ آپ کی وفا کی کوئی قیمت نہیں دے گا۔ وہ آپ کی گردن کٹا دے گا۔“

بیٹی رو رو کر اسے روک رہی تھی لیکن اوریزی مسکرا رہا تھا۔

”پریشان نہ ہو بیٹی!“ — سالار اوریزی نے بڑے پیار سے کہا — ”میں جو کچھ کر رہا ہوں، مجھے کرنے دو“ — وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوا — ”میں جانتا ہوں تم بڑے ہی حوصلے اور جرات والی عورت ہو۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، سوچ سمجھ کر اور اللہ پر بھروسہ رکھ کر کر رہا ہوں۔ اندر جاؤ اور میرے لئے دعا کرو۔“

ماں بیٹی روتی رہیں، اسے روکتی رہیں لیکن سالار اوریزی انہیں خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ دو محافظ اس کے پیچھے پیچھے گھوڑوں پر سوار جا رہے تھے۔ بیٹی اور اس کی ماں نے ہاتھ پھیلا کر اور آسمان کی طرف دیکھ کر اس کی سلامتی کی دعائیں مانگیں۔ ان کی آہوں اور ان کے آنسوؤں میں بھی دعائیں تھیں۔

وہ سلطان کے محل میں جا پہنچا اور اندر اطلاع پہنچائی۔ اسے فوراً بلا لیا گیا۔



سالار اوریزی جب سلطان برکیارق کے سامنے گیا تو جھکا نہیں بلکہ مسلمانوں کی طرح السلام علیکم کہا اور پوچھا کہ اس کے لئے کیا حکم ہے۔

سلطان نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا اور اسے بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ تم نے دونوں جلاؤں کو تیر اندازوں سے مروا دیا ہے؟“ — سلطان نے اس سے پوچھا۔

”ہاں سلطان محترم!“ — سالار اوریزی نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا —

”جلاؤں کو میں نے مروا دیا ہے۔“

”کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ ان دو سپاہیوں کو میرے حکم سے سزائے موت دی جا رہی تھی؟“ — سلطان برکیارق نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”معلوم تھا سلطان محترم!“ — سالار اوریزی نے جواب دیا۔

”پھر تم نے میرے حکم کی تعمیل میں یہ رکاوٹ کیوں ڈالی؟“ — سلطان نے گرج

کر پوچھا۔

”اس لئے کہ کسی کو سزائے موت دینے کا جو حکم اللہ نے دیا ہے، آپ نے اس حکم کے تقاضے پورے نہیں کئے تھے“..... سالار اور یزی نے کہا — ”آپ ان دو موصوم اور بے گناہ سپاہیوں کو نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کو قتل کروا رہے تھے۔“

”یہاں میرا حکم چلتا ہے“ — سلطان برکیارق نے اپنی ران پر بڑے زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

”اور میں بحیثیت ایک مسلمان صرف اللہ کا حکم مانتا ہوں..... یہ سلطنت آپ کی نہیں، یہ اللہ کی دی ہوئی سلطنت ہے۔ اسلامی سلطنت میں صرف اسلامی قانون چلے گا۔ آپ مجھے حکم دیں کہ اپنے پیٹ میں تلوار گھونپ دو کہ اس سے سلطنت کو فائدہ پہنچے گا تو میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔“

”تم زبان دراز ہو“ — روزینہ بولی — ”اس سلطنت میں کوئی زبان دراز نہیں رہ سکتا۔ تم سالاری کے قاتل نہیں۔“

”محترمہ!“ — سالار اور یزی نے کہا — ”یہ اَلْمَوْتَ نہیں، یہ مَرُو ہے۔ یہ باغیوں کی نہیں مسلمانوں کی سلطنت ہے۔ یہاں حسن بن صباح کا حکم نہیں چلے گا۔“

”خاموش بد تمیز!“ — سلطان برکیارق اور زور سے گرجا..... ”میں تمہیں اس گستاخی کی ایسی سزا دوں گا کہ دیکھنے والے عبرت حاصل کریں گے۔“

”کان کھول کر سن لو سلطان!“ — سالار اور یزی نے کہا — ”میں جانتا ہوں کہ آج کا دن میری زندگی کا آخری دن ہے۔ میں صرف اللہ سے ڈرتا ہوں۔ تمہارے جلاؤ کے ہاتھوں سر کٹاؤں گا تو اللہ کے حضور سر خرو ہو جاؤں گا۔ میں صرف اللہ کے آگے جوابدہ ہوں۔“

”اس گستاخ، زبان دراز کو سالاری سے معزول کر دیں“ — روزینہ نے کہا۔

”نہیں روزینہ!“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”میں اسے صرف معزول نہیں کروں گا۔ اسے اور بھی سزا دینی ہے۔“

”مجھے سالاری تم نے نہیں، تمہارے باپ نے دی تھی“ — سالار اور یزی نے کہا — ”تم مجھ سے سالاری چھین لو گے تو بھی میں اپنی قوم کا سالار ہی رہوں گا اور اس سلطنت کی عظمت اور بقا کے لئے اپنے فرائض پورے کرتا رہوں گا..... میں اُن

شہیدوں کی روحوں کے آگے جوابدہ ہوں جن کا خون اس سلطنت کی بنیادوں میں ابھی تک تازہ ہے۔“

”میں اپنی اس سے زیادہ توہین برداشت نہیں کر سکتا“ — سلطان برکیارق نے قہر آلود آواز میں کہا — ”اور سن لو اوریزی!.....“

”یہ عورت“ — سالار اوریزی نے روزینہ کی طرف اشارہ کر کے کہا — ”یہ عورت سلطان کی سرپا توہین ہے۔ یہ آستین کا سانپ ہے“ — پھر اس نے سپہ سالار حجازی کی طرف اشارہ کر کے کہا — ”اور سلطان کی آستین میں دوسرا سانپ یہ شخص ہے۔ یہ تمہیں آنے والا وقت بتائے گا۔“

”سلطان عالی مقام!“ — سپہ سالار حجازی تڑپ کر بولا — ”اے آپ مزید توہین کی اجازت نہ دیں اور اسے سزا سنا دیں۔“

”ہاں سلطان!“ — روزینہ نے کہا — ”اے سزائے موت نہ دیں۔ عمر بھر کے لئے قید خانے میں ڈال دیں جہاں یہ گل سڑ کر مرے گا۔ مرنے سے پہلے اسے وقتاً فوقتاً“ باہر نکالیں اور بیڑیاں ڈال کر شہر کے لوگوں کے سامنے کھڑا کریں اور لوگوں کو بتایا جائے کہ یہ ہے سزا باغی اور غدار کی۔“

سلطان برکیارق نے سالار اوریزی کو یہی سزا سنادی اور کہا کہ اس کی تلوار اس سے لے لی جائے۔

سالار اوریزی نے اپنی تلوار اور نیام اتار کر سلطان کی طرف پھینک دی۔
”یہ نو تلوار سلطان!“ — سالار اوریزی نے کہا — ”میں اس وقت جہاد کے میدان میں اترا تھا جب تم ابھی ماں کا دودھ پی رہے تھے“ — اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے کہا — ”یہ ہاتھ تلوار سے کبھی خالی نہیں رہیں گے۔ جذبہ اور ایمان زندہ رہنا چاہئے۔ ان ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ خود تلوار دے گا۔“

سلطان برکیارق نے قہقہہ لگایا اور روزینہ کی طرف دیکھا۔ روزینہ بھی ہنس پڑی۔
”اس شخص کا دماغ اس کے قابو سے نکل گیا ہے“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”میں اسے اس کل کو ٹھڑی میں بھجوا رہا ہوں جہاں یہ ایک سال بھی زندہ نہیں رہے گا اور یہ کہتا ہے کہ اللہ اس کے ہاتھ میں تلوار دے گا..... اوبد قسمت انسان! تلوار اگر کبھی تمہارے پاس آئی بھی تو وہ تمہارے ہاتھ میں نہیں بلکہ جلاؤ کے ہاتھ میں ہوگی اور تمہارا

سر جھکا ہوا ہو گا..... لے جاؤ اسے۔“

”ٹھہر جاؤ“ — روزینہ نے کہا — ”ہمارے سامنے اس کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ دو اور باہر لے جا کر اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دو۔ پھر اسے گھوڑے کی پیٹھ پر نہیں بلکہ پیدل لے کر جاؤ اور اتنا آہستہ چلنا کہ لوگوں کا ہجوم تمہارے پیچھے اکٹھا ہو جائے اور پھر اسے چوک میں کھڑا کر کے لوگوں کو بتانا کہ غداری اور بغاوت کی سزا یہ ہے اور پھر اسے چوک سے فوراً آگے نہ لے جانا۔ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے دیکھیں۔“

پہ سالار حجازی دوڑتا باہر نکلا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ سلطان کے دو محافظ تھے۔ انہوں نے زنجیریں اور بیڑیاں اٹھا رکھی تھیں جو اوریزی کو ڈال دی گئیں۔

”لے جاؤ اسے“ — سلطان برکیارق نے کہا۔

”سلطان!“ — سالار اوریزی نے مسکرا کر کہا — ”میں واپس آؤں گا..... انشاء اللہ..... اُس وقت تم سلطان نہیں ہو گے۔“



سالار اوریزی کو جب باہر لایا گیا تو اس کے دونوں گھوڑوں پر محافظ ذرا دور کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اپنے سالار کو زنجیروں اور بیڑیوں میں بندھا دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ اسے قید خانے میں لے جایا جا رہا ہے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور وہاں چلے گئے۔

زنجیر کا ایک سراپہ سالار حجازی کے ہاتھ میں تھا جو اس نے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا۔ اس نے بارہ گھوڑوں پر سوار محافظ اپنے ساتھ لے لئے اور وہاں سے چل پڑا۔ آگے آگے وہ جا رہا تھا۔ اس کے گھوڑے کے ساتھ بندھا سالار اوریزی پیدل چلا جا رہا تھا اور پیچھے بارہ محافظ چل رہے تھے۔ سلطان کے محل سے نکل کر پہلے سالار حجازی اُس راستے پر ہو گیا جس راستے میں شہر کی آبادی زیادہ تھی۔ شہر کے کئی لوگ سالار اوریزی کو جانتے اور پہچانتے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ اوریزی کو زنجیروں میں بندھا لے جایا جا رہا ہے تو لوگ پہلے تو حیران ہوئے پھر پیچھے پیچھے چل پڑے۔ وہ محافظوں سے پوچھتے تھے کہ سالار اوریزی نے کیا جرم کیا ہے۔ محافظ لوگوں کو صرف یہی ایک جواب دیتے تھے کہ سالار اوریزی نے بغاوت اور غداری کی ہے۔

قید خانہ شہر سے باہر اور کچھ دور تھا۔ اس کے ارد گرد گھنا جھنگل تھا اور راستے میں تھوڑا سا علاقہ چٹانی بھی تھا۔ قید خانے تک باہر باہر سے جایا جا سکتا تھا لیکن پہلے سالار

حجازی اور یزی کو شہر میں لے گیا اور ایک ایسے چوک میں جار کا جہاں چار بازار ملتے تھے۔ کچھ تو راستے میں لوگ پیچھے پیچھے چل پڑے تھے اور زیادہ تر بازار میں آنے والے لوگ وہاں اکٹھے ہو گئے۔ سپہ سالار حجازی نے لوگوں سے کہا کہ اسے لمبی میز کی ضرورت ہے۔ ذرا سے وقت میں ایک لمبی اور مضبوط میز آگئی۔ یہ میز چوک میں رکھ کر سالار اور یزی کو اس پر کھڑا کر دیا گیا اور حجازی خود گھوڑے سے اتر کر میز پر اور یزی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اور یزی کی زنجیر اُس کے ہاتھ میں تھی۔ گھوڑا سوار محافظوں نے اپنی ترتیب اس طرح کر لی کہ دائرے میں ذرا دُور دُور کھڑے ہو گئے تاکہ لوگ آگے نہ جاسکیں۔

اگر اور یزی چور، ڈاکو یا قاتل ہوتا تو لوگ اُسے دیکھ کر ہنستے اور اس پر لعن طعن کرتے لیکن لوگ جانتے تھے کہ یہ سالار اور یزی ہے اس لئے وہ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے اور وہ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ اس سالار سے کیا جرم سرزد ہو گیا ہے۔

اسی صبح جب دو سابق فوجیوں کو سزائے موت دی جانے لگی تھی، شہر کے لوگوں کو پتہ چلا تو ایک ہجوم یہ تماشا دیکھنے پہنچ گیا تھا۔ وہ تو کوئی اور تماشا دیکھنے آئے تھے لیکن وہاں کوئی اور ہی تماشا ہو گیا۔ وہاں جلاؤ ہی مارے گئے اور لوگوں نے سالار اور یزی کو دیکھا کہ وہ گھوڑا دوڑتا مرے ہوئے جلاؤں کے پاس جا پہنچا اور اس نے مارے جانے والے دونوں آدمیوں کو آزاد کر دیا تھا۔ لوگ سمجھ نہ سکے تھے کہ یہ کیا ہوا ہے۔ اب جس وقت وہ سالار اور یزی کو زنجیروں اور بیڑیوں میں بندھا دیکھ رہے تھے، اُس وقت تک بیشتر لوگوں کو پتہ لگ چکا تھا کہ یہ دونوں آدمی بے گناہ تھے جنہیں سالار اور یزی نے رہا کروایا تھا۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں سالار اور یزی کا احترام پیدا ہو گیا تھا۔

سپہ سالار حجازی نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ لوگ خاموش ہو گئے۔

”اس شخص کو اچھی طرح پہچانو یہ کون ہے“ — سپہ سالار حجازی نے سالار اور یزی کی طرف اشارہ کر کے کہا — ”اسے سلطان محترم نے عمر قید کی سزا دی ہے..... جانتے ہو کیوں؟..... یہ سلطان کا باغی اور غدار ہے..... یہ شخص قاتلوں کا ساتھی ہے۔ اس نے دو قاتلوں کو سزائے موت سے چھڑوانے کے لئے دو جلاؤں کو قتل کروایا ہے۔ یہ فوج میں بغاوت پیدا کر رہا تھا۔“

”اور میرے ساتھ اس سپہ سالار کو بھی پہچان لو“ — اور یزی نے ہنستے ہوئے کہا

— ”یہ عیاش سلطان برکیارق کا بھائی ہے۔ مجھے سلطان نے غدار نہیں کہا بلکہ اس کی باطنی بیوی نے کہا ہے..... یہ سپہ سالار ابو جعفر حجازی سلطان کی اس باطنی بیوی کے آگے سجدے کرتا ہے۔“

”خاموش رہ غدار!“ — حجازی نے اوریزی کو ڈانٹ کر کہا — ”اپنے گناہوں پر جھوٹ کا پردہ مت ڈال ورنہ ہمیں زبان کھینچ لوں گا۔“

”بولنے دو اسے!“ — ہجوم میں سے کچھ آوازیں سنائی دیں — ”اسے بولنے دو۔.... ہمیں پتہ چلنے دو ہوا کیا ہے۔“

سپہ سالار حجازی نے دیکھا کہ لوگوں کا ردِ عمل اور رویہ کچھ اور ہے تو وہ ذرا ذبک گیا۔ ہجوم اب شور شرابہ کرنے لگا تھا کہ اوریزی کو بولنے دیا جائے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ لوگوں کی ہمدردیاں اوریزی کے ساتھ ہیں۔

”میں نے آج صبح دو بے گناہوں کو جلادوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا ہے۔“ — اوریزی نے بلند آواز میں کہا — ”انہیں ایک فوجی عہدیدار کا قاتل نہ ملا تو سلطان نے بلکہ سلطان کی بیوی نے یہ فیصلہ سنایا کہ سابق فوجیوں میں سے کوئی دو فوجی پکڑ لئے جائیں اور ان کی گردنیں کاٹ دی جائیں اور لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ یہ دو آدمی قاتل تھے۔“

”اے لوگو!“ — سپہ سالار حجازی نے کہا — ”اس کی مت سنو، یہ تو دھتکارا ہوا مجرم ہے۔“

لوگ شور مچا کر جا رہے تھے۔ سپہ سالار حجازی کے لئے حکم تھا کہ اوریزی کو زیادہ سے زیادہ دیر چوک میں کھڑا رکھا جائے۔ مقصد اس کی تذلیل تھا۔ خود حجازی بھی یہی چاہتا تھا کہ اوریزی کو خوب ذلیل و خوار کیا جائے لیکن اب لوگوں نے کچھ اور ہی انداز سے واہیلہ پکڑ دیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اوریزی کو فوراً ”قید خانے“ تک پہنچا دیا جائے لیکن وہ روزینہ سے ڈرتا تھا کہ اسے پتہ چل گیا کہ اوریزی کو زیادہ دیر چوک میں کھڑا نہیں رکھا گیا تو وہ ناراض ہوگی۔

”اے اہل اسلام!“ — سالار اوریزی نے بڑی بلند آواز میں کہا — ”اس اسلامی سلطنت کی حفاظت کے لئے بیدار اور چوکس ہو جاؤ۔ حسن بن صباح آ رہا ہے۔ اس شہر میں باطنی چلے آ رہے ہیں۔ وہ تخریب کاری کے لئے آئے ہیں اور آ رہے ہیں۔ سلطنت

کی اصل حکمران ایک باطنی عورت ہے اور سلطان برکیارق برائے نام سلطان ہے۔ اس سلطنت سے عدل و انصاف اٹھ گیا ہے۔“



اُس وقت جب سالار اور یزی کو چوک میں کھڑا کر کے ذلیل و رسوا کیا جا رہا تھا، اس سے کچھ دیر پہلے سلطان برکیارق کی ماں اور اس کے دوسرے دونوں بیٹوں محمد اور سنجر کو پتہ چلا کہ سالار اور یزی کو یہ سزا دی گئی ہے اور اس کا اصل جرم کیا ہے۔ محمد اور سنجر تو خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے لیکن ان کی ماں سے نہ رہا گیا۔ وہ غصے سے اٹھی اور باہر نکلی۔ ایک خادم آ رہا تھا۔ اس نے برکیارق کی ماں کو دیکھا تو رک گیا۔

”مادر سلطان!“ — اس خادم نے کہا — ”میں بازار سے آ رہا ہوں۔ سالار اور یزی کو سپہ سالار حجازی نے چوک میں کھڑا کر رکھا ہے اور وہاں لوگ تماشا دیکھ رہے ہیں۔“

”تو اس بیچارے کو ذلیل بھی کیا جا رہا ہے؟“ — ماں نے حیرت سے کہا۔ وہ اپنے بیٹے سلطان برکیارق کے کمرے کی طرف لے لے ڈگ بھرتی چل پڑی۔ ”ہے کہاں میرا بے غیرت بیٹا!“ — ماں کہتی چلی جا رہی تھی — ”میں نے تو حلال کا جنا تھا۔ اس کے باپ کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ میں نے اپنی اولاد کے خون میں ملاوٹ نہیں کی تھی“ — اس کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی — ”کیا اس نے اور یزی کو گرفتار کر لیا ہے؟..... یہ اس باطنی چیل کا کام ہے۔“

روزینہ اپنے کمرے میں تھی۔ اسے برکیارق کی ماں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ اسے برکیارق کی ماں آتی نظر آئی۔ روزینہ نے بڑی تیزی سے ایک طرف جا کر دربان کو بلایا۔

”اسے روک لو“ — روزینہ نے دربان سے کہا — ”کہنا سلطان سو رہے ہیں.... اسے اندر نہ آنے دینا۔“

دربان برکیارق کی ماں کے راستے میں کھڑا ہو گیا اور اسے روک دیا۔ یہ بھی کہا کہ سلطان کی طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ سو رہے ہیں لیکن ماں نے اسے دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا اور آگے کو چل پڑی۔

روزینہ بہت ہی چالاک لڑکی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ماں رک نہیں رہی تو وہ دوڑتی

باہر نکلی اور برکیارق کی ماں کے آگے جا کھڑی ہوئی اور بڑے پیار سے اس سے پوچھا کہ وہ کیوں اتنے غصے میں ہیں؟

”کیا تمہارے دربان مجھے روک لیں گے؟“ — ماں نے غصے کے عالم میں کہا۔

روزینہ نے دربان کو ڈانٹ کر کہا کہ اس نے انہیں کیوں روکا ہے؟ کیا وہ بھول گیا ہے کہ یہ عظیم خاتون کون ہیں؟..... دربان خاموش کھڑا روزینہ کا منہ دیکھتا رہا۔

”کیا برکیارق سویا ہوا ہے؟“ — ماں نے روزینہ سے پوچھا۔

”اگر وہ سوئے ہوئے ہیں تو بھی آپ کے لئے جاگ اٹھیں گے“ — روزینہ نے احترام کی اداکاری کرتے ہوئے کہا — ”آپ میرے کمرے میں آکر بیٹھیں، میں انہیں اٹھا کر میس لے آؤں گی۔“

ماں روزینہ کی باتوں میں آگئی اور اس کے ساتھ اس کے کمرے میں جا بیٹھی۔ روزینہ کمرے سے نکل گئی اور سلطان برکیارق کے پاس چلی گئی۔ اسے بتایا کہ اس کی ماں وہاں تباہی بکتی آئی ہے اور اس نے ماں کو دوسرے کمرے میں ذرا ٹھنڈا کر کے بٹھالیا ہے۔

”تو میں اس کا کیا علاج کروں؟“ — برکیارق نے پوچھا۔

”وہ ماں ہے“ — روزینہ نے کہا — ”اس کا احترام ہم پر فرض ہے لیکن وہ ایک باغی اور غدار سالار کا ساتھ دے رہی ہے۔ آپ سلطنت کے مفاد کو دیکھیں گے یا ماں کے احترام کو؟“

”میں تو سلطنت کے مفاد کو پہلے دیکھوں گا“ — برکیارق نے کہا — ”تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں ماں کے سامنے جاؤں یا نہ جاؤں۔“

”آپ یہاں سے ادھر ادھر ہو جائیں تو اچھا ہے“ — روزینہ نے کہا۔

ادھر محمد اور سخر کو پتہ چلا کہ ان کی ماں بڑے غصے میں برکیارق کی طرف گئی ہے تو انہیں فکر ہوا کہ برکیارق اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے گا۔ دونوں ماں کے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہاں انہیں بتایا گیا کہ ان کی ماں فلاں کمرے میں ہے۔ وہ دونوں اس کمرے میں گئے تو ماں کو بڑے غصے میں ٹھلتے دیکھا۔

”چلو ماں!“ — محمد نے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا — ”یہاں آپ کیا لینے آئی ہیں؟ آپ کے اس بیٹے کا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہا۔“

”میں اس کا دماغ ٹھیک کرنے آئی ہوں“ — ماں نے کہا..... ”میں نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا؟“

”ہم دونوں بھائی کریں گے“ — محمد نے کہا — ”ہم نے انتظام کر دیا ہے۔ آپ یہاں سے چلیں۔“

ماں جانے پر راضی نہیں ہو رہی تھی۔ محمد اور سخر کی بہت سی باتوں اور منت سماجت کے بعد وہ اس پر راضی ہوئی کہ وہ اسی کمرے میں بیٹھی رہے گی اور دونوں بھائی برکیارق کے پاس جائیں گے۔

”میں اس کے پاس کیوں نہ جاؤں؟“ — ماں نے پوچھا۔

”میں بتاتا ہوں آپ کیوں نہ جائیں“ — سخر بولا — ”اگر ہمارے اس بڑے بھائی برکیارق نے ہمارے سامنے آپ کے ساتھ بد تمیزی کی تو میں اسے یہیں ختم کر دوں گا۔ کیا آپ اپنے ایک بیٹے کو دوسرے بیٹے کے ہاتھوں مروانا پسند کریں گی؟“

وہ آخر ماں تھی۔ اس پر سخر کی اس بات کا ایسا اثر ہوا کہ اس کا منہ ذرا سا کھل گیا اور آنکھیں ٹھہر گئیں۔ وہ آہستہ سے بیٹھ گئی اور اس نے سر سے اشارہ کیا کہ تم جاؤ میں یہیں بیٹھوں گی۔

محمد اور سخر برکیارق سے ملنے کمرے سے نکل گئے۔ ماں اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر رونے لگی۔ اس نے آہ لے کر کہا، یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔

”آؤ..... بیٹھو“ — برکیارق نے اپنے بھائیوں سے کہا اور پوچھا — ”ماں کو کیا ہو گیا ہے؟..... سنا ہے وہ چیختی چلاتی یہاں آئی ہے۔ وہ پاگل تو نہیں ہو گئی؟“

”ابھی ہوئی تو نہیں بھائی جان!“ — محمد نے کہا — ”ہو جائے گی۔“

”جلدی پاگل ہو جائے گی“ — سخر نے کہا۔

”ابھی تو وہ مجھے پاگل سمجھتی ہے“ — برکیارق نے کہا — ”اب وہ کیا کہنے آئی ہیں؟“

”وہ سلطنت کی تباہی کو برداشت نہیں کر سکتی“ — محمد نے پُر اعتماد اور دو ٹوک لہجے میں کہا — ”سالار اور یزی کو آپ نے یہ سزا دے کر اچھا نہیں کیا۔“

”کیوں روزینہ!“ — برکیارق نے روزینہ کی طرف دیکھ کر کہا — ”انہیں بتاؤ کہ اور یزی نے کیا جرم کیا ہے۔“

”ہم آپ کے ساتھ بات کرنے آئے ہیں بھائی جان!“ — سبخر نے کہا۔
 ”تم ابھی بہت چھوٹے ہو سبخر!“ — برکیارق نے کہا — ”سلطنت کے کاموں کو
 ابھی تم نہیں سمجھ سکتے۔“

”لیکن میں ایک بات سمجھ سکتا ہوں“ — سبخر نے کہا — ”جو مرد اپنی بیوی کا غلام
 ہو کر اپنے گھر کے سارے معاملات اور فیصلے اُس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے، اُس کے گھر
 میں تباہی، ذلت اور خواری کے سوا کچھ نہیں رہتا لیکن آپ نے گھر کے نہیں بلکہ اتنی
 بڑی سلطنت کے معاملات اور فیصلے اپنی بیوی کے ہاتھ میں دے دیے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ
 ہے کہ آج ایک قابل، تجربہ کار اور جذبے والا سالار ذلیل و رسوا کیا جا رہا ہے اور اسے عمر
 قید دے دی گئی ہے۔“

”تم دونوں بھائی میری ایک بات غور سے سن لو“ — برکیارق نے کہا —
 ”روزینہ میرا دماغ ہے۔ میرے کان اور میری آنکھیں بھی روزینہ ہے.....“
 ”سلطان محترم!“ — محمد نے کہا — ”یہ بات آپ فخر سے نہ کہیں۔ یوں کہیں کہ
 اللہ نے آپ کے دماغ پر مہر لگا دی ہے اور ایک مشکوک لڑکی کے ہاتھوں آپ کی سوچنے
 کی طاقت ختم کر ڈالی ہے۔ آپ کی آنکھوں پر پٹی بندھ چکی ہے۔“
 ”کیا بک رہے ہو محمد!“ — برکیارق نے ڈانٹ کر کہا۔

”میں بک نہیں رہا“ — محمد نے کہا — ”میں وہ بات کہہ رہا ہوں جو اللہ نے
 قرآن میں کہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اُن گناہگار لوگوں پر جو اپنے گناہوں پر فخر کرتے ہیں اللہ
 نے یہ لعنت نازل کی ہے کہ ان کے دماغوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے..... آپ
 نے اپنے اوپر شیطان کو مسلط کر لیا ہے۔“

”آپ کی آنکھیں اُس وقت کھلیں گی جب سلطنت سلجوقیہ پر بائیسوں کا قبضہ ہو چکا
 ہوگا“ — سبخر نے کہا۔

”آپ کی جگہ حسن بن صباح بیٹھا ہوا ہوگا“ — محمد نے کہا — ”اور آپ کی لاش
 بھی نہیں ملے گی اور یہاں آپ کی اس بیگم کی حکمرانی ہوگی۔ اپنی آنکھوں سے پٹی
 کھولیں بھائی جان!“

”میں یہاں سے چلی جاتی ہوں“ — روزینہ نے منہ بسور کر کہا — ”ان لوگوں کو
 میرا وجود اچھا نہیں لگتا۔“

روزینہ دروازے کی طرف چل پڑی۔ سلطان برکیارق اُس کے پیچھے دوڑا لیکن وہ دروازے سے نکل گئی اور اپنے کمرے میں پلنگ پر اوندھے منہ گر کر روئے گئی۔ برکیارق بے تاب ہو کر اسے منانے بیٹھ گیا لیکن روزینہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ آخر برکیارق نے اسے اٹھالیا۔

”میری وجہ سے آپ کی ماں آپ کے خلاف ہو گئی ہے“ — روزینہ نے کہا —
 ”آپ کے بھائی آپ کے دشمن ہو گئے ہیں۔ مجھے آپ کی اور اس سلطنت کی سلامتی چاہئے۔ میں تارک الدنیا ہو کر کسی غار میں جا بیٹھوں گی اور آپ کے لئے اور آپ کی سلطنت کے لئے دعا کرتی رہا کروں گی۔“

برکیارق اتنی بڑی سلطنت کا سلطان تو بن گیا تھا لیکن وہ نہ سمجھ سکا کہ چالاک اور عیار عورت جب چاہے اپنے آنسو نکال سکتی ہے۔ یہ تو قلعہ الموت کی تربیت یافتہ لڑکی تھی۔

”تم بتاؤ میں کیا کروں“ — برکیارق نے کہا — ”جو فیصلہ تم کرو گی میں اپنی ماں اور اپنے بھائیوں کو سنا دوں گا۔“

”میری اپنی کوئی خواہش نہیں“ — روزینہ نے کہا — ”میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ سلطنت کے معاملات میں پوری دلچسپی لیں اور اسی طرح فیصلے کرتے رہیں جس طرح آپ نے اس سالار کو سزا سنائی ہے۔ میں تو آپ کو روحانی سکون دے رہی ہوں مگر آپ کی ماں اور بھائی یہ سکون تباہ کر رہے ہیں۔ یہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔“

”پھر تم چپ رہو“ — برکیارق نے کہا — ”اگر میری ماں کا منہ بند نہ ہو تو میں اسے نظر بند کر دوں گا۔“

روزینہ کے ہونٹوں پر تبسم آگیا اور برکیارق کی جان میں جان آئی۔

”اپنے بھائیوں کو چلتا کریں“ — روزینہ نے کہا — ”انہیں کہیں کہ وہ ایک باغی اور غدار سالار کی حمایت نہ کریں ورنہ تمہیں بھی وہیں پہنچا دیا جائے گا جہاں اسے پہنچا دیا گیا ہے۔“

سلطان برکیارق لمبے لمبے قدم اٹھاتا اس کمرے میں گیا جہاں وہ اپنے دونوں بھائیوں کو بیٹھا چھوڑ گیا تھا۔ بھائی وہاں نہیں تھے۔ وہ اُس کمرے میں گیا جہاں اُس کی ماں بیٹھی تھی۔ ماں بھی جا چکی تھی۔

سالار اور یزی کو ابھی تک چوک میں کھڑا رکھا ہوا تھا۔ سپہ سالار ابو جعفری حجازی نے اسے رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔

”سپہ سالار حجازی جھوٹ کہہ رہا ہے“ — ایک آواز اٹھی۔

”سپہ سالار خود غدار ہے“ — ایک اور آواز۔

”ہم انصاف چاہتے ہیں“ — دو تین آوازیں اٹھیں۔

اور ہجوم میں ایک بار پھر شور و غوغا شروع ہو گیا۔ حجازی کے چہرے پر گہرا ہٹ کے آثار آگئے اور وہ ادھر ادھر آگے اور پیچھے دیکھنے لگا۔ اس کے محافظوں نے برچھیاں تان لی تھیں اور وہ لوگوں کو پیچھے ہٹا رہے تھے۔

ایک گھوڑا سرپٹ دوڑتا آ رہا تھا۔ لوگوں نے اُدھر دیکھا۔ گھوڑے پر کوئی عورت سوار تھی اور اس کے ہاتھ میں سلطنت سلجوقیہ کا پرچم تھا جس پر چاند اور ستارے کا نشان تھا۔ گھوڑا اسی رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ ہجوم نے اسے راستہ دے دیا۔ گھوڑا دونوں سالاروں کے پاس جا رکا۔ سوار عورت بڑی تیزی سے گھوڑے سے اتری اور اُس میز پر کھڑی ہو گئی جس پر دونوں سالار کھڑے تھے۔ عورت نے اپنا نقاب اٹھا دیا..... وہ سلطان برکیارق کی ماں تھی۔

”میرے عزیز لوگو!“ — برکیارق کی ماں نے جیسے جیسے لوگوں کا پورا زور لگا کر کہا —

”اس پرچم کو دیکھو۔ یہ پرچم تمہارے ایمان اور دین کی علامت ہے۔ یہ پرچم تمہاری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتوں کا نشان ہے۔ یہ پرچم اس اسلامی سلطنت کی عصمت ہے۔ آج حسن بن صباح کے باطنی اس پرچم کو پامال کرنے کے لئے تمہارے درمیان آگئے ہیں۔ انہیں پہچانو۔ اچھے اور بُرے کو پہچانو..... مجھے پہچانو..... میں تمہاری ماں ہوں..... سلطان ملک شاہ کو یاد کرو۔ اُس کے ایمان اور جذبے کو یاد کرو۔ بھول جاؤ کہ میرا بیٹا سلطان ہے۔ میں اس ناخلف انسان کو اپنا بیٹا کہنے سے شرماتی ہوں۔ میرے بیٹے تم ہو۔ میرا بیٹا ایک باطنی چڑیل کے قبضے میں آ گیا ہے۔ اسلام کو حسن بن صباح کی گدھوں اور چیلوں نے نوچنا شروع کر دیا ہے..... سلطنت سلجوقیہ کی جس فوجی طاقت پر ہم سب کو اور تم سب کو تازہ تھا، اس فوجی طاقت کو توڑا جا رہا ہے۔ تمہارے سالار اور یزی کو اس

جرم میں قید میں ڈالا جا رہا ہے کہ یہ اس فوجی طاقت کو نہ صرف قائم رکھنا چاہتا ہے بلکہ اس میں اضافہ کر رہا تھا۔ قید میں اس سپہ سالار حجازی کو ڈالنا چاہئے.....“

”محترم ماں!“ — سپہ سالار حجازی نے برکیارق کی ماں کو بازو سے پکڑ کر کہا —

”سلطان برکیارق کا حکم بڑا ہی سخت ہے۔ آپ خاموش.....“

”چھوڑ دے میرا بازو خوشامدی غلام!“ — برکیارق کی ماں نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا — ”میرے عزیز لوگو! میری بات غور سے سن لو..... تمہارے درمیان افواہیں پھیلانی جا رہی ہیں۔ حسن بن صباح قلعہ الموت میں بیٹھا تمہیں آپس میں لڑا رہا ہے..... اگر تم نے آنکھیں نہ کھولیں اور اپنی عقل استعمال نہ کی تو یہاں بھائی بھائی کی گردن کاٹے گا۔ بھول جاؤ کہ سلطان میرا بیٹا ہے میں کہہ چکی ہوں کہ میں اس سلطنت کی ماں ہوں، میں تمہاری ماں ہوں..... اور یزی ابھی تک سالار ہے، یہ مجرم نہیں.....“

اس کے بعد برکیارق کی ماں بولتی رہی لیکن اس کی آواز ہجوم کے شور و غل میں دب گئی۔ ہجوم بھڑک اٹھا تھا۔ لوگ ایسے جوش میں آگئے تھے کہ سپہ سالار حجازی کو اپنا انجام کچھ اور ہی نظر آنے لگا۔

اس شور و غل میں سپہ سالار حجازی نے اپنے قریب کھڑے محافظ سے کچھ کہا۔ محافظ نے پیچھے سے اور یزی کو کمر سے دیوچا اور اسے اٹھا کر قریب کھڑے ایک گھوڑے پر بٹھا دیا پھر خود اس گھوڑے پر اور یزی کے پیچھے سوار ہوا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ سپہ سالار حجازی میز سے کود کر اترا اور ایک محافظ کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس نے محافظوں کو کوئی حکم دیا۔

تمام محافظوں نے گھوڑے دوڑا دیئے اور برہمیاں آگے کر لیں۔ تمام لوگ گھوڑوں اور برہمیوں سے ڈر گئے اور ایک طرف ہو گئے اور اس طرح سپہ سالار حجازی اور اس کے محافظ سالار اور یزی کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔



پہلے تو محافظوں نے ہجوم کو پیچھے روک رکھا تھا، جب محافظ وہاں سے نکل بھاگے تو ہجوم برکیارق کی ماں کے قریب آگیا۔ اس خاتون نے ایسا تاثر پیدا کر دیا تھا کہ ہر کوئی سالار اور یزی کا حامی ہو گیا تھا۔

محمد اور سنجر کو کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ ان کی ماں باہر کہیں چلی گئی ہے۔ وہ اسے

ڈھونڈنے لگے تو اصل سے پتہ چلا کہ ان کی ماں ایک گھوڑا نکلا کر اور پرچم ہاتھ میں لے کر کہیں چلی گئی ہے۔ سب کا خیال یہی تھا کہ وہ اُس چوک میں ہی گئی ہوگی جہاں سالار اور یزی کو تذلیل کے لئے کھڑا کیا گیا ہوگا۔

محمد اور سب نے گھوڑے لئے، ان پر سوار ہوئے اور چوک کی طرف گھوڑے دوڑا دیئے۔ ان کی ماں وہیں تھی اور ہجوم نعرے لگا رہا تھا۔ دونوں بھائی اُس میز پر چڑھ گئے جس پر ان کی ماں کھڑی تھی۔ انہوں نے ماں سے کہا کہ وہ واپس چلے۔

”اے ایمان والو!“ — ماں نے اپنے ایک پہلو میں محمد کو اور دوسرے پہلو میں سب کو کھڑا کر کے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور بلند آواز سے کہا — ”میں اپنے یہ دونوں بیٹے اس اسلامی سلطنت پر قربان کر دوں گی۔“

محمد نے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے اس جوش و خروش کو قابو میں رکھیں اور ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ اس نے کہا کہ ہم حسن بن صباح کو ختم کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے لیکن صورت حال یہ پیدا ہو گئی ہے کہ حسن بن صباح ہمیں ختم کرنے کا بندوبست کر چکا ہے۔

یہ کہہ دینا تو آسان تھا کہ باطنی شہر میں پھیلے جا رہے ہیں لیکن یہ معلوم کرنا بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن تھا کہ شہر کے لوگوں میں باطنی کون کون ہیں۔ بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مرو کا شہر حسن بن صباح کی گرفت میں آ گیا تھا اور اس شہر میں خون خرابہ تقریباً شروع ہو گیا تھا۔ محمد اور سب اپنی ماں کو ساتھ لے کر چلے گئے۔

سپہ سالار ابو جعفر حجازی سالار اور یزی کو اپنے محافظوں کے ساتھ لے کر سرپٹ دوڑتے گھوڑوں پر شہر سے نکل گیا۔ اس نے پیچھے دیکھا۔ تعاقب میں کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ اسے تعاقب کا کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ اس کے محافظ تلواروں اور برہمیوں سے مسلح تھے۔ شہری تعاقب کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی اس کے دل پر یہ اندیشہ سوار ہو گیا تھا کہ شہری بھڑک اٹھے تھے اور اس کے خلاف ہو گئے تھے۔

اس نے محافظوں کو گھوڑے آہستہ کرنے کا حکم دیا۔ قید خانہ ابھی دور تھا۔ وہ جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ اور یزی زنجیروں میں بندھا ایک محافظ کے آگے بیٹھا بالکل خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر افسوس اور تذبذب کا ہلکا سا بھی تاثر نہیں تھا۔ آگے علاقہ چٹانی آ گیا۔ راستہ ان چٹانوں کے درمیان سے بل کھاتا گزرتا تھا۔ یہ قافلہ اس راستے پر

چلتا چٹانوں کے اندر گیا تو اچانک دائیں بائیں سے بہت سے آدمی جو تلواروں اور برہمیوں سے مسلح تھے، ان پر ٹوٹ پڑے۔ حملہ آوروں نے دو تین محافظوں کو تو پہلے حملے میں ہی گھائل کر کے گھوڑے سے گرا دیا۔ جن پر حملہ ہوا تھا وہ کوئی اناڑی نہیں تھے، وہ تجربہ کار محافظ تھے جنہیں جانیں قربان کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ وہ فوج سے منتخب کئے گئے تھے۔

وہاں لڑنے کے لئے جگہ تنگ تھی۔ محافظوں کے لئے مشکل یہ تھی کہ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور پینترے بدلنے کے لئے گھوڑوں کو تیزی سے موڑنا اور آگے پیچھے کرنا مشکل تھا۔ حملہ آور پیادہ تھے۔ محافظوں نے جم کر لڑنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ گھوڑوں سے اتر آئے۔

سپہ سالار حجازی نے بلند آواز سے حکم دیا کہ اوریزی کو حفاظت میں لئے رکھو، اسے بھاگنے نہ دینا..... وہ تو زنجیروں اور بیڑیوں میں بندھا ہوا تھا۔ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا لیکن حجازی یہ سمجھ گیا تھا کہ یہ حملہ اوریزی کو آزاد کرانے کے لئے ہوا ہے۔ چارپانچ محافظوں نے سالار اوریزی کو گھوڑے سے اتار کر ایک جگہ گرا دیا اور وہ سب اس کے ارد گرد کھڑے ہو کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے لگے۔ حملہ آوروں کی تعداد محافظوں سے خاصی زیادہ تھی لیکن کسی ایک محافظ نے بھی پیٹھ دکھانے کی نہ سوچی۔

”میرے شیرو!“ — ”سپہ سالار حجازی کی آواز گرجی — ”قیدی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ اسے قید خانے تک پہنچا دو گے تو تمہیں جھولیاں بھر کر انعام دلوادوں گا۔“

محافظوں کے لئے سالار اوریزی بڑی ہی قیمتی چیز بن گیا تھا۔ وہ اسی کے قریب رہنے کی کوشش کرتے اور لڑ رہے تھے۔ اوریزی کو انہوں نے ایک چٹان کے دامن میں بٹھا دیا تھا۔ دو تین حملہ آور اس چٹان پر چڑھ گئے۔ چٹان اونچی نہیں تھی۔ حملہ آوروں نے اوپر سے محافظوں کو برہمیاں ماریں لیکن چٹان کے پہلوؤں کی طرف سے محافظوں نے اوپر جا کر حملہ آوروں کو گرا لیا۔

”لڑتے ہوئے مر جاؤ“ — سپہ سالار حجازی کی آواز ایک بار پھر گرجی — ”اگر قیدی تمہارے ہاتھ سے نکل گیا تو سلطان تم سب کو سزائے موت دے گا۔“

حملہ آور پیچھے ہٹ گئے اور کچھ دیر کے لئے یہ خونریز لڑائی ختم گئی۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ حملہ آور بھاگ گئے ہیں یا چٹانوں میں چھپ گئے ہیں۔ حجازی نے محافظوں کو اکٹھا

کر لیا۔ وہ ابھی نکل نہیں سکتا تھا۔ اس نے محافظوں کو گنا تو پانچ محافظ کم ہو گئے تھے۔ وہ شدید زخمی ہوئے یا مارے گئے تھے۔ حملہ آوروں میں سے بھی کچھ کم ہو گئے تھے۔ حملہ آور چٹانوں کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ محافظ اپنے گھوڑوں کو پکڑ کر لے آئے اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔ اچانک ایک طرف سے پانچ چھ حملہ آور دوڑتے ہوئے آئے۔ محافظوں نے گھوڑوں کو چھوڑا اور حملہ آوروں کے مقابلے کو آگے بڑھے۔ حملہ آور لڑتے ہوئے اس طرح پیچھے ہٹے گئے جیسے وہ محافظوں کی تلواروں اور برہمیوں اور ان کے جوش و خروش کا مقابلہ نہ کر سکتے ہوں۔

پیچھے ہٹتے ہٹتے آدھے حملہ آور ایک چٹان سے ایک طرف مڑ گئے اور باقی ذرا پیچھے جا کر دوسری طرف مڑ گئے اور بھاگنے لگے۔ محافظ ان کے پیچھے دوڑے۔ ادھر جہاں اوریزی کو بٹھایا گیا تھا، وہاں ایک سپہ سالار حجازی تھا اور اس کے ساتھ صرف ایک محافظ تھا۔

”اس قیدی کو میں ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا“ — سپہ سالار حجازی نے محافظ سے کہا — ”اگر ان لوگوں نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا تو میں اسے یہیں قتل کر دوں گا۔ سلطان یقیناً خوش ہو گا۔“

سالار اوریزی حجازی کی یہ بات سن رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر خوف کا نام و نشان نہ تھا بلکہ وہ مسکرا رہا تھا۔ حجازی نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں اوریزی!“ — حجازی نے طنزیہ لہجے میں کہا — ”مسکراتے ہوئے جان دے دو تو بڑا ہی اچھا ہے۔“

سالار اوریزی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا اور مسکراتا رہا، منہ سے کچھ نہ بولا۔

اچانک قریب سے ہی چار پانچ حملہ آور نکلے اور انہوں نے بلہ بول دیا۔ حجازی کے ہاتھ میں تلوار تھی اور وہ کچھ لڑا بھی تھا لیکن اب وہ بھاگ اٹھا اور قریب کھڑے گھوڑے پر سوار ہو کر اس نے ایڑ لگا دی۔ پیچھے جو محافظ رہ گیا تھا اسے وہیں کٹ دیا گیا۔ حملہ آوروں نے اوریزی کو اٹھایا اور ایک گھوڑے پر ڈال دیا۔ اس کے پیچھے ایک حملہ آور سوار ہو گیا اور اس نے گھوڑا دوڑا دیا۔

حملہ آوروں نے بڑی اچھی چال چلی تھی۔ وہ ایک طرف سے آئے اور محافظوں

سے لڑتے ہوئے پیچھے ہٹتے ہٹتے محافظوں کو اپنے ساتھ چٹانوں کے اندر لے گئے۔ پیچھے میدان صاف تھا۔ حملہ کرنے اور اوریزی کو اڑا لے جانے کے لئے آدمی موجود تھے۔ ان کی یہ چال کامیاب رہی۔

دو یا تین محافظ بچ کر نکلے ہوں گے۔ وہ پیدل بھاگے تھے۔ باقی شدید زخمی ہوئے اور مارے بھی گئے تھے۔ ان کے گھوڑے پیچھے رہ گئے تھے۔



سلطان برکیارق کو دربان نے اطلاع دی کہ سپہ سالار حجازی آیا ہے۔ سلطان نے حکم دیا کہ اسے فوراً اندر بھیجا جائے۔

حجازی جب سلطان برکیارق کے سامنے گیا تو ٹکست اور شرمساری اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

”آپ اتنے بوڑھے تو نہیں ہو گئے!“ — برکیارق نے مسکراتے ہوئے کہا —
”لیکن حکم آپ کے چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے۔ کیا ایک قیدی کو قید خانے تک پہنچانا لڑائی سے زیادہ بڑی مشقت ہے؟“

”سلطان عالی مقام!“ — سپہ سالار حجازی نے تھکی تھکی اور ہاری ہوئی آواز میں کہا —
”میں لڑائی میں سے ہی نکل کر آیا ہوں۔“

”کیسی لڑائی؟“ — برکیارق نے پوچھا — ”کیا قید خانے کے عملے کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی..... کیا وہ قیدی کو وصول نہیں کر رہے تھے؟..... کس سے لڑائی لڑی ہے؟“

”ہم قید خانے کے قریب پہنچ گئے تھے“ — حجازی نے کہا — ”ہم جب چٹانوں میں سے گزر رہے تھے تو ہم پر آگے سے پیچھے اور دائیں بائیں سے حملہ ہو گیا۔ حملہ آور تعداد میں زیادہ تھے۔ ان کے پاس تلواریں اور برہچھیاں تھیں اور.....“

”مجھے صرف ایک بات بتاؤ“ — سلطان برکیارق نے پوچھا — ”کیا اوریزی کو اُسی کوٹھڑی میں بند کر آئے ہو یا نہیں؟“

حجازی کی زبان مل نہ سکی۔ اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور سر جھکا لیا۔
”پھر کہاں ہے اوریزی؟“ — روزیہ جو اس وقت تک خاموش تھی بولی — ”کیا اسے جنگل میں پھینک آئے ہو؟“

”نہیں!“ — سپہ سالار حجازی نے کہا — ”اسے حملہ آور لے گئے ہیں۔“

”پھر تم زندہ میرے پاس کیوں آئے ہو؟“ — سلطان برکیارق نے گرج کر کہا اور پوچھا — ”باقی محافظ کہاں ہیں؟“

”صرف ایک میرے ساتھ آیا ہے“ — سپہ سالار حجازی نے کہا — ”باقی شاید زندہ نہیں۔“

”حملہ آور کون تھے؟“ — سلطان برکیارق نے پوچھا — ”کیا تم نے کسی کو پہچانا نہیں؟“

”میں صرف شک میں بات کر سکتا ہوں سلطان محترم!“ — سپہ سالار حجازی نے جواب دیا — ”مجھے شک ہے کہ حملہ آور اُن فوجیوں میں سے تھے جنہیں فوج سے نکال کر ابھی خیموں میں رکھا ہوا ہے..... میرے ساتھ جو محافظ آیا ہے، وہ کچھ وثوق کے ساتھ بات کرتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے اندر بلا لوں۔“

سلطان برکیارق کے اشارے پر حجازی باہر گیا اور اس محافظ کو ساتھ لے آیا۔ ”کیا تم نے حملہ آوروں کو پہچانا تھا؟“ — سلطان برکیارق نے محافظ سے پوچھا۔ ”ہاں عالی جاہ!“ — محافظ نے جواب دیا — ”وہ ہمارے اُن ساتھیوں میں سے تھے جنہیں فوج میں سے نکالا جا رہا ہے..... میں نے تین کو تو پہچان لیا تھا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ باقی بھی وہی ہوں گے جو فوج سے نکالے گئے ہیں۔“

سپہ سالار حجازی نے سلطان برکیارق سے اجازت لے کر اس محافظ کو باہر بھیج دیا۔ ”سلطان عالی مقام!“ — سپہ سالار حجازی نے کہا — ”پیشتر اس کے کہ آپ مجھے سزا دیں یا کوئی اور حکم دیں، میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں لیکن کہنے سے اس لئے ڈرتا ہوں کہ میری بات کا تعلق آپ کی محترمہ والدہ اور بھائیوں کے ساتھ ہے۔“

”جو کہنا ہے صاف صاف کہو“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”میں سنوں گا۔ مجھے صرف سلطنت کے مفاد کا خیال ہے۔ میری ماں ہے یا بھائی، ان کا درجہ سلطنت کے بعد ہے۔ ان کے متعلق انتہائی بُری اور توہین آمیز بات کرو گے تو میں وہ بھی سنوں گا۔ مجھے صحیح صورتِ حال معلوم ہونی چاہئے۔“

”محترم سلطان! آپ کا اقبال اور زیادہ بلند ہو“ — حجازی نے کہا — ”کسی نے ہم پر حملے کی جرات نہیں کرنی تھی۔ یہ حملہ آپ کی محترمہ والدہ اور آپ کے بھائی محمد نے کروایا ہے۔ وہ اس طرح کہ میں آپ کے حکم کے مطابق اور یزی کو چوک میں کھڑا کر

کے اس کا جرم لوگوں کو بتا رہا تھا۔ اور یزی اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔ ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ اتنے میں آپ کی والدہ محترمہ گھوڑے پر سوار وہاں آ پہنچیں۔ ان کے ہاتھ میں سلطنت کا پرچم تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر کر ہمارے پاس آکھڑی ہوئیں اور انہوں نے لوگوں کو آپ کے خلاف اور میرے خلاف اتنا زیادہ بھڑکایا کہ لوگ ہمارے خلاف اور اور یزی کے حق میں مشتعل ہو گئے۔ پھر آپ کا بھائی محمد چھوٹے بھائی سب کے ساتھ آ گیا۔ محمد نے اتنی اشتعال انگیز باتیں تو نہ کیں لیکن جو کچھ بھی اس نے کہا تھا وہ اور یزی کے حق میں جاتا تھا۔ لوگوں کا ہجوم اتنا زیادہ مشتعل ہو گیا کہ لوگ ہم پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھنے لگے۔ وہ محافظوں کی برہمیوں سے بھی نہ ڈرے۔ یہ تو میرا کمال تھا کہ میں نے اور یزی کو ایک گھوڑے پر پھینکا اور محافظوں سے کہا کہ یہاں سے نکلیں اور ان کی برہمیوں اور گھوڑوں کی زد میں کوئی بھی آتا ہے، پرواہ نہ کریں..... سلطان علی مقام! میں خوش تھا کہ قیدی کو مشتعل ہجوم میں سے نکال لایا ہوں لیکن آگے جا کر ہم پر حملہ ہوا تو میں سمجھ گیا کہ سابق فوجی بھی ہجوم میں موجود تھے۔ وہ کسی اور راستے سے ہم سے پہلے آگے جا کر گھات میں بیٹھ گئے۔ یہ ہے ہم پر حملے کی اصل وجہ۔“

سلطان برکیارق کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے روزینہ کی طرف دیکھا۔ روزینہ دانت پیس رہی تھی۔ یہ اس کے غصے کی انتہا تھی۔

”اگر وہ میری ماں ہوتی“ — روزینہ نے کہا — ”تو معلوم نہیں میں کیا کر گزرتی۔ وہ آپ کی ماں ہے اس لئے میں کچھ کہہ نہیں سکتی..... ماں کو اتنا بھی خیال نہیں کہ وہ سلطنت کو خانہ جنگی کی بھٹی میں جھونک رہی ہے..... اور آپ کا بھائی محمد.... ایک احمق آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہ آپ کا تختہ الٹنا چاہتا ہے اور اس کے دل میں سلطانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

”میں تمہیں کوئی سزا نہیں دوں گا جازی!“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”اس کی بجائے میں تمہیں مہلت اور موقع دیتا ہوں کہ ان حملہ آوروں کو پکڑو، پھر دیکھنا کہ میں انہیں کیا سزا دیتا ہوں۔“

”گستاخی معاف سلطان علی مقام!“ — جازی نے کہا — ”میں تو ان غداروں اور باغیوں کو پکڑنے کے لئے دن رات ایک کروں گا لیکن آپ کی والدہ محترمہ اور بھائی

میرے لئے بہت بڑی رکاوٹ بن جائیں گے۔ میں ان کے محلہ کو ایک کاری ضرب سے توڑ سکتا ہوں۔ ان کے سر آپ کے قدموں میں پیش کر سکتا ہوں لیکن وہ آپ کی ماں اور آپ کے بھائی ہیں جن پر میں ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ انہیں اگر آپ پابند کر لیں تو.....“

”ماں کو نظر بند کر دیں“ — روزینہ نے برکیارق سے کہا — ”ماں کو قید خانے

میں پھینکنا بہت ہی معیوب ہے۔ انہیں ان کے کمرے میں پابند کر دیں کہ وہ باہر نہ نکلیں۔ پہرہ کھڑا کر دیں۔ بھائیوں کو سمجھانے کی کوشش کریں کہ وہ آپ کے حکم کے خلاف لوگوں کو نہ بھڑکائیں۔ انہیں ذہن نشین کرائیں کہ حسن بن صباح سیاہ گھٹا کی طرح افق سے اٹھتا چلا آ رہا ہے اور اگر یہاں بھائیوں میں ہی اختلاف پیدا ہو گیا تو یہ گھٹا سلطنت سلجوقیہ کو تاریک کر ڈالے گی۔“

اس باطنی لڑکی روزینہ کی ایسی ہی باتیں تھیں جو سلطان برکیارق کو متاثر کرتی تھیں۔ اسے کوئی کتا تھا کہ یہ حسن بن صباح کے گھونسلے سے نکلی ہوئی لڑکی ہے تو برکیارق کا خون کھول اٹھتا اور ایسی بات کہنے والے پر وہ برس اٹھتا تھا۔

”اب سنو حجازی!“ — سلطان برکیارق نے دو ٹوک لہجے میں کہا — ”دو راتوں بعد جب تیسری رات آدمی گزر جائے تو اپنی پوری فوج کو بیدار کرو اور ان فوجیوں کے خیموں کو محاصرے میں لے لو جنہیں ہم نے فوج سے سبکدوش کر کے ~~خارج~~ خارج طور پر رکھا ہوا ہے۔ اپنی فوج کو پہلے ہی بتا دینا کہ وہ تیاری کی حالت میں رہیں اور باہر کسی کو پتہ نہ چل سکے کہ فوج تیاری کی حالت میں ہے۔ آدمی رات کو صرف ایک اشارے پر فوج خاموشی سے اٹھے اور وہیں سے محاصرے کی ترتیب میں ہو کر خیموں کو اپنے زرخے میں لے لے۔ رات کے وقت کوئی کارروائی نہیں کرنی۔ صبح جب وہ لوگ اٹھیں تو انہیں پکڑ پکڑ کر الگ کھڑا کرتے جانا۔ پھر ہر خیمے کے اندر دیکھنا کہ کوئی چھپا ہوا تو نہیں رہ گیا۔ اپنے اس محافظ کو ساتھ لے لینا اور یہ ان میں سے اُن تین آدمیوں کو پہچانے گا جو حملے میں شریک تھے۔ حملے میں تمہارے محافظوں نے کچھ حملہ آوروں کو زخمی بھی کیا تھا۔ ان میں جو زخمی نظر آئے اسے بھی الگ کر لینا۔ سختی کرنی پڑے تو تمہیں اجازت ہے کہ کسی کو جان سے مار ڈالو۔ تم خود عقل رکھتے ہو۔ میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔ مجھے یہ حملہ آور چاہئیں۔ ابھی دو دن اور دو راتیں تم یوں دبک کر رہو جیسے کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی اور تم ڈر گئے ہو۔ اپنی ماں اور بھائیوں کا انتظام میں خود کر لوں گا۔“

سلطان برکیارق نے سر سے اشارہ کیا تو سپہ سالار حجازی رکوع میں چلا گیا اور اسی حالت میں پیچھے ہٹتے ہٹتے دروازے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد سلطان برکیارق اٹھا اور کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ وہ کبھی رک جاتا، اوپر دیکھتا پھر سر جھکا کر چل پڑتا۔ کبھی رک کر اپنے ماتھے کو زور زور سے ملتا۔ روزینہ پہلے تو اسے دیکھتی رہی پھر اس نے برکیارق کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور بٹھا کر اس پر اس طرح جھکی کہ اس کے ریشمی بالوں نے برکیارق پر سلیہ کر دیا۔

”آپ کو یہ لوگ جینے نہیں دیں گے“ — روزینہ نے اس کے ساتھ اس طرح پیار کر کے کہا جس طرح ماں اپنے معصوم بچے کے ساتھ کرتی ہے، وہ کہنے لگی — ”ذرا سر میرے ساتھ لگالیں۔ آپ کی ذہنی حالت تو ان لوگوں نے بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ کوئی غیر ہوتا تو اور بات تھی، اپنی سگی ماں اور سگے بھائی آپ کو جہنم میں پھینک رہے ہیں۔“

سلطان برکیارق پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنے آپ کو روزینہ کے حوالے کر دیا اور دو سال کا بچہ بن گیا۔ کچھ دیر بعد روزینہ اٹھی اور صراحی میں سے ایک مشروب پیالے میں ڈال کر برکیارق کو پلایا۔

سلطان برکیارق محسوس نہ کر سکا کہ اس کے آباؤ اجداد کی سلطنت اس پیالے میں ڈبوئی جا رہی ہے۔



سلطان برکیارق کے ذہن اور دل پر اپنا قبضہ مکمل کر کے روزینہ اٹھی۔

”کیا میں ماں کو بلا کر اسے کہوں“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”لیکن وہ تو میری جان کو آجائے گی۔“

”محمد اور سبخر کو بلائیں“ — روزینہ نے کہا — ”انہیں بتائیں کہ ماں کو ان کے کمرے میں نظر بند کیا جا رہا ہے اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا جائے کہ وہ کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہ کریں۔“

اب وہی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جو روزینہ نے یہاں آتے ہی پیدا کر دی تھی یعنی سوچتی وہ تھی اور عمل برکیارق کرتا تھا۔ برکیارق کا اپنا دماغ روزینہ کی حسین گود میں بے ہوشی کی نیند سو گیا تھا۔

اس کیفیت میں برکیارق نے اپنے دونوں بھائیوں کو بلایا اور بھائی اطلاع ملتے ہی آ

گئے۔

”میرے عزیز بھائیو!“ — برکیارق نے کہا — ”تصور میں لاؤ کہ میری جگہ تم ہو اور تم کوئی حکم دیتے ہو اور کچھ لوگ تمہارے حکم کی تعمیل کے راستے میں اس طرح رکاوٹ بنتے ہیں جس طرح میرے محافظوں پر حملہ ہوا۔ صاف اور سچے دل سے بتاؤ کہ تم کیا محسوس کرو گے اور کیا کارروائی کرو گے؟ یہ نہ کہنا کہ میرا حکم غلط تھا اور اسلام کے منافی تھا۔ سلطان انسان ہے اور غلطی بھی کر سکتا ہے لیکن کوئی سلطان بغاوت اور غداری برداشت نہیں کر سکتا۔ تم نے محمد! اپنی ماں کے ساتھ مل کر میرے خلاف زہرا گلا اور یہی وجہ تھی کہ جو محافظ دستہ اور یزی کو قید خانے میں لے جا رہا تھا اس پر حملہ ہوا، قیدی کو وہ ساتھ لے گئے اور محافظوں کو قتل کر گئے..... تم بتاؤ کہ میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے!“

”ہم حملہ آوروں کو گرفتار کرتے“ — محمد نے کہا — ”اور انہیں سزا دیتے۔“
”اگر میں یہ کہوں کہ یہ حملہ تم نے اور ہماری ماں نے کروایا ہے تو تم کیا کو گے؟“
— سلطان برکیارق نے پوچھا۔

”یہ الزام بے بنیاد ہے“ — محمد نے کہا — ”یہ صحیح ہے کہ ماں وہاں چلی گئی تھی اور اس نے لوگوں سے جو باتیں کہیں وہ سلطنت سلجوقیہ اور سلار اور یزی کے حق میں جاتی تھیں۔ انہوں نے بار بار کہا کہ میں اپنے بیٹے اس سلطنت پر قربان کر دوں گی لیکن اس پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دوں گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ پرچم اس اسلامی سلطنت کی عصمت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ شہر حسن بن صباح کے بیٹھے ہوئے تجربہ کار باطنی تخریب کاروں سے بھرتا جا رہا ہے۔“

”ماں نے جو کچھ بھی کہا“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”وہ ہماری سلطنت اور اور یزی کے حق میں تو جاتا ہے لیکن ماں اور تم یہ نہ دیکھ سکے کہ لوگ مشتعل ہو رہے ہیں اور ان کے جوش و خروش میں انتقام کی آگ سلکتی جا رہی ہے۔ وہاں سابق فوجی بھی موجود تھے۔ ان میں چونکہ لڑنے کا جذبہ ہے اس لئے انہوں نے یہ فوجی کارروائی جس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ اب تم بتاؤ کہ میں کیا کروں؟“

اس طرح بھائیوں میں بحث مباحثہ چلتا رہا جو تلخ کلامی کی صورت اختیار کر گیا اور روزینہ برکیارق کے حق میں بول پڑی۔

”تم خاموش رہو لڑکی!“ — محمد نے کہا — ”سلطان ہمارا بھائی ہے اور تمہاری

حیثیت صرف ایک بیوی کی ہے۔ میرے ساتھ کوئی بات نہ کرنا۔“

”اب میرا فیصلہ سنو محمد اور سب!“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”میں اپنی ماں کو

اس کے کمرے میں نظر بند کر رہا ہوں۔ تم دونوں میرا یہ حکم اس تک پہنچا دو۔ وہ کمرے

سے باہر نہ نکلے۔ باہر دو سنتری بٹھا دیئے جائیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا یہ فیصلہ نہ

تمہیں اچھا لگا ہے نہ ماں اسے پسند کرے گی بلکہ وہ جتنے گی چلائے گی لیکن مجھے اپنی

سلطنت کو بھی دیکھنا ہے اور یہ بھی کہ ماں یوں ماری ماری نہ پھرے۔ اس کا ہر جگہ پہنچ جانا

اور جو منہ میں آیا کہتے جانا اس کے اپنے وقار کے منافی ہے۔ مجھے یہ خطرہ بھی نظر آ رہا

ہے کہ جس طرح وہ خود کہتی ہے کہ اس شہر میں باطنی اکٹھے ہوتے جا رہے ہیں، کوئی

بد بخت باطنی اسے قتل ہی نہ کر دے۔“

”باطنی ہی ہماری ماں کو نظر بند کروا رہے ہیں“ — محمد نے اٹھتے ہوئے کہا —

”ہم آپ کا حکم ماں تک پہنچا دیں گے۔ وہ جتنے گی نہ چلائے گی، کچھ بھی نہیں کہے گی

لیکن میں آپ کو آخری بار بتا رہا ہوں کہ جن باطنیوں کے متعلق آپ نے خدشہ ظاہر کیا

ہے کہ وہ ہماری ماں کو قتل کر دیں گے، وہی باطنی اس سلطنت پر حکومت کر رہے ہیں۔

اپنی ماں کو نظر بند کرنے کا حکم آپ نے نہیں حسن بن صباح نے دیا ہے۔ کسی باطنی میں

اتنی جرات نہیں ہو گی کہ وہ ہماری ماں کو قتل کر دے۔ ہمارے بڑے بھائی کا دین، ایمان

اور کردار باطنیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ آپ جو ہمارے سامنے چلتے پھرتے، بولتے

اور حکم دیتے نظر آتے ہیں یہ آپ کا صرف جسم ہے۔ سوچنا کوئی اور ہے اور اس پر عمل

آپ کا جسم کرتا ہے۔ آج کے بعد آپ ہمیں اپنے سامنے نہیں دیکھیں گے۔“

”اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں بھائی جان!“ — سب نے کہا — ”آئندہ آپ کا

کوئی حکم ہم تک نہ پہنچے ورنہ ہم وہاں تک پہنچ جائیں گے جہاں آپ کے فرشتے بھی

نہیں پہنچ پائیں گے..... ہم بھاگ نہیں جائیں گے، مر نہیں جائیں گے، اپنے آباؤ اجداد

کی اور اپنے عظیم باپ کی اس سلطنت کو زندہ و پائندہ رکھنے کی پوری جدوجہد کریں گے

خواہ ہماری جانیں چلی جائیں۔“

دونوں بھائی کمرے سے نکل گئے اور سلطان برکیارق احمقوں کی طرح منہ کھولے

اُس دروازے کو دیکھتا رہا جس دروازے سے اس کے بھائی نکل گئے تھے۔ وہ اُس وقت

بیدار ہوا جب روزینہ کا ایک رخسار اس کے گل کے ساتھ لگا۔



سلار اور یزی کو محافظوں سے چھین کر وہ اسے شہر میں نہیں لائے تھے بلکہ اسے شہر سے دور ایک ویران علاقے میں لے گئے تھے۔ اپنی رہائی کا یہ انتظام اور یزی نے خود ہی کیا تھا۔ اسے جب سلطان برکیارق کا بلاوا آیا تھا تو اسے معلوم تھا کہ سلطان اسے بخش نہیں دے گا۔ اسے معلوم تھا کہ سپہ سلار حجازی اسے انتہائی سزا دلوائے گا اسی لئے اس نے اپنے ساتھ دو محافظ لے لئے تھے اور انہیں سلطان کے محل سے ذرا دور کھڑا کر دیا تھا اور انہیں بتا دیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔

سلار اور یزی کو جب سلطان برکیارق نے زنجیروں اور بیڑیوں میں باندھ کر باہر بھیجا تو اور یزی کے محافظوں نے دور سے دیکھ لیا۔ انہوں نے وہاں سے گھوڑے دوڑا دیئے اور ان لوگوں کے پاس جا پہنچے جنہوں نے اور یزی کو رہا کرنا تھا۔ وہ اسی اطلاع کی انتظار میں تھے۔ جونہی انہیں اطلاع ملی، وہ کسی اور راستے سے چٹانی علاقے میں جا پہنچے اور گھات میں بیٹھ گئے۔ وہ گھوڑے نہیں لے گئے تھے کیونکہ گھات میں گھوڑے جھنسا کر راز فاش کر دیتے ہیں۔

انہیں بہت انتظار کرنا پڑا کیونکہ اور یزی کو چوک میں نمائش کے لئے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ آخر انہیں سپہ سلار حجازی اپنے محافظوں کے ساتھ نظر آیا۔ وہ تیار ہو گئے اور جونہی یہ محافظ دستہ ان کی گھات میں آیا، انہوں نے حملہ کر دیا اور یزی کو اپنے ساتھ لے گئے۔

اور یزی نے ہی انہیں ایک جگہ بتائی تھی جہاں چھپنے کا محفوظ مقام تھا۔ وہ ویرانے میں ایک پہاڑی سی تھی جس میں ایک غار تھا۔ غار کا دروازہ گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا اور اس کے آگے مٹی کا ایک چھوٹا سا ٹیلہ بھی تھا۔ اور یزی کو اس غار میں لے گئے۔ وہاں اس کی زنجیریں اور بیڑیاں کاٹنے کا انتظام تھا۔

اور یزی کو جب بتایا گیا کہ اپنے کچھ آدمی مارے گئے ہیں تو اس نے کہا کہ فوراً وہاں جاؤ اور لاشوں کو اٹھا کر لے آؤ اور یہاں دفن کر دو۔ ہو سکتا ہے وہاں کچھ زخمی بھی پڑے ہوں۔

اور یزی کے آدمی محافظوں کے گھوڑے بھی پکڑ لائے تھے۔ بچے ہوئے آدمی

گھوڑوں پر سوار ہوئے اور واپس اُس جگہ چلے گئے جہاں انہوں نے گھات لگائی تھی۔ وہ بہت جلدی میں تھے کیونکہ خطرہ تھا کہ سرکاری فوج پہنچ جائے گی۔ اتفاق سے سلطان برکیارق نے بھی نہ سوجھانہ سپہ سالار حجازی نے کہ جا کر حملہ آوروں کی لاشیں دیکھتے اور ایسے زخمیوں کو اٹھا کر لے آتے جو بھاگنے کے قاتل نہیں رہے تھے۔ ان سے پتہ چل جاتا کہ حملہ آور کون تھے۔ حملہ آور لاشیں اور زخمی اٹھانے آئے تھے اور اٹھا کر لے گئے۔

سلار اور یزی نے صرف چار آدمی اپنے ساتھ رکھے اور دوسروں سے کہا کہ وہ چلے جائیں اور پوری جاسوسی اور مخبری کرتے رہیں اور ذرا اطلاع اس تک اس عار میں پہنچاتے رہیں۔ اس کا خیال یہ تھا کہ چند دن دیکے رہیں۔

”سابق فوجیوں کو بتانا کہ اب تیار رہیں“ — اور یزی نے کہا — ”انہیں یہ بھی بتانا کہ انہیں ہتھیار جلدی مل جائیں گے اور اب ہمارا تصلوم سرکاری فوج کے ساتھ ہو گا اور اب ہمارا مقصد برکیارق کو ہٹا کر اس کی جگہ محمد کو سلطان بنانا ہے اور اس کے بعد فوج تیار کر کے حسن بن صباح کے خلاف محاذ کھولنا ہے..... لیکن میرے دوستو! ہمیں خون کے دریا میں سے گزرنا پڑے گا۔ ہم کوشش کریں گے کہ بھائی بھائی سے نہ لڑے لیکن یہ ممکن نظر نہیں آتا۔ خانہ جنگی ہو کر رہے گی..... باقی جو کچھ کرنا ہے وہ پانچ سات دنوں بعد بتاؤں گا۔ ابھی ہمیں زمین کے نیچے رہنا ہے۔“

چار پانچ مہینے گزرے باہر سے ایک طبیب آیا تھا جس نے مرو میں اپنا مطب کھولا تھا۔ وہ جراح بھی تھا۔ اس کے ہاتھ میں خدا نے ایسی شفا دی تھی کہ مایوس اور بڑے پرانے مریض صحت یاب ہو گئے تھے۔ لوگ اس کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ اور یزی کے فرار کے دو تین روز بعد رات کا وقت تھا۔ طبیب مریضوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے مکان کا باہر والا دروازہ بند کر دیا تھا اور چار آدمی اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

”یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے حق میں ہو رہا ہے“ — طبیب نے ان آدمیوں سے کہا — ”اور یزی کا فرار بھی ہمارے حق میں جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ اسے فرار کرانے والے سابق فوجی ہیں۔ مجھے روزینہ نے محل سے اطلاع بھیج دی ہے کہ سلطان نے اپنی ماں کو نظر بند کر دیا ہے اور سپہ سالار حجازی سے کہا ہے کہ وہ حملہ آوروں کو تلاش کرے اور پکڑے۔ میں نے اپنے آدمی اس سارے کھیل میں شامل کر دیئے ہیں۔ اور یزی کا فرار ہی سابق اور حاضر فوجیوں کے درمیان لڑائی کا باعث بن جائے گا.....“

”الموت سے امام حسن بن صباح کا حکم آیا ہے کہ مَرُو شہر کو خون میں ڈبو دو۔ یہ بھی کہ اپنے آدمیوں کو استعمال کرنا لیکن اس طرح کہ اپنے زیادہ تر آدمی محفوظ رہیں۔ بھائی کو بھائی سے لڑاؤ۔ سلطان کی فوج کو دو حصوں میں کاٹ دو اور انہیں آپس میں لڑاؤ۔ امام نے یہ حکم بھی بھیجا ہے کہ تین چار آدمی ہر روز اس شہر میں مرنے چاہئیں..... ہمیں امام کے اس حکم پر فوراً عمل کرنا ہے۔ تم لوگ دو یا تین دنوں بعد خیموں میں رہنے والے تین چار سابق فوجیوں کو رات کے وقت قتل کر دو اور افواہ پھیلا دو کہ انہیں سرکاری فوجیوں نے اپنے محافظوں کے خون کے انتقام میں قتل کیا ہے۔ پھر ایک دو دنوں کا وقفہ دے کر فوج کے دو چار آدمی قتل کر دیتا۔ تم خود تجربہ کار ہو، قتل کرنا جانتے ہو اور افواہیں پھیلانا بھی جانتے ہو۔ جاؤ اور یہ بندوبست کرو۔“

گیارہویں صدی عیسوی تھی جب اسلام اپنی تاریخ کے بہت بڑے خطرے میں گھر گیا تھا۔ مؤرخوں نے اسے تاریخ اسلام کا سب سے بڑا خطرہ کہا ہے۔ یہ ویسا ہی خطرہ تھا جیسا آج داستان گودیکھ رہا ہے۔ دنیائے کفر اسلام کو گھیرے میں لے کر حملہ آور ہو چکی ہے۔ بالکل ایسے ہی حالات حسن بن صبح نے گیارہویں صدی عیسوی میں پیدا کر دیئے تھے۔ یہود و نصاریٰ اس کے ساتھ مل گئے تھے اور اس کی پوری پوری پشت پناہی کر رہے تھے۔ اسے جس قسم کی مدد و کار ہوتی تھی وہ پیش کرتے تھے۔

سلطنت سلجوقیہ کے نیچے لاوانک رہا تھا بلکہ پک چکا تھا اور اب اس آتش فشاں کو پھٹنا تھا..... سلطنت سلجوقیہ دراصل اسلامی سلطنت تھی اور یہ اسلام کا مرکز بن گئی تھی۔ جس طرح آج دوست اور دشمن کا غدار اور وفادار کا کچھ پتہ نہیں چلتا ایسے ہی اُس دور میں چہروں پر ایسے پردے پڑ گئے تھے کہ نیک و بد کی تمیز ختم ہو گئی تھی۔ سلطنت کا حکمران تو برکیارق تھا لیکن حکومت اس کی بیوی روزینہ کر رہی تھی۔

برکیارق نے اپنی ماں کو اس کے گھر میں نظر بند کر دیا تو برکیارق کے دونوں بھائی محمد اور سنجر ماں کے پاس گئے اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو پریدار نکواریں اور برتھیوں سے مسلح آگئے اور دروازے کے باہر کھڑے ہو گئے۔

”یہ کیوں آئے ہیں؟“ — ماں نے پریداروں کے متعلق بیٹوں سے پوچھا۔

”آپ کے سلطان بیٹے نے آپ کو اس گھر میں نظر بند کر دیا ہے“ — محمد نے کہا

— ”اور ہمیں کہا ہے کہ ہم اس کا یہ حکم آپ تک پہنچادیں۔“

ماں پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ اس کے ہونٹ کانپنے مگر زبان سے کوئی لفظ نہ

نکلا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو آئے جو اُس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

”آپ اتنی زیادہ پریشان کیوں ہو گئی ہیں؟“ — ہم بڑے بھائی کے غلام تو نہیں... .. لیکن مقدس ماں! ہمیں اپنی آزادی اور غلامی کے ساتھ کوئی غرض نہیں۔ ہم اس سلطنت کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سلطنت حسن بن صباح کے قبضے میں آ چکی ہے۔ حکومت روزینہ کر رہی ہے۔ ہم دونوں بھائیوں کو سلطنت کی حکمرانی نہیں چاہئے بلکہ ہمیں اسلام کی حکمرانی کی ضرورت ہے۔ آپ بالکل خاموش رہیں۔ اب برکیارق کے پاس نہیں جانا۔ ہم یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہم نے اپنا بڑا بھائی اس سلطنت کی عظمت پر قربان کر دیا ہے۔ اب ہمیں اجازت دیں کہ کفر کی اس یلغار کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں۔“

”اور ماورِ محترم!“ — سخر نے کہا — ”آپ ہمارے لئے صرف دعا کریں۔ آپ کی دعا ہمارے لئے ایک بڑی ہی مضبوط ڈھال ہو گی۔ ہمیں لڑنا ہے اور آج کے بعد سلطنت سلجوقیہ کی تاریخ خون سے لکھی جائے گی۔“

”میرے مجاہد بچو!“ — ماں نے کہا — ”میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم جیسے میرے بیٹے ہوتے تو میں اسلام کی اس سلطنت پر قربان کر دیتی۔ لڑنا ہے تو طریقے سے، عقل سے لڑنا۔ ابو مسلم رازی کو اطلاع دے دو۔ وہ بہت ہی دانشمند آدمی ہے۔ مشورے بھی اچھے دے گا اور ہر طرح کی مدد بھی کرے گا۔“

”اب آپ نے برکیارق کے سامنے نہیں جانا“ — محمد نے کہا — ”اپنے آپ پر غصے کو بھی غالب نہیں آنے دینا۔ اب جو بھی کرنا ہو گا وہ ہم کریں گے۔“

”مزل آفندی آئے ہیں“ — پریدار نے اندر آ کر کہا — ”وہ یہاں اندر نہیں آ سکتے کیونکہ ہمیں بڑا سخت حکم ملا ہے۔ محترم محمد اور محترم سخران سے مل سکتے ہیں لیکن کسی دوسرے کمرے میں..... میرے لئے کیا حکم ہے؟“

”تمہارے لئے حکم یہ ہے کہ فوراً اس کمرے میں سے نکل جاؤ“ — محمد اور سخر کی ماں بولی — ”اور کتوں کی طرح باہر کھڑے رہو۔“

پریدار کھیانا سا ہو کر محمد کی طرف دیکھنے لگا۔

”مزل آفندی کو دوسرے کمرے میں بٹھاؤ“ — محمد نے کہا — ”ہم آتے

ہیں۔“

”ماورِ محترم!“ — پریدار نے محمد کی ماں کے آگے جھک کر کہا — ”ہم حکم کے

بندے ہیں۔ ہمیں آپ کے خلاف حکم دیا جاسکتا ہے لیکن ہمارے دلوں سے آپ کا احترام نہیں نکالا جاسکتا۔“

ماں نے سر جھکا لیا۔ پریدار آداب بجالا کر باہر نکل گیا۔ محمد اور سخر اسی مکان کے ایک اور کمرے میں چلے گئے۔ منزل آئندی اس کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔



برکیارق اور روزینہ کے پاس سلطنت کا وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے برکیارق نے سپہ سالار ابو جعفر حجازی کو کچھ حکم دیئے تھے اور پھر اپنی ماں کی نظر بندی کا حکم بھی دیا تھا تو روزینہ نے کہا تھا کہ وہ اپنے وزیر اعظم کو بلا کر یہ سارے احکام لکھوادے اور اسنے کہے کہ ان کی تعمیل کی نگرانی وہ کرے۔

”آپ ہر مسئلہ اپنے سر لے لیتے ہیں“ — روزینہ نے کہا تھا — ”آپ آخر ایک انسان ہیں۔ ساری سلطنت کا درد اپنے دل میں بھر کر آپ کو سکون اور چین کیسے مل سکتا ہے۔ آپ کا روحانی سکون تو آپ کی ماں نے اور بھائیوں نے مل کر تباہ کر دیا ہے۔ میں تو انہیں کہنا چاہتی تھی کہ آؤ تم سلطانی کی گدی پر بیٹھ جاؤ اور ذرا سلطنت کا کاروبار چلا کر دکھاؤ۔ یہ آپ کی ہی دیانتداری اور خلوص ہے کہ آپ ان پہاڑوں سے نکر رہے ہیں..... اتنا پریشان نہ ہوں میں اپنا خون آپ کی رگوں میں ڈال دوں گی۔“

برکیارق نے ایک بازو لہبا کر کے روزینہ کی کمر میں ڈالا اور اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ تھوڑی دیر بعد روزینہ نے ہی دربان کو بلا کر کہا تھا کہ وزیر اعظم کو فوراً بلا لاؤ۔ وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری فوراً پہنچ گیا۔ برکیارق نے اسے بتایا کہ آج کیا ہوا ہے اور اس نے کیا احکام جاری کئے ہیں۔

”ان امور اور مسائل کی نگرانی آپ نے کرنی ہے“ — برکیارق نے کہا — ”ان احکام کی تعمیل میں یہ نہیں دیکھنا کہ یہ خاتون میری ماں ہے یا وہ لڑکے میرے بھائی ہیں۔ کسی کی حیثیت کا خیال نہیں رکھنا۔“

”سلطان محترم!“ — وزیر اعظم سمیری نے کہا — ”میں صرف آپ کو جانتا ہوں۔ اگر آپ مجھے حکم دیں گے کہ اپنے ایک بیٹے کا سر کاٹ کر پیش کرو تو میں آپ کا یہ حکم بلا حیل و حجت پورا کروں گا۔“

”آپ دیکھ رہے ہیں کہ سلطان کس قدر تھکے تھکے لگتے ہیں“ — روزینہ نے کہا

— ”ان کا چہرہ کس طرح اتر گیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ اور بولیں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ انہوں نے آج کیا احکام جاری کئے ہیں۔ یہ تو آپ کو پتہ چل گیا ہو گا کہ سلار اور یزی کو قید خانے میں بند کرنے کے لئے لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں محافظوں پر حملہ ہو گیا اور حملہ آور محافظوں کو قتل کر کے سلار اور یزی کو چھڑا کر لے گئے ہیں۔“

”یہ خبر مجھ تک پہنچ چکی ہے“ — وزیر اعظم سمیری نے کہا — ”میں نہیں جانتا کہ سلطان محترم نے کیا فیصلہ صادر فرمایا ہے، اگر ان کی جگہ میں ہوتا تو اور یزی اور اس کے حامیوں کو فوری طور پر سزائے موت دیتا۔ یہ غداری ہے۔“

”سلطان نے یہ حکم دیا ہے“ — روزینہ نے کہا — ”آج سے تیسری رات ان خیموں کو محاصرے میں لے لیا جائے جن میں برطرف کئے جانے والے فوجی رہتے ہیں پھر ایک ایک خیمے میں جا کر انہیں بیدار کیا جائے گا اور ایک جگہ اکٹھا کر کے شناخت کی جائے گی کہ حملہ آور کون کون تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ اور یزی کو انہی میں سے چند ایک آدمیوں نے رہا کروایا ہے۔ اس کارروائی کا باقاعدہ منصوبہ تیار کر لیں۔ اس میں ناکامی نہیں ہونی چاہئے..... اس کے ساتھ ہی اور یزی کو ڈھونڈنا ہے۔ آپ کے پاس جاسوس ہیں اور مخبر بھی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ مفرور اور روپوش مجرم کو کس طرح ڈھونڈا جاتا ہے۔“

”یہ آپ مجھ پر چھوڑیں سلطان عالی مقام!“ — وزیر اعظم سمیری نے کہا — ”میں اس غدار کو زمین کی ساتویں تہ میں سے بھی نکل لاؤں گا۔ آپ آگے فرمائیں۔“

”میں نے اپنی ماں کو اس کے گھر میں نظر بند کر دیا ہے“ — برکیارق نے کہا — ”در اصل میری ماں نے ہی لوگوں کو بھڑکایا تھا کہ اور یزی کو ناحق قید کیا جا رہا ہے۔ وہ میری ماں نہ ہوتی تو میں اسی وقت اسے جلاد کے حوالے کر دیتا۔ آپ نے یہ نگرانی کرنی ہے کہ میری ماں تک میرے دونوں بھائیوں کے سوا کوئی نہ جائے۔“

”یہ آپ کے کردار کی بلندی ہے سلطان محترم!“ — وزیر اعظم سمیری نے کہا —

”یہ آپ کے ایمان کی پختگی ہے کہ آپ اس قسم کی ماں کا اتنا احترام کر رہے ہیں۔ گستاخی نہ ہو اور آپ معاف کر دیں تو کہوں کہ آپ کی ماں میں وہ جذبہ اور وہ عظمت نہیں جو آپ کے والد مرحوم سلطان ملک شاہ میں تھی۔ آپ اپنے والد مرحوم کے صحیح جانشین ہیں۔“

”آپ دانشمند ہیں“ — برکیارق نے وزیر اعظم سے کہا — ”مجھے معلوم ہے کہ میری ماں آپ کا بہت احترام کرتی ہے۔ آپ اس کے پاس جائیں اور اسے اور دونوں بھائیوں کو کچھ ہندو نصیحت کریں کہ وہ میرے لئے مشکلات پیدا نہ کریں اور میرے ساتھ تعاون کریں۔ وہ میری نہیں مانتے۔“

”بات کچھ اور ہے“ — روزینہ نے کہا — ”سلطان برکیارق نے مجھے بے سہارا اور یتیم سمجھ کر میرے ساتھ شادی کر لی ہے۔ ان کی ماں کو ان کا یہ فیصلہ اچھا نہیں لگا۔ وہ یہ تو سمجھ ہی نہیں رہیں کہ میں سلطان کی بیوی کم، لونڈی زیادہ ہوں۔ میں تو ان کی خدمت کے لئے اور ان کو سکون دینے کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکی ہوں۔“

”میں سب سمجھتا ہوں“ — وزیر اعظم سیری نے کہا — ”آپ سلطان کے لئے بہت ایثار کر رہی ہیں۔ سلطان محترم! آپ نے جو احکام آج صلوٰۃ فرمائے ہیں، میں انہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ میں آپ کی والدہ اور بھائیوں کے پاس جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں اور برملا کہوں گا کہ آپ کی والدہ کا دل غ چل گیا ہے۔ میں سلطنت کی بقا اور سلامتی کا واسطہ دے کر انہیں اور آپ کے بھائیوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ میری بات سن لیں گے۔“

سلطان برکیارق نے وزیر اعظم کو جانے کی اجازت دے دی۔ وزیر اعظم جانے لگا تو اس نے برکیارق کی نظر بچا کر روزینہ کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ وہ باہر نکلا تو روزینہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ کچھ آگے جا کر دونوں ایک کمرے میں چلے گئے۔

”کوئی خاص بات ہے؟“ — روزینہ نے وزیر اعظم سے رازدارانہ لہجے میں

پوچھا۔

”سلطان بہت ہی پریشان ہیں“ — وزیر اعظم نے کہا — ”میں جانتا ہوں کہ آپ ان کا بہت زیادہ اور ہر وقت خیال رکھتی ہیں لیکن انہیں مزید سکون اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ میں آپ کے جذبہ ایثار کی تعریف کر ہی نہیں سکتا، پھر بھی میں آپ سے کہتا ہوں کہ سلطان کو اور زیادہ سکون اور سہارے کی ضرورت ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ماں اور بھائیوں نے ان کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ میں یہی کچھ کر سکتا ہوں کہ سلطان کی ذمہ داریاں خود سنبھال لوں لیکن گھر میں آپ نے ان کا خیال رکھنا ہے جو آپ رکھ ہی رہی ہیں..... میں نے بس اتنی سی بات کہنی تھی۔“

”مجھے آپ کے ہی تعاون کی ضرورت ہے“ — روزینہ نے کہا اور وزیراعظم سمیری کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔
وزیراعظم عبدالرحمن سمیری نے مشفق باپ کی طرح روزینہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور چلا گیا۔



جس وقت وزیراعظم سمیری سلطان برکیارق سے اس کے احکام اور روزینہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا، اُس وقت مزل آفندی محمد اور سخر کے پاس بیٹھا انہی مسائل پر باتیں کر اور سن رہا تھا۔ اسے خبر ملی تھی کہ سلار اور یزی کو کچھ جملہ آوروں نے رہا کر لیا ہے تو اُسی وقت محمد اور سخر کے پاس آگیا تھا۔ محمد نے اسے سنایا کہ برکیارق نے مل کو نظر بند کر دیا ہے۔

”برکیارق نہ کہو“ — مزل آفندی نے کہا — ”روزینہ کہو..... سلطان برکیارق کی حیثیت اتنی ہے کہ وہ سلطان ہے۔ فیصلے روزینہ کرتی ہے..... یہ بات کوئی نئی نہیں“ میں بات کرنے آیا ہوں کہ سلار اور یزی کی رہائی ہمارے لئے بہت ہی خوشگوار بات ہے۔ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ ہمارا محاذ مضبوط ہے۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ مجھے پتہ چل جائے کہ سلار اور یزی کہاں روپوش ہے تو میں اُس کے پاس چلا جاؤں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ ادھر ہم کیا کریں۔“

وہ خاصی باتیں کر چکے تھے اور اب یہ سوچ رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ وزیراعظم عبدالرحمن سمیری کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر مزل، محمد اور سخر تعظیماً ”اٹھ کھڑے ہوئے۔ وزیراعظم نے تینوں سے ہاتھ ملایا اور سب بیٹھ گئے۔“
”کہو لڑکو!“ — وزیراعظم سمیری نے پوچھا — ”کیا باتیں ہو رہی ہیں..... مزل! تمہیں بڑے عرصے بعد دیکھا ہے۔“

”آپ تو جانتے ہیں کہ ہم کیا باتیں کر رہے ہوں گے“ — محمد نے کہا — ”سلار اور یزی کی رہائی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مزل اس سلسلے میں آیا ہے۔ اچھا ہوا آپ بھی آ گئے۔ نہ آتے تو میں آپ کے پاس آ جاتا۔“

”سلطان نے طلب فرمایا تھا“ — ”وزیراعظم نے کہا — ”انہوں نے اپنے وہ احکام اور فیصلے مجھے سنائے ہیں جو انہوں نے آج صادر فرمائے ہیں۔ آپ کی والدہ محترمہ

کو نظر بند کر دیا گیا ہے۔ یہ تو کہنے والی بات ہی نہیں نہ کہنے کی مزید ضرورت ہے کہ روزیہ نے تو سلطان کو بولنے ہی نہیں دیا..... ایک حکم مجھے اور ملا ہے۔ وہ یہ کہ میں تم دونوں اور آپ کی والدہ کو سمجھاؤں کہ آپ سب سلطان سے تعاون کریں اور ان کے لئے مزید پریشائیاں پیدا نہ کریں۔“

”آج اپنی ماں کو نظر بند کیا ہے“ — منزل نے کہا — ”کچھ دنوں بعد دونوں بھائیوں کو سزائے موت دے دے گا۔“

”وہاں تک نویت نہیں پہنچنے دی جائے گی“ — وزیر اعظم نے کہا — ”میں زندہ اور سلامت موجود ہوں۔ میں سلطان اور سلطانہ کی جڑوں میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اگر تم لوگ مجھے ان کے ساتھ باتیں کرتے اور ان کی باتیں سنتے دیکھو اور میں وہاں جو غلامانہ حرکتیں کرتا ہوں، تم دیکھ لو تو میرے ساتھ بات کرنا بھی گوارہ نہ کرو۔ تم کو گے کہ یہ تو کوئی خاندانی غلام ہے لیکن میں نے دونوں کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ روزیہ تو میری مرید بن گئی ہے۔ اب یہ سوچنا ہے کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔ اور یزی کی رہائی ہمارے محاذ کی بہت بڑی کامیابی ہے۔“

”میں صرف ایک بات جانتا چاہتا ہوں“ — منزل نے کہا — ”اور یزی کہاں روپوش ہے؟ میں اُس تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اُس سے ہدایات لینی ہیں کہ میں کیا کروں۔“

”آج رات کو نہیں تو کل تک مجھے یہ پتہ چل جائے گا“ — ”وزیر اعظم سیری نے کہا — ”تم نے اُس سے کوئی ہدایت نہیں لینی نہ اُس کے پاس جانا ہے۔ سلطنت کے سرکاری مخبر اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کے پیچھے وہاں تک پہنچ جائیں۔ تم لوگوں کو اب جو ہدایات ملیں گی وہ مجھ سے ملیں گی۔“

”بات یہ ہے محترم!“ — محمد نے کہا — ”منزل بہت ہی بیتاب ہو رہا ہے کہ باغیوں کے خلاف کسی جارحانہ کارروائی میں شامل ہو۔“

”بیتاب نہیں ہونا منزل!“ — وزیر اعظم نے کہا — ”اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھنا ہے اور جذبات کو قابو میں رکھنے کی شدید ضرورت ہے..... میری ایک بات غور سے سن لو۔ تم ابھی اُن جنگوں کو ذہن میں لئے لئے پھرتے ہو جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑی تھیں اور پھر حضرت خالد بن ولیدؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور ان جیسے سپہ سالاروں

نے لڑی تھیں۔ ہمارے دلوں میں وہ عسکری روایات تو زندہ موجود ہیں لیکن اب جس جنگ کا ہمیں سامنا ہے وہ ان غزوات اور بعد کی لڑائیوں سے بالکل ہی مختلف ہے۔ ہماری روایت تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے کفار کا مقابلہ میدانوں میں کیا ہے۔ ایک ہزار کو تین سو تیرہ نے اور سو لاکھ کے لشکر کو صرف چالیس ہزار کے لشکر نے شکست دی تھیں۔ انہوں نے رومیوں اور فارسیوں کو ہر میدان میں شکست دی۔ وہ آنے والے سامنے کی لڑائیاں تھیں لیکن اب ہمارا پالا جس دشمن کے ساتھ پڑا ہے وہ میدان میں نہیں آ رہا بلکہ زمین کے نیچے سے وار کر رہا ہے۔ مسلمان اس قسم کی جنگ سے واقف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج یہ سلطنت ایک بھیانک خطرے میں پڑ گئی ہے۔ شاید تم جانتے ہو گے کہ اس شہر میں بے شمار باطنی پہنچ چکے ہیں اور ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان میں حسن بن صباح کے فدائی بھی ہیں جو صرف یہ جانتے ہیں کہ قتل کر کے قتل ہو جانا ہے۔ ہمیں اب زمین کے اوپر بھی لڑنا ہے اور زمین کے نیچے بھی۔“

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں“ — مزل نے کہا — ”جس طرح حسن بن صباح نے روزینہ کو بڑی ہی حسین اور زہریلی ناگن بنا کر سلطنت کی بالائی سطح پر پہنچا دیا ہے اسی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ ایسی ہی ایک ناگن وہاں بھیجی جائے جو روزینہ کا زہر مار ڈالے۔“

”ایسی ناگن کہاں سے لاؤ گے؟“ — وزیر اعظم نے پوچھا۔

”وہ میرے پاس ہے“ — مزل نے جواب دیا — ”اس کا نام شمونہ ہے۔ محمد اور خنجر اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ بڑا اچھا اتفاق ہے کہ برکیارق نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ لڑکی ہے اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حسن بن صباح اور بائیسوں کے خلاف دل میں انتقام کی آگ لئے پھرتی ہے۔“

”میں اسے جانتا ہوں“ — وزیر اعظم نے کہا — ”اسے دیکھا بھی ہے۔ شکل و صورت اور جسم کی کشش کے لحاظ سے وہ موزوں لڑکی ہے لیکن ایسی کارروائیاں کرنے سے پہلے ہمیں بہت کچھ سوچنا پڑے گا۔“

”آپ نے اسے صرف دیکھا ہے؟“ — مزل نے کہا — ”اس کے انتقامی جذبے کا اندازہ اس سے کریں کہ اُس کے دل میں میری محبت موزن ہے اور وہ فیصلہ کر چکی ہے کہ شادی میرے ساتھ ہی کرے گی۔ اُس کی ماں بھی ہمارے ساتھ ہے لیکن شمونہ

کہتی ہے کہ میں جب تک حسن بن صباح پر انتقامی وارنہ کر لوں، شادی نہیں کر لی گی۔
اگر آپ کہیں تو وہ بڑے آرام سے روزینہ کو زہر دے کر یا ویسے کسی ہتھیار سے سے
قتل بھی کر آئے گی۔“

”میں پھر یہی کہوں گا کہ اسے استعمال کریں گے لیکن سوچ سمجھ کر“ — وزیر اعظم
نے کہا — ”ابھی میں نے ایک خفیہ کارروائی کرنی ہے۔ وہ تم تینوں اچھی طرح سن لو۔
آج سے تیسری رات ان خیموں کو فوج محاصرے میں لے گی جن میں ہر طرف کئے جانے
والے فوجی رہتے ہیں۔ سلطان نے مجھے بتایا ہے کہ ان خیموں کی بستی کو محاصرے میں
لے کر تمام سابق فوجیوں کو جگایا اور اکٹھا کیا جائے گا۔ اور یزی کو قید خانے لے جانے
والے محافظوں میں سے جو ایک بچ گیا ہے وہ ان آدمیوں میں سے حملہ آوروں کو شناخت
کرے گا۔ بعض کو سپہ سالار مجازی شناخت کرے گا۔ صاف ظاہر ہے جو پکڑے جائیں
گے، انہیں اگلے ہی روز سزائے موت دے دی جائے گی۔ میں نے یہ بندوبست کرنا ہے
کہ ایسا کوئی آدمی نہ پکڑا جائے۔“

”اس کارروائی میں ایک خطرہ اور بھی ہے“ — محمد نے کہا — ”سپہ سالار مجازی
انتابد طینت آدمی ہے کہ وہ ویسے ہی پندرہ بیس آدمیوں کو الگ کر کے دے گا کہ یہ
تھے وہ حملہ آور اور اگلے روز ان کے سر کنوا دے گا..... ہمارے پاس ان لوگوں کو پہچانے
کا کوئی انتظام نہیں۔“

”میں کچھ نہ کچھ بندوبست کر لوں گا“ — وزیر اعظم نے کہا — ”اگر میرا انتظام
ناکام رہا تو میں ایسی خفیہ کارروائی کراؤں گا کہ جب ان لوگوں کو سزائے موت کے لئے
لے جائیں گے تو انہیں رہا کر لیا جائے..... اصل بات یہ ہے کہ اب خون خرابہ ہو کر
رہے گا۔ میرے آدمی فوج میں بھی موجود ہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ جاسوسی اور
مخبری کام میں نے اپنا ایک ذاتی نظام بھی قائم کر رکھا ہے۔“

”ان حالات اور واقعات کی پوری اطلاع رے پہنچی چاہئے“ — محمد نے کہا —
”ابو مسلم رازی نے مجھے خاص طور پر کہا تھا کہ حالات میں کوئی ذرا سی بھی اچھی یا بُری
تبدیلی آئے، انہیں فوراً اطلاع ملنی چاہئے۔“

”ہاں، یہ بہت ہی ضروری ہے“ — وزیر اعظم نے کہا — ”کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ
مزل ابھی روانہ ہو جائے؟ میں اپنا آدمی اتنی دور نہیں بھیجوں گا۔ میرے خاص اور خفیہ

آدمی دوسرے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔“

”میں ابھی روانہ ہو جاتا ہوں“ — منزل نے کہا — ”حالات اور واقعات مجھے

معلوم ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہاں کیا بات کرنی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ فوجی نیتے ہیں جنہیں فوج سے برطرف کیا جا رہا ہے۔ ان کے لئے ہتھیاروں اور گھوڑوں کا انتظام کرنا ہے۔ ہماری یہ ضرورت ابو مسلم رازی ہی پوری کر سکتے ہیں۔“

”وہ تو ہر طرح کی مدد دینے کا وعدہ کر چکے ہیں“ — محمد نے کہا — ”انہوں نے تو یہاں تک کہا تھا کہ وہ اپنی پوری فوج یہاں بھیج دیں گے۔“

”پھر میں چلتا ہوں!“ — منزل نے کہا — ”آپ شمونہ پر غور کرنا۔ وہ کسی طرح سلطان اور روزینہ تک پہنچ جائے تو اور کوئی شدید کارروائی کرے نہ کرے، جاسوسی اور مخبری تو کرے گی ہی، یہ بھی تو ہماری ضرورت ہے۔“

”تم واپس آ جاؤ تو یہ بات بھی کر لیں گے“ — ”وزیر اعظم سمیری نے کہا — ”یہ کام کرنا ہی پڑے گا..... تم جاؤ تیار ہو کر روانہ ہو جاؤ..... خالی ہاتھ نہ چل پڑنا۔ تمہارے پاس دو یا تین ہتھیار ہونے چاہئیں اور گھوڑا کمزور نہ ہو۔“



اُسی رات کا واقعہ ہے، برطرف کئے جانے والے فوجیوں کے خیموں سے ذرا ہی پرے تین آدمی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک آدمی اٹھا اور خراں خراں کچھ دُور تک چلا گیا۔ وہ ایک جگہ رکا، پھر واپس ہوا اور اپنے ساتھیوں میں جا بیٹھا۔ اس کیمپ میں خیموں کی تعداد کچھ کم نہیں تھی۔ بارہ چودہ ہزار آدمی رہتے تھے۔ ہر خیمے میں پانچ چھ آدمیوں کی رہائش تھی۔

آدمی رات کے کچھ وقت بعد کسی خیمے میں سے ایک آدمی اٹھا اور خیموں کی بستی میں سے باہر نکل گیا۔ وہ پیشاب کرنے گیا تھا۔ وہ ایک جگہ رکا ہی تھا کہ اچانک پیچھے سے ایک آدمی نے جھپٹ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور پیشتر اس کے کہ اسے پتہ چلنا کہ یہ کون ہے کہ ایک مخنجر اُس کے سینے میں اُس جگہ اُتر گیا جہاں دل ہوتا ہے۔ یہ مخنجر وہاں سے نکلا اور ایک بار پھر اس کے سینے میں داخل ہو گیا۔ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھا گیا تھا اس لئے اس کی آواز نہیں نکلی تھی۔ وہ گرا اور مر گیا۔

وہ تینوں آدمی اس کی لاش وہیں چھوڑ کر ایک اور طرف چلے گئے اور ایک جگہ

چھپ کر بیٹھ گئے۔

”آج رات کم از کم تین آدمی مارنے ہیں“ — ”ان تینوں میں سے ایک نے کہا۔
”انہیں خاصی دیر انتظار کرنا پڑا۔ پھر ایک اور آدمی خیمے میں سے باہر نکلتا نظر آیا۔
یہ تینوں قاتل بے پاؤں سرکتے، جھکے ہوئے اور نہایت آہستہ آہستہ چلتے اس آدمی کے
عقب میں پہنچ گئے۔ اس آدمی کو بھی انہوں نے اسی طرح قتل کیا اور اس کی لاش وہیں
پھینک کر دوسری طرف جھاڑیوں کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ کسی اوٹ میں بیٹھنے کی
ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ رات تاریک تھی۔

اس طرح صبح کاذب تک انہوں نے تیسرے آدمی کو بھی قتل کیا اور وہاں سے چلے
گئے۔ انہوں نے آبادی میں جا کر ایک دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ہلکی کی میاؤں کی
آواز آئی۔ باہر کھڑے تین میں سے ایک آدمی نے اسی طرح ہلکی کی آواز میں میاؤں کیا
اور دروازہ کھل گیا۔ تینوں اندر گئے اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔ دروازہ کھولنے والا انہیں
ایک کمرے میں لے گیا اور دیا جلایا۔

”تمہارے کپڑے بتا رہے ہیں کہ تم کام کر آئے ہو“ — اس آدمی نے کہا اور
پوچھا — ”کتنے؟“

”تین!“ — ایک نے جواب دیا — ”آج رات اتنے ہی کافی ہیں۔“
”ہاں، امام کے نام پر آج کی رات اتنے ہی کافی ہیں“ — اس آدمی نے کہا —
”باقی قتل و غارت وہ خود ہی آپس میں کر لیں گے..... اب تم سو جاؤ اگلا کام کرنے والے
جلدی اٹھ جائیں گے۔ انہیں میں اطلاع دے دوں گا۔“

یہ اُس طبیب کا گھر تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے ہاتھ میں شفا ہے۔ اسی
نے اپنے آدمیوں کو یہ حکم سنایا تھا کہ اَلْمَوْتُ سے امام کا حکم آیا ہے کہ مَرُو کو خون میں ڈبو
دو۔ ہر روز تین چار آدمی قتل ہونے چاہئیں۔



اگلی صبح خیموں کی اس بستی میں جب یہ خبر پہنچی کہ ان کے تین ساتھی باہر مرے
پڑے ہیں اور انہیں خنجر لگے ہیں تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہزار ہا سابق فوجی اکٹھے ہو گئے۔
راہ جاتے لوگ بھی وہیں رک گئے شہر میں خبر پہنچی تو لوگ اُدھر ہی کو اُٹھ دوڑے۔
ایک آواز اٹھی کہ فوجیوں نے یعنی اُن فوجیوں نے جنہیں فوج میں رکھا جا رہا تھا،

اپنے عہدے دار کے خون کا بدلہ لیا ہے۔ یہ آواز ہوا کے تیز جھونکے کی طرح ہر طرف پھیل گئی اور ذرا سی دیر میں یہی بات ہر کسی کی زبان پر تھی کہ حاضر فوجیوں نے سابق فوجیوں کے تین بندے مار ڈالے ہیں۔

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ فوج میں رہنے والے ایک عہدے دار کی لاش ملی تھی اور یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ فوج میں سے نکالے جانے والے دو آدمیوں نے اسے قتل کیا ہے۔ سپہ سالار حجازی نے ویسے ہی کسی ثبوت اور شہادت کے بغیر سابق فوجیوں کے دو آدمی پکڑ جلاؤں کے حوالے کر دیئے تھے۔ اس نے ایسا فساد اٹھا جو خانہ جنگی کی صورت اختیار کر گیا۔

سپہ سالار ابو جعفر حجازی کو اطلاع ملی تو وہ اپنے محافظوں کو ساتھ لئے گھوڑا دوڑاتا پہنچا۔ خیموں میں رہنے والے سابق فوجیوں نے اسے گھیر لیا۔ اس قدر شور و غل اور احتجاج کا ایسا ہنگامہ کہ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ سپہ سالار حجازی نے بڑی مشکل سے سب کو خاموش کروایا اور کہا کہ کوئی ایک ذمہ دار آدمی بات کرے۔

”میں بات کرتا ہوں“ — ایک نائب سالار سب کی نمائندگی میں بولنے لگا۔ اسے بھی فوج سے برطرف کیا جا رہا تھا اور وہ ان ہی خیموں میں رہتا تھا۔ اس نے کہا — ”حاضر نوکری کا ایک عہدے دار قتل ہو گیا تو ہمارے دو آدمیوں کو ویسے ہی پکڑ لیا گیا تھا۔ اب ہمارے تین آدمی قتل ہو گئے ہیں، حاضر فوجیوں کے چھ آدمی پکڑ کر ہمارے سامنے جلاؤں کے حوالے کئے جائیں۔“

سپہ سالار حجازی نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ وہ سلطان کے پاس جا رہا ہے اور وہاں سے حکم لے کر واپس آئے گا۔

حجازی سلطان برکیارق کے پاس جانے کی بجائے وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری کے پاس چلا گیا اور اُسے بتایا کہ پہلے اُدھر سے ایک آدمی قتل ہوا تھا اور اب اُدھر سے خیموں میں رہنے والے تین آدمی قتل ہو گئے ہیں۔ وزیر اعظم نے سپہ سالار حجازی کو ساتھ لیا اور دونوں سلطان برکیارق کے پاس چلے گئے۔ اسے نئی واردات سنائی۔

”سلطان علی مقام!“ — سپہ سالار حجازی نے کہا — ”میں تو یہ سمجھا ہوں کہ حاضر اور برطرف فوجیوں میں دشمنی پیدا ہو گئی ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ہر طرف شدہ فوجیوں کو فارغ کر کے گھروں کو بھیج دیا جائے۔“

”ایسا ہرگز نہ کرنا“ — وزیر اعظم نے کہا — ”یہاں وہ نہتے پڑے ہیں انہیں فارغ کیا گیا تو یہ ہتھیار اٹھالیں گے اور بڑا ہنگامہ ہو گا۔“

وزیر اعظم سمیری نے یہ جو مشورہ دیا تھا اس سے اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ اس کا جو منصوبہ تھا اس کے مطابق وہ ان سابق فوجیوں کو یہیں رکھنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی خفیہ فوج تھی جسے اس نے خانہ جنگی کی صورت میں سلطان کی فوج کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ اس نے سلطان برکیارق سے منوالیا کہ انہیں ابھی یہاں سے جانے نہیں دیا جائے گا۔ اُدھر خیموں میں رہنے والے سابق فوجی للکار رہے تھے کہ وہ اپنے مقتولوں کا بدلہ لیں گے۔ شہر میں بھی یہی افواہ گردش کر رہی تھی کہ حاضر فوجیوں نے سابق فوجیوں کے تین آدمی قتل کر دیئے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ یہ غلط ہے۔ بعض جگہوں پر شہری ایک دوسرے سے الجھ بھی پڑے۔

ابھی کسی کے ذہن میں شک تک نہیں آیا تھا کہ یہ آگ لگانے والے باہر کے لوگ ہیں اور وہ ایسی صورت حال پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ہو چکی ہے۔ یہ افواہیں حسن بن مباح کے آدمی پھیلا رہے تھے۔

سپہ سالار حجازی کے ساتھ وزیر اعظم بھی خیموں کی بستی میں گیا اور اس نے بڑی مشکل سے ان لوگوں کو ٹھنڈا کیا اور کہا کہ قاتل بچ کر نہیں جائیں گے۔



حسن بن مباح کا ڈنکا دُور دُور تک بجنے لگا تھا۔ اس کی مقبولیت بڑی تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی۔ اس تبلیغ کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ کسی قبیلے کے سردار کو حوروں جیسی حسین لڑکیوں اور حشیش کے ذریعے اپنے دام کفر میں پھانس لیتا تھا۔ پھر اسے یہ تاثر دیتا کہ اسے اسلام سے خارج نہیں کرایا جا رہا بلکہ اسلام کے دائرے میں لایا جا رہا ہے۔ حسن بن مباح نے جو دائرہ بنا رکھا تھا اسے وہ اسلام ہی کہتا تھا لیکن اس میں ہر گناہ کی کھلی اجازت تھی۔ قبیلے کے اس سردار کو وہ ذہنی اور روحانی طور پر اپنی بڑی ہی خوبصورت اور چمکتی ہوئی زنجیروں میں جکڑ لیتا اور پھر اس سے اس قبیلے کو حکم دلواتا کہ وہ سب باطنی عقیدے کے قائل ہو جائیں اور حسن بن مباح کو اپنا امام یا نبی مان لیں۔

اگر کسی قبیلے کے سردار نے اس کی مخالفت کرنے کی کوشش کی تو اسے حسن بن مباح نے اپنے فدائین کے ہاتھوں قتل کروا ڈالا۔ پھر اس قبیلے کو ایسے شعبدے دکھائے

کہ لوگوں نے اس کی امامت کو تسلیم کر لیا۔ اس کے ابلیسی عقائد کے فروغ اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا راستہ روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اسے صرف سلطنت سلجوقیہ کی طرف سے خطرہ تھا لیکن اس کے ابلیسی دماغ نے ایسی زمین دوز چالیں چلیں کہ اس سلطنت کے حکمران طبقے کو آپس میں ہی ٹکرا دیا اور وہاں خانہ جنگی کا بیج بو ڈالا جو پھوٹ کر باہر نکلا اور ہر ابھرا ہو کر پھیل رہا تھا۔ اصفہان تو بانیوں کا ہی شہر بنتا جا رہا تھا۔ پھر وہ رات آئی جس رات فوج نے برطرف کئے ہوئے فوجیوں کے خیموں کو محاصرے میں لیتا اور خیموں میں سوئے ہوئے آدمیوں کو جگا کر ایک جگہ کھڑا کرنا تھا۔ آدمی رات کا وقت ہو گا جب وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری اور سپہ سالار ابو جعفر حجازی فوجیوں کی بارکوں میں پہنچ گئے۔ فوج کو بتا دیا گیا تھا کہ رات کو خیموں کے پورے علاقے کو محاصرے میں لیتا ہے۔ فوجیوں کو بڑی سختی سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ باہر کے کسی بھی شخص کو نہ بتائیں کہ آج رات کیا ہونے والا ہے۔

فوج تیار ہو کر باہر ایک ترتیب میں کھڑی تھی۔ پہلے وزیر اعظم سمیری نے ان فوجیوں سے خطاب کیا۔ اس نے کہا کہ عہدے دار کے قاتل اور اوریزی کو محافظوں سے رہائی دلانے والے انہی آدمیوں میں سے ہیں۔ انہیں شناخت کرنا ہو گا پھر سپہ سالار حجازی نے فوجیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے چند ایک باتیں کیں۔

فوج چل پڑی۔ اس فوج کے پاس تلواریں بھی تھیں اور برچھیاں بھی۔ بعض سپاہیوں کے پاس مشطیں بھی تھیں جنہیں حکم ملنے پر جلانا تھا۔ ان فوجیوں کو یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ یہ کوئی حملہ نہیں بلکہ اس محاصرے کا مطلب کچھ اور ہے اس لئے کسی پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے اور کسی کو قتل نہ کیا جائے۔ فوجی خود بھی جانتے تھے کہ جنہیں وہ محاصرے میں لینے جا رہے ہیں وہ نیتے ہیں اور برہمنوں اور تلواروں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں۔

یہ فوجی پیدل جا رہے تھے۔ ان کی بارکیں شہر کے ایک طرف تھیں اور خیمے شہر کے دوسری طرف اور شہر سے ہٹ کر تھے۔ فوجیوں نے مکمل خاموشی اختیار کر کے جانا تھا تاکہ جنہیں محاصرے میں لیتا تھا وہ بیدار نہ ہو جائیں۔ سپہ سالار حجازی ان کے ساتھ تھا۔ وزیر اعظم پیچھے رک گیا تھا۔ اس نے اس کارروائی کی نگرانی کرنی تھی۔

فوج خیمہ گاہ سے کچھ دور ہی محاصرے کی ترتیب میں ہو گئی اور پھر اس نے خیمہ گاہ

کی طرف پیش قدمی شروع کی خیمہ گاہ کے قریب پہنچ کر جس طرح انہیں پہلے بتا دیا گیا تھا، فوج رک گئی۔

صرف ایک مشعل بردار سپاہی کو کہا گیا کہ وہ مشعل جلا لے، یہ سپاہی سپہ سالار مجازی کے ساتھ تھا۔ مجازی نے ہی اسے مشعل جلانے کو کہا تھا۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ جس جس سپاہی کے پاس مشعل ہے وہ جلا لیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں مشعلیں جل اٹھیں اور رات دن میں تبدیل ہو گئی۔ خیموں میں سابق فوجی اتنی گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ کسی ایک کی بھی آنکھ نہ کھلی۔ اگلا اشارہ ملا تو فوجی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ انہیں تلواریں نیاموں سے نکالنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی نہ ہی برہمچیاں لڑائی کے انداز میں تن کر آگے بڑھنا تھا کیونکہ یہ حملہ نہیں تھا۔

پہلے خیمے کے پردے اٹھائے گئے اور مشعل کی روشنی میں اندر دیکھا گیا تو وہاں کوئی ایک بھی آدمی نہیں تھا جس خیمے کو بھی دیکھا گیا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

اچانک عقب سے دوڑتے قدموں کی آوازیں اس طرح سنائی دیں جیسے طوفان آ رہا ہو اور اس کے آگے نہ جانے کیا کیا اڑتا اور بہتا آ رہا ہو۔ پیشتر اس کے کہ فوجی سمجھ پاتے کہ یہ کیا آ رہا ہے، ان پر حملہ ہو گیا۔

حملہ اس نوعیت کا تھا کہ ایک ایک فوجی کو ایک ایک دو دو آدمیوں نے پیچھے سے پکڑ لیا۔ کسی نے کسی فوجی کی تلوار نکال لی اور کسی نے مشعل بردار سپاہی سے مشعل چھین لی۔ یہ بڑی مشعلیں تھیں جو ڈنڈوں کے اوپر کپڑے باندھ کر اور اس پر تیل ڈال کر جلائی گئی تھیں۔ فوجی جو ذرا سنبھل گئے یا بروقت چوکتے ہو گئے تھے، انہوں نے تلواریں نکال لیں اور جن کی تلواریں چھینی گئی تھیں انہوں نے لڑائی کے انداز میں برہمچیاں تن لیں۔ اس کے بعد بڑی ہی خونریز جھڑپ ہوئی۔ بعض فوجیوں کو ان سے چھینی ہوئی مشعلوں سے ہی جلا دیا گیا۔ ان کے کپڑوں کو آگ لگی تو وہ ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگے اور جل کر مارتے رہے۔

سپہ سالار مجازی حیران اور پریشان ہو گیا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ اس کے لئے اس صورت حال پر قابو پانا ناممکن تھا وہ بارکوں کی طرف بھاگا۔ اس کے دو محافظ اس کے ساتھ تھے۔ دوڑتے دوڑتے وہ بارکوں میں پہنچا اور حکم دیا کہ فوج تیار ہو کر فوراً خیمہ گاہ میں پہنچے۔

یہ حکم دے کر وہ اس جگہ پہنچا جہاں وزیر اعظم نے اسے کہا تھا کہ وہ موجود رہے گا۔ اس نے وزیر اعظم کو بتایا کہ وہاں تو کچھ اور ہی ہو گیا ہے۔ خیمے خالی تھے اور فوج پر پیچھے سے حملہ ہو گیا۔ حجازی نے یہ بھی بتایا کہ وہ مزید فوج بھیج رہا ہے۔

”میں جان گیا ہوں“ — وزیر اعظم سمیری نے کہا — ”ہماری یہ کارروائی راز میں نہیں رہ سکی۔ کسی مخبر نے قبل از وقت خیمہ گاہ میں یہ راز پہنچا دیا ہو گا۔“

وزیر اعظم سپہ سالار حجازی کے ساتھ خیمہ گاہ کی طرف چلا گیا۔ خیمہ گاہ سے شعلے اٹھ رہے تھے جن کی روشنی شہر میں آرہی تھی۔ بعض شہری جاگ اٹھے اور چھتوں پر جا کر دیکھنے لگے کہ یہ آگ کہاں لگی ہوئی ہے۔ سپہ سالار حجازی اور وزیر اعظم نے دور سے ہی خیمہ گاہ دیکھ لی۔ وہاں تو باقاعدہ میدان جنگ جیسی لڑائی ہو رہی تھی اور شعلے جو اٹھ رہے تھے یہ جلتے ہوئے خیموں کے تھے۔ مشطیں بھی لڑائی میں ہتھیاروں کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں۔ بعض سپاہیوں کے ہاتھوں سے مشطیں خیموں کے اوپر یا اندر گریں تو چند ایک خیمے جلنے لگے۔

اُدھر سے مزید فوج برہمیوں اور تلواروں سے مسلح سرپٹ دوڑتی آرہی تھی۔ جب یہ فوج میدان جنگ میں پہنچی تو وہاں لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ صرف یہ نظر آیا کہ کچھ آدمی جنگل کی طرف دوڑے جا رہے تھے اور ذرا آگے جا کر غائب ہو گئے۔ کسی فوجی نے ان کا تعاقب نہ کیا۔

سپہ سالار حجازی اور وزیر اعظم نے خیمہ گاہ میں جا کر دیکھا۔ وہاں فوج کے زخمی تڑپ رہے تھے اور ان کے ساتھ لاشیں بھی پڑی تھیں۔ یہ لاشیں فوجیوں کی بھی تھیں اور ان کی بھی جو فوجی نہیں تھے۔ کچھ دیر بعد یہ راز کھلا کہ یہ وہ فوجی تھے جنہیں فوج سے نکالا جا رہا تھا اور وہ ان خیموں میں رہتے تھے۔

تاریخ کے مطابق یہ راز صرف وزیر اعظم سمیری کو معلوم تھا کہ یہ ہوا کیا تھا۔ حملہ تو فوج کرنے گئی تھی لیکن حملہ اُس پر ہو گیا۔ اس لڑائی کے پیچھے وزیر اعظم کا اپنا ہاتھ تھا۔ جن مورخوں نے یہ واقعہ لکھا ہے وہ اس دور کے دستاویزی حوالے دے کر لکھتے ہیں کہ برطرف کئے جانے والے فوجیوں میں اوریزی کے علاوہ ایک اور سالار اور ایک نائب سالار اور چند ایک تجربہ کار عہدے دار تھے۔ وزیر اعظم سمیری نے انہیں وقت سے خاصا پہلے اپنے مخبروں کے ذریعے بتا دیا تھا کہ آج رات آدمی رات کے وقت انہیں محاصرے

لے کر جگایا جائے گا اور ان میں سے ان آدمیوں کو شناخت کیا جائے گا جنہوں نے اور یزی کو رہا کر لیا تھا۔

وزیر اعظم سمیری نے انہیں یہ طریقہ بتایا تھا کہ جب سارا شہر سو جائے تو یہ تمام برطرف شدہ فوجی ایک ایک دو دو کر کے خیمہ گاہ سے نکل جائیں اور قریب ہی کہیں جا کر چھپ جائیں۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اتنے تھوڑے سے وقت میں پندرہ سولہ ہزار تلواریں فراہم نہیں کی جاسکتی تھیں۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ فوج اپنی تلواریں نیاموں میں رکھے گی اور فوج کا ارادہ لڑائی کا نہیں ہو گا۔ سابق فوجیوں کو یہ کہا گیا کہ وہ اُس وقت خلل ہاتھ ان فوجیوں پر حملہ کریں جب وہ خیموں میں رہنے والوں کو جنگلے جائیں اور ان کی نیاموں سے تلواریں کھینچ لیں اور مشطیں بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور پھر یہ نہ دیکھیں کہ فوج کا ارادہ لڑنے کا تھا یا نہیں۔ انہیں یہ بھی بتادیا گیا تھا کہ وہ لڑائی کے بعد خیمہ گاہ میں نہ آئیں۔ دور پیچھے جنگلوں میں اور پہاڑی علاقے میں چلے جائیں۔ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ انہیں اکٹھا کر لیا جائے گا اور پھر بتایا جائے گا کہ وہ کیا کریں گے۔

وزیر اعظم کا یہ منصوبہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ جب فوج کی کمک پہنچی تو وہاں زخمیوں اور لاشوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا یا جلتے ہوئے خیمے تھے۔



فوج کی کمک جو لڑنے کے لئے آئی تھی، وہ لاشوں اور زخمیوں کو اٹھانے میں مصروف ہو گئی۔ سپہ سالار حجازی بار بار وزیر اعظم سمیری سے پوچھتا تھا کہ آخر یہ ہوا کیسے؟ وزیر اعظم ہر بار گردن کو ذرا سا خم دے کر سر کے اشارے سے یہ تاثر دیتا کہ وہ حیران ہے۔

صبح سویرے سویرے سپہ سالار حجازی اور وزیر اعظم سمیری سلطان برکیارق کے محل کے باہر اس کے جاگنے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت دیر بعد انہیں اندر بلایا گیا۔

وہ جب اندر گئے تو سلطان برکیارق ابھی تک بستر میں تھا۔

”رات کا کلام ٹھیک ہو گیا؟“ — سلطان نے پوچھا — ”کچھ آدمی پہچانے گئے یا نہیں؟“

”وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور بن گیا ہے سلطان محترم!“ — وزیر اعظم سمیری نے کہا

— ”فوج گئی تو تمام خیمے خالی تھے۔ فوج خیموں کو دیکھ ہی رہی تھی کہ ہر طرف سے فوج پر حملہ ہو گیا۔“

سلطان برکیارق جو غنودگی کی کیفیت میں بول رہا تھا، بڑی تیزی سے اٹھ بیٹھا اور آنکھیں پھاڑے ہوئے سپہ سالار حجازی اور وزیر اعظم کو دیکھنے لگا — ”کیا کہہ رہے ہو تم؟“ — سلطان برکیارق نے حیرت زدہ سرگوشی سے پوچھا — ”یا شاید میں ابھی تک نیند میں ہوں اور تمہاری بات سمجھا نہیں!“

”نہیں سلطان محترم!“ — وزیر اعظم نے کہا — ”آپ ٹھیک سن رہے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو خیمہ گاہ میں چل کر دیکھیں وہاں آپ کو خون اور جلے ہوئے خیموں کی راہ نظر آئے گی۔ زخموں کی مرہم پٹی ابھی تک ہو رہی ہے۔“

”لیکن یہ سب ہوا کیسے؟“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”میرے اس حکم سے آپ دونوں واقف تھے۔ میں یہ سمجھا ہوں کہ خیموں میں رہنے والوں کو قبل از وقت پتہ چل گیا تھا کہ میں نے کیا حکم دیا ہے۔ انہوں نے یہ جوابی وار کیا کہ محاصرے سے پہلے ہی وہاں سے نکل گئے اور فوج پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ مجھے یہ بتائیں کہ انہیں یہ اطلاع کس نے دی تھی؟“

”سلطان محترم!“ — وزیر اعظم نے کہا — ”ایک انسان اور ہے جسے آپ کے اس حکم کا علم تھا..... آپ کی بیگم محترمہ..... لیکن میں ان پر شک کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔“

”اور نہ ہی اس پر شک کیا جاسکتا ہے“ — سلطان برکیارق نے کہا۔
 ”یہ کارستانی اوریزی کی معلوم ہوتی ہے“ — سپہ سالار حجازی نے کہا۔
 ”لیکن اس تک یہ خبر کس طرح قبل از وقت پہنچی؟“ — سلطان برکیارق نے غصے سے کہا — ”مجھے اس سوال کا جواب چاہئے۔“

اس سوال کا جواب ملنا ناممکن تھا۔ روزینہ بھی وہاں موجود تھی۔ وہ سلطان برکیارق کی نسبت زیادہ پریشانی کا اظہار کر رہی تھی لیکن دلی طور پر وہ خوش اور مطمئن تھی کہ جو صورت حال حسن بن صباح پیدا کروانا چاہتا تھا وہ پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے سلطان سے کہا کہ اب یہ معلوم کرنا کہ اس کے حکم کی بھنک کس طرح خیمہ گاہ میں پہنچ گئی تھی، بے کار ہے اور وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اب کرنے والا کام یہ ہے کہ فوج کو باہر نکال کر ان لوگوں

کے تعاقب اور تلاش میں بھیجا جائے۔ وہ لوگ جہاں کہیں بھی ہوں ان پر زوردار حملہ کر کے ان کو بالکل ہی ختم کر دیا جائے۔

”ہمیں یہی کارروائی کرنی چاہئے“ — سپہ سالار حجازی نے کہا — ”اگر ہم یہاں سوچتے رہے اور باتیں کرتے رہے تو وہ لوگ بکھر کر ادھر ادھر ہو جائیں گے اور اپنے اپنے گھروں کو جا پہنچیں گے۔ پھر ہم انہیں کہاں کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔ انہیں فوراً پکڑ کر سزا دی جانی چاہئے۔“

”ہاں، ہمیں یہی کرنا چاہئے“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”حجازی! تم فوراً جاؤ اور یہ کارروائی شروع کر دو۔“



شہر میں بھی خبر پھیل گئی تھی کہ رات سابق فوجیوں کی خیمہ گاہ میں بڑی خونریز لڑائی ہوئی ہے۔ طبیب نے جو حسن بن صباح کے اس مشن کو چلا رہا تھا، اپنے آدمیوں کو پہلے ہدایات دے دی تھیں۔ ان کے مطابق ان باغیوں نے شہر میں یہ افواہ پھیلا دی کہ رات فوج نے نہتے لوگوں پر اس وقت حملہ کیا ہے جب وہ سوئے ہوئے تھے۔ اس افواہ نے پورا پورا کام کیا اور لوگوں میں سلطان کی فوج کے خلاف نفرت پیدا ہونے لگی اور ہر کوئی سلطان کو اور فوج کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

لوگ خیمہ گاہ تک پہنچے تو انہیں وہاں جلے ہوئے خیمے نظر آئے اور ہر طرف خون بکھرا اور جما ہوا دیکھا۔ زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔

وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ شہر میں جو افواہیں پھیل گئی ہیں وہ حسن بن صباح کی طرف سے پھیلائی گئی ہیں۔ وزیر اعظم نے اپنے خفیہ آدمیوں کے ذریعے بھی شہریوں کو فوج اور سلطان کے خلاف کرنے کے لئے ایسی ہی افواہیں پھیلا دیں۔ ان سے باغیوں کے محاذ کو تقویت ملی۔ وزیر اعظم جو کچھ زیر زمین ہو کر کر رہا تھا وہ اسلام اور سلطان کے مفاد کے لئے ضروری تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ سلطان برکیارق سلطانی چھوڑ دے اور اس کی جگہ محمد کو سلطان بنایا جائے تاکہ روزیہ کی صورت میں سلطنت پر جو آسیب طاری ہو گیا ہے وہ اتر جائے۔ وزیر اعظم کو اتنا ہی معلوم تھا کہ سلطان برکیارق پر صرف روزیہ غالب ہے۔ یہ حسن بن صباح کی ٹریننگ کا مکمل تھا کہ اس کے فدائی اور دیگر پیروکار کسی کو اپنی موجودگی اور تحریری سرگرمیوں کا پتہ ہی نہیں

چلے دیتے تھے۔

مزل رے کے حاکم ابو مسلم رازی کے پاس پہنچ گیا تھا اور اسے مرو کے حالات بتا دیئے تھے۔

”میں پوری طرح تیار ہوں“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”ایک تو میرے پاس اپنی کچھ فوج ہے جو کلنی تو نہیں لیکن تجربہ کار اور جذبے والی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے شہریوں کو تیار کر رکھا ہے۔ جو نہی ضرورت محسوس ہوئی یہاں سے اچھا خاصا لشکر روانہ کر دوں گا اور اگر میری ضرورت محسوس ہوئی تو میں بھی آجاؤں گا۔“

انہیں ابھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ پیچھے مرو میں کیسا خونریز واقعہ ہو گیا ہے۔ مزل اسی روز وہاں سے واپس چل پڑا۔ ابو مسلم رازی نے اسے محمد اور وزیر اعظم سمیری کے لئے ایک پیغام اور کچھ ہدایات دی تھیں۔

مزل جب واپس آ رہا تھا تو تقریباً ”نصف راستے میں اسے ایک اور آدمی ملا جس کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھے۔ اس نے مزل کو بتایا کہ وہ ابو مسلم رازی کے لئے ایک اور پیغام لے جا رہا ہے۔ اس نے مزل کو تفصیل سے سنایا کہ فوج نے خیمہ گاہ پر حملہ کیا ہے اور بڑی خونریز لڑائی ہوئی ہے، مگر اب فوج ان برطرف شدہ فوجیوں کی تلاش میں جا رہی ہے۔

مزل اس آدمی کے ساتھ واپس رے کی طرف چل پڑا۔ وہ ابو مسلم رازی سے اس نئی صورت حال کے سلسلے میں ہدایات لینا چاہتا تھا۔

فاصلہ خاصا زیادہ تھا۔ یہ دونوں رات کے وقت ابو مسلم رازی کے ہاں پہنچ گئے۔ رازی کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو انہیں فوراً ”اندر بلا لیا گیا۔ قاصد نے اسے مرو کی نئی صورت حال سنائی۔ اس قاصد کو وزیر اعظم سمیری نے بھیجا تھا۔

یہ ایک بڑا ہی اہم اور تاریخی واقعہ تھا جس نے اسلام اور سلطنت سلجوقیہ کو بڑے خطرناک دوراں پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ مورخوں نے اس واقعہ کی زیادہ تفصیلات نہیں لکھیں البتہ ابن اثیر اور ایک یورپی مورخ نے کچھ حالات بیان کئے ہیں۔ ان سے یہ صورت سامنے آتی ہے کہ ابو مسلم رازی نے اپنی فوج اور شہریوں کو ایک میدان میں اکٹھا کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اس اجتماع سے خطاب کیا۔

”اسلام کے شیدائیو! شمع رسالت کے پروالو!“ — ابو مسلم رازی نے انتہائی بلند

آواز میں کہا — ”تمہاری آزمائش کا اور ایثار کا وقت آپہنچا ہے۔ مرو میں نیتے لوگوں پر سلطان کی فوج نے حملہ کر کے قتل عام کیا ہے۔ اس خونریزی کے پیچھے حسن بن صباح کے باطنیوں کا ہاتھ ہے۔ سلطان برکیارق کی بیوی باطنی ہے اور وہ حسن بن صباح کی بھیجی ہوئی ہے۔ اس نے سلطان کو نشہ پلا پلا کر اور اس پر اپنے حسن کا نشہ طاری کر کے دماغی طور پر بے کار کر دیا ہے۔ سلطان کے ایوان سے جو حکم جاری ہو رہے ہیں وہ سلطان کی بیوی سلطان کی زبان سے جاری کرتی ہے۔ وہاں بھائی کو بھائی سے لڑوایا جا رہا ہے اور شہر میں اتنے زیادہ باطنی آچکے ہیں کہ ہمارے اس دار السلطنت پر باطنی قابض ہو گئے ہیں۔ یہاں سوال صرف سلطنت کا نہیں بلکہ تمہارے دین اور ایمان کا سوال ہے۔ اسلام کے نور کو ہمیشہ کے لئے بجھایا جا رہا ہے۔ اگر تمہیں اپنا دین اور اپنا ایمان عزیز ہے تو اللہ کا نام لے کر اٹھو اور باطل کی اس قوت کو اسی طرح کچل کر رکھ دو جس طرح ہمارے آباؤ اجداد نے روم اور فارس کی ہبت ناک قوتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اس سلطنت پر حسن بن صباح کا قبضہ ہو گیا تو تمہاری بیٹیاں اور بہنیں اٹھالی جائیں گی اور تم جانتے ہو کہ انہیں کس طرح اور کہاں کہاں استعمال کیا جائے گا۔ اگر تم میں غیرت ہے تو مسلح ہو کر باہر آ جاؤ اور اپنے سروں پر کفن باندھ لو۔ اپنے دین کو اور اپنی عزت کو شیطانی فرقے سے بچاؤ۔ تم پر ایک شیطانی قوت قابض ہونا چاہتی ہے۔ میں ایک لشکر مرو روانہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو فوج ہے لیکن یہ کافی نہیں۔ جو غیر فوجی اس لشکر کے ساتھ جانا چاہتے ہیں وہ ایک طرف ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ انہیں ہتھیار ملیں گے اور ساری سہولتیں ملیں گی، البتہ گھوڑے خود لائیں گے جو ان کی اپنی ملکیت میں رہیں گے۔“

ابو مسلم رازی کے بولنے کے انداز میں جہاں جوش و خروش اور دین اسلام کی تپش تھی وہاں اس کا انداز بار بار جذباتی ہو جاتا تھا اور دو تین مرتبہ اس پر رقت بھی طاری ہو گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے آدھے شہر ایک طرف ہو گئے۔ وہ حسن بن صباح اور اس کے باطنی فرقے کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ہر طرف سے جہاد جہاد کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ ارد گرد کے مکانوں کی چھتوں پر عورتیں کھڑی تھیں۔ انہوں نے بھی ابو مسلم رازی کا خطاب سنا تھا۔ انہوں نے بھی نعروں کی زبان میں اپنے مردوں کی حوصلہ افزائی

شروع کر دی۔

”امیر شہر رازی!“ — ایک چھت سے ایک عورت کی بڑی بلند آواز آئی —
”اگر معاملہ لڑائی کا ہے تو وہاں عورتوں کی بھی ضرورت ہوگی۔ زخمیوں کو اٹھانا، ان کی
مرہم پٹی اور پانی پلانا عورتوں کا کام ہے۔ ہمیں بھی اس لشکر کے ساتھ بھیج دیں۔“
”اگر نفری کم ہے تو ہم بھی لڑ سکتی ہیں۔“ — دوسری عورت کی آواز آئی۔

”نہیں، ابھی نہیں!“ — ابو مسلم رازی اپنا گھوڑا اس چھت کے قریب دوڑاتا
لے گیا اور رک کر بلند آواز سے کہا — ”جب تک مرد زندہ ہیں، عورتوں کو باہر نہیں
نکالا جائے گا۔ تم مستورات صرف یہ کام کرو کہ اپنے بچوں کو بتاؤ کہ اسلام کیا ہے اور
اسلام کے دشمن کون ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ میری بیٹیوں اور بہنوں میں
جماد کا جذبہ جوش مار رہا ہے۔ تم گھروں میں رہ کر اپنے ان مجاہدوں کے لئے دعا کرتی
رہنا۔“

ابو مسلم رازی کو شاید معلوم ہی ہو گا کہ جن شہریوں کو اکٹھا کر کے وہ جوش دلا رہا تھا
ان میں حسن بن صباح کے فدائین، جاسوس اور دیگر پیروکار بھی موجود تھے۔ ابو مسلم
رازی نے اپنے علاقے میں مسجدوں کے اماموں کے ذریعے حسن بن صباح اور اس کے
ابلیسی عقیدے کے خلاف نفرت پیدا کر دی تھی۔ اس نے جامع مسجد کے خطیب اور
دوسری مسجدوں کے اماموں کو حکم دے رکھا تھا کہ حسن بن صباح کے خلاف بولتے رہا
کریں اور لوگوں کے دلوں پر نقش کر دیں کہ حسن بن صباح سرِ پاپلیس ہے اور وہ اسلام
کا بدترین دشمن ہے۔



دو تین دنوں بعد رے سے اور شہریوں کی کچھ نفری کا ایک لشکر چلا لیکن اسے مرو
نہیں پہنچنا تھا بلکہ مرو کے قریب ایک پہاڑی علاقے میں چھپ کر رہنا تھا۔ منزل اور
دوسرا قاصد اس لشکر کے ساتھ تھا۔ یہ لشکر اگلے روز اس مقام تک پہنچا جہاں اسے پہنچنا
تھا۔ فوج میں دو تجربہ کار سلاہ تھے جن کا جذبہ ان کے تجربے سے زیادہ تیز تھا۔

منزل مرو پہنچا اور سید ہاشم کے پاس گیا۔ وزیر اعظم سمیری کے پاس براہِ راست جانا
مناسب نہیں تھا۔ اس نے محمد کو بتایا کہ ابو مسلم رازی نے ایک لشکر دیا ہے جو فلاں مقام
تک پہنچ گیا ہے اور اسے اگلے حکم کا انتظار ہے۔

”وزیر اعظم نے تمام انتظامات اتنی خوبی سے خفیہ طور پر مکمل کر دیئے ہیں کہ اس لشکر تک یہ ہدایات پہنچ جائیں گی کہ انہیں کیا کرنا ہے“ — محمد نے کہا — ”میں اسی انتظار میں تھا کہ ابو مسلم رازی کوئی لشکر بھیج دیں۔ معلوم نہیں انہوں نے ہتھیاروں کا الگ ذخیرہ بھیجا ہے یا نہیں۔“

”بھیجا ہے“ — منزل نے جواب دیا — ”بے شمار اونٹوں پر تلواریں، برہمچیاں، کمائیں اور تیر لدے ہوئے آئے ہیں۔“

”ہمیں ان ہتھیاروں کی ضرورت تھی“ — محمد نے کہا — ”بر طرف کئے ہوئے فوجیوں کو یہ ہتھیار پہنچانے ہیں۔ یہ انتظام موجود ہے کہ ہتھیار ان تک کس طرح پہنچائے جائیں۔“

اتنے دنوں سے سلطان کی فوج شہر سے دور جنگوں اور پہاڑیوں کے اندر بر طرف فوجیوں کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی، بر طرف کئے ہوئے فوجی بھی آخر عسکری تجربہ رکھتے تھے انہوں نے سرکاری فوج کو نقصان پہنچانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب سرکاری فوج کا کوئی دستہ پہاڑیوں کے اندر گشت کرتا آگے نکل جاتا تو اس کے پچھلے حصے پر بر طرف فوجی حملہ کر دیتے اور چند ایک فوجیوں کو مار کر پہاڑیوں کے اندر ہی ادھر ادھر ہو جاتے۔ ان فوجیوں کی مکمل اور یزی کے ہاتھ میں تھی۔ اور یزی کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ سرکاری فوج بر طرف فوجیوں کی خیمہ گاہ کا محاصرہ کر کے تلاشی لے گی اور کچھ آدمیوں کو گرفتار کیا جائے گا۔ یہ چال اور یزی کے دماغ کی اختراع تھی کہ خیمہ گاہ شام کے بعد خاموشی سے خللی کر دی جائے اور فوجیوں پر عقب سے حملہ کیا جائے۔

اس کی یہ سکیم کامیاب ہو گئی تو اس نے بر طرف فوجیوں کے سالار کو اور دو تین عہدے داروں کو اپنے ساتھ رکھ لیا اور خبر رسانی کا انتظام بھی کر لیا اور سابقہ فوجیوں کو پہاڑیوں کے اندر اور جنگوں میں بکھیر دیا۔ اور یزی تک ہر خبر بروقت پہنچ رہی تھی۔ یہ طریقہ جنگ اسی نے بتایا تھا کہ سرکاری دستوں کے پچھلے حصے پر چھاپہ مارو اور چند ایک آدمیوں کو گھائل کر کے غائب ہو جاؤ۔

سپہ سالار حجازی کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ سلطان برکیارق اُسے ہر روز بلاتا اور پوچھتا تھا کہ بر طرف فوجیوں کا کچھ سراغ ملایا نہیں۔ سپہ سالار حجازی منہ لٹکا کر غلاموں کی طرح یہی ایک جواب دیتا تھا کہ ان کا سراغ تو نہیں ملا لیکن وہ ہر روز ہمارے کسی نہ کسی دستے

کے چند ایک آدمی مار کر غائب ہو جاتے ہیں۔ ایک روز تو اس نے یہ بھی بتایا کہ گزشتہ رات ان باغیوں نے فوج پر شب خون مارا ہے اور بہت سا جلنی نقصان کر کے غائب ہو گئے ہیں۔

ایک روز محمد کو ابو مسلم رازی کا ایک زبانی پیغام ملا وہ یہ تھا کہ اسے یہ دیکھ کر بہت ہی دکھ ہو رہا ہے کہ ہم لوگ جو سلطنت کو نہیں بلکہ اسلام کو فروغ دے رہے تھے اب اپنا ہی خون بہا رہے ہیں۔ رازی نے محمد سے کہا تھا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے پاس جائے لیکن یہ خیال رکھے کہ اس کی باطنی بیگم اس کے ساتھ نہ ہو۔ محمد اسے اسلام اور سلطنت کا واسطہ دے کر کہے کہ وہ ہوش میں آئے اور اگر اسلام کے ساتھ اس کی دلچسپی ختم ہو گئی ہے تو اپنی سلطنت کو ہی بچالے۔

ابو مسلم رازی کے قاصد نے محمد سے یہ بھی کہا کہ برکیارق نہ ملنے تو اسے بتا دیا جائے کہ وہ سلطانی سے دستبردار ہو جائے یا اپنی باطنی بیوی کو چھوڑ دے۔ اسی سے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے اور پھر وہی باہمی پیار پیدا ہو جائے گا جو اس لڑکی کے آنے سے پہلے ہوا کرتا تھا۔

ابو مسلم رازی نے یہ بھی کہا تھا کہ برکیارق نہ ملنے تو اسے کہہ دینا کہ وہ منہ بچ کے لئے تیار رہے اور یہ بھی کہ یہ منہ بچ اُس کے لئے اور اُس کی باطنی بیوی کے لئے بڑے ہی بھیاںک ہوں گے۔

محمد اُسی وقت وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری کے پاس گیا اور اسے ابو مسلم رازی کا یہ زبانی پیغام سنایا۔

”مجھے توقع تھی کہ وہ ایسا پیغام ضرور بھیجے گا“ — وزیر اعظم نے کہا — ”اپنے بھائی تک یہ پیغام تم ہی لے جاسکتے ہو۔ میں تو بظاہر اسی کا اور اس کی بیگم کا آدمی ہوں۔ تم سلطان سے ملو اور اس کے ساتھ یہ بات کرو..... میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ وہ ذرا سا بھی اثر قبول نہیں کرے گا بلکہ الٹا تمہیں دھمکیاں دے گا..... بہر حال ہمیں اپنا یہ فرض بھی ادا کر دینا چاہئے کہ ہم نے اسے پہلے خبردار نہیں کر دیا تھا۔“

محمد اسی وقت برکیارق کے پاس چلا گیا۔ اتفاق سے وہ اسے اکیلا مل گیا۔

”دیکھا محمد!“ — برکیارق نے کہا — ”یہاں کیا خون خرابہ ہو رہا ہے؟..... اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہماری ماں اگر لوگوں کو نہ بھڑکاتی تو وہ اور یزی کو آزاد نہ کراتے۔ یہ

سارا خوزیر فسلو دیں سے شروع ہوا ہے۔“

”میرے سلطان بھائی!“ — محمد نے کہا — ”میں آپ کے ساتھ آج آخری بات کرنے آیا ہوں..... ہوش میں آئیں اور دیکھیں یہاں کیا ہو رہا ہے..... خانہ جنگی شروع ہو گئی ہے۔ یہ رک سکتی ہے۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ خون خرابہ رکے یا بہتا رہے اور اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔“

”تم فکر نہ کرو محمد!“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”میں نے فوج بھیج دی ہے اور دو تین دنوں تک باغی پکڑے جائیں گے یا فوج انہیں وہیں ختم کر دے گی۔“

”سلطان عالی مقام!“ — محمد نے پُر اعتماد لہجے میں کہا — ”آپ کی فوج کسی ایک باغی کو بھی نہیں پکڑ سکتی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہر روز ہماری فوج کے پندرہ بیس آدمی مارے جا رہے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ صاف بات کرتا ہوں۔ اگر آپ سچے دل سے چاہتے ہیں کہ آپس کی قتل و غارت بند ہو جائے اور اسلام کا جھنڈا بلند ہو اور یہ سلطنت قائم رہے تو سلطانی کی گدی سے اٹھ کر الگ ہو جائیں یا اس باطنی لڑکی روزینہ کو چھوڑ دیں۔ کون نہیں جانتا کہ حکم آپ کی یہ بیگم دیتی ہے لیکن یہ حکم آپ کی زبان سے نکلتا ہے۔ آپ کے لئے اب کوئی اور راستہ نہیں رہا۔ سلطانی چھوڑ دیں یا اس بیوی کو چھوڑ دیں۔“

”ہوش میں آ محمد!“ — سلطان برکیارق نے سلطانوں کے سے لہجے میں کہا — ”پہلے میں نے اپنی ماں کو نظر بند کیا ہے۔ اب ایسا نہ ہو کہ میں اپنے بھائی کو قید خانے میں ڈال دوں۔ میں تمہیں اور سب کو چھوڑ دوں گا، اپنی اس بیوی کو نہیں چھوڑوں گا..... اور رہا سوال سلطانی کا“ تو یہ میں جانتا ہوں کہ ہماری ماں تمہیں اس گدی پر بٹھانا چاہتی ہے۔“

”ٹھیک ہے سلطان محترم!“ — محمد نے کہا — ”آپ کا دماغ آپ کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیا گیا۔ اب میں آپ کو آخری بات کہتا ہوں کہ مجھے آپ قید خانے میں ڈال دیں، جلاد کے حوالے کر دیں لیکن اس سے حالات سُدھریں گے نہیں اور زیادہ بگڑیں گے اور اس کے جو نتائج ہوں گے وہ آپ کے لئے اور آپ کی اس باطنی بیوی کے لئے بڑے ہی بھیانک ہوں گے۔“

محمد اُٹھ کھڑا ہوا اور وہاں سے نکل آیا۔ واپس آکر اس نے اپنے چھوٹے بھائی سبخر کو

ساتھ لیا اور دونوں اپنی ماں کے پاس گئے۔ ان کی ماں نظر بند تھی لیکن اس کے یہ دونوں بیٹے اسے مل سکتے تھے۔ محمد نے اپنی ماں کو بتایا کہ ابو مسلم رازی کا کیا پیغام آیا ہے۔ پھر اسے بتایا کہ وہ برکیارق کے ساتھ بات کر کے آرہا ہے لیکن برکیارق نے اسے قید میں ڈالنے کی اور سزائے موت دینے کی دھمکی دی ہے۔

”مقدس ماں!“ — محمد نے کہا۔ — ”میں آپ سے اجازت لینے آیا ہوں۔ اب مجھے جملہ پکار رہا ہے۔ آپ اور سخریمیں رہیں گے۔ آپ نے ہماری کامیابی کے لئے دعا کرنی ہے اور اس کے سوا کسی اور کے ساتھ کوئی بات نہیں کرنی نہ کسی کے ساتھ جھگڑا مول لیتا ہے۔ صرف ایک عورت نے بھائی کو بھائی کا دشمن بنا ڈالا ہے اور ایک مجاہد قوم کو دو حصوں میں کاٹ کر انہیں آپس میں ٹکرا دیا ہے۔ ان حالات میں مجھے یہاں نہیں رہنا چاہئے۔ وزیراعظم عبدالرحمن سمیری سے میری بات ہو چکی ہے۔ سالار اور یزی بھی میرا انتظار کر رہا ہے..... میں آج رات غائب ہو جاؤں گا۔“

”تم جہاں بھی جاؤ گے میری دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی“ — ماں نے کہا۔ — ”مسلمان مائیں اپنے بیٹوں کو قربان کرتی چلی آئی ہیں، میں اس روایت کو زندہ رکھوں گی۔ تمہارا باپ تمہاری ہی طرح دین دار اور مجاہد تھا۔ اس نے اپنی زندگی اسلام کی سربلندی کے لئے وقف کر رکھی تھی اور اس نے اپنی جان اس راستے پر دے دی..... جا بیٹے! اللہ تیرے ساتھ ہے۔“



پانچ سات دن ہی گزرے ہوں گے کہ ایک رات شہر کے کسی کونے سے آواز آئی کہ شہر کو ایک لشکر نے محاصرے میں لے لیا ہے۔ یہ آواز ذرا سی دیر میں سارے شہر میں پھیل گئی اور لوگ جاگ اٹھے۔

ایک زمانہ گزر گیا تھا کہ یہ شہر محاصرے میں نہیں آیا تھا نہ کوئی ایسا خطرہ تھا اس لئے شہر کے تمام دروازے رات کو کھلے رہتے۔ صرف یہ احتیاط کی جاتی تھی کہ ہر دروازے کے ساتھ ایک دو کمرے تھے جن میں فوجی رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ رات کو کون اندر آیا ہے اور کون نکل گیا۔ اس رات جب شہر محاصرے میں آ گیا تو ان فوجیوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شہر کے تمام دروازے بند کر دیئے اور اپنے سپہ سالار ابو جعفر حجازی کو اطلاع دی۔ حجازی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس نے محاصرے کا لفظ ہی سنا تو ہڑبڑا کر

اٹھا اور شبِ خوابی کے لباس میں ہی دوڑ پڑا اور شہرِ نہ کے ایک بُرج میں جا کھڑا ہوا۔
 ”شہر کے دروازے کھول دو“ — باہر سے للکار سنائی دی — ”نہیں کھولو گے تو
 ہم دروازے توڑ کر اندر آجائیں گے پھر ہم کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

فوج کے متعدد دوستے شہر سے دور سابق فوجیوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے
 تھے اور کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں تھے۔ باقی جو فوج تھی اُسے اسی وقت جگا کر
 شہرِ نہ پر چڑھا دیا گیا۔

شہرِ نہ برائے نام تھی، یہ کوئی مضبوط قلعہ نہیں تھا۔ فوجیوں نے تیر پھینکنے شروع کر
 دیئے۔ محاصرہ کرنے والی فوج کی طرف سے ایک بار پھر للکار اٹھی کہ مقابلہ کرنے کی
 کوشش نہ کی جائے ورنہ شہریوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑے گا لیکن سپہ سالارِ حجازی نے
 تیر اندازی جاری رکھنے کا حکم دیا۔ حجازی نے للکار کر یہ بھی پوچھا کہ تم کون لوگ ہو اور
 کس ملک سے آئے ہو۔ اس کا جواب نہ آیا۔ سلطان برکیارق کو اطلاع دی گئی تو وہ اٹھ
 کر آگیا اور سپہ سالارِ حجازی کے ساتھ ایک بُرج میں جا کھڑا ہوا۔

رات ایسے ہی ایک دوسرے کو للکارتے گزر گئی۔ صبح ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ اپنے ہی
 لوگ ہیں اور ان میں برطرف کئے ہوئے فوجی بھی شامل ہیں چونکہ شہر کی فوج بہت
 تھوڑی تھی اس لئے سلطان کے حکم سے شہریوں کو مقابلے کے لئے تیار کیا جانے لگا۔ یہ
 بھی پتہ چل گیا کہ یہ فوج یا لشکرِ رے سے آیا ہے اور یہ وہاں کے امیرِ شہر ابو مسلم رازی کا
 بھیجا ہوا ہے۔ شہریوں کو یہ خبر ملی تو ان میں سے بہت سے لوگوں نے مقابلہ کرنے سے
 انکار کر دیا۔ شہری یہ شور کرنے لگے کہ اپنی فوج نے اپنے ہی شہر کو کیوں محاصرے میں
 لے لیا ہے، اس کی کوئی اور وجہ ہوگی۔

حسن بن صباح کا ایجنٹ طبیب بہت خوش تھا کہ اس کی زمین دوز کو ششیں کامیاب
 ہو گئی ہیں اور باقاعدہ خانہ جنگی شروع ہو گئی ہے۔ وہ اس پر تو اور ہی زیادہ خوش تھا کہ
 شہری بھی مقابلے کے لئے تیار ہو گئے ہیں لیکن اس نے دیکھا کہ شہری مقابلے سے
 انکار کر رہے ہیں کیونکہ انہیں پتہ چل گیا ہے کہ یہ اپنی ہی سلطنت کی فوج ہے۔ طبیب
 نے دوسری چال چلی، وہ یہ کہ اپنے آدمیوں سے کہا کہ شہر میں یہ افواہ پھیلا دیں کہ رے
 کا حاکم ابو مسلم رازی باغی ہو گیا ہے اور اس نے امام حسن بن صباح کے ہاتھ پر بیعت کر
 لی ہے اور اس کی مدد سے اس شہر کو فتح کرنے آیا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد یہی افواہ ایک سچی اطلاع اور خبر کی صورت میں سارے شہر میں پھیل گئی۔ شہری ایک بار پھر جوش و خروش سے مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ شہرناہ پر ایک انسانی دیوار کھڑی ہو گئی شہر سے تیروں کا مینہ برسنے لگا۔

محاصرہ کرنے والے نہتے تو نہیں آئے تھے، ان کے پاس بھی کمائیں اور تیروں کا ذخیرہ تھا اور ان کے پاس بڑے ماہر تیر انداز بھی تھے۔ انہوں نے جوابی تیر اندازی شروع کی تو دیوار پر لوگ تیر کھا کھا کر گرنے لگے۔ نقصان دونوں طرف سے ہو رہا تھا۔

وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری نے دیکھا کہ ایک غلط افواہ پھیلا کر شہریوں کو بھڑکایا گیا ہے تو اس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ شہریوں تک یہ خبر پہنچائیں کہ ابو مسلم رازی نے حسن بن صباح کی بیعت نہیں کی بلکہ ہمارا اپنا سلطان اپنی بیوی کے ذریعے حسن بن صباح کا مرید ہو گیا ہے اور اس شہر میں بے شمار باطنی آگے ہیں۔

وزیر اعظم کے آدمی بھی خاصے تجربہ کار تھے۔ انہوں نے یہ خبر اپنے طریقے سے پہنچانی شروع کر دی اور اس کے اثرات بھی دیکھنے میں آنے لگے۔ وہ اس طرح کہ کچھ شہری شہر کے دفاع سے منہ موڑ کر نیچے اتر آئے۔

ہوا یہ کہ کسی طرح سلطان کی اس فوج کو پتہ چل گیا کہ شہر محاصرے میں ہے جو فوج برطرف فوجیوں کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم پھر رہی تھی ان دستوں کا کماندار کوئی عقلمند آدمی تھا۔ اس نے اپنے دستے اکٹھے کئے اور انہیں واپس لے آیا۔ اس نے دلیری کا یہ مظاہرہ کیا کہ عقب سے محاصرہ کرنے والوں پر حملہ کر دیا۔ سپہ سالار حجازی نے یہ منظر دیکھا تو اس نے یہ حکم دے دیا کہ شہر کے دروازے کھول دیئے جائیں اور اندر کی فوج اور شہری باہر نکل کر محاصرہ کرنے والوں پر ٹوٹ پڑیں۔

بڑی خونریز لڑائی لڑی گئی اور سورج غروب ہو گیا۔ اندر سے گئی ہوئی فوج اور شہری واپس آ گئے۔ وہ دیکھ نہ سکے کہ ان کے ساتھ ہی حملہ آور فوج یعنی جس لشکر نے شہر کو محاصرے میں لیا تھا وہ بھی شہر میں آ گئے۔ انہوں نے شہر کے تمام دروازوں پر تیل پھینک کر آگ لگا دی۔ اس طرح تمام دروازے جل گئے۔

رات کو شہر میں لڑائی ہی ہوتی رہی اس کے ساتھ ہی حملہ آور لشکر کی طرف سے یہ اعلان ہوتے رہے کہ ہم تمہارے بھائی ہیں، ہمارے خلاف نہ لڑو، ہم باطنیوں کو یہاں سے نکلنے آئے ہیں لیکن لڑائی جاری رہی اور شہری دو حصوں میں تقسیم ہوتے گئے۔

بعض طبیب کی افواہ کو سچ مانتے تھے اور دوسرے دوسری قسم کی افواہ کے قائل ہو گئے
لیکن شرکی گلیوں میں خون بہتا رہا۔



پھر دن اور ہفتے گزرتے چلے گئے اور یہ خون بہتا ہی رہا۔
یہ خانہ جنگی تھی جس میں حسن بن صباح کے پیروکار اور تخریب کار تیل ڈالتے
رہے اور سلطنت سلجوقیہ میں بھائی بھائی کا خون بہاتا رہا۔ تاریخ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ
سلطانی کی گدگی کی یعنی اقتدار کی خانہ جنگی تھی لیکن مستند اور حقائق پر نظر رکھنے والے
مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ آگ حسن بن صباح نے لگائی تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ
سلطان برکیارق مسلسل اپنی بیوی روزینہ کے زیر اثر چلا آ رہا تھا۔ احکام روزینہ کے دماغ
کی اختراع ہوتے تھے جس کا خفیہ رابطہ ایک عورت کے ذریعے طبیب کے ساتھ تھا اور
اسے حسن بن صباح کے احکام اور ہدایات اسی طبیب کی طرف سے اس عورت کی
وساطت سے ملتی تھیں۔

سلطان برکیارق کے محل کے ارد گرد حفاظتی انتظامات بڑے ہی سخت کر دیئے گئے
تھے۔ یہ تو فوراً ہی واضح ہو گیا تھا کہ دو بھائی ایک طرف ہیں اور بڑا بھائی دوسری طرف۔
وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری کا کردار ڈھکا چھپا رہا۔ وہ بظاہر برکیارق اور روزینہ کا زر خرید
غلام بنا رہا لیکن درپردہ وہ محمد اور ابو مسلم رازی کے ساتھ تھا۔ سلطان کے ہاں جو نیا
منصوبہ بنایا کوئی حکم ملتا وہ وزیر اعظم ابو مسلم رازی اور محمد تک پہنچا دیا کرتا تھا۔ ان
لوگوں کو اور ان کی حامی فوج کو باغی کہا گیا تھا۔ ان باغیوں کا سپہ سالار اور یزی تھا جو بڑا ہی
قاتل اور قومی جذبے سے سرشار آدمی تھا۔

ایک روز عبدالرحمن سمیری نے منزل کے ساتھ درپردہ رابطہ کر کے کہا کہ اب وہ
شمنہ کو استعمال کرے کیونکہ روزینہ کو قتل کرانا اس کا آسیب برکیارق سے اتارنا ممکن
نظر نہیں آتا۔ شمنہ فریب کاری اور اداکاری کی ماہر تھی اور جب سے خانہ جنگی شروع
ہوئی تھی وہ تڑپتی تھی کہ وہ بھی اس میدان میں کچھ کر کے دکھائے۔ اس کے اندر حسن
بن صباح کے خلاف جو انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا تھا وہ وقت گزرنے کے ساتھ ٹھنڈا نہیں ہوا
بلکہ اور زیادہ بھڑک اٹھا تھا۔ وہ عقل و دانش والی لڑکی تھی۔ وہ جب دیکھتی تھی کہ
باغیوں نے بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیا ہے اور خون بہتا ہی چلا جا رہا ہے تو وہ پنجرے میں

بند پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتی اور پنجرہ توڑنے کی ناکام کوشش کرتی تھی۔ آخر منزل نے اسے بتایا کہ اب وزیر اعظم سمیری نے اس کے لئے موقع پیدا کر لیا ہے۔
خانہ جنگی کو چھ سات مہینے گزر گئے تھے یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ ابو مسلم رازی سلطان برکیارق کے خلاف اپنی فوج اور اپنے تمام تر وسائل استعمال کر رہا ہے۔ ایک روز وزیر اعظم سمیری روزینہ کے پاس گیا اور اسے معمول کے مطابق بتایا کہ خانہ جنگی کی صورت حل کیا ہے۔

”آج ایک درخواست لے کر آیا ہوں“ — وزیر اعظم نے کہا — ”نیکی کا ایک کام کرنا ہے اور یہ آپ کے اختیار میں ہے۔“

”آپ بتائیں کیا کام ہے؟“ — روزینہ نے پوچھا — ”میں آپ کی خدمت نہیں کروں گی تو اور کس کی کروں گی؟“

”اس خانہ جنگی نے تو ملک کا بیڑہ غرق کر دیا ہے“ — وزیر اعظم نے کہا — ”میں ابو مسلم رازی، محمد اور سخر کو قتل کروانے کا انتظام کر رہا ہوں..... لیکن اس وقت آپ سے ایک اور عرض کرنا چاہتا ہوں، میرا ایک بڑا ہی معزز اور پیارا دوست تھا وہ بیچارہ مارا گیا ہے۔ وہ گھر سے نکلا ہی تھا کہ ایک برچھی جو کسی نے دوسرے کو ماری تھی وہ اسے لگ گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے دو جوان بیٹے تھے۔ دونوں خانہ جنگی میں مارے گئے ہیں۔ اس کی صرف بیوی اور ایک جوان بیٹی بچ گئی ہیں لیکن ان کے گھر میں کھانے کے لئے ایک دانہ بھی نہیں۔ لڑکی جوان ہے اور کچھ زیادہ ہی خوبصورت ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں باغیوں کے ہاتھ چڑھ گئی تو بیچاری کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا کہ آپ کے ہاں نوکروں اور نوکرانیوں کی تو کوئی کمی نہیں لیکن ایک سلجھی ہوئی اور سلیقہ شعار اور خوبصورت کنیز آپ کے پاس ضرور ہونی چاہئے۔ اگر اب میری یہ عرض مان لیں تو میں یہ لڑکی آپ کے حوالے کر دوں۔ اس سے ایک تو آپ کی ضرورت پوری ہو جائے گی اور سب سے بڑی نیکی تو یہ ہوگی کہ ایک پردہ دار یتیم لڑکی کو سارا اور پردہ مل جائے گا۔ میں اس لڑکی کی ہر طرح ضمانت دینے کو تیار ہوں۔“

”آپ کو اتنی لمبی بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی“ — روزینہ نے کہا —

”اس لڑکی کو ساتھ لے آتے اور میں اسے اپنے پاس رکھ لیتی..... آپ اسے لے آئیں۔ اگر اس کی ماں بھی آنا چاہتی ہے تو آجائے میں اسے رہائش کے لئے جگہ دے دوں

گی۔“

”نہیں بیگم محترمہ!“ — وزیر اعظم نے کہا — ”اس کی ماں اپنے گھر میں ہی رہتا چاہتی ہے۔ آپ اس کی بیٹی کو رکھ لیں اور کبھی کبھی اسے اپنے گھر جانے کی اجازت دے دیا کریں۔“

اس طرح شمونہ روزینہ کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے روزینہ کو اپنا نام گمینہ بتلایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ روپڑی اور اپنے باپ اور بھائیوں کو یاد کر کر کے گھر کی باتیں سنانے لگی۔ شمونہ نے ایسی اداکاری کی جیسے وہ بالکل ہی سیدھی سادی اور پردہ نشین لڑکی ہو اور اسے دنیا کی ہوائی نہ لگی ہو۔

”آپ مجھے سمجھاتی رہیں کہ میں نے یہاں کیا کرتا ہے“ — شمونہ نے کہا — ”میں آپ کی پسند اور مرضی پر پوری اترنے کی کوشش کروں گی۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو یہ سمجھ کر معاف کر دینا کہ میں غریب اور پس ماندہ سے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ ایسا شہانہ گھر تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔“

روزینہ کو شمونہ بہت ہی اچھی لگی۔ شمونہ میں اس نے جو سادگی اور بے ساختہ پن دیکھا، وہ تو اسے بڑا ہی پیارا لگا۔ شمونہ کی عمر تو جوانی کی تھی لیکن اس نے شادی نہیں کی تھی اور اپنی صحت کو برقرار رکھا تھا اس لئے وہ اپنی عمر سے کم اور نوجوان لگتی تھی۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ روزینہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ لڑکی ہے۔ شمونہ اس تربیت سے بہت اچھی طرح واقف تھی اور اس تربیت کو اس نے عملی زندگی میں بھی استعمال کیا تھا۔ اب وہ اسی تربیت اور تجربے کو روزینہ کو نیچا دکھانے کے لئے استعمال کرنے لگی۔

چند دنوں میں ہی شمونہ نے شاہی طور طریقے سیکھ لئے۔ یہ طور طریقے تو وہ پہلے ہی سے جانتی تھی۔ روزینہ کے دل میں اس نے اپنی جگہ پیدا کر لی۔ ابھی سلطان برکیارق نے شمونہ کو نہیں دیکھا تھا۔ روزینہ نے جب دیکھا کہ شمونہ نے بڑی تیزی سے سارے کام اور انداز وغیرہ سیکھ لئے تو ایک روز اس نے شمونہ کو سلطان برکیارق کے سامنے کیا اور کہا کہ یہ ایک تحفہ ہے جو وہ اسے دے رہی ہے۔

”یہ میری اور آپ کی کنیز ہے“ — روزینہ نے کہا — ”اس کا نام گمینہ ہے اور یہ بے بھی گمینہ۔“

”وہ تو میں نے دیکھ لیا ہے“ — سلطان برکیارق نے اپنا بازو شمونہ کی طرف پھیلا

کر کہا — ”یہاں آؤ..... ہاں ادھر بیٹھ جاؤ“۔

”نہیں!“ — شمونہ نے جھپکنے اور شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا —
”میری جگہ آپ کے پلنگ پر نہیں، یہ محترمہ بیگم کی جگہ ہے۔ اگر بیگم اجازت دیں گی تو
میں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں گی۔“

”میں تمہیں بیگم کی جگہ اپنے پاس نہیں بٹھا رہا“ — سلطان برکیارق نے ہنستے
ہوئے کہا — ”اگر میں تمہیں ایک پھول پیش کروں تو تم اسے ایک بار سونگھو گی تو
ضرور۔“

شمونہ نے روزینہ کی طرف دیکھا۔ روزینہ نے مسکرا کر اسے سر سے ہلکا سا اشارہ
کیا تو شمونہ پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گئی تو سلطان برکیارق نے بازو اس کی کمر میں ڈال کر
اپنے قریب کر لیا۔

”آپ نے پھول سونگھ لیا ہے“ — شمونہ نے برکیارق کے بازو سے نکل کر اٹھتے
ہوئے کہا — ”اب پھول اسی کے پاس جا رہا ہے جس کی ملکیت ہے۔“

روزینہ اور برکیارق نے بے ساختہ تہقہہ لگایا۔ شمونہ کا جادو کام کر گیا تھا۔
ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ شمونہ کی حیثیت روزینہ کی نگاہوں میں ایسی ہو گئی
جیسے وہ اس کی کنیز نہیں بلکہ ہمزاد سہیلی ہو۔ ایک روز شمونہ نے روزینہ سے بڑی سادگی
سے پوچھا کہ یہ امام حسن بن صباح کون ہے اور باطنی کسے کہتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا
کہ میں نے سنا ہے کہ حسن بن صباح امام بھی ہے اور نبی بھی۔ شمونہ نے یہ بھی کہا کہ
میں اس کی باتیں سن سن کر دل سے اس کی مرید ہو گئی ہوں۔

روزینہ نے حسن بن صباح کی باتیں شروع کر دیں اور ثابت کر دیا کہ وہ زمین پر امام
ہے اور آسمانوں میں نبی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ”الکوت میں خداوند تعالیٰ نے اسے
جنت بنا دی ہے۔ اس طرح روزینہ نے شمونہ کو حسن بن صباح کی ایسی باتیں سنائیں کہ
شمونہ جھوم اٹھی۔

”میری یہ خواہش ہے“ — شمونہ نے کہا — ”ایک بار صرف ایک بار اللہ کے
اس مقدس انسان کو دیکھوں..... میں نے پہلے بھی اس کے متعلق ایسی ہی باتیں سنی
ہیں۔ کیا آپ مجھے اس کی زیارت نہیں کرا سکتیں؟“

”کیوں نہیں گمینہ!“ — روزینہ نے کہا — ”کسی وقت تمہاری یہ خواہش بھی

پوری کر دوں گی۔“

اُس روز کے بعد شمونہ اکثر حسن بن صباح کا ذکر چھیڑ دیتی اور اس طرح باتیں کرتی جیسے وہ حسن بن صباح کی عبادت کر رہی ہو۔ اس دوران شمونہ نے وہ عورت دیکھ لی جس کے ذریعے روزینہ طبیب کے ساتھ رابطہ رکھتی اور پیغام دیتی تھی۔ شمونہ وزیر اعظم سمیری سے چوری چھپے ملنے کا موقعہ پیدا کر لیا کرتی تھی۔

اب وہ وزیر اعظم سے ملی تو اسے کہا کہ شامی طبیب سے کہیں کہ وہ سفوف مجھے دے دیں۔ یہ بھی کہا کہ سفوف تھوڑا نہ ہو، اچھی خاصی مقدار میں ہونا چاہئے اور طبیب یہ بھی بتا دے کہ ایک وقت میں یہ کتنا استعمال کیا جائے کہ اس کے ذائقے اور بُو کا پتہ نہ چلے۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ منزل آفندی حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا لیکن وہاں سے یہ ارادہ لے کر واپس آیا کہ وہ سلطان ملک شہ کو قتل کرے گا۔ یہ حسن بن صباح کے ذاتی طلسم کا اور حشیش کا اثر تھا کہ اس کا دماغ ہی ان لوگوں نے الٹا کر دیا تھا۔ سلطان کے طبیب نے اسے کچھ دوائیاں پلا پلا کر ٹھیک کیا تھا اور اس کا دماغ واپس اپنی اصلی حالت میں آ گیا تھا۔ اب شمونہ اس طبیب سے وہی دوائی منگواری تھی۔

وزیر اعظم نے اگلے ہی روز شمونہ کو وہ دوائی دے دی جو سفید رنگ کا ایک سفوف تھا۔ وزیر اعظم نے یہ بھی بتایا کہ ایک صراحی میں اس کی کتنی مقدار ڈالنی ہے۔

شمونہ دیکھ رہی تھی کہ روزینہ ہر صبح ایک بڑی خوبصورت اور سنہری صراحی میں مشروب ڈالتی تھی اور اس میں کچھ ملاتی تھی۔ شمونہ جانتی تھی کہ یہ صراحی میں کیا ملا رہی ہے۔ روزینہ کو شمونہ پر مکمل طور پر اعتبار آ گیا تھا اس لئے وہ اپنی بیشتر حرکتیں شمونہ سے چھپاتی نہیں تھی۔ اس نے شمونہ سے کہہ رکھا تھا کہ سلطان جب اپنے کام سے واپس آئیں اور وہ موجود نہ ہو تو سلطان کو ایک پیالہ اس مشروب کا پلانا ہے۔

روزینہ اکثر شمونہ کے ساتھ حسن بن صباح اور اس کی جنت کی باتیں کیا کرتی تھی اور شمونہ اس کی یہ باتیں ایسے اشتیاق سے سنا کرتی جیسے اس پر مدہوشی طاری ہوئی جا رہی ہو۔ کبھی شمونہ یہ بھی کہہ دیتی کہ آپ کتنی خوش نصیب ہیں کہ ایسے نبی کی زیارت کر چکی ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لئے اس سرزمین پر اتارا ہے۔ ایک روز روزینہ نے حسب معمول صراحی میں مشروب ڈالا اور شمونہ سے کہا کہ یہ سلطان کے

کمرے میں رکھ دے۔ شمونہ صراحی لے گئی اور سلطان کے کمرے میں بھی چلی گئی لیکن اس نے صراحی وہاں رکھنے کی بجائے غسل خانے میں لے جا کر نل میں بہا دی۔ شمونہ نے روزینہ کا روزمرہ کا معمول دیکھ لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت روزینہ کون سے کمرے میں ہو گی اور وہ کتنی دیر وہاں رہے گی۔ شمونہ نے بڑی تیزی سے ویسا ہی مشروب صراحی میں ڈالا اور شلفی طبیب کا دیا ہوا سفوف نکل کر ذرا سا صراحی میں ملا دیا اور اسے اچھی طرح ہلایا۔

سلطان برکیارق جب اپنے روزمرہ امور سلطنت سے واپس آیا تو روزینہ دوڑی آئی۔ اس نے پہلا کلام یہ کیا کہ اس مشروب کا پیالہ برکیارق کو پلا دیا۔ اُس روز رات سونے تک سلطان برکیارق کو یہی مشروب پلایا جاتا رہا۔ شمونہ دو تین مرتبہ سلطان برکیارق کے کمرے میں گئی۔ ایک بار تو برکیارق نے اسے بلایا تھا اور باقی دو مرتبہ وہ کسی نہ کسی بہانے چلی گئی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ سلطان برکیارق کے رویے میں یا بولنے کے انداز میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ ایک یہ کہ برکیارق دن کے وقت بھی سویا کرتا تھا۔ اُس روز وہ کروٹیں بدلتا رہا اور سونہ سکا۔

صبح جب شمونہ اپنے روزمرہ کے کلام کالج کے لئے روزینہ کے کمرے میں گئی تو روزینہ نے اسے پہلی بات یہ سنائی کہ سلطان ساری رات بہت بے چین رہے ہیں اور اچھی طرح سو نہیں سکے۔

”بے چین نہ رہیں تو اور کیا کریں“ — شمونہ نے کہا — ”جس سلطان کی سلطنت میں آپس کی قتل و غارت ہو رہی ہو اور خانہ جنگی روز بروز خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہو، وہ سلطان کیسے سکون سے سو سکتا ہے۔“



شمونہ نے اپنا یہ کلام جاری رکھا۔ روزینہ مشروب میں نشہ ملا دیتی اور شمونہ وہ صراحی انڈیل کر اور مشروب ڈالتی اور اس میں اپنا سفوف ڈال دیتی۔ وہ سلطان برکیارق میں نمایاں تبدیلی دیکھنے لگی۔

شمونہ نے موقع پیدا کر کے وزیر اعظم سمیری کے ساتھ مختصر ملاقات کی اور اسے بتایا کہ وہ اپنا کلام کر رہی ہے اور سلطان میں تبدیلی آ رہی ہے۔ تبدیلی یہ کہ وہ اب کسی

کسی وقت گہری سوچ میں کھو جاتا اور بات سنجیدگی سے کرتا تھا۔ وزیر اعظم نے اسے یہ نئی بات بتائی کہ طبیب نے کہا ہے کہ جس مشروب میں کوئی نشہ خواہ وہ حشیش ہی ہو، ملا ہوا ہو، اس میں یہ سفوف معمول کی دو گنی مقدار سے ڈال دو تو بھی نشہ اثر نہیں کرتا۔ طبیب کی یہ ہدایت شمونہ کے لئے بڑی آسان تھی۔ روزانہ مشروب غسل خانے کی تلی میں گراتا خطرناک تھا۔ وہ کسی بھی وقت پکڑی جاسکتی تھی۔ اس نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ روزینہ نشہ والا مشروب صراحی میں ڈالتی تو شمونہ اس میں اپنا سفوف زیادہ مقدار میں ملا دیتی۔

خانہ جنگی دور دور تک پھیل گئی تھی۔ سرکاری فوج لڑ رہی تھی لیکن اس کی طاقت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس فوج کو باغیوں نے مسلمانوں کے روپ میں پورا کیا اور اس میں شامل ہو گئے تاکہ یہ آگ جلتی رہے۔ امن و امان تباہ ہو گیا تھا۔ لوگوں کو کھانے کے لئے اناج بھی نہیں ملتا تھا۔ جو لوگ نہ سرکاری فوج کے ساتھ تھے نہ باغیوں کے ساتھ تھے، وہ تو ڈر کے مارے باہر ہی نہیں نکلتے تھے۔ باطنی شہر میں بھرتے چلے جا رہے تھے اور صاف نظر آنے لگا تھا کہ کسی بھی دن حسن بن صبح یہاں آن دھمکے گا اور سلطان کی گدی پر بیٹھ کر سلطان برکیارق کو قتل کر دے گا۔

ایک روز شمونہ وزیر اعظم سے ملی اور اسے کہا کہ وہ طبیب سے کوئی ایسا زہر لا دے جو جسم میں جالتے ہی جسم کو بے جان کر دے..... وزیر اعظم نے اسی روز ایک زہر شمونہ کو دے دیا جو شمونہ نے اپنے پاس چھپا کر رکھ لیا۔



ایک روز سلطان برکیارق نے اپنے آرام والے کمرے میں ہی وزیر اعظم سمیری کو بلایا۔ وزیر اعظم فوراً پہنچا۔

”کیا آپ نے خانہ جنگی کو روکنے کا کوئی طریقہ نہیں سوچا؟“ — سلطان برکیارق نے عجیب سی بے بسی کے لہجے میں پوچھا اور آہ بھر کر بولا — ”محترم سمیری! آپ میرے باپ ہیں۔ کوئی حل نکالیں۔ یہ خون میرے دماغ کو چڑھ رہا ہے۔“

عبدالرحمن سمیری سلطان برکیارق کی یہ بات سن کر حیران تو ہوا ہی تھا لیکن اسے حیرت اس کے لہجے سے ہوئی۔ وہ تو غنودگی کی حالت میں بولا کرتا تھا یا اس کے لہجے میں رعونت ہوتی تھی۔ پھر وزیر اعظم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ روزینہ کمرے میں داخل ہوئی

تو سلطان برکیارق نے اسے کہا کہ تم ذرا باہر ٹھہرو۔ روزینہ نے آنکھیں پھاڑ کر سلطان برکیارق کی طرف دیکھا اور اندر آگئی۔ وہ جب بھی دیکھتی کہ سپہ سالار حجازی یا وزیر اعظم آیا ہے تو دوڑ کر سلطان کے پاس آ بیٹھتی اور یوں باتیں کرتی تھی جیسے سلطنت کی حکمرانی اس کے ہاتھ میں ہو اور حکم اسی کا چل رہا ہو۔

”باہر کی صورت حل کیا ہے؟“ — روزینہ نے وزیر اعظم سے پوچھا۔

”روزینہ!“ — سلطان برکیارق نے بڑی جاندار آواز میں کہا — ”میں موجود ہوں تو تمہیں بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ باہر ٹھہرو۔“

روزینہ آہستہ آہستہ اٹھی اور قدم کھینچتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”میں آپ سے کچھ کہہ رہا تھا“ — سلطان برکیارق نے وزیر اعظم سے کہا —

”کہ کوئی طریقہ سوچیں کہ یہ خانہ جنگی رک جائے۔“

”میں تو سوچتا ہی رہتا ہوں“ — وزیر اعظم نے کہا — ”آپ سے بات کرتے

جھجکتا ہوں۔ بات آپ کے ساتھ کرتا ہوں تو جواب محترمہ بیگم صاحبہ سے ملتا ہے.....

سلطان محترم! خون جو بہہ رہا ہے یہ میری اور آپ کی گردن پر ہو گا۔ اس کی سزا صاف

نظر آرہی ہے۔ نہ یہ سلطنت رہے گی نہ اس کا کوئی سلطان رہے گا نہ کوئی وزیر اعظم ہو

گا۔ ہم ہوں گے لیکن غلام، زنجیروں سے بندھے ہوئے۔ ہمارے سرتن سے جدا کر

دیئے جائیں گے..... اگر آپ اجازت دیں تو صلح سمجھوتہ کیا جاسکتا ہے۔“

”آپ کسی حل پر پہنچیں اور مجھے بتائیں“ — سلطان برکیارق نے کہا۔

شمنونہ نے پہلی بار روزینہ کو خفگی یا مایوسی کی حالت میں دیکھا۔ شمنونہ نے اس سے

پوچھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک ہے یا وہ کوئی گڑبڑ محسوس کر رہی ہے۔ روزینہ نے اکھڑی

ہوئی سی آواز میں جواب دیا۔ اُس وقت روزینہ پیالے میں کوئی مشروب ڈال رہی تھی۔

”میری طبیعت تو ٹھیک ہے“ — روزینہ نے کہا — ”سلطان کی طبیعت ٹھیک

معلوم نہیں ہوتی۔ ان کے لئے یہ خاص شربت تیار کر رہی ہوں۔ سلطنت کے غم نے

ان کے دماغ پر بہت بُرا اثر کیا ہے۔ کبھی کبھی ان کی یہ حالت ہو جایا کرتی ہے تو میں انہیں

یہ شربت پلایا کرتی ہوں۔ وزیر اعظم اٹھ کر جائیں گے تو انہیں یہ شربت پلا کر سلا دوں گی

پھر وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“

شمنونہ سمجھ گئی کہ اس شربت میں با تو حشیش کی زیادہ مقدار ملائی گئی ہے یا کوئی تیز

نشہ ملایا گیا ہے۔ شمونہ کو شک ہوا کہ سلطان برکیارق نے اسے کوئی سخت بات کہہ دی ہے جس کی شمونہ کو توقع ہی تھی۔ شمونہ سلطان برکیارق کو اتنا زیادہ سنوف پلا چکی تھی کہ اب تک سلطان کو صحیح ذہنی حالت میں آجانا چاہئے تھا۔

روزینہ نے شربت وہیں پڑا رہنے دیا اور وہاں سے نکل گئی۔ وہ شاید یہ دیکھنے لگی تھی کہ وزیر اعظم چلا گیا ہے یا نہیں۔ شمونہ نے طبیب کا دیا ہوا زہرا اپنے کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے وہ پڑیا نکلی اور شربت میں ڈال کر حل کر دی۔

اس کے بعد فوراً ”روزینہ آگئی اور کہنے لگی کہ وزیر اعظم نے لمبی ہی باتیں شروع کر دی ہیں، بہتر ہے کہ یہ شربت انہیں ابھی پلا دوں..... روزینہ نے پیالہ اٹھایا اور سلطان برکیارق کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ شمونہ اس کے پیچھے پیچھے گئی۔

روزینہ سلطان کے کمرے میں داخل ہوئی، شمونہ دروازے کے ساتھ باہر کھڑی رہی۔ اُسے روزینہ کی آواز سنائی دی — ”سلطان محترم! یہ شربت پی لیں آپ بہت تھکے ہوئے ہیں“ — یہ کہہ کر روزینہ کمرے سے نکلنے لگی۔ شمونہ آگے ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ سلطان برکیارق نے پیالہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور وہ وزیر اعظم کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ بات ختم کرتے ہی اس نے یہ شربت پی لینا تھا جس میں شمونہ نے بڑا ہی تیز زہر ملا دیا تھا۔

سلطان برکیارق پیالہ اپنے منہ کی طرف لے جانے لگا تو شمونہ تیر کی طرح دروازے سے اس تک پہنچی اور بڑی گھبراہٹ میں کہا — ”مت پینا یہ شربت سلطان!“ — اس نے لپک کر وہ پیالہ سلطان کے ہاتھ سے لے کر تپائی پر رکھ دیا۔ روزینہ کمرے سے نکل چکی تھی، شمونہ کی اس حرکت سے واپس آگئی۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے شمونہ!“ — روزینہ نے غصیلی آواز میں کہا — ”سلطان کے ہاتھ سے پیالہ کیوں چھین لیا ہے؟“

”سلطان محترم!“ — شمونہ نے روزینہ کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا — ”ابھی کسی کو بلا کر کہیں کہ ایک بلی یا کتیا کوئی اور جانور یہاں لے آئے اور پھر یہ شربت اسے پلا کر دیکھیں..... اس میں آپ کی بیگم نے زہر ملایا ہوا ہے۔ اگر میں جھوٹی ثابت ہوئی تو اپنا سر پیش کر دوں گی۔“

روزینہ نے تو وہی جہی بکئی شروع کر دی اور سلطان برکیارق حیرت سے کبھی

روزینہ کو اور کبھی شمونہ کو دیکھتا تھا۔ وزیر اعظم سمیری کو معلوم تھا کہ شمونہ نے اس سے زہر منگوایا تھا۔ وہ دانشمند آدمی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ شمونہ نے کوئی چال چلی ہے۔ سلطان کے حکم کے بغیر وزیر اعظم باہر گیا اور ایک خادم سے کہا کہ ایک بلی یا کتا فوراً پکڑ کر لائے۔

روزینہ وہیں کھڑی رہی اور شمونہ کو دھمکیاں دیتی رہی۔ وہ تو پتہ تھی کیونکہ اس نے شربت میں زہر نہیں ملایا تھا۔ اسے صرف یہ ڈر تھا کہ اس شربت میں اس نے ذرا تیز نشہ ملایا تھا۔ بلی یا کتے کو پلانے کی صورت میں یہ ہوتا تھا کہ اس جانور نے تھوڑی دیر بعد گر کر سو جاتا تھا۔

سلطان کا حکم تھا اس لئے ایک کتا فوراً حاضر کیا گیا۔ سلطان نے کتا لانے والے سے کہا کہ اس پیالے میں جو شربت ہے یہ کتے کے منہ میں اندر ڈال دو۔ خادم نے کتے کا منہ کھولا اور شمونہ نے آدھا پیالہ شربت کتے کے حلق سے نیچے اتار دیا۔ سلطان نے کہا اس کتے کو چھوڑ دو۔ کتے کو چھوڑ دیا گیا۔

کتا کمرے سے باہر کو چل پڑا۔ دہلیز سے بھی آگے چلا گیا لیکن اس سے آگے اس کے قدم لڑکھڑائے اور وہ رک گیا۔ اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلیں اور وہ گر پڑا۔ ذرا سی دیر اس کی ٹانگیں کانپیں اور پھر ٹانگیں ساکت ہو گئیں۔ کتا مر گیا تھا۔ سلطان برکیارق فوراً اٹھا اور اس نے قبر بھری نظروں سے روزینہ کو دیکھا۔ اس نے اس کمرے میں داخل ہوتے ہی روزمرہ کی طرح کمر بند سے لمبا خنجر نکال کر قریب ہی تپائی پر رکھ دیا تھا۔ سلطان نے کچھ بھی نہ کہا۔ لپک کر خنجر اٹھایا، اس کی نیام کھینچ کر پرے پھینکی اور روزینہ کی طرف بڑھا۔ روزینہ اس سے دو ہی قدم پرے کھڑی حیرت کا مجسمہ بنی ہوئی تھی۔

”نہیں سلطان!“ — وزیر اعظم سمیری نے برکیارق کی طرف لپکتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا — ”یہ کلم آپ کا نہیں، جلا کا ہے۔“

وزیر اعظم کا آخری لفظ اس کی زبان پر ہی تھا کہ سلطان برکیارق کا خنجر روزینہ کے پیٹ میں اتر چکا تھا۔ اس نے خنجر کھینچا اور کہا — ”لوگ سچ کہتے تھے کہ یہ باطنی ہے اور اس ابلیس حسن بن صباح کی بھیجی ہوئی ہے۔“ — سلطان نے روزینہ کے گرنے سے پہلے ایک بار پھر خنجر روزینہ کی پسلیوں میں اتار دیا۔ روزینہ گری، سلطان نے خنجر کھینچ لیا

اور فرش پر پھینک دیا۔

سلطان نے کچھ دیر آخری سانس لیتی ہوئی روزینہ کو دیکھا اور اس کے بہتے ہوئے خون کو دیکھا۔ شموٰنہ اور وزیر اعظم بھی روزینہ کو مرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

”محترم سمیری!“ — سلطان برکیارق نے غم سے بوجھل آواز میں کہا — ”اے یہاں سے اٹھو ادریں۔ لاش اٹھانے والوں سے کہہ دیں کہ اسے کفن نہیں پہنایا جائے گا نہ ہی اس کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ کتے کو بھی اٹھو ادریں اور کہیں ویرانے میں گڑھا کھود کر کتے کو بھی اس کے ساتھ دفن کر دیں۔“

سلطان کا سر ڈولنے لگا جیسے وہ چکرا کر گر پڑے گا۔ وزیر اعظم نے لپک کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

”مجھے سمیری مل کے پاس لے چلو“ — سلطان برکیارق نے کہا۔

”آپ چل سکیں گے؟“ — وزیر اعظم سمیری نے پوچھا۔

”ہاں!“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”چل کر جاؤں گا۔“

وہ وزیر اعظم کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ ماں جس کمرے میں نظربند تھی، وہ قریب ہی تھا۔ برکیارق اپنے سہارے چلتا وہاں پہنچا۔ وزیر اعظم ساتھ تھا اور شموٰنہ پیچھے کھڑی دیکھ رہی تھی۔

برکیارق وزیر اعظم کے ساتھ مل کے کمرے میں داخل ہوا۔ ماں غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ برکیارق کو دیکھ کر اس کے چہرے پر غصے کی سرخی آگئی۔ برکیارق اس کو دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھا اور ماں کے قدموں میں گر پڑا پھر سر اس کی گود میں رکھ دیا۔

”مجھے بخش دو ماں!“ — سلطان برکیارق نے روتے ہوئے کہا — ”آپ کا بھٹکا ہوا بیٹا آپ کی آغوش میں واپس آ گیا ہے۔“

”سلطان نے روزینہ کو قتل کر دیا ہے“ — وزیر اعظم نے کہا — ”اور اب سلطان اپنی خواہش کا اظہار کر کے آپ کے قدموں میں آگرے ہیں۔“

ماں نے برکیارق کو اٹھا کر اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کا منہ چومنے لگی۔

باہر خون بہہ رہا تھا۔ بھائی بھائی کا گلا کٹ رہا تھا اور باطنی جلتی پر تیل ڈال رہے

تھے۔

جس وقت ماں برکیارق کو اپنے قدموں سے اٹھا کر اور بازوؤں میں لے کر اُس کا منہ چوم رہی تھی، اُس وقت چار پانچ شاہی ملازم روزینہ کی لاش اٹھا رہے تھے۔ وہ سب حیران تھے کہ یہ ہوا کیا اور یہ کیسے ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ سلطنت سلجوقیہ کا سلطان برکیارق ہی ہے لیکن حکم روزینہ کا چلتا تھا اور اس سلطنت کی تو وہ ملکہ تھی۔ شمونہ شاہی خاندان کی فرد نہیں تھی، وہ تو ایک کنیز تھی..... ایک خادمہ!..... ملازم اُس سے پوچھ سکتے تھے کہ اسے کس نے قتل کیا ہے۔

”یہ قتل ہو گئی ہے“ — شمونہ نے بڑے شگفتہ لہجے میں جواب دیا — ”اسے سلطان نے اپنے ہاتھوں قتل کیا ہے۔“

”اس سے کیا جرم سرزد ہو گیا تھا؟“

”کیا آپ نہیں جانتے تھے کہ یہ باطنی تھی؟“ — شمونہ نے کہا — ”یہ اُس شیطان حسن بن صباح کی بھیجی ہوئی تھی۔“

”اچھا ہوا سلطان کو پتہ چل گیا!“ — عہدیدار نے دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا اور بولا — ”اللہ تیرا شکر..... سب تعریفیں تیری ذات کے لئے ہیں..... سلطان کہاں ہیں؟“

”اپنی والدہ محترمہ کے پاس!“ — شمونہ نے کہا — ”اللہ نے اس سلطنت پر بڑا ہی کرم کیا ہے۔ اب آپس کا خون خرابہ بند ہو جائے گا۔“

”میرے دو بھائی تھے“ — عہدیدار نے کہا — ”وہ فوج میں عہدیدار تھے۔ دونوں اس خانہ جنگی میں مارے گئے ہیں۔ میرا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔“

”شکر ادا کرو اللہ کا!“ — شمونہ نے کہا — ”اللہ تبارک و تعالیٰ نے سلطنت کو بچا لیا ہے..... یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، مجھے آپ کے بھائیوں کا بہت افسوس ہے۔ یہ سب اسی کے ہاتھوں کرایا گیا ہے جس کی لاش آپ دیکھ رہے ہیں۔ سلطان حکم دے گئے ہیں کہ اس کی لاش اور مرا ہوا یہ کتا بوری میں ڈال کر کسی جگہ گڑھا کھود کر دبا دو۔ انہوں نے کہا ہے کہ اسے قبرستان میں دفن نہیں کرنا، اسے کفن پہنانا ہے نہ اس کا جنازہ پڑھنا ہے..... اور یہ احتیاط بھی کرنا کہ کسی کو پتہ نہ چل سکے کہ سلطان نے اپنی بیگم کو قتل کر دیا ہے..... لاش اٹھوائیں اور فرش اچھی طرح صاف کروادیں۔“

ایک بوری لائی گئی جس میں روزینہ کی لاش اور مرے ہوئے گتے کو ڈالا گیا اور بوری کا منہ بند کر کے ملازم اٹھالے گئے۔ دوسرے ملازم فرش دھونے لگے۔ شمونہ نکل کر برآمدے میں کھڑی ہو گئی۔ روزینہ کی لاش باہر والے دروازے سے بھی نکل گئی تھی۔ شمونہ گہری سوچ میں کھو گئی۔

”یہ ہے انسان کی اصل حقیقت!“ — شمونہ کے ہونٹوں سے ذرا بلند سرگوشی نکل گئی۔

”کیا کہا شمونہ بی بی؟“ — شمونہ کو ایک خادمہ کی آواز سنائی دی جو اُس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی لیکن شمونہ اسے دیکھ نہیں سکی تھی۔ خادمہ سمجھی کہ شمونہ نے اُسے کچھ کہا ہے۔ شمونہ نے اس کی طرف دیکھا اور چونکی۔

”میں کہہ رہی تھی کہ انسان اپنی حقیقت اور اصلیت کو بھول جاتا ہے“ — شمونہ نے کہا — ”یہ بد نصیب یوں سمجھ بیٹھی تھی جیسے یہ ہمیشہ اس سلطنت کی ملکہ بنی رہے گی۔ یہ اللہ کو بھول گئی تھی اور شیطان کی پجاری بن گئی تھی۔ حکمرانی کے نشی اپنا تختہ اپنے ہاتھوں الٹ دیا کرتے ہیں۔“

”عبرت تو کوئی حاصل نہیں کرتا“ — خادمہ نے کہا — ”جس کے سر پر سلطانی کا تاج رکھ دیا جاتا ہے وہ سب سے پہلے یہ بھولتا ہے کہ سدا بادشاہی اللہ کی ہے..... اس ملکہ کا انجام دیکھ لو۔ ایک کتے کے ساتھ دفن ہو رہی ہے۔“

”اور اس کی قبر بھی نہیں بنے گی“ — شمونہ نے کہا — ”کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکے گا کہ یہاں وہ عورت دفن ہے جس نے کچھ عرصہ اس سلطنت پر حکومت کی تھی اور سلطان کو بھی اپنا غلام بنالیا تھا۔“

شمونہ اپنے خیالوں میں کھو گئی تھی۔ روزینہ کی لاش دُور نکل گئی تھی۔ محل کے باہر والے دروازے میں ایک عورت آن کھڑی ہوئی۔ دربان نے اُسے دیکھا اور سر سے اشارہ کیا۔ عورت اندر آگئی۔

”شیطان کی دوسری پجارن آگئی ہے“ — خادمہ نے کہا۔

”غور سے سُن لو“ — شمونہ نے خادمہ سے کہا — ”اسے یہ پتہ نہ چلے کہ روزینہ ماری جا چکی ہے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ باہر والے دربان کو بھی معلوم نہیں کہ یہ جو بوری گھوڑا گاڑی میں محل سے نکالی گئی ہے، اس میں روزینہ کی لاش تھی..... تم یہاں سے چلی جاؤ اور سامنے نہ آنا۔“

یہ تھی وہ عورت جو روزینہ کے پاس آتی اور اس سے پیغام لے کر اُس طبیب تک پہنچاتی تھی جو حسن بن صباح کا بھیجا ہوا خاص آدمی تھا اور جس نے زمین دوز طریقوں سے خانہ جنگی شروع کرائی تھی۔ یہ عورت پیغام لایا بھی کرتی تھی۔ اس کی عمر 35 سال کے لگ بھگ تھی اور وہ خوبصورت عورت تھی۔ ایسا لباس پہنتی تھی کہ کسی شاہی خاندان کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ روزینہ نے اسے شمونہ کے متعلق بتا دیا تھا کہ یہ اس کی ہمراز کنیز ہے اور حسن بن صباح کی غائبانہ معتقد اور مرید ہے۔ اس کی وجہ سے یہ عورت شمونہ کے ساتھ بھی کچھ بے تکلف ہو گئی تھی۔ شمونہ کسی کو اپنے ساتھ بے تکلف کرنے کے فن میں مہارت رکھتی تھی۔ اس عورت کے ساتھ شمونہ کی اچھی خاصی دوستی پیدا ہو گئی تھی۔

یہ عورت ذرا قریب آئی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ شمونہ بھی کھل کر مسکرائی اور اس کے استقبال کو آگے بڑھی۔

”کون سے کمرے میں ہیں؟“ — اس عورت نے روزینہ کے متعلق پوچھا۔ شمونہ کو کہنا تو یہ چاہئے تھا کہ اب وہ کسی بھی کمرے میں نہیں بلکہ ایک گتے کے ساتھ بوری میں بند ہے اور شاید اب تک زمین میں بھی دبائی جا چکی ہوگی لیکن شمونہ نے یوں نہ کہا نہ ہی اسے ایسا کہنا چاہئے تھا۔

”آپ آئیں تو سہی!“ — شمونہ نے کہا — ”آج آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ سلطان کے پاس ہیں اور شاید انہیں معلوم تھا کہ آپ آرہی ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ آئیں گی تو میں آپ کو کمرے میں بٹھاؤں..... آجائیں۔“

شمونہ اُسے اُس کمرے میں لے گئی جہاں وہ روزینہ کے ساتھ کانا پھوسی کیا کرتی تھی۔ اسے احترام سے بٹھایا اور کہا کہ میں آپ کے لئے کچھ لاتی ہوں۔ روزینہ اس عورت کی بہت خاطر تواضع کیا کرتی تھی۔ شمونہ بھی یہی اشارہ دے کر کمرے سے نکل گئی کہ وہ اُس کی خاطر تواضع کرے گی۔

تھوڑی ہی دیر بعد شمونہ جب اس کمرے میں واپس آئی تو اُس کے ساتھ محل کے دو محافظ تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بڑی لمبی رتسی تھی۔

”اس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دو اور اس کے پاؤں بھی باندھ دو“ — شمونہ نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

محافظ آگے بڑھے تو وہ عورت حیرت زدگی کے عالم میں شمونہ کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں محافظوں نے اسے گرا کر اس کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے اور پھر اسی رتسی کے ساتھ پاؤں بھی باندھ دیئے۔ اس دوران وہ چیختی اور چلاتی رہی اور شمونہ سے پوچھتی رہی کہ یہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔

”اسے فرش پر پھینک دو“ — شمونہ نے محافظوں سے کہا — ”اور دروازہ باہر سے بند کر دو“۔

شمونہ محافظوں کے ساتھ باہر نکل آئی اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ شمونہ وہیں اکھڑی کچھ سوچنے لگی۔

”تم دونوں یہیں ٹھہرو“ — شمونہ نے محافظوں سے کہا — ”میں سلطان کو اطلاع دینے جا رہی ہوں“۔



سلطان برکیارق اپنی ماں کے سامنے بیٹھا تھا۔ ماں کے چہرے پر ایک مدت بعد رونق آئی تھی۔ برکیارق کی آنکھیں پُر غم تھیں۔ وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری اُس کی ماں کو سنا چکا تھا کہ روزینہ کو برکیارق نے کیوں اور کس طرح قتل کیا ہے۔ ماں نے جب یہ سنا کہ روزینہ اس کے بڑے بیٹے کو زہر پلا رہی تھی تو ماں تڑپ اٹھی اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر آسمان کی طرف کئے اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کا بیٹا بچ گیا۔

دربان کمرے میں داخل ہوا۔ سب نے اس کی طرف دیکھا۔

”سلطان محترم کی کنیز آئی ہے“ — دربان نے کہا — ”اندر آنے کی اجازت

چاہتی ہے۔“

”اسے فوراً اندر بھیج دو“ — برکیارق کی ماں نے کہا — ”یہ تو اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہے جس نے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے اور سلجوقی سلطنت کو بہت بڑے خطرے سے محفوظ کر دیا ہے۔“

شمونہ کمرے میں داخل ہوئی۔ برکیارق کی ماں اٹھی اور لپک کر شمونہ کو گلے لگالیا۔ وہ شمونہ کو چومتی اور اس کا شکر ادا کرتی تھی۔

”میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے“ — شمونہ نے کہا — ”میں اسی مقصد کے تحت روزینہ کی کنیز بنی تھی..... یہ باتیں بعد میں کریں گے۔ میں سلطان عالی مقام کو یہ اطلاع دینے آئی ہوں کہ روزینہ کی لاش کتے کے ساتھ بوری میں بند کر کے لے گئے ہیں اور دوسری اطلاع اس سے زیادہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اتفاق سے ایک عورت آگئی ہے جسے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ روزینہ کو پیغام دینے اور اس کے پیغام لے جانے آیا کرتی تھی۔ یہ پیغام حسن بن صباح کی طرف سے آتے تھے۔ میں نے روزینہ کے ساتھ بھی بے تکلفی پیدا کر لی تھی اور اس عورت کے ساتھ بھی۔ ابھی ابھی تو میں نے اسے یہ کہہ کر کمرے میں بٹھادیا کہ روزینہ کو اطلاع دیتی ہوں۔ میں محافظ دستے کے دو آدمی ساتھ لے گئی اور ایک رسی بھی۔ میرے کہنے پر انہوں نے اس عورت کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے ہیں اور اسے ایک کمرے میں بند کر دیا ہے۔ یہ ہے وہ عورت جس سے آپ کو بڑے ہی قیمتی اور چونکا دینے والے راز ملیں گے، تب آپ کو پتہ چلے گا کہ اس سلطنت پر کتنا بڑا خطرہ منڈلا رہا تھا اور مجھے امید ہے کہ آپ نے بروقت کارروائی کی تو یہ خطرہ ٹل جائے گا اور آپ کو پتہ چلے گا کہ اس شہر میں کتنے زیادہ باطنی اکٹھے ہو گئے ہیں۔“

سلطان برکیارق کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ شمونہ کون ہے اور اس نے اس مقصد کو اپنا فرض کیوں بنایا تھا۔ وہ تو اسے ایک کنیز سمجھتا تھا جو کسی مجبوری کے تحت نوکری کی تلاش میں آئی تھی۔ اصل حقیقت تو عبدالرحمن سمیری جانتا تھا۔

”تم یہ ساری باتیں کس طرح جانتی ہو؟“ — سلطان برکیارق نے شمونہ سے

پوچھا۔

”اس سوال کا جواب بعد میں دوں گی“ — شمونہ نے جواب دیا — ”ہو سکتا ہے

اس کا جواب سلطان کو کوئی اور دے۔“

”تم وہیں چلو“ — برکیارق نے شمونہ سے کہا — ”اس عورت کو کمرے میں بند رہنے دو“۔

سلطان برکیارق اپنے وزیر اعظم سمیری سے کہہ چکا تھا کہ خانہ جنگی فوراً بند کر دی جائے لیکن مشکل یہ تھی کہ کچھ پتہ نہیں تھا کہ لڑائی کہاں کہاں ہو رہی ہے۔ سرکاری فوج تک تو حکم پہنچایا جاسکتا تھا لیکن باغی فوج تک حکم پہنچانا محال ہو رہا تھا کیونکہ یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے سالار وغیرہ کہاں ہیں۔ سالار اور یزی روپوش تھا اور اس باغی فوج کی کمان برکیارق کے چھوٹے بھائی محمد کے ہاتھ میں تھی اور سلطان تک یہ اطلاع بھی پہنچ گئی تھی کہ رے سے امیر شہر ابو مسلم رازی نے بھی اپنی فوج بلکہ ایک بڑا لشکر تیار کر کے محمد اور سالار اور یزی کی مدد کے لئے بھیجا ہے۔ اب یہ پتہ چلانا تھا کہ محمد اور سالار اور یزی کہاں ہیں۔

وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری نے تین چار قاصد بلوائے۔ ایک کو تو سرکاری فوج کے سپہ سالار ابو جعفر حجازی کے پاس اس پیغام کے ہاتھ بھیجا گیا کہ اپنی فوج کو اکٹھا کر کے شہر میں لے آئے اور جنگ بند کر دے۔ باقی قاصدوں کو یہ کام دیا کہ وہ کسی طرح یہ معلوم کریں کہ سالار اور یزی اور محمد کہاں ہیں اور انہیں یہ پیغام دیں کہ سلطان برکیارق نے اپنی والدہ محترمہ کے حکم سے جنگ بند کرنے کا اعلان کر دیا ہے اور وہ دونوں ہمارے پاس پہنچ جائیں۔

خانہ جنگی بند کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ خانہ جنگی کی صورت یہ نہیں تھی کہ دونوں طرفوں کی فوجیں ایک میدان میں لڑ رہی ہوں۔ لڑائی کی صورت یہ پیدا ہو گئی تھی کہ سرکاری اور باغی فوجیں چھوٹے بڑے دستوں میں بٹ گئی تھیں اور یہ جنگ شہر سے نکل کر مضافات میں اور اُس سے بھی دور دور جنگلوں میں پھیل گئی تھی۔ ایک دوسرے پر شب خون مارے جاتے تھے اور کہیں دستے آپس میں جم کر لڑتے تھے۔ دونوں طرف زخمی اور ہلاک ہو رہے تھے۔ بعض کی لاشیں ان کے گھروں تک پہنچ جاتی تھیں اور اکثر لاشیں وہیں گھوڑوں تلے روندی پکلی جاتی تھیں۔

یوں بھی ہوتا تھا کہ سرکاری یا باغی فوج کا کوئی آدمی مارا جاتا اور اس کی لاش گھر آ جاتی تو اس کا کوئی بھائی یا باپ یا چچا وغیرہ اسے ذاتی یا خاندانی قتل سمجھ کر انتقام کے لئے خانہ جنگی میں شامل ہو جاتا۔ باغیوں نے لوگوں کا یہ رویہ عمل اور انداز دیکھا تو انہوں نے

طیب کو بتایا۔ طیب تخریب کاری کا ماہر تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ایک خصوصی ہدایت نامہ جاری کیا۔ جس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا کہ کسی آدمی کی لاش شہر میں آتی تو اس کے گھروالوں کو بتایا جاتا کہ اسے فلاں آدمی نے لڑائی میں قتل کیا ہے۔ مقتول کے گھر کے آدمی اس آدمی کے گھر پر ٹوٹ پڑتے اور ان کے ایک دو آدمیوں کو قتل کر دیتے۔ یہ سلسلہ یوں آگے چلایا گیا اور باطنی تخریب کار کسی گھر میں آکر یہ اطلاع دیتے کہ تمہارا جو آدمی لڑنے گیا تھا وہ آدمی مارا گیا ہے اور اُس کی لاش کو گھوڑوں تلے کچل اور مسل دیا گیا ہے اور اسے فلاں آدمی نے قتل کیا ہے۔ اس اطلاع کا ردِ عمل بھی یہی ہوتا کہ مقتول کے وارث اُس گھر کے کسی آدمی کو قتل کر دیتے۔ اس طرح اس خانہ جنگی میں یہ نیا پہلو پیدا ہو گیا جس نے لوگوں کے درمیان ذاتی دشمنی پیدا کر دی۔ شہر کے لوگ اپنے گھروں کے دروازے اندر سے مقفل رکھتے تھے۔

بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ خانہ جنگی دو سال جاری رہی تھی لیکن مستند مؤرخ کچھ حوالے دے کر لکھتے ہیں کہ خانہ جنگی ایک سال اور ایک یا دو مہینے لڑی گئی تھی اور اس نے سلطنت اور لوگوں کو بھی بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان پہنچایا تھا۔ سب سے بڑا نقصان تو یہ تھا کہ سلطنت کا انتظام تمہ و بالا ہو گیا تھا اور اس سے بھی بڑا نقصان یہ ہوا کہ حسن بن صباح نے بڑے وسیع و عریض علاقے پر قبضہ کر لیا یا یوں کہنے کہ ان علاقوں کو اس نے زیرِ اثر لے لیا۔ سلطنت سلجوقیہ کو خانہ جنگی میں الجھا کر اس نے اپنا مقصد بڑی آسانی سے پالیا تھا۔ اسے صرف سلطنت کی فوج روک سکتی تھی لیکن اس سلطنت کو اس نے خاک و خون کے بڑے ہی خوفناک کھیل میں الجھا دیا۔ سرکاری فوج کا سپہ سالار ابو جعفر حجازی چونکہ شہر میں ہی تھا اور یہیں سے لڑائی کو کنٹرول کر رہا تھا اس لئے وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری کے قاصد کے پہنچنے ہی وہ آگیا۔ اُس نے سلطان برکیارق کو اپنی ماں کے پاس بیٹھا دیکھا تو وہ کچھ پریشان بھی ہوا اور حیران بھی۔

”حجازی!“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”جنگ فوراً بند کر دو اور اپنی فوج کو اس شہر میں بلا لو۔“

”سلطان عالی مقام!“ — حجازی نے کہا — ”سلطان کے حکم کی تعمیل فوراً ہوگی لیکن دستے کچھ ایسے بکھر گئے ہیں کہ انہیں لڑائی سے ہٹانا اور شہر میں لانا بڑا ہی دشوار اور وقت طلب کام ہے۔“

”کوشش کرو یہ کام ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر شروع ہو جائے“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”اور یہ بھی سن لو کہ ہم نے سالار اور یزی کو معاف کر دیا ہے۔ کسی اور کو بھی گرفتار یا ہلاک یا زخمی نہیں کرنا۔ تلواریں نیاموں میں ڈال لو۔“
 سپہ سالار حجازی فوراً روانہ ہو گیا۔



”سلطان محترم!“ — وزیر اعظم سمیری نے کہا — ”خانہ جنگی کو روکنے اور دونوں اطراف فوجوں کو الگ الگ کر کے شہر میں لانے کے لئے کچھ دن تو چاہئیں، کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم اس عورت سے کچھ پوچھ گچھ کر لیں جسے کنیز نے پکڑا ہے۔ راز کی باتیں تو اس سے معلوم ہوں گی لیکن میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ عورتیں یا آدمی اپنی جانیں دے دیتے ہیں راز نہیں دیا کرتے۔“

”ہاں!“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”یہ خطرہ تو ہے لیکن ہم کوشش کرتے ہیں شاید اس عورت کی زبان سے کچھ اگلا سکیں۔ ہمیں ناکامی ہوئی تو زندہ یہ بھی نہیں رہے گی..... میں اپنی اس کنیز نگینہ کا احسان ساری عمر نہیں بھول سکوں گا۔ اگر ماں — مجھے اجازت دے دی تو میں اس کے ساتھ شادی کر لوں گا۔“

شمونہ نے روزینہ اور سلطان برکیارق کو اپنا نام نگینہ بتایا تھا اس لئے برکیارق اسے نگینہ ہی سمجھ رہا تھا۔ اس کا نام عبدالرحمن سمیری کو معلوم تھا لیکن اس نے سلطان کو ابھی اصل نام نہ بتایا۔

”میرے بیٹے!“ — ماں نے برکیارق سے کہا — ”یہ خون خرابہ رک جائے اور سلطنت پر خطروں کی گھٹائیں منڈلا رہی ہیں، یہ اڑ جائیں تو میں تمہیں شادی کی اجازت بھی دے دوں گی اور میرا خیال ہے کہ اس سے بڑھ کر اچھی لڑکی کوئی اور نہیں ہوگی۔“
 وزیر اعظم سمیری نے جب یہ سنا کہ سلطان شمونہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور سلطان کی ماں بھی اسی لڑکی کو پسند کر رہی ہے تو اسے پریشانی سی ہوئی کیونکہ شمونہ منزل آفندی کی محبت میں گرفتار تھی اور اس نے منزل کے ساتھ ہی شادی کرنی تھی۔ سمیری کو پریشانی یہ تھی کہ جب یہ صورت پیدا ہوگی کہ سلطان شمونہ سے شادی کا فیصلہ کرے گا تو اسے کس طرح قائل کیا جاسکے گا کہ شمونہ سے ہاتھ اٹھا دے اور اسے دل سے نکال دے کیونکہ یہ منزل کے ساتھ منسوب ہے۔

دونوں اس کمرے میں گئے جہاں وہ عورت اوندھے منہ فرش پر پڑی تھی اور اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ سلطان برکیارق نے محافظ دستے کے کماندار کو بلایا اور اسے کہا کہ اس عورت کے ہاتھ پاؤں کھول دے۔

ذرا سی دیر میں عورت کے ہاتھ پاؤں کھل گئے اور وہ وہی تباہی بکنے لگی کہ سلطان کی ایک ادنیٰ سی کنیز نے اس کے ہاتھ پاؤں بندھوا دیئے تھے۔

”تم ہو کون؟“ — سلطان برکیارق نے پوچھا — ”اور یہاں کیا لینے آئی تھیں؟“
 ”میں سلطان عالی مقام کی بیگم کی سہیلی ہوں“ — عورت نے جواب دیا — ”میں ان کے پاس آتی رہتی ہوں۔ آج آئی تو آپ کی کنیز نے.....“

”تمہیں رستوں سے بندھوا دیا“ — سلطان برکیارق نے اس کی بات کاٹ کر کہا —
 ”اور تمہیں میری بیگم دیکھنے نہیں آئی..... تم کس کی بیٹی ہو؟ تم کس کی بیوی ہو؟ تمہارا گھر کہاں ہے؟ مجھے ٹھیک جواب دو اور میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلوں گا۔“

”میرا نام رابعہ ہے“ — عورت نے جواب دیا — ”میں شاہ در کی رہنے والی ہوں اور یہاں اپنے خاوند کے ساتھ رہتی ہوں لیکن میں آپ سے یہ عرض کروں گی کہ میرے گھر نہ آئیں کیونکہ میرا شوہر بڑا ہی ظالم آدمی ہے اور وہ وہی بھی ہے۔ اگر آپ یا کوئی اور میرے گھر آیا تو میرا خاوند مجھ پر نہ جانے کیسے کیسے الزام تھوپ دے اور میری پٹائی شروع کر دے۔ میں شاہ در کے ایک قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں۔“

”تمہارا نام رابعہ نہیں ہے“ — وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری نے کہا — ”تمہارا باپ کسی بھی قبیلے کا سردار نہیں نہ تمہارا کوئی خاوند ہے..... میری ایک بات غور سے سن لو۔ اپنی اصلیت فوراً بتادو۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ اگر تمہارا یہ ارادہ ہے کہ تم کوئی راز اگلنے سے پہلے اپنے آپ کو ہلاک کر لو گی تو یہ خیال دل سے نکال دو۔“

سمیری نے محافظ دستے کے کماندار سے کہا — ”اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پیچھے کر لو۔“

رابعہ فوراً اٹھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی ناف پر رکھ لئے۔ کماندار طاقتور آدمی تھا۔ اس نے پیچھے ہو کر عورت کے دونوں بازو پکڑے اور بڑی زور سے جھٹکا دے کر بازو اس کی پیٹھ کے پیچھے کر لئے۔ سمیری آگے بڑھا اور اس کی قمیض اوپر کر دی۔ اس نے سلطان برکیارق سے کہا کہ یہ دیکھ لے۔ عورت نے نیفے میں ایک خنجر اڑسا ہوا تھا۔

سمیری نے یہ خنجر اس کے نیپے سے نکال لیا۔

”سلطان محترم!“ — سمیری نے برکیارق سے کہا — ”اس خنجر کی نوک یقیناً“
زہر میں بچھی ہوئی ہے۔ کسی جانور کو مار کر دیکھ لیں۔“

وزیر اعظم سمیری نے اس عورت کے بال مٹھی میں پکڑ کر بڑی زور سے جھٹکا دیا۔
عورت کے دانت بچ اٹھے۔ دوسرا جھٹکا دے کر سمیری نے اس کا سر پیچھے کر دیا۔

”ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے“ — سمیری نے کہا — ”ایسی اذیتیں دیں گے
کہ مروگی بھی نہیں اور زندہ بھی نہیں رہو گی۔ حسن بن صباح تمہیں ہم سے چھڑا نہیں
سکے گا..... کو‘ج بولتی ہو؟“

”کیا ج بولوں؟“ — رابعہ نے کہا — ”کیا آپ لوگوں میں اتنی بھی تہذیب نہیں
کہ میں اتنے بڑے باپ کی بیٹی.....“

وزیر اعظم سمیری نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی اور بڑی زور سے جھٹکا دیا جس
سے وہ پیچھے دیوار کے ساتھ ٹکرائی۔ محافظ کا کماندار آگے بڑھا۔

”مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی زبان کھولوں“ — کماندار نے کہا۔

سلطان برکیارق کے اشارے پر کماندار رابعہ کی طرف بڑھا اور اُس کی گردن اور
اُس کے کندھے کے درمیان میں کوئی رگ اپنی مٹھی میں لے کر دبائی۔ رابعہ تڑپنے لگی
اور اس کا منہ کھل گیا۔ یہ عورت اتنے طاقتور کماندار کی مٹھی میں ایسے ہی تھی جیسے شیر
نے ایک خرگوش کو اپنے منہ میں لے رکھا ہو۔

”کو میں باطنی ہوں“ — کماندار نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی کماندار نے مٹھی اور زور سے دبائی تو عورت کا چہرہ لال سرخ ہو گیا
اور وہ اور زیادہ تڑپنے لگی۔ کماندار نے ایک بار پھر کہا کہ وہ کہے کہ میں باطنی ہوں۔

رابعہ نے اپنا سر زور زور سے ہلایا جیسے وہ اقرار کر رہی ہو۔ کماندار نے اس کی رگ
چھوڑ دی۔ وہ فرش پر گری اور ایک ہاتھ سے وہ رگ دبائے لگی۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا وہ
ابھی تک تکلیف میں ہے۔

”بولو“ — کماندار نے اسے پاؤں کی ٹھوکر خاصے زور سے لگا کر کہا۔

”مجھے قتل کر دو“ — رابعہ نے روتے ہوئے کہا — ”اگر میں اپنا سینہ کھول کر
راز آپ کے آگے انڈیل دیتی ہوں تو بھی مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ وہ یوں قتل نہیں

کریں گے کہ میری گردن کاٹ دیں گے بلکہ بڑی ہی اذیت ناک موت ماریں گے۔ میرے تمام کپڑے اتار کر میرے جسم پر شد مل دیں گے پھر میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر باہر جنگل میں پھینک دیں گے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ کیڑے مکوڑے اور کھیاں کس طرح مجھے کھائیں گی۔ بچھو اور دوسرے زہریلے کیڑے بھی میری کھال کو کالتے رہیں گے۔ میں نے اس طرح ایک عورت کو مرتے دیکھا ہے۔ وہ پورے دس دن تڑپتی رہی تھی اور حشرات الارض آہستہ آہستہ اس کی کھال کو کھاتے رہے تھے۔ میں اس موت سے ڈرتی ہوں۔“

”مت ڈرو“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”میں تمہیں ساری عمر یہیں اسی محل میں رکھوں گا۔ چاہو گی تو کسی اچھے آدمی کے ساتھ تمہاری شادی کرادوں گا۔ یہاں آرام سے عمر گزارو گی اور بڑے ہی عیش و عشرت میں رہو گی۔“

”اگر جھوٹ بولو گی تو سن لو“ — وزیر اعظم سمیری نے کہا — ”تمہیں قید خانے میں بڑی ہی بدنودار کوٹھڑی میں پھینک دیا جائے گا جس میں چوہے اور زہریلے کیڑے رہتے ہیں۔ دن کے وقت تمہیں الٹا لٹکا کر نیچے دھکتے انگارے رکھ دیئے جایا کریں گے اور ان پر ایک آدمی مرچیں پھینکتا رہے گا۔ تصویر میں لاؤ کہ مرجوں کا دھواں تمہاری ناک اور منہ کے راستے تمہارے اندر جائے گا تو تمہاری کیا حالت ہو گی۔ رات کو تمہیں اس کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے گا۔۔۔۔۔ بہتر ہے کہ تم اپنی اصلیت بتا دو اور تمہارا رابطہ حسن بن صباح کے جن لوگوں کے ساتھ ہے وہ بتا دو کہاں کہاں رہتے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلنے دیا جائے گا کہ ہمیں یہ راز تم نے دیا ہے۔“

مسلمان مؤرخوں نے اور یورپی مؤرخوں نے بھی متفقہ طور پر لکھا ہے کہ حسن بن صباح کے فدائیوں کو ایسی تربیت دی جاتی تھی کہ ان کی فطرت ہی بدل جاتی تھی۔ ان کے لئے زندگی اور موت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ زندہ رہتے تھے تو صرف حسن بن صباح کے احکام کی تعمیل کے لئے زندہ رہتے تھے اور جب اپنی جانیں لینے پر آتے تھے تو بڑے فخر اور اطمینان سے اپنی جانیں دے دیتے تھے۔ ہر فدائی کے پاس وہ عورت ہوتی یا مرد، ایک خنجر ہوتا تھا جس کی نوک زہر میں بھجھتی ہوتی تھی۔ ان میں سے کوئی پکڑا جاتا اور وہ دیکھتا کہ فرار کا کوئی راستہ نہیں اور راز اگلنا ہی پڑے گا تو وہ خنجر نکال کر اپنے دل میں اتار لیتا تھا۔ رابعہ نے بھی اپنے پاس ایک خنجر اسی مقصد کے لئے رکھا ہوا تھا لیکن

وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری جانتا تھا کہ ہر فدائی کے پاس خنجر ہوتا ہے۔ اس نے اس عورت کے لباس سے خنجر نکال لیا۔ اس خنجر کی موجودگی ہی یہ پکا ثبوت تھا کہ وہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ عورت ہے۔ سلطان برکیارق کے ذہن میں اگر ابھی تک کوئی شک باقی تھا تو وہ بھی نکل گیا۔

”میں اپنے دو بچوں کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہوں“ — رابعہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا — ”دونوں ابھی چھوٹے ہیں۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا خاوند بھی ہے“ — عبدالرحمن سمیری نے کہا — ”وہ بھی یقیناً فدائی ہو گا۔“

”میرا کوئی خاوند نہیں“ — رابعہ نے کہا — ”میں کبھی کسی کی بیوی نہیں رہی۔ ایک بچے کا باپ کوئی اور ہے اور دوسرے کا کوئی اور۔ میں نے اپنی زندگی شیخ الجبل حسن بن صباح کے نام وقف کر دی تھی۔ میری ساری عمر فریب کاری میں گزری ہے۔“

”وہ ہم جانتے ہیں“ — عبدالرحمن سمیری نے کہا — ”ہم جانتے ہیں کہ فدائی عورتیں کیا کچھ کرتی ہیں۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ یہاں جو فدائی ہیں وہ کہاں کہاں رہتے ہیں۔“

”اس شہر کی ایک چوتھائی آبادی بائنیوں کی ہے“ — رابعہ نے کہا — ”کوئی ایک بھی اس شہر کا باشندہ نہیں۔ سب باہر سے آئے ہیں۔ میں اتنے زیادہ لوگوں کے گھر تو بتا نہیں سکتی، صرف ایک جگہ بتاتی ہوں۔ وہاں رات کو چھاپہ ماریں تو آپ کو فدائیوں کا ایک مرکز مل جائے گا۔ وہاں جو آدمی ہوں گے، ان کے متعلق میں اتنا ہی کہوں گی کہ ہر آدمی حسن بن صباح کا فدائی ہے۔“

ماس نے طبیب کے گھر کا پتہ بتا دیا۔ پھر اس نے چند اور اہم آدمیوں کے نام اور ٹھکانے بتائے۔

”آپ کی سلطنت میں خانہ جنگی حسن بن صباح نے شروع کرائی تھی“ — رابعہ نے بتایا — ”سلطان کو مٹھی میں لینے اور انہیں کٹھپتلی کی طرح استعمال کرنے کے لئے روزینہ کو بھیجا گیا تھا۔ روزینہ سلطان کو صبح شام ایک خاص قسم کی حشیش پلاتی رہتی تھی اور پھر اس کیفیت میں وہ اپنے حسن و جوانی کا طلسم استعمال کرتی تھی۔ سلطان تو جوان ہیں اور ان کے جذبات بھی جوان ہیں، روزینہ اور اُس جیسی لڑکیاں پتھروں کو بھی موم کیا کرتی ہیں۔ میں روزینہ اور طبیب کے درمیان ایک رابطہ ہوں۔ اگر روزینہ انکار کرتی

ہے اور کہتی ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں تو اسے میرے سامنے لائیں۔ میں آپ کو اس محل میں وہ جگہ دکھاؤں گی جہاں اس نے حشیش رکھی ہوئی ہے۔“

”کیا روزینہ مجھے قتل کرنا چاہتی تھی؟“ — سلطان برکیارق نے پوچھا۔

”نہیں!“ — رابعہ نے جواب دیا — ”آپ پوری طرح اس کی مٹھی میں تھے۔ آپ کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ قتل صرف اُس صورت میں آپ کو کیا جاتا کہ آپ بیدار ہو کر اس کی مٹھی سے نکل آتے..... ہاں، آپ کے دونوں بھائیوں کو، آپ کی ماں کو اور آپ کے وزیر اعظم کو قتل کرنا تھا لیکن کچھ دیر بعد..... ایک بات اور بتاتی ہوں لیکن میں شک میں ہوں۔ آپ کی یہ جو کنیز ہے اس نے اپنا نام گنیمہ بتایا ہے۔ مجھے کچھ ایسا شک ہوتا ہے کہ اس کا نام گنیمہ نہیں کچھ اور ہے۔ میں لڑکپن میں حسن بن صباح کے پاس گئی تھی۔ مجھے دھوکے میں لے جایا گیا تھا۔ مجھے کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ یہ کنیز اُس وقت وہیں تھی۔ یہاں میں نے اسے دیکھا تو کچھ یقین بھی آنے لگا کیونکہ یہ روزینہ کے ساتھ پوری طرح بے تکلف تھی اور اس کی رازدار بھی تھی۔ کبھی کبھی حسن بن صباح کی باتیں بھی کرتی تھی اور روزینہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی یہ کنیز فطری طور پر باطنی ہے اور غائبانہ طور پر حسن بن صباح کی مرید ہے۔“

سلطان برکیارق نے اپنے وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری کی طرف دیکھا۔ وزیر اعظم نے سلطان کو آنکھ کا ہلکا سا اشارہ کیا۔

”کیا تم اپنے بچوں کو یہاں لانا چاہو گی؟“ — وزیر اعظم سمیری نے رابعہ سے پوچھا۔

”کیا آپ مجھے جانے کی اجازت نہیں دیں گے؟“ — رابعہ نے پوچھا۔

”نہیں!“ — وزیر اعظم سمیری نے کہا — ”تم کہتی ہو کہ اپنے بچوں کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہو۔ اب تم صرف اس صورت میں زندہ رہو گی کہ یہیں رہو۔ تمہارے بچے یہاں آجائیں گے۔ ہمیں بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں۔“

”بچے ہی تو نہیں“ — رابعہ نے کہا — ”میرا اتنا قیمتی سلمان بھی وہاں پڑا ہے۔“

”سب کچھ آجائے گا“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”تم صرف جگہ بتا دو۔“

رابعہ نے اپنا گہرا چھی طرح سمجھا دیا۔

”بچوں کو ابھی لے آئیں گے“ — رابعہ نے کہا — ”سلمان رات کو اس طرح

لائیں کہ کسی کو پتہ نہ چلے ورنہ میں ماری جاؤں گی اور میرے بچے بھی محفوظ نہیں رہیں گے..... لیکن ایک بات تو میں نے سوچی ہی نہیں تھی، وہ اب دماغ میں آئی ہے۔ اگر روزینہ یہاں ہے تو میں یہاں کس طرح رہ سکتی ہوں؟ وہ تو کسی وقت بھی مجھے قتل کروا دے گی یا دھوکے میں زہر پلا دے گی۔ اگر اس نے مجھے قتل نہ کیا تو میرے بچوں کو مروا ڈالے گی یا اغوا کرادے گی۔ اس کے پاس ایک ایسا زہر ہے جس کا کوئی ذائقہ ہی نہیں۔“

وزیراعظم عبدالرحمن سمیری اور محافظ دستے کے کماندار نے سلطان برکیارق کی طرف دیکھا۔ اس بات کا جواب سلطان ہی دے سکتا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ سلطان روزینہ کے قتل کو ابھی پردے میں رکھنا چاہتا ہے یا نہ جانے اس کا کیا خیال ہے۔

”تم روزینہ کو یہاں نہیں دیکھ سکو گی“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”وہ دفن ہو چکی ہے۔ اس سارے محل میں گھوم پھر کر دیکھ لو۔ وہ زندہ نہیں۔“

”دفن ہو چکی ہے؟“ — رابعہ نے حیرت سے پوچھا — ”کیوں؟ کیا وہ بیمار ہو کر مر گئی نہ یا.....“

”ہم پر اس کی اصلیت بے نقاب ہو گئی تھی“ — سلطان برکیارق نے جواب دیا — ”میں نہیں جانتا کہ تمہیں حسن بن صباح سے کیا ملتا تھا۔ اگر یہ بتا دو تو یہاں سے تمہیں دگنا انعام اور معاوضہ ملے گا۔ اب تم وہی کام ہمارے لئے کرو جو تم حسن بن صباح کے لئے کرتی رہی ہو۔ پہلے تم آوارہ پھرتی رہی ہو، اب تم اس محل کی ایک قابل عزت فرد بنادی جاؤ گی..... سوچ لو، اب تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔“

داستان گو پہلے بیان کر چکا ہے کہ حسن بن صباح کے کسی فدائی سے راز لینا ایسا ہی ناممکن تھا جیسے ایک پتھر سے دودھ کی دھاریں نکالی جائیں۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ ایک فدائی عورت نے سارے ہی راز دے دیئے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ سلطان برکیارق، اس کے بھائی، اس کی ماں اور وزیراعظم اسلام کے تحفظ بقا اور فروغ کے لئے لڑ رہے تھے اور ان کا ایمان تھا کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ رابعہ نے اپنی جوانی حسن بن صباح کے باطل عقیدے کو سینے سے لگائے گزار دی تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ حسن بن صباح نے اس کی فطرت ہی بدل ڈالی ہے لیکن مامتا ایسا جذبہ ہے جو ماں کا دین و ایمان بھی ہلا ڈالتا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے دو بچوں نے اسے راز اگلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بہر حال یہ ایک معجزہ تھا کہ رابعہ نے تمام راز دے دیئے اور بہت

سے آدمیوں کی نشاندہی بھی کی۔



سلطان برکیارق نے رابعہ کی رہائش کا انتظام کرنے کا حکم دے دیا اور یہ بھی کہ اس کے بچوں کو بھی یہاں لے آئیں وزیراعظم عبدالرحمن سمیری نے کہا کہ اس عورت کی رہائش پر پہرہ ضرور ہونا چاہئے اور پہرہ ایسا ہو کہ اسے پتہ نہ چلے۔ دو تین ملازموں کو یہ فرض سونپ دیا جائے کہ وہ ہر وقت اس پر نظر رکھیں سلطان برکیارق نے اس مشورے کے مطابق حکم جاری کر دیا۔

اس کے بعد سلطان برکیارق نے باہر آ کر وزیراعظم سے کہا کہ جنگ بند کرانا اس کا کام ہے اور وہ جس قدر جلدی ہو سکے یہ قتل و غارت روکوا دے۔

سمیری چلا گیا اور سلطان برکیارق نے اپنے دربان سے کہا کہ وہ کنیز نگینہ کو میرے کمرے میں بھیج دے۔ اس نے جا کر دیکھا اس کے کمرے کے فرش سے روزینہ کا خون دھو دیا گیا تھا اور دروازے کے باہر جو خون گرا تھا وہ بھی صاف کر دیا گیا تھا۔ کمرے میں پھر قالین ویسے ہی بچھ گیا تھا جیسے پہلے ہوا کرتا تھا جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ برکیارق پلنگ پر بیٹھا اور پھر لیٹ گیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شمونہ کمرے میں داخل ہوئی اور کنیزوں کی طرح آداب بجالائی۔ سلطان برکیارق نے اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ۔ شمونہ قالین پر بیٹھ گئی۔

”نگینہ!“ — سلطان برکیارق نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا — ”اب تم کنیز نہیں ہو۔ میرے دل میں تم نے اپنا درجہ خاصا بلند کر لیا ہے۔ اوپر بیٹھو یا میرے پاس پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔“

شمونہ قالین سے اٹھی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے“ — برکیارق نے کہا — ”تم نے سلجوقی سلطنت کو مزید خون خرابے سے بچا لیا ہے میں تمہیں اس کا انعام دینا چاہتا ہوں بولو“ کیا چاہئے!“

”سلطان عالی مقام!“ — شمونہ نے کہا — ”میں نے آپ کی والدہ محترمہ سے بھی کہا تھا اور آپ سے بھی کہتی ہوں کہ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے نئی زندگی یا موت دینے والا صرف اللہ ہے۔ اللہ نے اگر مجھے اس کا سبب بتایا ہے تو یہ میرا کمال

نہیں۔ میں کوئی انعام نہیں چاہتی۔“

”لیکن میں تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”تم نے میری صرف جان ہی نہیں بچائی بلکہ میری ذات اور میری شخصیت کو ایک تباہی سے بچایا ہے۔ میں ایک شیطان کے قبضے میں آگیا تھا۔ اس نے مجھ سے میری ماں کی توہین کرائی۔ یہ ایک کبیرہ گناہ ہے جو معلوم نہیں اللہ تعالیٰ بھی معاف کرے گا یا نہیں اور اس شیطان نے مجھے میرے بھائیوں کا دشمن بنایا اور یہ جو قتل و غارت میری سلطنت میں شروع ہو گئی ہے، یہ بھی میرے حساب میں لکھی جائے گی۔ تم آگنی تو میں راہ راست پر آگیا ہوں۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ اور مجھ پر معمولی احسان نہیں۔“

”میں نے انعام حاصل کر لیا ہے سلطان محترم!“ — شمونہ نے کہا — ”میں یہ کلام کرنا چاہتی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میں کامیاب ہو جاؤں گی لیکن اللہ نے میری دعائیں قبول کیں اور میں کامیاب ہو گئی۔ یہ انعام کچھ کم نہیں کہ میں نے جو کرنا چاہا وہ ہو گیا۔“

”میں تمہیں ایک انعام دینا چاہتا ہوں“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”تم اب روزینہ کی جگہ لوگی..... آج سے تم کنیز نہیں ہو۔ میں اس خانہ جنگی کا خاتمہ کر کے حالات کو معمول پر لے آؤں تو تمہارے ساتھ شادی کر لوں گا۔ مجھے ایسی امید نہیں رکھنی چاہئے کہ تم انکار کرو گی۔“

”سلطان محترم!“ — شمونہ نے مسکراتے ہوئے کہا — ”آپ یہی امید رکھیں کہ میں انکار ہی کروں گی۔ اس انکار کا ایک جواز ہے اور اس کا پس منظر بھی ہے..... آپ پس منظر سن لیں پھر شادی کر لیں گے۔“

”مطلب یہ کہ تم شادی شدہ ہو“ — سلطان برکیارق نے کہا۔

”میں شادی شدہ نہیں ہوں“ — شمونہ نے کہا — ”لیکن میں مرد کی فطرت کی کمزوریوں سے اور مرد کے وجود سے اور مرد کی عیش پرستی اور لذت پرستی سے ناواقف نہیں ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ سلطان عالی مقام! میرا نام مگینہ نہیں شمونہ ہے۔ میں نے یہاں اپنا صحیح نام اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر نہیں بتایا تھا۔ میں بچپن میں ایک قافلے سے اغوا کی گئی تھی اور میری پرورش حسن بن صبح کی جنت میں ہوئی تھی۔ جوان ہوئی تو میں حسن بن صبح کے زیر سایہ رہی۔ میرے اندر اہلیت سمودی گئی تھی اور پھر

مجھے اس طرف بھیج دیا گیا۔ میں آپ کو کوئی لمبی داستان نہیں سناؤں گی۔ میں نے بڑے بڑے سرداروں، عہدیداروں اور کمانداروں کو حسن بن صباح کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پھر جس طرح آپ راہِ راست پر آئے ہیں اسی طرح اللہ نے مجھے روشنی دکھائی اور میں بھی اللہ کی راہ پر آگئی.....

”اللہ نے مجھے یہ انعام دیا کہ مجھے میری ماں مل گئی جس کی آغوش سے مجھے برسوں پہلے نوچا گیا تھا۔ پھر مجھے ایک اور انسان مل گیا جس نے مجھے دلی اور روحانی محبت سے آشنا ہی نہیں بلکہ سرشار کیا۔ اس آدمی نے حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے اتنی زیادہ قربانی دی کہ اپنے خاندان سے الگ ہو کر بیس کاہو کے رہ گیا ہے۔ وہ اصفہان کا رہنے والا ہے اور اس کا ہم منزل آندی ہے۔ وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے گیا تھا لیکن ان کے جہل میں آگیا۔ انہوں نے اپنے خصوصی طریقوں سے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا اور اسے سلطان ملک شاہ مرحوم کے قتل کے لئے تیار کر کے یہاں بھیج دیا.....

”یہ سلطان مرحوم کی خوش نصیبی تھی اور یہ منزل کی بھی خوش نصیبی تھی کہ اس نے میرے ساتھ اس ارادے کا ذکر کر دیا۔ میں نے سلطان مرحوم کو بتا دیا۔ سلطان مرحوم نے طبیب کو بلایا اور طبیب نے اسے دوائیاں وغیرہ دیں۔ کراس کے دل و دماغ سے بائیسوں کے اثرات نکل دیئے۔ اسے واپس اپنی اصلی حالت میں لانے میں میرا عمل دخل بھی ہے۔ ہم دونوں کی محبت ایک دوسرے کی روح میں اترتی ہوئی ہے۔“

”پھر تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟“ — سلطان برکیہ ق نے پوچھا۔

”ہم دونوں کا مقصد اور عہد ایک ہے“ — شمونہ نے کہا — ”ہم نے حسن بن صباح کو قتل کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ یہ عہد پورا کر کے ہم شادی میں گئے لیکن ہمارے سامنے مشکل یہ رہی ہے کہ مجھے بھی اور منزل کو بھی قلعہ الموت بہت سے لوگ جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ہم وہاں گئے تو جاتے ہی پکڑے جائیں گے۔ ہم حسن بن صباح کے خلاف کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن کوئی موقعہ نہیں مل رہا تھا۔ آپ کی شادی روزینہ سے ہوئی تو مجھے بتایا گیا کہ روزینہ حسن بن صباح کی جنت سے آئی ہے۔ پھر میں اور منزل سنتے رہے کہ اس لڑکی نے آپ کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے اور پھر یہ بھی پتہ چلا کہ یہ خانہ جنگی بائیسوں نے ہی شروع کرائی ہے۔ میں تڑپتی رہی کہ مجھے کو کس طرح قتل کروں لیکن کوئی راستہ اور کوئی ذریعہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر مجھے وزیر اعظم

عبدالرحمن سمیری سے ملوایا گیا اور انہوں نے مجھے یہاں کنیز رکھوایا۔“

شمونہ نے سلطان برکیارق کو تفصیلاً سنایا کہ اس نے روزینہ کے دل میں اپنا اعتماد کس طرح پیدا کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ جو تربیت روزینہ کو ملی تھی وہی تربیت اسے دے دی گئی تھی۔ شمونہ نے بتایا کہ اس نے وہی تربیت اور وہی تجربہ روزینہ پر استعمال کیا اور اس کے دل میں اتر گئی۔

شمونہ نے سلطان برکیارق کو یہ نہ بتایا کہ روزینہ نے شربت میں زہر نہیں ملایا تھا بلکہ زہر شمونہ نے اپنے ہاتھوں سے ملایا اور یہ منصوبہ جو اس نے سوچا تھا کامیاب رہا۔ شمونہ نے بھی سوچ لیا تھا کہ اس نے اگر برکیارق کو بتا دیا کہ روزینہ نے شربت میں زہر نہیں ملایا تھا تو ہو سکتا ہے کہ برکیارق کو افسوس ہو کہ اس نے بلاوجہ روزینہ کو قتل کیا۔

شمونہ نے برکیارق کو یہ بھی بتایا کہ روزینہ شربت میں خاص قسم کی حشیش ملایا کرتی تھی اور شمونہ نے یہ شربت غسل خانے میں امڈیل دی اور دوسرا شربت ڈال کر اس میں وہ دوائی ملا دی تھی جو طبیب نے منزل کو دی تھی۔ مختصر یہ کہ شمونہ نے برکیارق کو لمحہ بہ لمحہ اپنے کارنامے کی تفصیلات سنائیں۔ برکیارق اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

”سلطان علی مقام!“ — شمونہ نے کہا — ”اگر آپ نے میرے ساتھ شادی کی یا جذباتی طور پر مجھے مجبور کیا تو یہ انعام نہیں ہو گا بلکہ میرا جو انعام ہے اس سے آپ مجھے محروم کریں گے۔ آپ کی سلطنت میں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی موجود ہے۔ مجھے آزاد رہنے دیں۔ میرا عہد ابھی پورا نہیں ہوا۔ میرے سینے میں حسن بن صلیح کے خلاف نفرت اور انتقام کا طوفان اٹھتا ہے جسے میں بڑی مشکل سے دباتی ہوں۔ میں اس شیطان تک تو نہیں پہنچ سکتی لیکن جہاں پہنچے گا کہ اس کا کوئی فدائی مرد یا عورت فلاں جگہ موجود ہے، میں اسے اپنے ہاتھوں زہر ملاؤں گی۔“

”میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔“ — سلطان برکیارق نے کہا اور پوچھا —
”منزل آتھدی کہاں ہے؟“

”وہ ملار اور یزی کے ساتھ ہے۔“ — شمونہ نے جواب دیا — ”اس کا رابطہ آپ کے دونوں بھائیوں غم اور سبخر کے ساتھ رہتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ باطنی دونوں طرفوں کی فوجوں اور شہر میں بھی موجود ہیں اور وہی جلتی پر تیل ڈال رہے ہیں۔ منزل ان

بانیوں کے قتل کے لئے دیوانہ ہوا جاتا ہے۔ میں اسے آپ سے ملواؤں گی۔“
 سلطان برکیارق پلنگ پر نیم دراز تھا۔ وہ یلکھت اٹھ بیٹھا اور لپک کر شمونہ کا
 دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور پھر اُس ہاتھ کو چوما اور پھر بڑے
 احترام سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”اگر ایک عورت اتنا بڑا کام کر سکتی ہے تو میں تو سلطان ہوتے ہوئے اور زیادہ
 بڑے کام کر سکتا ہوں۔“ — سلطان برکیارق نے بڑے جوشیلے اور پُر عزم لہجے میں کہا
 — ”زندگی میں صرف شادی ہی تو ایک مسئلہ نہیں ہوتا۔ مجھے بہت کچھ کرنا ہے اور میں
 کروں گا۔“

”اب میرے لئے کیا حکم ہے؟“ — شمونہ نے برکیارق سے پوچھا اور کہا —
 ”میں اپنا فرض ادا کر چکی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی ماں کے پاس چلی جاؤں۔..
 ... میں اپنے تجربے کی بنا پر کہتی ہوں کہ مجھے یہاں سے چلے ہی جانا چاہئے۔ میں آپ
 کے سامنے نہ ہی رہوں تو اچھا ہے ورنہ آپ کے ارادے متزلزل رہیں گے اور جب بھی
 آپ مجھے دیکھیں گے تو آپ کے دل میں یہ خواہش تڑپے گی کہ میں روزینہ کی جگہ لے
 دوں۔ مجھے آپ جب بھی یاد کریں گے فوراً ”پہنچوں گی۔“

”ہاں شمونہ!“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”تم نے مجھے بیدار کر دیا ہے اور تم
 نے میرے اندر ایک عزم پیدا کیا ہے..... تم نے جو کہا ٹھیک کہا ہے۔ تم اپنی ماں کے
 پاس چلی جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں بھی مجبور کر دوں
 کہ میرے ساتھ شادی کر لو۔ اب میں ہمہ وقت سلطنت کے کاموں میں مصروف ہو
 پاؤں گا۔“

شمونہ انٹھی اور آداب بجالا کر برکیارق کے کمرے سے نکل آئی۔



شمونہ اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔

سلطان برکیارق نے وزیر اعظم سمیری کو بلایا۔ تھوڑی دیر بعد سمیری آگیا۔
 ”اُس طبیب کے گھر آج رات ہی چھاپہ مارنے کا انتظام کریں“ — سلطان
 برکیارق نے کہا — ”چھاپہ آدمی رات کے کچھ دیر بعد مارا جائے، بہر حال یہ انتظام
 آپ نے کرنا ہے۔“

”انتظام ہو جائے گا“ — وزیر اعظم سمیری نے کہا — ”لیکن میں سلطان محترم کو بتا دوں کہ ان لوگوں کو زندہ پکڑنا آسان نہیں ہو گا۔ میں اجازت چاہتا ہوں کہ وہ لوگ مقابلہ کریں تو ہم یہ کوشش نہ کریں کہ انہیں زندہ پکڑا جائے۔ البتہ یہ کوشش ضرور ہو گی کہ ایک دو آدمی زندہ ضرور پکڑے جائیں۔“

”یہ سب کچھ سوچنا آپ کا کام ہے“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”صبح تک مجھے یہ لوگ زندہ یا مردہ دیکھنے ہیں۔“

اُس زمانے میں وزیر اعظم سپہ سالاری کا اور فن حرب و ضرب کا پورا پورا تجربہ رکھتے تھے۔ ضرورت کے وقت وزیر اعظم فوج کی کمان بھی لے لیا کرتا تھا۔ وزیر اعظم سمیری نے جا کر چھاپے کے لئے آدمی منتخب کر لئے۔ اس چھاپہ مار جماعت کا جو کماندار تھا اسے بھیجا گیا کہ وہ طبیب کا گھر دیکھ آئے۔ طبیب کا گھر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ پورے شہر میں مشہور ہو گیا تھا۔ بہر حال کماندار چلا گیا اور وہ گھر اس نظر سے دیکھ آیا کہ رات اس گھر پر چھاپہ مارنا ہے۔

اس رات طبیب کے گھر میں کچھ زیادہ ہی آدمی اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ خانہ جنگی بند کرنے کا حکم مل گیا ہے۔ پتہ اس طرح چلا کہ سلطان برکیارق نے سپہ سالار ابو جعفر حجازی کو حکم دیا تھا کہ سرکاری فوج کو لڑنے سے روک دیا جائے۔ سپہ سالار حجازی نے ہر طرف قاصد دوڑا دیئے تھے اور جس طرف زیادہ دستے تھے اُس طرف وہ خود چلا گیا تھا۔ اس طرح سلطان کا حکم کوئی راز نہیں رہا تھا۔ یہ فوراً ”باغیوں تک پہنچ گیا تھا۔ ان باغیوں میں جو لیڈر قسم کے افراد تھے وہ طبیب کے ہاں اکٹھے ہو گئے تھے اور وہ اس صورتِ حال پر ہلچل خیز خیال کر رہے تھے۔ انہیں اب یہ سوچنا تھا کہ خانہ جنگی کس طرح جاری رکھی جائے اور اس صورتِ حال میں کس قسم کی تخریب کاری کی جاسکتی ہے۔“

اس حویلی میں کم و بیش بیس آدمی اکٹھے ہو گئے تھے۔ رات گزرتی جا رہی تھی اور یہ لوگ اس طرح تباہ خیالات اور بحث مباحثہ کر رہے تھے جیسے ان کا سونے کا کوئی ارادہ نہیں۔ طبیب بار بار کہتا تھا کہ خانہ جنگی بند ہو گئی تو وہ شیخ الجبل (حسن بن صباح) کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔

”غور اس پر کریں کہ سلطان نے یہ حکم دیا ہی کیوں ہے“ — طبیب کے ایک

دستِ راست نے کہا — ”اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ روزِ نہ ناکم ہو گئی ہے۔“
 ”میں نے یہی سوچ کر رابعہ کو بلوایا تھا“ — طبیب نے کہا — ”اور اسے روزِ نہ
 کے پاس جانے کو کہا تھا لیکن رابعہ ابھی تک واپس نہیں آئی۔ اس کے گھر آدمی بھیجا تو پتہ
 چلا کہ اس کے بچے بھی گھر میں نہیں ہیں۔ گھر خالی پڑا ہے۔“
 ”پھر وہ پکڑی گئی ہے“ — ایک آدمی نے کہا — ”کیسے ایسا تو نہیں کہ سلطان
 برکیارق کو بھائیوں نے قتل ہی کر دیا ہو؟..... خانہ جنگی بند کرنے کا حکم محمد نے ہی دیا ہو
 گا۔“

اس گروہ کو ابھی پتہ نہیں چلا تھا کہ جوا کیا ہے۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے
 تھے اور راتِ آدمی گزر گئی تھی..... یہ ایک بڑی حویلی تھی جس کی ساخت ایک قلعے
 جیسی تھی۔ اس کی چھت سباتھ والے مکانوں کی چھتوں سے ملتی تھی۔ ان آدمیوں میں
 سے کسی ایک نے کہا کہ چھت پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ سب
 خاموش ہو گئے۔ قدموں کی آہٹیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ آدمی
 دوڑ کر صحن میں آئے اور اوپر دیکھنے لگے۔

عبدالرحمن سمیری کی بھیجی ہوئی چھاپہ مار جماعت کسی قریبی مکان میں داخل ہو کر
 اوپر گئی اور چھتوں کے ذریعے طبیب کی چھت تک پہنچی۔ نیچے سے بانٹیوں نے دیکھ لیا
 اور کوئی زور سے پکارا — ”تیار ہو جاؤ بھائیو!“ — حویلی کے برآمدے میں دو دیسے
 جل رہے تھے۔ ان کی روشنی صحن میں بھی جا رہی تھی۔

صحن میں جو باطنی نکلے تھے، ان میں سے کچھ برآمدے کی طرف دوڑے اور دو
 دروازے کی طرف گئے اور دروازے کی زنجیر اتارنے لگے۔ منڈیر سے ایک چھاپہ مار نے
 ان پر برچھی پھینکی جو ایک چھاپہ مار کی پیٹھ میں اتر گئی۔ دوسرے نے ایسی دلیری کا مظاہرہ
 کیا کہ باہر بھاگنے کی بجائے اس نے اپنے ساتھی کی پیٹھ میں سے برچھی نکال لی اور چھاپہ
 ماروں سے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ چھاپہ مار دوڑتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف آئے
 اور بڑی ہی تیزی سے نیچے اترنے لگے۔

کمرے میں سے تمام باطنی تلواریں اور برچھیاں لے کر نکل آئے۔ چھاپہ ماروں کی
 تعداد پچیس یا تیس تھی۔ باطنی بیس تھے۔ حویلی کے صحن میں بڑا ہی خونریز معرکہ لڑا
 گیا۔ دو چھاپہ مار دروازے کے قریب کھڑے ہو گئے تھے تاکہ کوئی بھاگ نہ سکے۔ چھاپہ

ماروں کا کماندار بار بار چلا رہا تھا کہ ان میں سے دو تین کو زندہ چھوڑ لیکن باطنی زندگی کا آخری معرکہ لڑنے کے انداز سے دلیری سے لڑ رہے تھے۔

چھاپہ مار تجربہ کار تھے۔ ان کے چند ایک آدمی زخمی ہو چکے تھے اور وہ گر پڑے تھے لیکن زیادہ نقصان بانیوں کا ہو رہا تھا۔ دیکھا گیا کہ ایک باطنی نے جب دیکھا کہ اس کے ساتھی مارے گئے ہیں اور چھاپہ مار غالب آگئے ہیں تو وہ دوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ دو تین چھاپہ مار اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھے لیکن باطنی نے اپنی تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔ ایک باطنی جو کسی کمرے میں چھپ گیا تھا، نکلا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ اُس وقت کوئی چھاپہ مار دروازے کے قریب نہیں تھا۔ باطنی درازہ کھول رہا تھا کہ دو چھاپہ ماروں نے اس پر وار کرنے کی بجائے اسے ایسا جکڑا کہ وہ لڑنے کے قائل نہ رہا۔ اسے زندہ پکڑ لیا گیا۔

طیب بھی مارا گیا اور اس کے گروہ کا کوئی ایک بھی آدمی پاؤں پر کھڑا نہ رہا۔ صرف ایک کو زندہ پکڑا گیا۔ چھاپہ ماروں کا کماندار زخمی بانیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان میں کوئی معمولی زخمی ہو گا تو اسے اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس نے ایک زخمی کو دیکھا جو پیٹھ کے بل پڑا تھا۔ اس نے اپنی تلوار جو اس کے قریب ہی پڑی تھی، اٹھائی اور اوپر کر کے اپنے پیٹ میں مار لی۔ پانچ چھ چھاپہ مار بارے جا چکے تھے اور زخمی تقریباً سب ہی ہوئے تھے لیکن وہ چل پھر سکتے تھے۔ چھاپہ ماروں نے اپنے زخمیوں کو کندھوں پر اٹھالیا اور زندہ باطنی کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل آئے۔

وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری چھاپہ ماروں کی واپسی کے انتظار میں بے تاب ہو رہا تھا۔ آخر چھاپہ مار پہنچ گئے۔ سب کے کپڑے خون سے لال تھے۔ انہوں نے زندہ باطنی وزیر اعظم کے حوالے کیا اور اسے بتایا کہ باقی سب مارے گئے ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ بانیوں نے کس بے خونی سے مقابلہ کیا تھا۔

”اسے اُس کمرے میں لے جاؤ“ — وزیر اعظم سمیری نے کہا۔

وہ ایک خاص کمرہ تھا جو محل کے ایک دور کے حصے میں تھا۔ کہاں محل کا حُسن اور رونق اور کہاں یہ کمرہ کہ اس میں جو داخل ہوتا وہ ناک پر کپڑا رکھ لیتا تھا کیونکہ یہ کمرہ ایسی بدبو سے بھرا ہوا تھا جو ناقابل برداشت تھی۔ یہاں ملزموں اور مُشتبوں سے تفتیش کی جاتی تھی۔ تفتیش کا مطلب پوچھ گچھ نہیں بلکہ ایسی غیر انسانی اذیتیں دی جاتی تھیں

کہ آدمی مر مر کر جیتا تھا۔ بعض مر ہی جاتے تھے۔ ان کی لاشیں کچھ دن وہیں پڑی رہنے دی جاتی تھیں اور وہ دوسرے مڑموں کو دکھا کر کہا جاتا تھا کہ سچ بولو ورنہ تمہاری لاش بھی ان لاشوں کے ساتھ پڑی ہوگی۔



اس باطنی کو اس کمرے میں لے جایا گیا اور کچھ دیر بعد وزیر اعظم سمیری اپنے دو خاص آدمیوں کے ساتھ وہاں گیا۔ باطنی سے کہا کہ وہ اگر سچ بولے گا تو اس کی جان بخشی کر دی جائے گی اور انعام بھی دیا جائے گا ورنہ اس کا حشر بہت بُرا ہوگا۔

”میں شیخ الجبل کو دھوکا نہیں دوں گا“ — باطنی نے کہا — ”میرے جسم کو پاؤں سے کاٹنا شروع کر دو۔ میری زبان سلامت رہنے دو تو بھی میری زبان پر وہ سچ نہیں آئے گا جو تم لوگ سنا چاہتے ہو۔“

اس کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کیا گیا، بھلانے اور درغلانے کا ہر حربہ آزمایا گیا اور لالچ دیئے گئے لیکن وہ شخص مسکراتا رہا۔ اس کے چہرے پر سکون اور اطمینان تھا۔ وزیر اعظم سمیری نے اپنے آدمیوں کو سر سے ہلکا سا اشارہ کیا اور خود باہر نکل آیا۔ ان آدمیوں نے دروازہ بند کر دیا۔

صبح طلوع ہوئی اور سورج کچھ اوپر اٹھا تو وزیر اعظم سمیری اپنے گھر سے نکلا۔ وہ اپنے دفتر میں جانے کی بجائے اُسی کمرے میں چلا گیا جس میں باطنی کو رکھا گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس باطنی کو اس کے آدمیوں نے اُلٹا لٹکایا ہوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کے ساتھ دس دس سیروزی پتھر بندھے ہوئے تھے۔ وزیر اعظم کو بتایا گیا کہ اس نے کچھ بھی نہیں بتایا بلکہ یہ بولتا ہی نہیں۔ وزیر اعظم نے انہیں کہا کہ اپنا عمل جاری رکھو اور اگر یہ مرجاتا ہے تو مرجانے دو لیکن کوشش کرو کہ یہ کچھ اُگل دے۔

چار پانچ گھنٹے گزر گئے تو وزیر اعظم سمیری ایک بار پھر اس کمرے میں گیا۔ باطنی ابھی تک اُلٹا لٹکا ہوا تھا۔ سمیری حیران ہو رہا تھا کہ یہ شخص انسان ہے یا پتھر کا مجسمہ ہے۔ اس نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔

کمرے کا دروازہ بڑی زور سے کھلا۔ وزیر اعظم سمیری اور اس کے دونوں آدمیوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ ایک عورت تھی جس کے بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے غریبانہ سے کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ پریشان حال نظر

آتی تھی۔ وہ اُلٹا لٹکے ہوئے باطنی کے ساتھ لپٹ گئی اور رونے اور چیخنے لگی۔ باطنی کو چھوڑ کر وہ وزیر اعظم سمیری کے قدموں میں جاگری اور اس کے قدموں میں ماتھا رکڑنے لگی۔

”اللہ تمہیں اس سے بڑا عمدہ دے“ — اس عورت نے روتے ہوئے فریاد کی — ”یہ میرا بھائی ہے..... ایک ہی ایک بھائی ہے“ اس پر کوئی شک نہ کرو۔ اسے باطنی نہ سمجھو۔ اس کا اس گروہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں..... اللہ کے نام پر اسے چھوڑ دو ورنہ میرے بچے بھوکے مرجائیں گے۔“

دونوں آدمی اس عورت کو اٹھا کر باہر کودھکیلنے لگے لیکن وزیر اعظم سمیری نے انہیں روک دیا اور اس عورت سے پوچھا کہ وہ اندر کس طرح آگئی ہے۔

”میں دربانوں کے آگے روئی اور فریادیں کی تھیں“ — عورت نے کہا —

”انہوں نے مجھے روک لیا تھا لیکن ان کے دلوں میں رحم آگیا اور انہوں نے یہ بھی بتا دیا کہ تمہارا بھائی فلاں کمرے میں بند ہے۔“

”آرام سے بات کرو“ — وزیر اعظم سمیری نے اسے کہا — ”ہم کسی پر بلا وجہ ظلم نہیں کرتے۔ تمہارا یہ بھائی ہم نے اُس طبیب کے گھر سے پکڑا ہے جو حسن بن صباح کا بھیجا ہوا خاص آدمی ہے۔ ان لوگوں نے ہمارے چھاپے ماروں کا مقابلہ کیا تھا اور سب مارے گئے ہیں۔ تمہارا یہ بھائی زندہ پکڑا گیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ یہ وہاں کیا کر رہا تھا؟“

”میں جانتی ہوں یہ وہاں کیوں گیا تھا“ — عورت نے کہا — ”یہ اس طبیب کے پاس گیا تھا۔ اسے پیٹ کی کوئی بیماری تھی ہوئی ہے۔ طبیب اسے اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا اور اس سے اپنے گھر کے اور دوائی خانے کے چھوٹے موٹے کام کرواتا تھا اور اس کی اسے اجرت دیتا تھا۔“

”لیکن یہ تو اپنے منہ سے کہتا ہے کہ میں باطنی ہوں“ — وزیر اعظم سمیری نے کہا — ”اس نے کہا ہے کہ میں شیخ الجبل کو دھوکا نہیں دوں گا اور سچ نہیں بولوں گا۔“

”اس سے پوچھیں کہ یہ جانتا ہے کہ شیخ الجبل کون ہے؟“ — عورت نے کہا —

”اسے ان شیطانوں نے یہ بتایا ہو گا کہ شیخ الجبل اللہ کا بھیجا ہوا کوئی نبی یا ولی یا امام ہے۔ اس بے پوچھو کہ حسن بن صباح کون ہے تو یہ نفرت سے تھوک دے گا۔“

یہ عورت بار بار وزیر اعظم کے آگے ہاتھ جوڑتی اور جھک کر اس کے پاؤں پکڑتی

اور یہی فریاد کرتی تھی کہ میرے بھائی کو چھوڑ دو، یہ بے گناہ ہے اور میرا اور میرے بچوں کا واحد سہارا ہے۔ اس عورت کا ترہنہ رونا اور بے حل ہو جانا کچھ اثر کر گیا۔ وزیر اعظم سمیری سوچ میں پڑ گیا۔ آخر اس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اسے اتار کر لٹاؤ اور اسے پانی پلاؤ۔

”اب میری ایک بات سنو“ — وزیر اعظم سمیری نے اس بد حال عورت سے کہا — ”میں تمہیں اس بھائی کے ساتھ اکیلا چھوڑ دوں گا اگر یہ حسن بن صبح کا چیلہ ہے تو بتا دے۔ اگر نہیں تو تم مجھ سے تسلیم کروالو کہ اس کا اس گروہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میری تسلی ہو گئی تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔“

اس باطنی کو اتار آگیا، پانی پایا گیا اور پھر وزیر اعظم کے کہنے پر اسے کچھ کھلایا گیا اور اس عورت کے ساتھ اسے کمرے میں تنہا چھوڑ دیا گیا۔ وزیر اعظم سمیری وہاں سے جا چکا تھا۔

”بے وقوف!“ — اس عورت نے باطنی کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا — ”تم زندہ کس طرح پکڑے گئے تھے؟ بھاگ جاتے، مرجاتے!“

”میں تو دروازے سے نکل رہا تھا کہ انہوں نے پکڑ لیا“ — باطنی نے کراہتے ہوئے کہا — ”تم نے تو مکمل ہی کر دیا ہے۔ کیا مجھے یہاں سے نکلا سکو گی؟“

”میں نے کوئی بھی کام ہاتھ میں لیا ہے تو کر کے ہی چھوڑا ہے“ — عورت نے کہا — ”مجھے امید ہے کہ تمہیں یہاں سے نکل لے جاؤں گی۔ اگر انہوں نے نہ چھوڑا تو مجھے یہ تو پتہ چل گیا ہے کہ تم یہاں ہو، میں تمہیں کسی نہ کسی طرح فرار کروالوں گی..... مجھے یہ بتاؤ کہ میں کسے اطلاع دوں کہ تم یہاں ہو۔ میں تو اپنے گروہ کو جانتی ہوں لیکن ہر کسی کو نہیں۔“

باطنی نے اسے بتانا شروع کر دیا۔



دن کے پچھے پھر وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری سلطان برکیارق کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ خانہ جنگی بند کرانے اور حالات کو معمول پر لانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ سلطان برکیارق ذہنی طور پر اس قدر ٹھیک ہو گیا تھا کہ وہ اپنے مرحوم باپ سلطان ملک شاہ کی طرح باتیں کرنے لگا تھا۔ اس نے یہاں تک کہا کہ خانہ جنگی رُک جائے تو دونوں طرف

کے لشکریوں کو اکٹھا کر کے میں ایسی طاقتور فوج بناؤں گا جو ایک ہی جے میں حسن بن صباح کا صفایا کر دے گی۔

دربان کمرے میں داخل ہوا۔

”سلطان عالی مقام!“ — دربان نے جھک کر کہا — ”ایک عورت آئی ہے۔ ملاقات کی اجازت چاہتی ہے۔“

سلطان برکیارق کے چہرے پر خفگی کے تاثرات آگئے اور اس نے وزیراعظم سمیری کی طرف دیکھا۔ اُس وقت سلطان کسی عام آدمی سے ملنے کے مُوڈ میں نہیں تھا۔
”میں جانتا ہوں وہ کون ہے؟“ — وزیراعظم سمیری نے کہا — ”اُسے آنے دیں سلطان محترم!“

وزیراعظم نے دربان سے کہا کہ اسے اندر بھیج دو۔

رابعہ کمرے میں داخل ہوئی۔ سلطان برکیارق نے اسے اس حالت میں دیکھا تو کچھ پریشان سا ہو کر بولا کہ یہ تجھے کیا ہو گیا ہے رابعہ؟ میرے محل میں تم اس حالت کو کس طرح پہنچی ہو؟..... رابعہ ہنس پڑی۔ اس کے بل بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے میلے اور بوسیدہ تھے اور وہ بھکارن لگتی تھی۔

”یہ میں آپ کو بتاؤں گا سلطان محترم!“ — وزیراعظم سمیری نے کہا — ”پہلے میں اس سے وہ بات سن لوں جس کے لئے میں نے اسے بلایا تھا۔“

”کام کر آئی ہوں“ — رابعہ نے بیٹھتے ہوئے کہا — ”یہ بھی بھلا کوئی کام تھا۔ میں نے اس سے وہ سب کچھ اُگلا لیا ہے جو آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے جسم کے آپ ٹکڑے کر دیتے، وہ نہ بولتا۔“

وہ عورت جو تفتیش والے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اُس باطنی سے لپٹ گئی تھی اور وزیراعظم سمیری کے قدموں میں ماتھا رگڑ کر فریادیں کرتی تھی، وہ اس باطنی کی بہن نہیں تھی نہ اس کی کچھ لگتی تھی۔ وہ رابعہ تھی۔ رابعہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ تھی۔ داستان گو سنا چکا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی خاطر سلطان برکیارق کے آگے جھک گئی اور اس نے راز اُگل دیئے تھے اور اب عبدالرحمن سمیری نے اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس نے رابعہ کو صبح اپنے پاس بٹھا کر بتایا تھا کہ رات ہم نے طیب کے گھر چھاپہ مارا

ہے اور اس کا صرف ایک آدمی زندہ بچا گیا ہے لیکن وہ بوتا نہیں۔
 ”بولے گا!“ — راجہ نے پُر اٹھو انداز سے کہا — ”میں وہاں آؤں گی لیکن آپ
 کا وہاں ہونا لازمی ہے۔“

وزیر اعظم سمیری اور راجہ نے ایک سکیم بنائی اور راجہ اٹھ کر چلی گئی۔ جو وقت
 مقرر کیا گیا تھا اس وقت وزیر اعظم اس کمرے میں پہنچ گیا اور راجہ ایک غریب، مفلوک
 الحال اور پریشان حال عورت کے بہروپ میں اس کمرے میں جا پہنچی اور وہ اداکاری کی جو
 پہلے سنائی جا چکی ہے۔ وزیر اعظم اپنے دونوں آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں سے آگیا اور
 راجہ نے اس باطنی کو رام کر لیا۔ یہ باطنی راجہ کو جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ راجہ اس
 قدر عیار اور تجربہ کار ہے کہ جنگل میں نکل جائے تو درندوں کو بھی اپنا مرید بنا لے۔ اس
 باطنی نے راجہ کو وہ باتیں بھی بتادیں جو راجہ کو بھی معلوم نہیں تھیں۔ یہ باطنیوں کے
 کچھ اور ٹھکانے تھے اور باطنیوں کی تخریب کاری کی تفصیلات تھیں۔

یہ کام اور یہ کامیاب اداکاری راجہ ہی کر سکتی تھی ورنہ یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی
 غریب سی عورت محل کے احاطے میں داخل بھی ہو سکتی، اور پھر وہ اس کمرے تک پہنچ
 جاتی جہاں کوئی غیر متعلق سرکاری کارندہ بھی نہیں جاسکتا تھا۔

”تم بہت بڑے انعام کی حقدار ہو راجہ!“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”میں
 تمہارے لئے اس محل میں رہائش کا خصوصی انتظام کروا رہا ہوں۔ تمہارے بچوں کی
 تعلیم و تربیت ہمارے ذمے ہوگی..... اب تم جاؤ، اپنا حلیہ صحیح کرو، میں تمہیں پھر بلاؤں
 گا۔“

راجہ فاتحانہ چال چلتی وہاں سے چلی گئی..... وزیر اعظم سمیری نے سلطان برکیارق
 سے کہا کہ اب ہمیں اس باطنی کو زندہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ
 اسے قید میں ڈالنے کی بجائے ختم ہی کر دیا جائے۔

دربان کو بلایا گیا اور اسے کہا گیا کہ فلاں آدمی کو بلائے۔ وہ آدمی آیا تو سلطان
 برکیارق نے اسے کہا کہ اس باطنی کو قتل کر کے اس کی لاش کہیں دبا دو لیکن قبرستان میں
 نہیں۔

وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری نے سلطان سے ایک ایسا حکم جاری کروایا جس نے
 تاریخ کا رخ ہی پھیر دیا۔ وزیر اعظم نے سلطان کو مشورہ دیا کہ جن باطنیوں کی نشاندہی ہو

گئی ہے، انہیں پکڑ لیا جائے، کسی سے کچھ بھی نہ پوچھا جائے نہ انہیں سزائے قید دی جائے بلکہ قتل کر دیا جائے۔ سلطان برکیارق پہلے ہی شرمسار تھا کہ وہ ایک باطنی لڑکی کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا اور سلطنت کو خانہ جنگی میں جھونک دیا۔ وہ اپنے اندر ایک تلخی محسوس کرتا تھا جو کبھی کم ہوتی اور کبھی اتنی زیادہ کہ اس کی برداشت سے باہر ہو جاتی اور وہ غصے میں آ جاتا تھا۔ اسی کیفیت میں اس نے وزیر اعظم کی بات مان لی اور کہا اس کی روحانی تسکین اسی طرح ہوگی کہ اس کے سامنے ان باغیوں کے سر اڑا دیئے جائیں۔

تاریخ نویس ابوالقاسم رفیع دلاوری نے مشہور مؤرخوں، ابن اثیر، ابن خلدون اور ابن جوزی کے حوالوں سے لکھا ہے کہ باغیوں کے جن ٹھکانوں کی نشاندہی ہو گئی تھی، وہاں چھاپے مارے گئے اور یہ چھاپے اس انداز سے مارے گئے کہ زیادہ سے زیادہ باطنی زندہ پکڑے گئے جن میں چند ایسے باطنی تھے جو طبیب کی طرح سرداری درجے کے تھے۔ وہ احکام اور ہدایات جاری کرتے تھے اور تخریب کاری کو خوش اسلوبی اور کامیابی سے چلانے رکھنا ان کی ذمہ داری تھی۔ ان تمام سرداروں کو لا کر کچھ بھی نہ کہا گیا، سرب یہ کیا گیا کہ تین چار جلاؤ بلائے گئے جو ان کی گردنیں کاٹتے گئے۔ ان کی لاشیں ایک ترا گڑھے میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی جاتی تھی۔

یہ سلسلہ چار پانچ دن چلتا رہا اور سلطان کو یہ اطلاع ملی کہ خانہ جنگی رک گئی ہے۔ اور تمام سالاروں اور کمانڈروں کے ساتھ رابطہ ہو گیا ہے۔ اس اطلاع کے فوراً بعد سپہ سالار ابو جعفر حجازی، نائب سپہ سالار لوریزی جو باغی ہو گیا تھا، محمد اور سبخر سلطان کے پاس آ گئے۔ سلطان یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ابو مسلم رازی بھی ان کے ساتھ تھا۔



سلطان برکیارق دو سروں کے لئے تونہ اٹھا لیکن ان کے پیچھے ابو مسلم رازی کو دیکھا تو وہ اس سے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر اور جھک کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر سب کو بٹھا کر ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔

”محترم رازی!“ — سلطان برکیارق نے ابو مسلم رازی سے کہا — ”آپ کو دیکھ کر مجھے اپنے وہ سرحوم یاد آ گئے ہیں لیکن آپ یہاں کیسے؟ کیا حیرت بے معنی ہے؟“

ابو مسلم رازی بہت بوڑھا گیا تھا۔ وہ سلطان ملک شاہ مرحوم کا دست راست اور

ہوا ہی گہرا دوست تھا۔ ملک شاہ نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ ابو مسلم رازی صرف ایک شر اور اس کے مضافاتی علاقے کا امیر ہے۔ دونوں اسلام کے شیدائی اور حسن بن صباح کے دشمن تھے۔ سلطان برکیارق تو یوں تھا جیسے ابو مسلم رازی کے ہاتھوں پیدا ہوا ہو۔

”نہیں بیٹے!“ — ابو مسلم رازی نے سلطان برکیارق سے کہا — ”تمہاری حیرت بے معنی نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میں اپنے لشکر کے ساتھ تمہارے دارالسلطنت سے تھوڑی ہی دور موجود رہا ہوں۔ میں نے تم سے یہ سلطنت چھینی نہیں تھی بلکہ اس سلطنت کو حسن بن صباح سے محفوظ رکھنا تھا مگر تم ایک باطنی لڑکی کے چنگل میں ایسے آئے کہ تمہیں نیک و بد کی تمیز سے ہی اُس نے محروم کر دیا اور تم میں سود و زیاں کا احساس ہی نہ رہا۔ اب قاصد نے یہ خبر دی کہ تم نے خانہ جنگی روکنے کا حکم دیا ہے تو یہ لڑکے من ہی نہیں رہے تھے لیکن میرے عزیز بیٹے! میں نے زمانہ دیکھا ہے۔ میں نے انہیں کہا چلو چلتے ہیں شاید بات چیت سے یہ مسئلہ حل ہو جائے۔“

”یہ مسئلہ حل ہو گیا ہے“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”اس باطنی لڑکی کو میں نے اپنے ہاتھوں قتل کر دیا ہے اور میں سب سے پہلے عظیم مل کے قدموں میں جا کر اور اس سے اپنے گنہ بخشوائے۔ پھر میں نے اور وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری نے آپس میں صلاح پشورے کر کے جو کارروائیاں کی ہیں، آپ کے گوش گزار کرتا ہوں۔“

سلطان برکیارق نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح باطنیوں کے ٹھکانوں کا سراغ لیا گیا ہے اور کس طرح چھاپے مار کر انہیں پکڑا جا رہا ہے اور ان سب کو قتل کیا جا رہا ہے۔ ان سب کو پہلے معلوم نہیں تھا کہ دارالسلطنت میں اور سلطان کے محل میں انقلاب آ رہا ہے۔ سب حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ وہ جب یہاں آئے تھے تو ان کے چروں پر تلو تھا اور ان سب کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ سلطان کو شک اور شبہ کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ سلطان برکیارق کی باتیں سن کر ان کے چروں پر رونق آ گئی۔

”اب میں چاہتا ہوں“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”کہ دونوں طرفوں کے لشکر اکٹھے کر کے ایک لشکر بنا دیا جائے اور پھر اس لشکر کو کچھ دن تربیت دے کر قلعہ الموت پر حملہ کیا جائے۔ چند ایک باطنیوں کو قتل کر دینے سے حسن بن صباح کے باطل عقیدے کے طوفان کو روکا نہیں جاسکتا۔ مجھے اطلاعات مل رہی ہیں کہ اس شیطان نے

بڑے ہی وسیع اور عریض علاقے کو اپنے زیر اثر کر لیا ہے۔۔۔

”زیر اثر بھی ایسا کہ ہمارا لشکر قلعہ الموت کی طرف پیش قدمی کرے گا تو ان علاقوں کے لوگ ہمارے لشکر کا اگر مقابلہ نہیں کریں گے تو لشکر راستے میں رکھوٹیں ضرور پیدا کریں گے“

ابو مسلم رازی کے کہنے پر سلطان برکیارق کی ماں کو وہاں بلا لیا گیا۔ ماں آئی تو اپنے بیٹوں بیٹوں کو اور ان سب کو اکٹھا بیٹھے دیکھ کر رو پڑی اور ہاتھ آسمان کی طرف کر کے ان کے اتھلو اور پیار کی دعائیں مانگنے لگی اور اللہ کا شکر لہوا کیا کہ آج اس کے بیٹے اور بیٹوں کے سلاار اور ابو مسلم رازی جیسا عالم اور فاضل یہ سب ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہیں۔

لوہر جن مورخوں کے حوالے دیئے گئے ہیں انہوں نے اور مسیحی مورخوں نے لکھا ہے کہ ابو مسلم رازی عالم اور فاضل تھا، وزیر اندیش اور دانشمند تھا۔ اس نے اس اجتماع میں ایک نئی تجویز رکھی اور زور دیا کہ اس پر فوری طور پر عمل کیا جائے۔ تجویز یہ تھی کہ تینوں بھائی ایک ہی دارالسلطنت میں اکٹھے نہ رہیں۔ کیونکہ انسان بڑی کمزور چیز ہے اور انسان ہلکی سب سے بڑی کمزوری اقتدار پرستی ہے۔ اس سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک حصے کا حکمران سلطان برکیارق ہو اور دوسرے کا محمد اور سبخر لیکن مرکز سلطان برکیارق کے تحت رہے تاکہ سلطنت کی مرکزیت بھی قائم رہے اور اتھلو بھی۔ ابو مسلم رازی نے یہ بھی کہا کہ سلطنت کو بانٹنا نہ کیا تھا مور سلطنت اور دیگر مسائل کا۔ ابوجہ صرف ایک سلطان کے سر پر پڑا رہے گا جو اس کے لئے کسی وقت بھی ناقد برداشت ہو سکتا ہے۔

وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری برائے نام وزیر اعظم نہیں تھا۔ وہ بھی عمر رسیدہ اور جہانگیر آدمی تھا۔ اس نے ابو مسلم رازی کی اس تجویز کی پُر زور تائید کی اور کہا کہ یہ تقسیم ابھی ہو جانی چاہئے اسے التوا میں نہ رکھا جائے۔

سلطان برکیارق کی ماں نے بھی اس تجویز کو پسند کیا اور دونوں سلااروں ابو جعفر حجازی اور اوریزی نے بھی کہا کہ یہ قتل دلو اور قتل عمل ہے۔ چنانچہ اسی وقت نقشے سامنے رکھے گئے اور سلطنت کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا لیکن اس پر عمل صرف اس لئے ملتوی کیا گیا کہ سرکاری فوج اور باغی کے دستے شہر میں آجائیں اور اس شہر کو پانسیون سے صاف کر دیا جائے تو پھر اطمینان سے تقسیم پر عمل کیا جائے گا۔

اس تقسیم پر تینوں بھائی رضامند ہو گئے اور ماں نے بھی اس کی منظوری دے دی۔ تاریخ کے مطابق جو حصے محمد اور سبخر کو دیئے گئے ان میں شام، عراق، موصل، آذربائیجان اور آرمینیا قاتل ذکر ہیں۔ باقی تمام حصہ برکیارق کو ملا لیکن یہ بھی طے پایا کہ بلا دستی اور برتری برکیارق کو حاصل ہوگی۔



بکھرے ہوئے دستے اکٹھے کئے جا رہے تھے اور وہ شہر میں آرہے تھے۔ سلطان برکیارق نے حکم دے دیا کہ جہاں کہیں کوئی باطنی نظر آئے اسے قتل کر دیا جائے۔ اس حکم میں یہ بھی کہا گیا کہ کسی نے کسی غیر باطنی کو ذاتی رنجش یا دشمنی کی بنا پر قتل کیا اور جواز یہ پیش کیا کہ یہ باطنی تھا، اس کے قاتل کو فوراً قتل کر دیا جائے گا اور اس کے پسماندگان سے تواں وصول کر کے مقتول کے پسماندگان کو دیا جائے گا۔ سرکاری طور پر انتظام کیا گیا کہ کوئی مشکوک آدمی شہر میں نظر آئے تو پوری چھان بین کی جائے کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کیا وہ اس شہر کا باشندہ ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اسے کسی حکم کے بغیر قتل کر دیا جائے۔

شہر میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو جانتے تھے کہ یہ خانہ جنگی باطنیوں نے زمین دوز تخریب کاری کے ذریعے شروع کرائی ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ کون باطنی اور کون مسلمان ہے اور اس شہر کا قدیم باشندہ ہے۔ ان تک جب باطنیوں کے قتل کا حکم پہنچا تو انہوں نے باطنیوں کو چُن چُن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔

شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ حکم یہ تھا کہ شہر میں سے کسی ایک کو بھی باہر نہ جانے دیا جائے اور شہر کے اندر صرف اُن فوجیوں کو آنے دیا جائے جو شہر سے باہر بکھر کر لڑ رہے تھے۔ اس حکم کا یہ اثر ہوا کہ شہر سے نکلنے کی کوشش کرنے والے باطنی پکڑے گئے اور قتل کر دیئے گئے۔

برکیارق نے باغیوں کے قتل عام کا حکم دے دیا اور باغی قتل ہونے لگے۔ کچھ سلطان باغی تو ایسے تھے کہ جن کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں تھا اور بعض ایسے بھی تھے جن پر شک تھا کہ یہ باغی ہیں۔ شہر کے مسلمانوں نے انہیں بھی قتل کر دیا لیکن سلطان برکیارق اس کے وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری اور ابو مسلم رازی کو اگر یہ یقین تھا کہ مرو میں باغیوں کو قتل کر دینے سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا تو یہ ان کی بھول تھی۔ اتنا تو وہ جانتے ہی ہوں گے کہ باغیوں کے اس قتل عام کی اطلاع حسن بن صباح تک ضرور ہی پہنچے گی اور وہ جوابی وار ضرور کرے گا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس ابلیس کا ہر وار زمین دوز ہوتا ہے اور بڑا ہی کاری ہوتا ہے لیکن تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ باغیوں کے متعلق خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ انہیں پوری طرح اندازہ نہیں تھا کہ حسن بن صباح کا انتقامی وار کس قدر خطرناک ہو گا اور وہ مسلمانوں کے خون کے دریا بہا دے گا۔

ابو مسلم رازی، عبدالرحمن سمیری اور سلطان برکیارق کی ماں نے سلطنت کو بھائیوں میں تقسیم بھی کر دیا لیکن باغیوں کے قتل عام کا فیصلہ اور سلطنت کی تقسیم کا فیصلہ بھڑکے ہوئے جذبات کے زیر اثر کیا گیا تھا۔ حسن بن صباح جس قدر بدترین اور خطرناک دشمن تھا اتنا ہی اس کا فرقہ منظم تھا۔ اس کے تخریب کار فدائی اور جاسوس قلعہ الموت سے جتنی بھی دور ہوتے تھے ان کے ذہنوں کی طرح ایک تنظیم میں پروئے ہوئے ہوتے تھے، مثلاً ”مرو میں طبیب تھا جو اس علاقے کے فدائین کو ایک بے عیب تنظیم اور بڑے سخت ڈسپلن کے تحت اپنے کنٹرول میں رکھتا تھا اور سوچ سمجھ کر تخریبی کارروائیاں کرواتا تھا۔ خانہ جنگی اُسی۔ نہ شروع کروائی تھی۔ ہر علاقے میں طبیب جیسے

آدمی موجود تھے اور ان سب کا رابطہ قلعہ الموت کے ساتھ جاسوسوں اور قاصدوں کے ذریعے تھا۔ ہر روز ایک قاصد تیز رفتار گھوڑے پر مروج سے قلعہ الموت کو روانہ ہوتا تھا اور وہ جس قدر جلدی ممکن ہو سکتا تھا، حسن بن صباح کے پاس پہنچتا اور اسے خبریں دیتا تھا۔

حسن بن صباح کے جاسوس سلطنت سلجوقیہ کے بڑے شہروں اور قصبوں میں اور دُور دراز کے دیہاتی علاقوں میں اس قدر زیادہ آگئے تھے جیسے ایک پتھر اٹھاؤ تو اس کے نیچے سے ایک باطنی جاسوس یا فدائی برآمد ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں سلطنت سلجوقیہ کے حکمران، وزیر اور مشیر لشکر کی زبان میں سوچتے اور ایک دوسرے کو مشورے دیتے تھے۔ حسن بن صباح جیسے دشمن کو فوج اور لشکر سے مارنا آسان نہیں تھا۔

مروج شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی تاکہ کوئی باطنی شہر سے نکل نہ سکے نہ ہی کوئی باطنی باہر سے آ سکے۔ یہ ناکہ بندی دو تین دنوں میں ختم کر دی گئی تھی کیونکہ شہر کے لوگ باہر جا کر اپنے عزیزوں کی لاشیں ڈھونڈنا اور شہر میں لانا چاہتے تھے تاکہ ان کے باقاعدہ جنازے پڑھے جائیں اور صحیح طریقے سے تجہیز و تکفین کی جائے۔ ان لوگوں کے لئے شہر کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔

دو دن تو باطنیوں کو چُن چُن کر قتل کیا جاتا رہا، اس کے بعد یہ سلسلہ ذرا تھم گیا اور اکاؤ کا باطنی قتل ہونے لگے۔ ایسے واقعات بھی تاریخ میں ملتے ہیں کہ کسی نے کسی مسلمان کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیا کہ یہ باطنی ہے تو مسلمانوں نے اُسے قتل کر دیا۔ ہر باطنی کو پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ یہ باطنی ہی تھے جو مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو ہی قتل کروا رہے تھے۔



شہر میں امن بحال ہوتا جا رہا تھا۔ سرکاری فوج اور اس کے خلاف لڑنے والے لشکر کے بکھرے ہوئے دستوں کو شہر میں واپس لایا جا چکا تھا۔ ایک روز سلطان برکیارق نے ان سب کو گھوڑ دوڑ کے میدان میں اکٹھا کیا۔ وہ خود گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس کے پیچھے گھوڑوں پر سعید الرحمن سمیری، ابو مسلم رازی، محمد اور سنجار اور سپہ سالار ابو جعفر ججازی اور سالار اور یزی گھوڑوں پر ایک صف میں کھڑے تھے۔ سلطان برکیارق نے اپنے سامنے اتنے بڑے لشکر کو فوجی ترتیب میں کھڑے دیکھا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا

کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً ”اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ یہ لشکر جو اس کے سامنے کھڑا تھا، دو متحارب حصوں میں بٹ گیا تھا اور دو چار دن پہلے تک یہ دونوں حصے ایک دوسرے کے خونی دشمن بن گئے تھے اور اب اللہ کا یہ خاص فضل و کرم تھا کہ دونوں حصے ایک ہو گئے تھے اور ان میں پہلے والا بھائی چارہ پیدا ہو گیا تھا۔

”میرے عزیز ہم وطنو!“ — سلطان برکیارق نے بڑی بلند اور پُر اعتماد آواز میں لشکر سے مخاطب ہو کر کہا — ”تم اللہ کے سپاہی ہو اور اسلام کا تحفظ تمہارا ایمان ہے۔ مجھے بہت ہی دکھ ہے کہ شیطان ہم پر غالب آ گیا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کی چالیں نہ سمجھ سکا اور ہم ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ بھائیوں نے اپنے ہی بھائیوں کا خون بہانا شروع کر دیا.....

”میں اللہ کے حضور اور تم سب کے آگے شرمسار ہوں کہ یہ خون میری گردن پر ہے۔ اسے میری کوتاہی کہہ لو، چشم پوشی کہہ لو، کچھ کہہ لو، میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ یہ خون ریزی میرا گناہ ہے۔ اب میں اس گناہ کا کفارہ دوں گا۔ یہ حسن بن صباح کا پیدا کیا ہوا فتنہ تھا۔ اس کے پیروکار ہماری صفوں میں ہمارے ہمدرد بن کر گھس آئے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی انہیں پہچان نہ سکا.....

”یہود و نصاریٰ اسلام کے ہمیشہ دشمن رہے ہیں اور دشمن ہی رہیں گے لیکن حسن بن صباح اور اس کا فرقہ اسلام کے انتہائی خطرناک دشمن ہیں کیونکہ یہ ابلیس جس نے اپنے آپ کو امام اور شیخ الجبل کا نام دے رکھا ہے، اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ اب ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی ذات باری نے ہمیں روشنی دکھائی اور ایسے ذرائع پیدا کئے کہ ہم شیطان کے اثر سے نکل آئے اور صراطِ مستقیم پر چل پڑے ہیں۔ میں تم سب کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں سلطان تو ہوں لیکن تمہیں اپنی رعایا نہیں سمجھتا۔ اللہ کی طرف سے مجھ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہی تم سب کی ذمہ داریاں ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہمارا ایمان ہے.....

”تم نے آپس میں قتل و غارت کی ہے۔ اب ایک دوسرے کو عزیزوں کا خون بخش دو۔ اسلام اتحاد کا سبق دیتا ہے۔ اتحاد میں ہی برکت ہے اور اتحاد ایک ایسی طاقت ہے جسے کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ دیکھ لو، ہم آپس میں الجھ پڑے تو اس کا فائدہ ہمارے دشمن کو پہنچا۔ ہم ایک دشمن کے فریب میں آ کر ایک دوسرے کا خون بہانے

لگے تو اس دشمن نے ہماری بہت سی زمین پر قبضہ کر لیا۔ اب ہم نے نئی زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ یاد رکھو، حسن بن صباح اسلام کا اور تمہاری سلطنت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہم نے اس کے مقابلے میں ایک لشکر تیار کرنا ہے.....

”تم میں سے جو شہری سرکاری فوج میں یا دوسرے لشکر میں شامل ہوئے تھے، اگر فوج میں رہنا چاہتے ہیں اور بائنیوں کو ختم کرنے میں یقین رکھتے ہیں تو بتادیں، انہیں فوج میں رکھا جائے گا اور جو فوج میں شامل نہیں ہونا چاہتے، وہ اپنے گھروں کو چلے جائیں لیکن یہ نہ بھولنا کہ کوئی فوجی ہے یا شہری، اسے اسلام کی بقا کی جنگ لڑنی ہے جو صرف فوجیوں کا ہی فرض نہیں، اس جنگ کے لئے جو جہاد ہے، ہر شہری کو تیار رہنا چاہئے۔ یہ جنگ اللہ کے نام پر لڑی جائے گی۔ اللہ ہر وقت اور ہر حال میں تمہارے ساتھ ہو گا۔ اب تمہیں اپنے دین اور ایمان کو اور اپنے عسکری جذبے کو مضبوط رکھنا ہو گا..... اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو گا۔“

صرف یہ تقریر کر دینے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو گیا تھا، کرنے والے کام ابھی پڑے تھے جن میں ایک یہ تھا کہ سلطنت کے دونوں حصوں کے لئے فوج کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرنا تھا لیکن یہ سوچنا بھی ضروری تھا کہ ان حالات میں فوج کو الگ الگ دو حصوں میں تقسیم کیا جائے یا ابھی کچھ انتظار کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل تھے۔



شمونہ اور اس کی ماں میمونہ بہت ہی پریشان تھیں۔ پریشانی یہ تھی کہ جو سرکاری اور باغی دستے لڑنے کے لئے شہر سے باہر چلے گئے تھے، وہ سب واپس آگئے تھے لیکن منزل ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ زخمیوں کو بھی اٹھا کر لے آئے تھے اور بہت سے آدمیوں کی لاشیں بھی آگئی تھیں لیکن منزل کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ شمونہ اور میمونہ کا خیال تھا کہ وہ واپس آگیا ہوتا تو سب سے پہلے گھر واپس آتا۔

شمونہ اور اس کی ماں میمونہ کے لئے ایک مسئلہ بڑا ہی ٹیڑھا تھا جو یہ تھا کہ وہ کھلے بندوں باہر نہیں نکل سکتی تھیں۔ اس کی وجہ پہلے اس داستان میں بیان کی جا چکی ہے کہ میمونہ بھی حسن بن صباح کے پاس رہ چکی تھی اور شمونہ تو حسن بن صباح کی منظور نظر اور بڑی ہی قیمتی لڑکی تھی۔ دونوں فرار ہو کر ابو مسلم رازی کے پاس پہنچ گئی تھیں۔ ابو

مسلم رازی نے انہیں الگ ایک مکان دے دیا تھا اور کچھ وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ منزل آفندی بھی ان کے ساتھ رہتا تھا اور اس نے تجارتی کاروبار شروع کر دیا تھا۔ شمونہ روزینہ کو سلطان برکیارق کے ہاتھوں قتل کروا کے واپس اپنی ماں کے پاس آ گئی تھی اور اب وہ مَرُو میں رہتی تھی۔ منزل آفندی بھی رے سے مَرُو آ گیا تھا..... اب ماں بیٹی دیکھ رہی تھیں کہ جنہوں نے واپس آنا تھا وہ سب آ گئے ہیں اور فوج کی تقسیم کا بھی فیصلہ ہو چکا ہے تو انہیں بہت زیادہ پریشانی ہونے لگی۔ ایک روز دونوں سلطان برکیارق کے چھوٹے بھائی محمد کے پاس چلی گئیں اور اس سے پوچھا کہ منزل کے متعلق کیا خبر ہے۔

”تمہیں میں کچھ نہیں بتا سکوں گا!“ — محمد نے کہا — ”وہ میرے ساتھ رہا تھا۔ تم تو جانتی ہو کہ وہ بائیسوں کے خلاف کس قدر جوشیلا اور بھڑکا ہوا انسان ہے۔ اس نے اپنا ایک الگ گروہ بنالیا تھا جس میں دس یا بارہ اس کے اپنے چنے ہوئے جنگجو اور غیر معمولی طور پر دلیر آدمی تھے۔ اس نے سرکاری فوج کے دستوں پر شب خون اور دن کے وقت چھاپے مارنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ سرکاری فوج کے دستوں کے لئے ایک بلائے ناگہانی یا آسمان سے گرنے والی بجلی بن گیا تھا۔ اس کے متعلق مجھے جو آخری اطلاع ملی تھی وہ بھی ایک شب خون کی کارروائی تھی۔ میں تمہیں وہ جگہ بتا دیتا ہوں اور راستہ بھی سمجھا دیتا ہوں۔ اگر تم کسی آدمی کو وہاں بھیجو تو شاید وہ.....“ — محمد خاموش ہو گیا۔ اس کی خاموشی نے شمونہ کو بنیادوں تک ہلا ڈالا۔ وہ سمجھ گئی کہ محمد یہ کہنا چاہتا تھا کہ شاید تمہیں منزل کی لاش مل جائے۔

”آپ ہمیں وہ جگہ بتا دیں“ — شمونہ نے کہا — ”میں اور میری ماں خود وہاں جائیں گی۔“

”تمہارا جانا ٹھیک نہیں“ — محمد نے کہا — ”اگر اس جنگل بیابان میں تمہیں اور کسی نے پہچان لیا تو پھر ہم تمہیں ڈھونڈتے پھریں گے..... اپنا انجام سوچ لو۔“

اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ سلطان برکیارق کا دربان آ گیا اور اس نے محمد سے کہا کہ اسے سلطان بلاتے ہیں۔ وہ وقت ایسا تھا کہ حکمران بہت ہی مصروف تھے ورنہ محمد ان کے ساتھ ایک دو آدمی بھیج دیتا۔ اس وقت وہ اتنا ہی کر سکتا تھا جو اس نے کیا کہ انہیں وہ جگہ بتائی اور وہاں تک کا راستہ سمجھا دیا اور یہ بھی کہا کہ اگر سالار اور یزی سے مل لیں تو ہو سکتا

ہے کہ اس سے کوئی اور خبر یا اطلاع مل جائے۔ محمد نے انہیں بتایا کہ منزل کا رابطہ سالار اور یزی کے ساتھ رہتا تھا۔

شمونہ اور میمونہ وہاں سے سالار اور یزی کے ہاں چلی گئیں۔ اب سالار اور یزی باغی اور مجرم نہیں تھا۔ اس کی سالاری بحال کر دی گئی تھی۔ اتفاق سے وہ شمونہ اور میمونہ کو مل گیا۔ اس سے منزل کے متعلق پوچھا۔

”مجھے امید نہیں کہ وہ زندہ ہو“ — سالار اور یزی نے کہا — ”مجھے وہ جگہ معلوم ہے جہاں منزل نے اپنے آٹھ مجاہدوں کے ساتھ سرکاری فوج کے ایک دستے کی خیمہ گاہ پر رات کے وقت شب خون مارا تھا۔ بڑا ہی خونریز معرکہ لڑا گیا تھا۔ ان آٹھ آدمیوں میں سے کوئی ایک بھی واپس نہ آیا تھا۔ میں نے اگلے روز وہاں جا کر دیکھا تھا کہ منزل اور اس کے ساتھیوں کا کیا بنا تھا لیکن سلطان کا بلاوا آگیا کہ لڑائی بند کر دی جائے اور جو کوئی جہاں بھی ہے وہاں سے واپس شہر میں آجائے۔ میرے لئے یہ حکم تھا کہ میں اپنے دستوں کو فوراً اکٹھا کر کے اس حکم کی تعمیل کروں۔ یہ ایسی وجہ تھی کہ میں مجبور ہو گیا اور منزل اور اس کی جانباز جماعت کو دیکھنے جا ہی نہ سکا..... اگر منزل زندہ ہو تا تو خود میرے پاس پہنچ جاتا۔“

سالار اور یزی نے ماں بیٹی کو وہ جگہ بتائی۔ یہی جگہ محمد نے بھی بتائی تھی۔ شمونہ کی جذباتی کیفیت بگڑنے لگی اور اس نے رونا شروع کر دیا لیکن وہ منزل کی لاش دیکھے بغیر تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی کہ منزل مارا جا چکا ہے۔

”بیٹی!“ — میمونہ نے کہا — ”اس تلخ حقیقت کو قبول کر لو کہ منزل اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ اگر تم اکیلی یا ہم دونوں گئیں تو پہچانی جاسکتی ہیں۔ سوچ لو کیا ہو گا!“

”جو کچھ بھی ہو گا ہو جائے“ — شمونہ نے پُر عزم آواز میں کہا — ”اگر منزل مر چکا ہے تو میں اس کی لاش لاؤں گی اور اسے باقاعدہ دفن کروں گی..... اور اگر ماں! تم ڈرتی ہو تو نہ جاؤ، میں اکیلی چلی جاؤں گی۔“

ماں نے شمونہ کو بہت سمجھایا اور اسے نتائج سے ڈرایا لیکن شمونہ کے دل میں منزل کی جو محبت تھی، اس محبت نے شمونہ پر دیوانگی طاری کر دی تھی۔ اس کے لئے منزل صرف اس لئے اہم نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کو عشق کی حد تک چاہتے تھے بلکہ اس لئے کہ منزل ایک جنگجو مجاہد تھا جس نے اپنے خاندان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور وہ

حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے چلا گیا تھا۔

اُس رات شمونہ نے اپنی ماں کو سونے نہ دیا اور نہ خود سوئی۔ رات بھر تڑپتی رہی اور ماں کے ساتھ مزمل کی ہی باتیں کرتی رہی۔ ماں نے سوچا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ شمونہ کے ساتھ نہ جائے تو شمونہ اکیلی ہی اسے بتائے بغیر چلی جائے۔ اس نے شمونہ سے کہا صبح ہوتے ہی اس جگہ روانہ ہو جائیں گی۔



اگلی صبح سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا کہ شمونہ اپنی ماں کے ساتھ گھر سے نکلی۔ دونوں گھوڑوں پر سوار تھیں۔ وہ گھوڑوں کا اور گھوڑ سوار کی کا زمانہ تھا۔ حسن بن صباح کے ہاں جو لڑکیاں تخریب کاری کے لئے تیار کی جاتی تھیں، انہیں شہسوار بنادیا جاتا تھا اور انہیں خنجر زنی، تیغ زنی اور تیر اندازی کی خاص طور پر ٹریننگ دی جاتی تھی اور مشق بھی کرائی جاتی تھی۔ اپنے شکار کو زہر کھلانے یا پلانے کے طریقے بھی بتلائے جاتے تھے۔ لڑکیوں کا دل اور حوصلہ مضبوط کرنے کے لئے ہر لڑکی سے چار چار پانچ پانچ زندہ آدمی خنجروں یا تلواروں سے مروائے جاتے تھے۔ یہ بد قسمت آدمی جنہیں ان لڑکیوں کو ٹریننگ دینے کے لئے مروایا جاتا تھا، وہ قید خانے میں بند قیدی ہوتے تھے یا کسی بھی آدمی کو پکڑ کر ایک لڑکی کے حوالے کر دیا جاتا اور اسے کہا جاتا کہ خنجر اس کے دل کے مقام پر مارو۔ دل میں اتر ا ہوا خنجر شکار کو زندہ نہیں رہنے دیتا اور دوسرے وار کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ایسے ہی لڑکی کے ہاتھ میں تلوار دے کر ایک آدمی کو اس کے سامنے جھکا دیا جاتا کہ لڑکی ایک ہی وار میں اس کی گردن صاف کاٹ دے۔

شمونہ نے بھی یہ ٹریننگ حاصل کی تھی۔ اس کی ماں میمونہ بھی خنجر زنی اور تیغ زنی کی سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔

ان دونوں کے جسم سر سے ٹخنوں تک سیاہ لبادے میں ڈھکے ہوئے تھے اور دونوں کے چہروں پر اس طرح نقاب تھے کہ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ انہیں جس جگہ جانا تھا وہ شہر سے کم و بیش دس میل دور تھی۔ وہ علاقہ بڑا خوبصورت سبزہ زار تھا۔ درخت بے شمار تھے اور خود رُو پودے اور جھاڑیاں بھی تھیں، ہرے بھرے فصل بھی کھڑے تھے اور ہری گھاس بھی تھی۔ کچھ علاقہ ہموار اور میدانی تھا جس میں پگندئی گزرتی تھی۔ آگے علاقہ چٹانی شروع ہو جاتا تھا جس میں ہری بھری اور اونچی نیچی ٹیکریاں بھی

تھیں اور نگلی چٹائیں بھی۔ شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی ندی بھی اس علاقے میں سے گزرتی تھی۔ اس علاقے میں تو بیل بوٹوں کی مہک ہوا کرتی تھی لیکن اب وہاں بدبو تھی اور تعفن تھا۔ اس فضا میں جس میں یہ روح افزا مہک ہوتی تھی، اب مُردار خور گدھ منڈلا رہے تھے۔ یہ گدھ نیچے اترتے اور اڑ جاتے تھے۔ گدھ چند ایک نہیں تھے بلکہ فضا میں جدھر بھی نظر جاتی گدھ ہی اڑتے نظر آتے تھے۔ درختوں پر بھی گدھ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ گدھ ان انسانوں کا گوشت نوچ رہے تھے جو خانہ جنگی میں مارے گئے تھے۔

شمونہ اور میمونہ اس علاقے میں داخل ہو گئی تھیں جو کچھ پہلے تک خوریز لڑائی کا میدان جنگ بنا رہا تھا۔ چلتے چلتے شمونہ کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اسے ایک بھیڑیا نظر آیا جس کے منہ میں کسی آدمی کا بازو تھا۔ وہ ایک طرف سے آیا اور بڑی بے نیازی سے شمونہ اور میمونہ کا راستہ کاٹتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ آدمی سے کچھ زیادہ سفر طے کر چکی تھیں۔ جب وہ چٹانی علاقے میں داخل ہو گئیں تو انہیں جگہ جگہ انسانی پتھر نظر آنے لگے۔ کھوپڑیاں ادھر ادھر پڑی نظر آتی تھیں۔ بعض کھوپڑیوں پر تھوڑا سا گوشت تھا اور بعض کو درندوں نے بالکل ننگا کر دیا تھا۔ کچھ کھوپڑیاں ایسی بھی تھیں جن کی آنکھیں سلامت تھیں اور کھلی ہوئی بھی تھیں۔ لاشوں کو گیدڑ، بھیڑیے، اودھ بلا اور گدھ کھا رہے تھے۔ کھانے کے لئے اتنی زیادہ لاشیں تھیں کہ یہ درندے جن میں آوارہ کتے تھے، آپس میں ذرا سا بھی لڑ نہیں رہے تھے۔

ان ہڈیوں میں تھوڑی دور کچھ آدمی ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے اور وہ ہڈیوں کے ہر ڈھانچے کو جھک کر دیکھتے تھے اور کھوپڑیوں کو تو وہ خاص طور پر بیٹھ کر اور پہچاننے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اپنے عزیزوں کی لاشیں ڈھونڈ رہے تھے لیکن اب کسی کو پہچاننا ممکن نہیں رہا تھا۔

ماں بیٹی دو چٹانوں کے درمیان سے نکلیں تو آگے پھر علاقہ کھلا اور ہموار آگیا۔ وہ تو کھوپڑیوں اور ہڈیوں کا دیس معلوم ہوتا تھا۔ جو نہی گھوڑے آگے نکلے دونوں گھوڑے ایک لخت رک گئے اور کانپنے لگے۔ گھوڑوں کی یہ بے چینی صاف نظر آرہی تھی۔ دونوں گھوڑے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ شمونہ اور میمونہ نے دیکھا کہ ایک دھاری دھار شیر جو بہت بڑا بھی نہیں تھا اور بچہ بھی نہیں تھا، منہ میں انسانی جسم کا کچھ حصہ پکڑے آ رہا تھا۔ اس انسانی جسم کے حصے کی کھوپڑی تھی اور ایک طرف کا کندھا اور آدھا

بازو تھا۔ شیر اسے منہ میں لئے آہستہ آہستہ چلتا آیا اور گھوڑوں سے تھوڑی ہی دور ایک طرف کو مڑا اور جھاڑیوں میں اور پھر ایک ٹیکری کے پیچھے غائب ہو گیا۔ اس شیر کو گھوڑوں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور ڈر کر کانپنے لگے تھے۔

”نہیں..... نہیں!“ — شمونہ نے تڑپ کر کہا — ”مزل زندہ ہو گا..... اس کے جسم کو کوئی درندہ کاٹ نہیں سکتا۔“

شمونہ بچوں کی طرح رو پڑی اور اس کی ہچکی بندھ گئی۔

”شمونہ بیٹی!“ — میمونہ نے شمونہ سے کہا — ”میری مانو اور ہمیں سے واپس چلی چلو۔ مزل اگر تمہیں مل بھی گیا تو اسی حالت میں ملے گا جو حالت تم ان انسانوں کی دیکھ رہی ہو جو یہاں لڑے تھے۔ مزل کی کھوپڑی دیکھ کر اگر تم نے پہچان لی تو تم اپنا داماشی توازن کھو بیٹھو گی۔“

”نہیں!“ — شمونہ نے دبی دبی لیکن پُر عزم آواز میں کہا — ”میرا دل گوشتی دیتا ہے کہ مزل مجھے زندہ مل جائے گا۔ میں اسے دیکھے بغیر واپس نہیں جاؤں گی۔ اگر اس کی کھوپڑی ہی نظر آگئی تو یہ تسکین تو ہو جائے گی کہ وہ مارا جا چکا ہے اور اب اس سے ملاقات اگلے جہان میں ہو گی۔“

شیر کے غائب ہو جانے کے بعد گھوڑے آگے چل پڑے۔

ایک ہری بھری ٹیکری سے گھوم کر شمونہ اور میمونہ آگے نکلیں تو انہیں ایک بڑے ہی شفاف پانی کی ندی نظر آئی۔ محمد اور سالار اور یزی نے انہیں بتایا تھا کہ راستے میں ایک ندی آئے گی جس میں سے گزر کر آگے جانا ہے اور ذرا ہی آگے ایک قبرستان ہو گا.... وہ ندی میں سے گھوڑے نکال کر لے گئیں۔ آگے قبرستان بھی آگیا۔ قبرستان کے قریب ہی ایک گاؤں تھا جو اتنا زیادہ آباد نہیں لگتا تھا۔ ماں بیٹی کو اس قبرستان میں سے گزرنا تھا۔ وہ قبرستان میں داخل ہو گئیں۔ انہیں بہت سی تازہ قبریں نظر آئیں جن کی مٹی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی۔

اس قبرستان میں ایک قبر کے قریب ایک ضعیف العمر سفید ریش آدمی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں لمبی لٹکھی تھی اور وہ اس لٹکھی کے سہارے کچھ جھکا ہوا تھا۔ شمونہ اور میمونہ اس کے قریب جا کر رک گئیں۔

”کیا یہ آپ کے کسی عزیز کی قبر ہے؟“ — شمونہ نے اس سفید ریش بزرگ سے

”صرف یہی نہیں!“ — بزرگ نے پاؤں پر کھڑے کھڑے ہاتھ پھیلائے اور گھوم کر سارے قبرستان کی طرف اشارہ کر کے کہا — ”یہ سب میرے عزیز ہیں..... صرف عزیز ہی نہیں، میری تو پوری قوم مر گئی ہے..... یہ سب نئی قبریں جو تم دیکھ رہی ہو، میرے ہی عزیزوں کی ہیں اور تم نے راستے میں دیکھا ہو گا کہ جن لاشوں کو بھیڑیے، گیدڑ، کتے اور گدھ کھا رہے ہیں، وہ بھی میرے عزیز ہیں۔ جس قوم میں پھوٹ اس طرح پڑ جائے کہ وہ قوم اپنا ہی خون بہانے پر اتر آئے، اس کی لاش کو کتے اور درندے ہی کھایا کرتے ہیں۔ جن دلوں کے دروازے بند کر دیئے جائیں تو لوگ کہتے ہیں کہ اب دشمن اندر نہیں آ سکتا لیکن دلوں کے دروازے اس طرح کھول دیئے جائیں کہ کفار کا ظلم اس میں داخل ہوتا رہے اور کافر حسینائیں بھی اس میں داخل ہوتی رہیں، حکمرانی اور زر و جواہرات کی ہوس دل کے دروازوں کو کبھی بند نہ ہونے دے، تو قلعے اونچی اور چوڑی دیواروں اور لوہے جیسے مضبوط اور بند دروازوں کے باوجود ریت کے گھروندے بن جایا کرتے ہیں۔ عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں پھر اپنا سگا بھائی بھی دشمن نظر آنے لگتا ہے.... ہماری قوم سے اور ہمارے سلطان سے یہی گناہ سرزد ہوا اور دیکھو اس کی سزا کسے مل رہی ہے۔ ماؤں کے جیلے بیٹوں کو کتے اور گدھ نوچ رہے ہیں اور ان کی کھوپڑیاں ہر طرف بکھر گئی ہیں۔ یہ تو خوش قسمت تھے جن کی سالم لاشیں ان کے عزیز اٹھالائے اور ان کے جنازے پڑھ کر انہیں دفن کیا گیا۔ انہیں دیکھو جن کے نصیب میں نہ کفن تھا نہ جنازہ نہ قبر میں دفن ہوئے..... تم کہاں سے آئی ہو اور کدھر جا رہی ہو؟“

”یہ میری بیٹی ہے“ — میمونہ نے شمونہ کی طرف اشارہ کر کے کہا — ”ہم اپنے ایک عزیز کی لاش کی تلاش میں نکلی ہیں۔ میں اسے بار بار کہہ رہی ہوں کہ واپس چلی چلو، میں جانتی ہوں کہ اس کی لاش مل بھی گئی تو بُرے حال میں ہوگی لیکن یہ نہیں مانتی۔“

”اسے ڈھونڈ لینے دو“ — سفید ریش بزرگ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا —

”ورنہ یہ خنث اسے ساری عمر تڑپاتی رہے گی..... میرے دو جوان بیٹے اس لڑائی میں ضائع ہو گئے ہیں۔ ان کے ساتھیوں نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ مارے گئے تھے لیکن ان کی لاشیں نہیں ملیں۔ میں یہاں قبرستان میں آ کر فاتحہ پڑھتا ہوں اور اپنے آپ کو یہ یقین دلانا رکھا ہے کہ ان سب تازہ قبروں میں جو دفن ہیں وہ میرے ہی بیٹے ہیں۔“

ماں بیٹی بوجھل دل سے وہاں سے چل پڑیں اور تازہ قبروں کو دیکھتی ہوئی قبرستان سے نکل گئیں۔ آگے علاقہ پھر غیر ہموار سا آگیا لیکن تھاوہ بھی بڑا دلکش اور خوبصورت علاقہ۔ نکلی بے آب و گیاہ چٹانیں بھی تھیں اور درختوں اور گھاس سے لدی ہوئی ٹیکریاں بھی۔ وہ چلتی چلی گئیں اور کچھ دور گئیں تو انہیں ایک چٹان کے دامن میں چشمہ نظر آیا۔ سات آٹھ گز کی گولائی میں پانی جمع تھا اور چشمہ چٹان میں سے نکل رہا تھا۔ پانی اتنا شفاف کہ تہہ میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں اور ذرا جتنی مچھلیاں بھی نظر آرہی تھیں۔

شمونہ نے ماں سے کہا کہ وہ پانی پینا چاہتی ہے۔ ماں بیٹی گھوڑوں سے اتریں۔ دونوں نے نقاب ہٹا دیئے کیونکہ انہوں نے ہاتھوں سے پانی پینا تھا۔ دونوں چشمے کے کنارے بیٹھ گئیں اور چٹو سے پانی پینے لگیں۔

شمونہ نے ہاتھ پانی میں ڈبو لئے اور چٹو سے پانی نکالنے لگی تو اسے دائیں طرف گھوڑوں کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اُس نے اور میمونہ نے دائیں طرف دیکھا۔ دو گھوڑے رُکے کھڑے تھے اور ان پر دو آدمی سوار تھے۔ ایک ادھیڑ عمر تھا اور دوسرا اس سے کم عمر۔ شمونہ کے چہرے سے نقاب ہٹا ہوا تھا۔

ادھیڑ عمر گھوڑ سوار کو دیکھ کر شمونہ کے ہاتھ رک گئے اور اس کے ہاتھوں سے پانی نکل گیا۔ شمونہ کے چہرے پر گھبراہٹ کا تاثر آگیا۔ گھوڑ سوار کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ گھوڑے سے اتر آیا۔ اس کا ساتھی بھی گھوڑے سے اتر۔ شمونہ نے اپنی ماں سے کہا کہ اٹھو، چلیں۔

”کیوں؟..... کیا ہوا؟“ — ماں نے شمونہ کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھ کر ہرگوشی میں پوچھا۔

”اس شخص نے مجھے پہچان لیا ہے“ — شمونہ نے اپنے گھوڑے کی طرف جاتے ہوئے دھیمی آواز میں جواب دیا — ”جلدی آ جاؤ ماں!..... یہ اُس ابلیس حسن بن صباح کا خاص آدمی ہے۔“

شمونہ اور میمونہ نے اپنے گھوڑوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا اس لئے وہ چند قدم دُور چلے گئے اور گھاس کھا رہے تھے۔ گھوڑے قریب ہوتے تو وہ دونوں فوراً ان پر سوار ہو جاتیں اور ایز لگا دیتیں لیکن شمونہ ابھی اپنے گھوڑے تک نہیں پہنچی تھی کہ وہ ادھیڑ عمر

شخص اس تک پہنچ گیا اور اس کے راستے میں آن کھڑا ہوا۔ اب اس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی تھی۔

”پھڑے ہوئے راہی زندگی میں کسی نہ کسی موڑ پر مل جایا کرتے ہیں“ — اس آدمی نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا — ”امام حسن بن صباح کا کوئی ہیرا گم ہو جائے تو کچھ عرصے بعد ہیرا خود ہی امام کے پاس پہنچ جاتا ہے۔“

”کون ہو تم؟“ — شمونہ نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر ذرا غصیلی آواز میں کہا — ”تم ڈاکو یا رہزن معلوم ہوتے ہو۔ اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ ہم عورتیں ہیں اور تم ہم پر قابو پالو گے۔“

”کیا تم بھول گئی ہو میں کون ہوں؟“ — اس شخص نے کہا — ”امام آج بھی تمہارے لئے چشم براہ ہے..... آؤ چلیں۔“

”مجھے سوچ سمجھ کر ہاتھ لگانا“ — شمونہ نے کہا — ”بہت بڑے انجام تک پہنچو گے۔“

”نیا چاہتے ہو تم؟“ — میمونہ نے اس آدمی کے آگے ہو کر پوچھا — ”میری بیٹی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟“

”شمونہ!“ — اس شخص نے میمونہ کو نظر انداز کرتے ہوئے شمونہ سے کہا — ”میں اتفاق سے ادھر آ نکلا تھا۔ یہاں امام کا کمشدہ ہیرا نظر آ گیا۔ میں اس ہیرے کو کیسے پھوڑ کر جا سکتا ہوں..... تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔“

وہ شخص میمونہ کو ہاتھ سے ایک طرف کر کے شمونہ کی طرف بڑھا۔ شمونہ کے لئے پیچھے ہٹنے کو جگہ نہیں تھی کیونکہ پیچھے چشمے کا پانی تھا اور وہ بالکل کنارے پر کھڑی تھی۔ اس شخص نے شمونہ کے قریب جا کر اس کے نقاب پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس کا چہرہ بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ شمونہ نے بڑی تیزی سے اپنے کپڑوں کے اندر ہاتھ ڈالا۔ وہ شخص سمجھ نہ سکا کہ شمونہ کیا کر رہی ہے۔ شمونہ نے اسی تیزی سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں لمبا خنجر تھا جو وہ گھر سے اپنے نیپے میں اڑس کر لائی تھی۔ اس نے بجلی کی سرعت سے خنجر اس آدمی کے دل میں اتار دیا۔ خنجر کھینچا اور ایک بار پھر خنجر اسی مقام پر مارا۔

وہ آدمی سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹا۔ اب وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ شمونہ جانتی تھی کہ یہ شخص اب چند لمحوں کا مہمان ہے۔ اس شخص نے اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھا اور

تکوار نیام میں سے کھینچی لیکن تکوار ابھی آدمی ہی باہر آئی تھی کہ وہ لڑکھڑایا اور ایک پہلو پر گر پڑا۔

اس دوران اس کا ساتھی جو اس کی نسبت جوان تھا بڑا تیز دوڑتا دھڑک رہا تھا۔ میمونہ بھی تیزی سے دوڑی اور سامنے سے اس آدمی کو اپنے ایک کندھے کی ٹکرائی زور سے ماری کہ وہ آدمی سنبھلتے سنبھلتے چشے میں جا گرا۔ وہ تھا ہی چشے کے کنارے پر۔

میمونہ کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ چشمہ اتنا گرا نہیں تھا کہ وہ آدمی ڈوب جاتا۔ وہ پانی میں گرا اور ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ شمونہ نے جھپٹ کر اس پر جست لگائی اور خنجر اس کی پیٹھ میں اتار دیا۔ وہ چشے میں گری اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس آدمی کے ہاتھ سے تکوار گر پڑی تھی۔ شمونہ اٹھ کر سنبھلی اور ایک بار پھر خنجر اس آدمی کے پہلو میں اتار دیا۔ وہ پانی میں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پانی بمشکل کمر تک گہرا تھا۔

وہ چل نہیں سکتا تھا۔ وہ پانی میں ہی گر پڑا اور پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ شمونہ نے آگے بڑھ کر اسے اوپر سے دبایا اور اسے ڈبو دیا۔ وہ ذرا سا تڑپا اور ختم ہو گیا۔

شمونہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر چشے میں سے نکلی۔ دوسرا آدمی باہر مرا پڑا تھا۔ چشے کا پانی خون سے لال ہونے لگا۔ یہاں سے پانی ایک ٹالی کی صورت میں باہر کو بہتا تھا اور آگے جا کر ندی میں مل جاتا تھا۔

”چلو ماں!“ — شمونہ نے کہا — ”کتوں اور گدھوں کو اب تازہ گوشت مل جائے گا۔“

شمونہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس کی ماں نے باہر پڑے آدمی کی لاش سے تکوار کھول لی۔ پھر وہ چشے میں اتری تو اس آدمی کی تکوار بھی اٹھالی۔ نیام اس کی کمرے بندھی ہوئی تھی جو اس نے کھول لی۔ میمونہ نے دونوں کے گھوڑے بھی پکڑ لئے۔ ایک گھوڑے کی زین کے ساتھ چمڑے کا تھیلا بندھا ہوا تھا۔ میمونہ نے وہ تھیلا کھولا تو اس میں کچھ درہم پڑے ہوئے تھے اور باقی سب سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ تھیلا انہی سے بھرا ہوا تھا۔ ماں نے یہ تھیلا کھول کر شمونہ کو دکھایا۔

”یہ لوگوں کو خریدنے کے لئے ساتھ لایا تھا“ — شمونہ نے کہا — ”اگر یہ شہر میں زندہ پہنچ جاتا تو کوئی نیا ہی طوفان کھڑا کر دیتا۔“

”اب میرا حوصلہ پوری طرح مضبوط ہو گیا ہے“ — میمونہ نے کہا — ”مجھے

یقین ہو گیا ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے ورنہ ایک لڑکی اتنے ثومند آدمی کو یوں آسانی سے قتل نہ کرتی، اور جس طرح اس کا ساتھی تمہارے ہاتھوں مارا گیا ہے، یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ ہم صحیح راستے پر جا رہی ہیں اور اللہ نے ہمارا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔“

انہوں نے ان دونوں آدمیوں کے گھوڑوں کی باگیں اپنے گھوڑوں کے پیچھے باندھ لیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر چل پڑیں۔

”اب سنو ماں! مزے کی ایک بات سناتی ہوں“ — شمونہ نے کہا — ”میں جب حسن بن صباح کے پاس تھی تو اس شخص نے مجھے خنجر زنی اور تیغ زنی اور گھوڑ سواری سکھائی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ دل کہاں ہوتا ہے اور اس میں خنجر کس طرح مارا جاتا ہے۔ یہ شخص میری سکھائی اس طرح کرتا تھا کہ عام خنجر جتنا لمبا لکڑی کا ایک ٹکڑا میرے ہاتھ میں دے کر سامنے کھڑا ہو جاتا اور کہتا کہ میرے دل کے مقام پر مارو۔ میں اس کی سکھائی کے مطابق لکڑی کا یہ ٹکڑا اس کے دل کے مقام پر آہستہ سے مارتی تھی۔ پھر یہ مجھے سکھاتا تھا کہ خنجر کس طرح تیزی سے نکالا جاتا ہے اور دشمن کسی بھی زادیے پر کھڑا ہو، اُسے کس طرح مارا جاتا ہے۔ میں نے آج اسی کا سکھایا ہوا دواؤ اسی پر استعمال کیا ہے۔ مرتے وقت اسے یہ خیال ضرور آیا ہو گا کہ میں اس کے سکھائے ہوئے طریقے بھولی نہیں۔ اس نے مجھے یہ بھی مشق کرائی تھی کہ پیٹھ کی طرف سے دل میں خنجر کس طرح اتارا جاتا ہے۔ میں نے چشمے میں اس کے ساتھی کی پیٹھ میں جو خنجر مارا تھا، وہ یقیناً اس کے دل میں اتر گیا تھا ورنہ وہ اتنی جلدی نہ کرتا۔“

”میں تو اللہ کا ہی شکر ادا کرتی ہوں بیٹی!“ — میمونہ نے کہا — ”اللہ کی مدد کے بغیر کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔“

”کچھ عرصہ یہ میرا محافظ بھی بنا رہا ہے“ — شمونہ نے کہا — ”حسن بن صباح نے جب مجھے پہلے شکار پر بھیجا تھا تو یہ شخص میرا محافظ بن کر میرے ساتھ آیا تھا۔ میں نے پہلا شکار بڑی کامیابی سے پھانس لیا تھا اور جب اس شخص کو یقین ہو گیا کہ میں اپنے کام میں ماہر ہو گئی ہوں اور قاتل اعتماد بھی ہوں تو یہ چلا گیا تھا..... میں نے صرف اس لئے قتل نہیں کیا کہ یہ مجھے اپنے ساتھ پھر حسن بن صباح کے پاس جانے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ اسے دیکھ کر دل میں نفرت کا طوفان اٹھ آیا تھا۔ یہ جب میرے ساتھ میرا محافظ بن کر آیا تھا تو اس نے مجھے اپنی چھوٹی بہن تو نہیں سمجھا تھا۔ یہ شیطان میری عصمت کے

ساتھ کھیلتا رہا تھا، حالانکہ حسن بن صباح کا حکم یہ تھا کہ مجھ جیسی لڑکیوں کے ساتھ ہوس کاری کا کھیل نہ کھیلا جائے مگر یہ خاصی عمر تک تندرست اور پھرتیلی رہیں۔ اُس وقت تو میں نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا نہ اسے گناہ سمجھا تھا کیونکہ حسن بن صباح کے ہاں عصمت اور آبرو نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہ احساس کہ میں آبرو باختہ ہوں، اُس وقت میرے اندر یہ احساس پیدا ہوا تھا جب میں یہاں آگئی اور مجھے تم ملیں اور پھر میرے دل میں منزل کی محبت پیدا ہوئی۔ آج اس شخص کو دیکھا تو میرے وجود میں آگ لگ گئی اور میں نے عہد کر لیا کہ اپنی عصمت کا انتقام لوں گی۔ وہ میں نے لے لیا ہے اور اب یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری روح ہلکی پھلکی ہو گئی ہے..... میری پیاری ماں! دعا کرو ہمیں منزل مل جائے۔“

”ایک بات سن لو بیٹی!“ — میمونہ نے کہا — ”دل سے یہ یقین نکال دو کہ منزل تمہیں زندہ مل جائے گا ورنہ تمہیں بہت زیادہ صدمہ ہو گا۔ اس کی بجائے دل میں یہ رکھو کہ منزل زندہ نہیں ملے گا۔ میں تو کہتی ہوں کہ ہمیں یہ حقیقت قبول کر لینی چاہئے کہ منزل زندہ نہیں۔ اگر وہ زندہ مل گیا تو تم دیکھنا تمہیں کتنی خوشی حاصل ہو گی۔“

محمد اور سالار اور یزی نے انہیں جو راستہ بتایا تھا، اس کی ایک نمایاں نشانی یہ چشمہ تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ اس چشمے سے پانی بہہ کر ایک ٹالی کی صورت میں آگے جاتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ چلی جانا اور تھوڑی دور آگے وہ جگہ جہاں منزل نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سرکاری فوج کے ایک دستے کے پڑاؤ پر شب خون مارا تھا..... وہ چشمہ آگیا تھا اور اب ماں بیٹی اس کے ساتھ ساتھ جا رہی تھیں۔



وہ بے آب و گیاہ چٹانوں اور ہری بھری ٹیکریوں کا علاقہ تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پانی کی یہ ٹالی مڑتی تھی۔ ماں بیٹی اس کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں مڑتی آگے بڑھتی گئیں۔ ایک اور موڑ مڑیں تو دیکھا یہ پانی خاصی دور تک بہتا تھا۔

”وہ جگہ تو یہی ہے“ — میمونہ نے کہا — ”وہ دیکھو لبوتری چٹان کھڑی ہے..... لیکن شمونہ بیٹی! تم کو تو عقل نہیں، ذرا سوچو منزل کوئی بے جان چیز تو نہیں کہ کسی نے ہمیں بتایا ہو کہ ایک لبوتری چٹان آئے گی اور وہ چیز جس کا نام منزل ہے وہاں پڑی ہوئی مل جائے گی۔ بتانے والوں نے تو ہمیں وہ علاقہ بتایا ہے جہاں منزل نے شب خون مارا

تھا۔ ضروری نہیں کہ وہ اُس رات سے اب تک یہیں ہو، کسی اور طرف نکل گیا ہو گا۔“
 ”میرے دل کی آواز سنو ماں!“ — شمونہ نے ایسے لہجے میں کہا جو اس کا قدرتی
 لہجہ نہیں تھا — ”میرے دل کی‘ میری روح کی آواز سنو..... اسے میرا وہم ہی سمجھ لو
 لیکن کوئی جذبہ یا کوئی غیبی طاقت مجھے کہہ رہی ہے کہ چلی چلو، تمہیں منزل مل جائے گا۔“
 میمونہ نے شمونہ کا یہ لب و لہجہ دیکھا تو اس کے آنسو نکل آئے۔ صاف پتہ چلتا تھا
 کہ شمونہ کا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ میمونہ کچھ دیر شمونہ کو دیکھتی رہی۔ شمونہ کا
 گھوڑا پانی کی تالی سے بائیں طرف اور میمونہ کا گھوڑا دائیں طرف پہلو بہ پہلو چلے جا رہے
 تھے۔ شمونہ سامنے دیکھ رہی تھی اور میمونہ کی نظریں شمونہ کے چہرے پر لگی ہوئی
 تھیں۔ میمونہ کو بہت دکھ ہو رہا تھا کہ اس کی بیٹی کی جذباتی کیفیت اس کے قابو سے باہر ہو
 رہی تھی۔

”وہ دیکھو ماں!“ — شمونہ نے چونک کر سامنے اشارہ کیا اور بے تابی سے کہا —
 ”وہ دیکھو، کوئی آدمی ہے۔“

میمونہ نے سامنے دیکھا۔ اسے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ وہاں درخت زیادہ تھے،
 جھاڑیاں بھی تھیں اور گھاس ذرا اونچی تھی۔ میمونہ کو کوئی آدمی نظر نہ آیا تو اسے بہت ہی
 دکھ ہوا کہ اس کی بیٹی کو اب اسی طرح کے وابہ نظر آنے لگے ہیں جیسے ریگستان میں
 جاتے ہوئے مسافر کو سراب نظر آنے لگتے ہیں۔ اب تو میمونہ کو یقین ہونے لگا کہ اس کی
 بیٹی کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔

”ہوش میں آ شمونہ بیٹی!“ — میمونہ نے دکھ ہوئے سے لہجے میں کہا — ”مجھے
 تو کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا۔“

”وہ چلتے چلے بیٹھ گیا ہے“ — شمونہ نے کہا — ”وہ دیکھو۔“

اب میمونہ نے اُدھر دیکھا تو اسے ایک آدمی نظر آیا جو ایک درخت کے تنے پر ہاتھ
 رکھے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس سے تیس پینتیس قدم دور ہو گا۔ اس کے کپڑے
 سرخ رنگ کے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔

صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس نے تنے کو دونوں
 بازوؤں سے پکڑ لیا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے تنے کو چھوڑا اور آگے کو قدم اٹھایا۔ وہ
 بمشکل دو یا تین قدم چلا ہو گا کہ اس کے گھٹنے زمین پر جا لگے اور پھر اس نے دونوں ہاتھ

زمین پر ٹیک دیئے۔ پانی کی ٹلی اس سے پانچ چھ قدم دور تھی۔ اب اُس آدمی نے اٹھنے کی بجائے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل پانی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ میمونہ اور شمونہ نے اپنے گھوڑے ذرا تیز کر دیئے۔

گھوڑے اُس سے دس بارہ قدم دور رہ گئے تو اُس آدمی نے اُدھر دیکھا۔ اُس وقت میمونہ اور شمونہ نے دیکھا کہ اس شخص کے کپڑے جو دُور سے سرخ نظر آتے تھے، دراصل خون سے سرخ ہو گئے تھے۔ اس آدمی نے مٹی کو دیکھا تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن گر پڑا۔ اس کے قریب چھوٹا سا ایک درخت تھا، اس نے اس طرف ہو کر درخت کا سہارا لیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پیٹھ درخت کے ساتھ لگالی اور نیام سے تلواریں کھینچ لی۔ مٹی اُس کے بالکل قریب پہنچ گئیں اور گھوڑے روک لئے۔

”میرے قریب نہ آنا“ — اس آدمی نے کہا — ”تم باطنی ہو، میرے قریب آؤ گی تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مرتے مرتے تم دونوں کو مار کر مروں گا۔“

مٹی اُٹھ کر اُس سے اُتریں۔ وہ آدمی بہت ہی زخمی تھا۔ اس کے سر پر کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ دونوں اس کے پاس جا کر کھیں اور اس آدمی نے تلواریں لی۔

”تم مسلمان لگتے ہو“ — میمونہ نے کہا — ”ہم باطنی نہیں۔ ہم اپنے ایک عزیز کو ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔ تمہیں اس حالت میں یہاں چھوڑ کر نہیں جائیں گی۔ دیکھو ہمارے پاس دو قاتلوں گھوڑے ہیں۔ جہاں کہو گے تمہیں ایک گھوڑے پر ڈال کر پہنچا دیں گی۔ ہم سے نہ ڈرو۔ میرا خیال ہے کہ شہر میں ارد گرد کے علاقے میں کوئی باطنی زندہ نہیں۔“

”پھر ڈھونڈ لو اپنے عزیز کو!“ — اس زخمی آدمی نے مری مری سی آواز میں کہا — ”یہاں اب تمہیں لاشیں ہی ملیں گی۔ اگر تمہارے عزیز کا چہرہ سلامت ہو تو پہچان لیتا۔“

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ — شمونہ نے پوچھا اور کہا — ”اور بتاؤ کہ ہم تمہیں کہاں لے چلیں۔“

”میں پانی پینے آیا ہوں“ — اس آدمی نے کہا — ”یہ دیکھو چھاگل، یہ بھر کر اپنے ایک ساتھی کے لئے لے جاؤں گا وہ مجھ سے زیادہ زخمی ہے۔“

وہ آدمی جو جواں سال تھا پاؤں پر زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا۔ شمونہ نے آگے بڑھ کر

اُس کے ہاتھ سے چھاگل لے لی۔ یہ چمڑے کا چھوٹا سا ایک مشکیزہ تھا جو اُس دور میں مسافر پانی کے لئے استعمال کیا کرتے تھے۔ شمونہ نے اس کا یہ ذرا جتنا مشکیزہ پانی سے بھر لیا اور اسی سے اسے پانی پلایا اور پھر مشکیزے کا منہ بند کر دیا۔ زخمی آدمی نے پانی پی کر لمبا سانس چھوڑا۔

”یہاں قریب ہی ایک غار ہے“ — اس آدمی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا — ”میرا ایک ساتھی مجھ سے زیادہ زخمی حالت میں وہاں پڑا ہے۔ میں نے اُسے جا کر پانی پلانا ہے۔ وہ شاید زندہ نہ رہ سکے۔ وہ نہ رہا تو شاید میں بھی نہ رہوں۔“

”ہم تم دونوں کو ساتھ لے جائیں گی“ — میمونہ نے کہا — ”چلو ہم تمہیں سہارا دے کر لے چلتی ہیں۔“

ماں بیٹی نے اُسے دائیں بائیں ہو کر اٹھایا اور اسے پہلوؤں سے سہارا دے کر آگے کو چل پڑیں۔ زخمی کو اتنا ہی سہارا چاہئے تھا۔

”صرف ایک دُکھ ہے“ — زخمی آدمی نے کہا — ”میرے ہاتھوں میرے بھائی قتل ہوئے ہیں۔ میں سرکاری فوج کے خلاف لڑا تھا۔ اس فوج میں میرے بھائی بھی تھے، وہ کوئی غیر تو نہیں تھے۔ دیر بعد پتہ چلا یہ فتنہ باغیوں نے کھڑا کیا تھا۔ زندہ رہنے کی خواہش صرف اس لئے ہے کہ میں حسن بن صباح کو قتل کروں گا۔“

یہ جواں سال آدمی اس قدر زخمی تھا کہ میمونہ اور شمونہ اسے جہاں بھی ہاتھ رکھتی تھیں، وہ کہتا تھا کہ ہاتھ ذرا نیچے یا اوپر رکھنا، یہاں زخم ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں ساتھی بُری طرح زخمی ہیں اور اگر انہوں نے مرنا ہوتا تو دو چار دن پہلے ہی مر چکے ہوتے۔ اُس نے پر عزم لہجے میں کہا کہ وہ ابھی تک شاید اس لئے زندہ ہیں کہ اللہ نے ان سے کوئی اور کام کروانا ہے۔ ایسے ہی باتیں کرتے کرتے زخمی ماں بیٹی کے سہارے ایک چٹان کے پہلو کی طرف گیا اور وہاں ایک کشادہ غار دیکھا جو زیادہ لمبا نہیں تھا۔ ایک آدمی جس کے کپڑے خون سے لال سرخ تھے، لیٹا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا جسم جگہ جگہ سے کٹا ہوا ہو۔ وہ پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا اور باہر کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔

”مزل بھائی!“ — زخمی جوان نے اسے پکارا اور کہا — ”یہ لوگ تمہارے لئے پانی لے آئے ہیں اور دیکھو اللہ نے ہمارے لئے گھوڑے بھی بھیج دیئے ہیں۔“

میمونہ اور شمونہ نے مزل کا نام سنا تو چونک اٹھیں۔ اُدھر غار میں زمین پر پڑے

ہوئے زخمی نے کروٹ بدلی تو اس کا چہرہ سامنے آگیا۔ وہ منزل آفندی تھا۔ اس کے سر پر بھی کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ شمونہ اُس پر اس طرح جھپٹی جس طرح شیر شکار پر جھپٹتا ہے۔ وہ اس پر جا پڑی اور پھر ”منزل“ ”منزل“ کہتی ہوئی اسے اٹھانے لگی۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ منزل ہوش میں تھا اور اس نے شمونہ اور میمونہ کو پہچان لیا۔ وہ بیٹھ گیا اور شمونہ نے پانی کی چھاگل کا منہ کھولا اور چھاگل اس کے منہ کے ساتھ لگا دی۔

منزل نے پانی پی لیا تو اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن بول نہ سکا۔ وہ بہت ہی کمزور ہو گیا تھا اور اس کے جسم میں خون کے چند ہی قطرے رہ گئے تھے۔ شمونہ اسے بازوؤں میں لے کر دیوانوں جیسی حرکتیں کر رہی تھی جیسے ماں کو اپنا وہ گمشدہ بچہ مل گیا ہو جس کے ملنے کی امید دم توڑ گئی تھی۔

میمونہ اور شمونہ نے ایک گھوڑے پر منزل کو اور دوسرے پر اس کے ساتھی کو اٹھا کر بٹھایا اور یہ قافلہ شہر کی طرف چل پڑا۔



منزل کے ساتھی کا نام رحیم ابن یونس تھا اور وہ بن یونس کے نام سے مشہور تھا۔ میمونہ اور شمونہ نے دیکھ لیا تھا کہ ان دونوں کے جسموں سے کلفتی خون نکل گیا ہے اور یہ صرف پانی پیتے رہے ہیں اور کھانے کو انہیں کچھ نہیں ملا۔ ان کی حالت بتاتی تھی کہ مَرُوں تک مشکل سے ہی پہنچیں گے۔

”شمونہ بیٹی!“ — میمونہ نے شمونہ کے قریب ہو کر آہستہ سے کہا — ”ان کا علاج معالجہ شہزی طبیب اور جراح ہی کر سکتے ہیں۔ کوئی عام طبیب ان کے جسموں میں جان نہیں ڈال سکے گا۔“

”میں انہیں سلطان کے محل میں لے جاؤں گی“ — شمونہ نے کہا — ”ان کی مرہم پٹی اور علاج سلطان کا طبیب کرے گا۔“

سورج غروب ہونے میں کچھ دیر باقی تھی جب چار گھوڑے سلطان کے محل کے باہر والے دروازے میں داخل ہوئے۔ دربان شمونہ اور اس کی ماں میمونہ کو جانتے تھے اس لئے انہیں روکا نہ گیا۔ نہ روکنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ دو گھوڑوں پر دو زخمی اس حال میں سوار تھے کہ وہ زخموں پر بیٹھے ہوئے نہیں بلکہ آگے کو پیٹ کے بل ہو گئے تھے اور غالباً وہ ہوش میں بھی نہیں تھے۔

شمونہ گھوڑے سے کود کر اتری اور محل میں داخل ہو گئی۔ وہ سلطان برکیارق کا پوچھ رہی تھی لیکن اسے بتایا گیا کہ سلطان بھی نہیں، وزیر اعظم سمیری بھی نہیں اور محمد اور سبخر بھی نہیں ہیں۔ یہ پتہ چلا کہ برکیارق کی ماں اپنے کمرے میں ہے۔ شمونہ دوڑتی ہوئی اس کمرے میں پہنچی۔ شمونہ نے روزینہ کو سلطان برکیارق کے ہاتھوں قتل کروا کے محل میں بڑا اونچا مقام حاصل کر لیا تھا۔ برکیارق کی ماں نے شمونہ کو دیکھا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بازو پھیلا کر شمونہ کو گلے لگالیا۔

”ماورِ محترم!“ — شمونہ نے سلطان کی ماں کے بازوؤں سے نکلتے ہوئے اور روتے ہوئے کہا — ”مزل آفندی مر رہا ہے..... اللہ کی راہ میں اسے بچالیں..... اس کا ایک ساتھی بھی ہے..... دونوں اتنے زخمی ہیں کہ ان کے جسموں میں خون رہا ہی نہیں۔ اپنے طبیب کو بلائیں۔“

سلطان کی ماں شمونہ کے ساتھ باہر کو دوڑی۔ اس نے دیکھا کہ دو زخمی گھوڑوں پر بے ہوش پڑے ہیں۔ ماں نے حکم دیا کہ طبیب اور جراح کو فوراً لایا جائے۔ سلطان کی ماں کے کہنے پر کئی آدمی دوڑے آئے اور وہ دونوں زخموں کو گھوڑوں سے اتار کر اور اٹھا کر ایک کمرے میں لے گئے۔ طبیب اور جراح بھی آگئے اور انہوں نے زخموں کی مرہم پٹی شروع کر دی..... سلطان برکیارق کی ماں میمونہ اور شمونہ کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ میمونہ نے اسے سنایا کہ شمونہ نے کس طرح دو باغیوں کو چشمے پر قتل کیا ہے۔



جس وقت ان زخموں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی، اس وقت قلعہ الموت میں حسن بن صباح اپنے اُس خصوصی باغیچے میں نہل رہا تھا جو اس نے اپنے لئے تیار کروایا تھا۔ اب حسن بن صباح کوئی جلو گر یا شعبدہ باز نہیں تھا نہ وہ اپنے آپ کو سلجوقیوں سے بھاگا ہوا مجرم سمجھتا تھا نہ اس کے دل پر کسی کا خوف یا ڈر سوار تھا، وہ تو اب خدا سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ اپنے پیرو مرشد اور استاد احمد بن غطاش سے بھی نظریں پھیر لیا کرتا تھا۔ اب وہ ایک طاقت بن گیا تھا۔ وہ سلطانوں اور بادشاہوں جیسی حکمرانی نہیں کر رہا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کا حکمران تھا۔ سلطان اور بادشاہ لوگوں کے جسموں کو غلام بناتے ہیں لیکن جن علاقوں پر حسن بن صباح قابض ہو گیا تھا ان علاقوں کے لوگ اسے دلی اور روحانی طور پر

چاہتے تھے۔ وہ اسے امام بھی کہتے تھے اور شیخ الجبل بھی اور ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو اسے نبی مانتے تھے۔

وہ جب اپنے اس خاص باغیچے میں ٹہل رہا تھا، اس کے ساتھ اس کے دو مصاحب اور مشیر بھی تھے۔

”مرو سے آج بھی کوئی خبر نہیں آئی“ — حسن بن صباح نے اپنے مصاحبوں سے کہا — ”وہاں کی خانہ جنگی اب تک اور زیادہ پھیل جانی چاہئے۔ مرو تو خون میں ڈوب ہی رہا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ابو مسلم رازی کے شہرے کی گلیاں بھی خون کی ندیاں بن جائیں..... لیکن کیا بات ہے کہ ادھر سے کوئی خبر نہیں آرہی۔“

”آجائے گی شیخ الجبل!“ — ایک مصاحب نے کہا — ”سلطنت سلجوقیہ کی بنیادیں ہل رہی ہیں۔ مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ ہمارے گھوڑے سلجوقیوں کی لاشوں کو روندتے، کچلتے اور مسلتے ہوئے مرو میں فاتحانہ چال چلتے ہوئے داخل ہوں گے۔“

سورج غروب ہو رہا تھا جب ایک گھوڑے کے ٹاپ سنائی دینے لگے۔ ٹاپوں کی آواز قریب آرہی تھی۔ حسن بن صباح اس طرف دیکھنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد گھوڑا اور اس کا سوار نظر آئے۔ سوار قریب آکر گھوڑے سے کود کر اترا اور تیزی سے چلتا حسن بن صباح کے پاس آیا۔

”مرو سے آئے ہو؟“ — حسن بن صباح نے پوچھا۔

”ہاں شیخ الجبل!“ — سوار نے کہا — ”مرو سے آیا ہوں۔“

قریب سنگ مرمر کا بنا ہوا ایک تخت سا تھا۔ حسن بن صباح اس پر بیٹھ گیا اور قاصد کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے سامنے بیٹھ جائے۔ قاصد اور دونوں مصاحب حسن بن صباح کے سامنے بیٹھ گئے۔

”کیا مرو والے ابھی تک ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں؟“ — حسن بن صباح نے شکستہ سی آواز میں پوچھا۔

”یا شیخ الجبل!“ — قاصد نے کہا — ”میں کوئی اچھی خبر نہیں لایا..... خانہ جنگی اچانک رک گئی تھی اور یہ سلطان برکیارق کے حکم سے روکی گئی تھی۔ اس کے فوراً بعد حکم ملا کہ جہاں کوئی باطنی نظر آتا ہے اسے قتل کر دیا جائے۔ سب سے پہلے ہمارا طبیب اور اس کے ساتھی اپنے گھر میں قتل ہوئے۔ ان کے گھر پر چھاپہ پڑا تھا۔ ہمارے

آدمیوں کو بھاگنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ جس کے متعلق ذرا سا بھی شک ہوا کہ یہ ہمارے فرقے کا آدمی ہے، اسے قتل کر دیا گیا۔

”یہ ہوا کیسے؟“ — حسن بن صباح نے بڑی زور سے اپنا ایک پاؤں زمین پر مار کر پوچھا — ”کیا وہ لڑکی روزینہ دھوکا دے گئی ہے یا مر گئی ہے؟“

”اسے سلطان برکیارق نے اپنے ہاتھوں قتل کر دیا تھا“ — قاصد نے جواب دیا۔

”اگر تم سب کچھ جانتے ہو تو پوری بات سناؤ“ — حسن بن صباح نے کہا۔

قاصد نے خانہ جنگی کی تفصیلات سنائی شروع کر دیں اور بتایا کہ دونوں طرفوں کے لشکر لڑتے لڑتے شہر سے کتنی دور چلے گئے تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ رے کا امیر ابو مسلم رازی اپنا لشکر لے کر مرو پہنچ گیا تھا اور وہ سرکاری فوج کے خلاف لڑا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ کس طرح خانہ جنگی اچانک رک گئی اور باغیوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔

”یا شیخ الجبل!“ — قاصد نے کہا — ”میں خانہ جنگی رکتے ہی وہاں سے اچل پڑتا لیکن میں نے کچھ راز لینے تھے۔ یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ خانہ جنگی کس طرح رُکی اور سلطان برکیارق نے یہ حکم کس کے کہنے پر یا کس کے دباؤ پر دیا تھا۔ بڑی مشکل سے راز حاصل کئے.....“

”یہ تو بتا چکا ہوں کہ ہماری لڑکی روزینہ کو سلطان برکیارق نے اپنے ہاتھوں قتل کیا تھا۔ طبیب نے سلطان کے محل کے دو ملازم اپنے ہاتھ میں لے لئے اور انہیں مخبر بنالیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ روزینہ کو ہماری ہی ایک مفرور لڑکی شمونہ نے قتل کروایا ہے۔ شمونہ روزینہ کی کینر بن کر محل میں داخل ہوئی تھی۔ ان ملازموں کو یہ پتہ نہیں چل سکا کہ شمونہ نے کس طرح سلطان برکیارق کو اپنے اثر میں لے لیا اور روزینہ کو قتل کروایا تھا۔ البتہ یہ خبر ملی ہے کہ اس کارروائی میں سلطان کا وزیر اعظم عبدالرحمان سمیری بھی شامل تھا۔“

”یہ لڑکی شمونہ اب کہاں ہے؟“ — حسن بن صباح نے پوچھا۔

”وہ مرو میں ہی ہے“ — قاصد نے جواب دیا — ”اس کی ماں جس کا نام میمونہ ہے، وہ بھی اس کے ساتھ ہے۔“

”شمونہ ابھی تک وہاں سے اٹھائی کیوں نہیں گئی؟“ — حسن بن صباح نے غصیلی آواز میں کہا — ”میں کبھی کا حکم دے چکا ہوں کہ اس لڑکی کو زندہ میرے سامنے لایا

جائے۔ کیا میرے فدائی میرا یہ حکم بھول گئے ہیں یا ان میں اتنی ہمت ہی نہیں رہی!“
 ”صرف شمنہ ہی نہیں یا شیخ الجبل!“ — قاصد نے کہا — ”ہماری ایک اور عورت جس کا نام رابعہ ہے، وہ بھی سلطان کے محل میں چلی گئی تھی۔ اس نے ایسے لوگوں کے نام اور پتے بتائے جو ہمارے خاص آدمی تھے۔ ان سب کو سلطان نے قتل کروا دیا ہے..... مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے کچھ اور آدمیوں کو سلطان کی فوج نے پکڑ لیا تھا اور ان پر اتنا زیادہ تشدد کیا گیا کہ انہوں نے اپنے ساتھیوں کی نشاندہی کر دی۔ اس طرح ہمارے آدمی مارے گئے.....“

”اور یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ ہمارے فرقے کے قتل عام کا حکم ابو مسلم رازی نے دلویا ہے اور وزیر اعظم عبدالرحمان سمیری بھی اس کے ساتھ ہے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ سلطان برکیارق ان دونوں کے ہاتھوں میں کھ پتلی بنا ہوا ہے..... پھر ایک خبر یہ بھی ہے کہ عبدالرحمان سمیری، ابو مسلم رازی اور سلطان برکیارق کی ماں نے سلطنت سلجوقیہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حصے کا سلطان برکیارق ہو گا اور دوسرا حصہ برکیارق کے چھوٹے بھائیوں، محمد اور سنجر، کو دے دیا گیا ہے لیکن برتری اور مرکزیت سلطان برکیارق کو حاصل ہو گی تاکہ دونوں حصوں کا اور ان کی فوجوں کا اتحاد قائم رہے۔“

”ابو مسلم رازی اور عبدالرحمان سمیری کو اب تک زندہ نہیں رہنا چاہئے تھا“ — حسن بن صباح نے کہا — ”رے میں ایک مشہور عالم ابو المنظر مجید فاضل اصفہانی ہے۔ مجھے پہلے اطلاعیں مل چکی ہیں کہ یہ عالم ابو مسلم رازی کا پیرو مرشد بنا ہوا ہے اور رازی اس کے مشوروں اور تجویزوں پر عمل کرتا ہے۔ اس عالم کو بھی ان دونوں کے ساتھ ختم کرنا ہے..... میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ میں رے میں گیا تو ابو مسلم رازی نے میری گرفتاری کا حکم دے دیا تھا۔ یہ تو مجھے بروقت پتہ چل گیا اور میں وہاں سے بھاگ کر مصر چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو بھی رازی نے میری گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اس کا بھی مجھے پہلے ہی پتہ چل گیا اور میں وہاں سے ایک بہروپ دھار کر بھاگ نکلا..... یہ شخص اسلام کا شیدائی اور سلجوقیوں کی سلطنت کا خیر خواہ بنا ہوا ہے۔ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ سب سے پہلے میں اس کا پتا کاٹوں گا۔ اس کے پیرو مرشد ابو المنظر مجید فاضل اصفہانی کو بھی صاف کرا دوں گا۔“

سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ حسن بن صباح وہیں بیٹھنا چاہتا تھا اس لئے فانوس دیں لائے گئے اور رات کو دن بنا دیا گیا۔ حسن بن صباح کے حکم سے شراب کی صراحی اور پیالے وہیں آ گئے۔ شراب پلانے کے لئے تین چار انتہائی خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں آ گئیں۔ ان کے نیم برہنہ جسموں کی خوبصورتی کو صرف جنت کی خوروں سے ہی تشبیہ دی جاسکتی تھی۔

حسن بن صباح نے چار پانچ آدمیوں کے نام لے کر کہا کہ انہیں فوراً "بلایا جائے.... زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ یہ سب آدمی دوڑے آئے۔ حسن بن صباح نے انہیں بتایا کہ مرو میں کیا ہوا ہے اور اس کے جواب میں انہیں کیا کرتا ہے۔ یہ آدمی تمام علاقوں میں پھیلے ہوئے باطنی تخریب کاروں، فدائیوں اور جاسوسوں کو سرگرم رکھتے اور ان سے اطلاعات وصول کیا کرتے تھے۔

"ایک ایک باطنی کے بدلے دس دس مسلمانوں کو قتل کرتا ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن سب سے پہلے ان کے سربراہوں اور قائدین کو ختم کرو..... تین نام یاد کر لو..... رے کا حاکم ابو مسلم رازی، سلطان برکیارق کا وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری رے کا ایک عالم ابو المنظر مجید فاضل اصفہانی..... سب سے پہلے ان تینوں کو صفحہ ہستی سے مٹادو۔ اس کے بعد بتاؤں گا کہ کس کی باری ہے۔"

مشہور تاریخ نویسوں ابن جوزی اور ابن اثیر نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح صرف مرو یا رے کے مسلمانوں سے بائنیوں کے قتل عام کا انتقام نہیں لینا چاہتا تھا بلکہ اس کی نظریں اصفہان پر لگی ہوئی تھیں۔ دوسرے مؤرخوں نے بھی لکھا ہے کہ وہ اصفہان کو اپنا مرکز بنانا چاہتا تھا۔ اس نے اصفہان میں بھی اپنا جال بچھا رکھا تھا۔ مؤرخوں کے مطابق اس نے اسی محفل میں ایک پلان بنا کر اپنے خاص کارندوں کو دے دیا تھا کہ اصفہان میں مسلمانوں کو ایسے خفیہ طریقوں سے قتل کیا جائے کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ انہیں کون قتل کر رہا ہے۔

تاریخوں سے ایک شہادت یہ بھی ملتی ہے کہ حسن بن صباح نے یہ حکم دیا تھا کہ اصفہان میں مسلمانوں کو قتل کر کے غائب کر دیا جائے۔ یہ پتہ ہی نہ چلے کہ جو آدمی غائب ہو گئے ہیں وہ زندہ ہیں یا مارے گئے ہیں۔

اس کی جنت دُور دُور تک مشہور ہو گئی تھی اور نوجوان اس جنت کو دیکھنے کے

لئے بڑی دُور کا سفر کر کے قلعہ الموت جاتے تھے۔ وہاں حسن بن صباح کے تجربہ کار کارندے ان نوجوانوں پر نظر رکھتے اور ان میں سے اپنے مطلب کے لڑکے منتخب کر لیتے اور انہیں اس جنت میں داخل کر دیتے تھے۔

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جو کوئی ایک بار اس جنت میں چلا جاتا تھا وہ دنیا کو بھول جاتا بلکہ اپنی اصلیت اور اپنی ذات بھی اسے یاد نہیں رہتی تھی۔ پہلے کسی باب میں بیان ہو چکا ہے کہ اس جنت میں حشیش تھی اور حوریں تھیں۔ قدرت نے اس خطے کو ایسا حسن دیا تھا کہ حشیش اور حسین لڑکیوں کے بغیر بھی وہ خطہ جنت نظیر تھا۔ اب تو اس جنت میں چٹے بھی پھوٹ پڑے تھے جن میں رنگین مچھلیاں چھوڑ دی گئی تھیں۔ اس جنت میں سے وہ فدائی تیار ہو کر نکل رہے تھے جو حسن بن صباح کے حکم سے دوسروں کو قتل کر ہی دیتے تھے، اپنے آپ کو بھی قتل کر دینے میں وہ فخر محسوس کرتے تھے۔ ان فدائیوں کو مسلمانوں کے علاقوں میں پھیلایا جا رہا تھا۔

حسن بن صباح کے ہاں تبلیغ بہت کم اور زیادہ تر قتل و غارت گری تھی۔ اس کا اصول اور طریقہ کار یہ تھا کہ علماء اور دیگر قائدین کو قتل کر دیا جائے اور عوام کو بھیڑ بکریوں کا ریوڑ بنا کر انہیں ہانک کر اپنے زیر اثر لے لیا جائے۔



مرو میں امن قائم ہو چکا تھا۔ امن کا مطلب یہ ہے کہ اب وہاں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں تھا لیکن جن گھروں کے جوان بیٹے اس لڑائی میں مارے گئے تھے، ان گھروں میں ابھی تک ماتم ہو رہا تھا۔ اگر انہوں نے کفار کی کسی فوج سے لڑائی لڑی ہوتی تو وہ لوگ فخر سے بتاتے کہ ان کا بیٹا حق و باطل کے اس معرکے میں شہید ہوا ہے لیکن وہاں تو بھائیوں نے بھائیوں کا خون بہا دیا تھا البتہ حسن بن صباح اور اس کے باطنی فرقے کے خلاف نفرت کا ایک طوفان اٹھ آیا تھا۔ ہر کسی کو معلوم تھا اور ہر کسی کو بتایا گیا تھا کہ یہ سارا فتنہ باطنیوں نے زمین دوز طریقوں سے شروع کیا تھا۔

ابو مسلم رازی ابھی مرو میں ہی تھا۔ اس نے اپنا لشکر اپنے شہر رے کو بھیج دیا تھا۔ وہ خود اس لئے رک گیا تھا کہ مرو میں تینوں بھائیوں، سلطان برکیارق، محمد اور سنجر — میں سلطنت کی تقسیم کے متعلق امور طے کرنے تھے۔ اس نے دو چار دنوں بعد وہاں سے رے کو روانہ ہونا تھا۔

مزل آفندی اور اس کا ساتھی بن یونس موت کے شکنجے سے نکل آئے تھے۔ انہیں دودھ اور شہد پلایا جا رہا تھا اور ایسی غذائی جارہی تھی کہ ان کا جو خون ضائع ہو گیا تھا وہ پورا ہونا شروع ہو گیا۔ زخم بھی ٹھیک ہو رہے تھے اور اب وہ دونوں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے تھے اور بڑی آسانی سے باتیں بھی کر لیتے تھے۔

سلطان برکیارق اور ابو مسلم رازی کو جب پتہ چلا تھا کہ مزل آفندی زخمی ہو کر آیا ہے تو دونوں بڑی تیزی سے محل میں آئے اور اسے دیکھا تھا۔ انہوں نے طبیب اور جراح سے کہا تھا کہ یہ بہت ہی قیمتی آدمی ہے اسے ہر قیمت پر زندہ رکھنا ہے اور پھر اس میں وہی روحانی اور جسمانی توانائی پیدا کرنی ہے جو زخمی ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔

”امیر محترم!“ — مزل نے ابو مسلم رازی سے کہا — ”میں آج ہی آپ کو بتا دیتا ہوں کہ پوری طرح صحت یاب ہو کر میں اپنے اس ساتھی بن یونس کے ساتھ قلعہ الموت جاؤں گا اور حسن بن صباح کو قتل کر کے ہی واپس آؤں گا ورنہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہیں آئے گا۔“

”پہلے صحت یاب ہو لو“ — ابو مسلم رازی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — ”یہ تو ہم سب نے دیکھ لیا ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے باطل فرقے کو ختم کرنے کے لئے ہمیں اپنی جانوں کی قربانیاں دینی پڑیں گی..... ابھی اپنے خون کو اتنا جوش نہ دو پہلے تندرست ہو جاؤ۔“

دو تین دنوں بعد ابو مسلم رازی مرو سے رے کو روانہ ہونے لگا۔ سلطان برکیارق اس کے بھائیوں اور اس کی ماں نے ابو مسلم رازی کو شہانہ طریقے سے بڑے تپاک سے رخصت کیا۔ اس کی مزید تعظیم اس طرح کی گئی کہ وزیر اعظم عبدالرحمان سمیری اسے الوداع کہنے کے لئے شہر سے باہر تک اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ وہ دونوں پہلو بہ پہلو گھوڑوں پر سوار چل پڑے۔ ان کے پیچھے آٹھ دس محافظوں کا دستہ تھا۔ اس کے پیچھے اونٹوں اور ایک فخر گاڑی پر سلمان وغیرہ جا رہا تھا۔

”سمیری بھائی!“ — چلتے چلتے ابو مسلم رازی نے سلطان کے وزیر اعظم سے کہا — ”ان لڑکوں پر نظر رکھنا اور انہیں قابو میں رکھنا آپ کا کام ہے۔ بیشک برکیارق راستے پر آگیا ہے لیکن جوان آدمی ہے، کہیں بھٹک نہ جائے اور دوسرے بھائی اس سے چھوٹے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ عقل کی بجائے ذاتی جذبات سے سوچتا اور عمل کرنا شروع

کردیں۔ حسن بن صباح کا قلع قمع اتنا آسان نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ انہیں کھلی جنگ اور حملے سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ میں الموت کی بات کر رہا ہوں۔ ہمیں کچھ اور طریقے سوچنے پڑیں گے، بہر حال میں آپ سے آخری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ فرض آپ کا ہے، ان لڑکوں پر بھروسہ نہ کرنا۔“

”آپ نے دیکھ لیا ہے کہ میں نے زمین کے نیچے نیچے کیسی کیسی کارروائیاں کی ہیں۔“ عبدالرحمن سمیری نے کہا۔ ”میں آپ کا ہم خیال ہوں۔ آپ کے ساتھ رابطہ رکھوں گا۔ آپ نے بجا فرمایا ہے کہ یہ کام ہم جیسے تجربہ کار اور گہری سوچ و فکر والے آدمیوں کے کرنے کا ہے..... اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے.....“

عبدالرحمن سمیری کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک غریب سا ادھیڑ عمر آدمی ان کے راستے میں سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی خشنثی داڑھی تھی اور وہ بوسیدہ سا چغہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر اداسیوں کی گہری پرچھائیاں تھیں اور تاثر ایسا جیسے وہ مظلوم ہو اور التجا کرنا چاہتا ہو۔ ابو مسلم رازی بڑا ہی رحم دل آدمی تھا۔ عبدالرحمن سمیری بھی رحمہی میں کم نہ تھا۔ دونوں نے گھوڑے روک لئے۔

”یا امیر!“ اس آدمی نے ہاتھ جوڑ کر ذرا آگے آتے ہوئے کہا۔ ”ذرا رک جا اور ایک مظلوم باپ کی فریاد سنتا جا۔“

”کو میرے بھائی!“ ابو مسلم رازی نے کہا۔ ”کو؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں تمہاری پوری مدد کروں گا پھر یہاں سے آگے قدم اٹھاؤں گا۔“

”یا امیر!“ اس مفلوک الحال آدمی نے زمین پر گھٹنے ٹیک دیئے اور ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا۔ ”لڑائی تو امیروں اور بادشاہوں کی تھی لیکن میرا ایک ہی ایک جوان بیٹا اس لڑائی میں مارا گیا ہے..... اگر میرا بیٹا کفار کے مقابلے میں لڑتا ہوا جان دے دیتا تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی بلکہ میں فخر سے اپنا سراونچا کر کے کہتا کہ میں نے اپنا اکلوتا بیٹا اللہ کی راہ میں قربان کر دیا ہے لیکن یہ کیسی لڑائی تھی!..... جس میں بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا اور.....“

”تم اپنی فریاد سناؤ میرے بھائی!“ ابو مسلم رازی نے کہا۔ ”وہ تو میں جانتا ہوں کہ یہ کیا ہوا تھا۔ تم جو چاہتے ہو وہ بتاؤ تاکہ میں تمہاری مدد کروں۔“

”اے رحمہی امیر!“ اس آدمی نے کہا۔ ”تیرے متعلق جو سنا تھا تو ویسا ہی

نکلا۔ اللہ نے تیرے دل میں رحم ڈالا ہے۔ کچھ رحم مجھ پر بھی کر دے۔“ — یہ آدمی جس نے گھٹنے پہلے ہی زمین پر ٹیکے ہوئے تھے سجدے میں چلا گیا اور سجدے میں بولا —
 ”میں جانتا ہوں کہ سجدہ صرف خدا کے آگے کیا جاتا ہے لیکن میں تیرے آگے سجدہ کرتا ہوں۔“

”کھڑے ہو کر بات کرو بھائی!“ — ابو مسلم رازی نے کہا — ”مجھے گناہگار نہ کرو..... کہو کیا بات ہے!“

اس آدمی نے سجدے سے سر اٹھایا اور پھر ہاتھ جوڑ کر بولا — ”مجھے بتا اے امیر! میں کہاں جاؤں..... میری فریاد کون سنے گا..... تو گھوڑے پر سوار ہے اور میں خاک نشین ہوں..... میری آواز تیرے کانوں تک نہیں پہنچ پائے گی۔“

ابو مسلم رازی کی رحمہلی اور انسان دوستی کا یہ عالم تھا کہ وہ گھوڑے سے اتر آیا۔ وہ پہلے ہی یہ صدمہ دل پر لئے ہوئے تھا کہ اس آدمی کے بیٹے جیسے نہ جانے کتنے بیٹے خانہ جنگی میں مارے گئے ہیں۔ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ ایک غریب آدمی جس کا اکلوتا بیٹا مارا گیا ہے اس کے آگے سجدہ کر رہا ہے۔

ابو مسلم رازی اس کے قریب پہنچا تو وہ آدمی ایک بار پھر سجدے میں چلا گیا۔ رازی نے دیکھ لیا تھا کہ اس آدمی کی آنکھوں سے آنسو بے جا رہے تھے۔ اس نے اس مظلوم آدمی کے اوپر جھک کر اس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ رکھے اور اسے اٹھنے کو کہا اور اسے اٹھانے بھی لگا۔ اس وقت ابو مسلم رازی رکوع کی حالت میں اس آدمی کے اوپر جھکا ہوا تھا اور وہ آدمی اس کے نیچے تھا۔

اس آدمی نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھتے اٹھتے اپنے بوسیدہ چنچے کے اندر کیا اور پھر بڑی تیزی سے ہاتھ باہر نکالا۔ پتھر اس کے کہ ابو مسلم رازی یا کوئی اور دیکھ سکتا کہ اس آدمی کے ہاتھ میں خنجر ہے، خنجر ابو مسلم رازی کے سینے میں اتر چکا تھا۔ اس آدمی نے نیچے سے خنجر کا وار کیا تھا۔ ابو مسلم رازی تیزی سے سیدھا ہوا تو اس آدمی نے اٹھ کر دوبار پھر اس کے سینے میں خنجر مارے۔ ابو مسلم رازی تیور اکر گرا اور اس کے جسم سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔

محافظ گھوڑوں سے کود کر اترے اور ابو مسلم رازی کی طرف دوڑے۔ عبدالرحمان سمیری بھی گھوڑے سے اتر آیا اور اس نے ابو مسلم رازی کو سہارا دیا لیکن ابو مسلم رازی

کے گھٹنے زمین سے لگ چکے تھے۔

قاتل کو وہیں پکڑا تھا لیکن قاتل نے چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنے خنجر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اپنے سر کے اوپر کر کے نحر لگایا — ”یا شیخ الجبل“ تیرے نام پر اپنی جان قربان کر رہا ہوں..... تیرے حکم کی تعمیل کر دی ہے“ — اس نے خنجر زور سے نیچے کو کھینچا اور اپنے دل میں اتار لیا۔ ذرا سی دیر وہ پاؤں پر کھڑا رہا پھر گر کر ایک طرف کو لڑھک گیا۔ محافظوں نے اسے اٹھانا چاہا لیکن وہ مرجکا تھا۔

چونکہ وزیر اعظم اور رے کا امیر جا رہے تھے اس لئے لوگ راستے کے دونوں طرف اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ایک آدمی نے امیر رے کو قتل کر دیا ہے تو وہ قاتل پر ٹوٹ پڑے۔ اسے تلواروں اور خنجروں سے قیمہ کر دیا اور جس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا اس نے پتھر اٹھا اٹھا کر اسے مارے اور ذرا سی دیر میں قاتل کے جسم کے چھتھرے کر دیئے۔

ابو مسلم رازی کی لاش گھوڑے پر ڈال کر واپس سلطان برکیارق کے محل میں لے جالی گئی۔ وہاں تو کھرام بپا ہو گیا۔



ابو مسلم رازی کی میت کو مروء میں ہی آخری غسل دے کر کفن پہنا دیا گیا تھا۔ ایک قاصد کو رے کی طرف دوڑا دیا گیا تھا کہ وہ ابو مسلم رازی کے خاندان کو اس حادثے کی اطلاع دے دے اور یہ بھی بتائے کہ اس کی میت لائی جا رہی ہے۔

ابو مسلم رازی ایک تاریخ ساز شخصیت تھی۔ حسن بن صباح نے اسے قتل کروا کر ایسا خلا پیدا کر دیا تھا جسے اب کوئی اور پورا نہیں کر سکتا تھا۔

جب ابو مسلم رازی کی میت رے پہنچی تو سارا شہر ہی ٹوٹ پڑا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر کوئی جانتا تھا کہ اسے بانیوں نے قتل کیا ہے۔ لوگ بلند آواز سے حلف اٹھا رہے تھے اور یہ عہد کر رہے تھے کہ وہ اپنے امیر کے خون کا انتقام لیں گے۔

اس قتل کی اطلاع شہر سے باہر دُور دُور تک پہنچ گئی تھی اور لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ جب جنازہ اٹھا تو رے کی فضا میں صرف آہ و بکا اور عورتوں کے بین سنائی دے رہے تھے۔ جنازہ گھڑ دوڑ کے میدان میں پڑھا گیا۔ عورتیں چھتوں پر کھڑی رو رہی تھیں اور بچے بھی جنازے میں شامل ہو گئے تھے۔ لوگوں کا اتنا بڑا ہجوم کبھی کم ہی دیکھنے

میں آیا تھا۔

جنازہ ابو المنظر مجید فاضل اصفہانی نے پڑھایا۔ جنازے کے بعد اس نے لوگوں کو بیٹھ جانے کو کہا۔ پھر اس نے بڑی بلند آواز میں لوگوں کو مختصر سا خطاب کیا:

”اے لوگو!“ — ابو المنظر مجید فاضل اصفہانی نے کہا — ”ہوش میں آؤ اور اپنے دین و ایمان کو اور زیادہ مضبوط کرو..... ابو مسلم رازی کو اس ابلیس حسن بن صباح نے قتل کر لیا ہے۔ اس سے ہماری قوم کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی صرف ابو مسلم رازی ہی کر سکتا ہے لیکن عہد کر لو کہ ہمیں ایک اور ابو مسلم رازی پیدا کرنا ہے۔ پروانے جل جل کر مرتے رہتے ہیں اور شمع جلتی رہتی ہے۔ ہمیں اسلام کی شمع کو جلتا رکھنا ہے اور اس پر اسی طرح جل جل کر مرنے ہے۔ انسان مرتے جاتے ہیں لیکن دین اور ایمان زندہ رہتے ہیں۔ کچھ اور انسان آتے ہیں جو پہلے انسانوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اب ہر آدمی اس عزم کو اپنے ایمان میں شامل کر لے کہ حسن بن صباح کو قتل کرنا ہے اور اس کے فرقے کا نام و نشان مٹا دینا ہے..... لیکن سوچنا عقل سے جذبات کی شدت اور جوش سے نہیں۔“

لوگوں میں اس قدر جوش و خروش اور ایسا غم و غصہ تھا کہ انہوں نے اس عالم کی آگے کوئی بات نہ سنی اور نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ اگر انہیں اشارہ بھی دے دیا جاتا کہ ابھی قلعہ الموت پر حملہ کرنا ہے تو سب اسی حالت میں چل پڑتے اور کچھ بھی نہ سوچتے..... فاضل اصفہانی نے ہاتھ کھڑے کر کے لوگوں کو خاموش کیا اور دعا پڑھنے لگا۔

لوگوں میں سے ایک آدمی اٹھا اور ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا مجید فاضل اصفہانی کے پاس جا کھڑا ہوا اور اس نے لوگوں کی طرف منہ کر لیا۔ وہ اس عالم کے پہلو کے ساتھ کھڑا تھا۔

”اے لوگو!“ — اس آدمی نے کہا — ”تم جوش میں آ کر نعرے لگا رہے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ حسن بن صباح کو قتل کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ اس کے لئے صرف دو تین آدمیوں کی ضرورت ہے۔ میں اس کے لئے اپنے آپ کو اور اپنی جان کو پیش کرتا ہوں..... مجھے دو آدمیوں کی ضرورت ہے۔“

”تم ابھی بیٹھ جاؤ میرے عزیز!“ — ابو المنظر مجید فاضل اصفہانی نے اس آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — ”یہ معاملہ ایسا نہیں جو یہاں جذبات کے جوش میں طے کر

لیا جائے، اس پر بعد میں غور کیا جائے گا۔

”میں نے غور کر لیا ہے“ — اس آدمی نے کہا اور بڑی تیزی سے اپنے کپڑوں کے اندر سے خنجر نکالا، ہوا میں لہرایا اور اس کا یہ خنجر ابو المنظر مجید فاضل اصفہانی کے سینے پر اُس جگہ اُتر گیا جہاں دل ہوتا ہے۔ اس شخص نے دو وار اور کئے اور پتھر اس کے کہ لوگ اٹھ کر اسے پکڑ لیتے اس نے اپنا خنجر ہوا میں بلند کر کے نعرہ لگایا — ”شیخ الجبل کے نام پر!“ — اور خنجر اپنے دل میں اتار لیا۔ وہ گرا اور مر گیا۔ یہ ایک اور تاریخی شخصیت تھی جسے حسن بن صباح نے قتل کرایا تھا۔ مجید فاضل اصفہانی صرف عالم ہی نہیں تھا بلکہ وہ عمل کے میدان کا سپاہی تھا، حقیقت پسند اور کچھ کر کے دکھا دینے والا..... ابو مسلم رازی اور مجید فاضل اصفہانی کے قاتل دو تین دن پہلے قلعہ الموت سے آئے تھے۔

ابو مسلم رازی کو دفن کر دیا گیا اور اس کے پیرو استاد مجید فاضل اصفہانی کی میت کو اٹھا کر اس کے گھر لے گئے۔ اگلے روز اسی بے پناہ اور بے قابو ہجوم نے اپنے اس عالم ابو المنظر مجید فاضل اصفہانی کا جنازہ پڑھا۔ بے قابو اس لئے کہ ہر کوئی غم و غصے سے پھنسا جا رہا تھا لیکن یہ لوگ اب قیادت سے محروم ہو گئے تھے۔ سلطان برکیارق اور اس کا وزیر اعظم عبدالرحمان سمیری وہیں رکے رہے تھے۔ جنازے کے بعد عبدالرحمان سمیری نے لوگوں سے خطاب کیا اور کہا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھیں اور اپنی عقل پر پردہ نہ پڑنے دیں، انشاء اللہ ان عظیم شخصیتوں کے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔



سلطان برکیارق، محمد، خنجر، ان کی ماں اور ان کا وزیر اعظم عبدالرحمان سمیری مڑو چلے گئے۔ تاریخ میں ایسا کوئی حوالہ نہیں ملتا کہ رے کا شہر اور علاقہ ابو مسلم رازی کے بعد کس امیر کو دیا گیا تھا۔ ایک اشارہ ملتا ہے کہ سلطان برکیارق نے اس علاقے کو اپنی عملداری اور نگرانی میں رکھ لیا تھا۔

ان لوگوں کے دلوں پر بہت ہی بوجھ تھا۔ ایک تو صدمہ تھا اور دوسرے یہ سوچ اور فکر کہ حسن بن صباح کا ہاتھ کس طرح روکا جائے..... مڑو پہنچتے ہی ان لوگوں نے اپنے سالاروں کو بلایا اور باقاعدہ اجلاس میں غور کیا گیا کہ باغیوں کا قلع قمع کس طرح کیا جاسکتا ہے۔

اس اجلاس میں کئی ایک طریقے سوچے گئے اور منصوبے بھی بنائے گئے اور اجلاس

برخواست ہو گیا۔ ایک فیصلہ یہ ہوا کہ سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے لیکن فوج کو ابھی تقسیم نہ کیا جائے ورنہ ہمارا دشمن اتنا شعبہ باز اور چالاک ہے کہ وہ ان دونوں حصوں کو الگ الگ الجھا کر نقصان پہنچائے گا۔

جب اجلاس برخواست ہوا تو سلطان برکیارق اور عبدالرحمن سمیری کو درپن نے اطلاع دی کہ تین آدمی بڑی دور سے آئے ہیں اور وہ انہیں ملنا چاہتے ہیں۔
 ”پہلے ان کی تلاشی لو“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”تلاشی بڑی سختی سے لینی ہے“ ان کے پاس چھوٹا سا چاقو بھی نہیں ہونا چاہئے۔“

کچھ دیر بعد یہ تین آدمی کمرے میں لائے گئے اور بتایا گیا کہ یہ بالکل نئے ہیں اور بہت دور سے آئے ہیں..... انہوں نے کہا کہ وہ ایک شہر ابھر کے رہنے والے ہیں اور تجارت پیشہ ہیں۔ وہ جو مسئلہ لے کر آئے تھے وہ یوں تھا کہ اس شہر کے قریب ایک قلعہ وسم کوہ پر تھا۔ وسم کوہ ایک پہاڑی تھی جس پر یہ قلعہ بنا ہوا تھا۔ ان آدمیوں نے بتایا کہ اس قلعے پر باطنی فدائی قابض ہو گئے ہیں اور وہاں انہوں نے کسی مسلمان کو زندہ نہیں رہنے دیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس قلعے کے قریب سے چھوٹے بڑے قافلے اور اراکے دُکے آدمی یا پورے پورے خاندان گزرتے رہتے ہیں۔ یہ باطنی فدائی انہیں لوٹ لیتے ہیں اور سارا مال قلعے میں لے آتے ہیں اور یہاں سے یہ مال قلعہ الموت جاتا ہے۔

یہ آدمی عقلمند معلوم ہوتے تھے اور جنگی امور سے بھی کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان فدائیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں اور وہ باقاعدہ فوجی بھی نہیں۔ ان میں صرف یہ طاقت تھی کہ اپنی جان پر کھیل جاتے تھے لیکن عسکری طریقوں سے بالکل بلاواقف تھے۔

”اگر آپ فوج لے کر آئیں تو آپ کو وہاں کے لوگوں کی مدد بھی مل سکتی ہے“ — اس وفد کے ایک آدمی نے کہا — ”وہاں سے قلعہ الموت بہت دُور ہے۔ ان قلعہ بند باغیوں کو کہیں سے مدد یا کمک نہیں مل سکتی..... اگر اس قلعے پر قبضہ کر لیا جائے تو اتنے زیادہ باطنی ہاتھ آئیں گے جنہیں قتل کیا جائے اور مل و متاع اور زر و جواہرات کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔“

کچھ بحث و تمحیص کے بعد سالار اور یزی نے کہا کہ وہ اس قلعے کا محاصرہ کرے گا اور انشاء اللہ کامیاب بھی ہو گا..... قلعہ کچھ دور تھا۔ سلطان برکیارق اور عبدالرحمن سمیری

نے اسے اجازت دے دی اور محاصرے کا منصوبہ تیار ہونے لگا۔

دو ہی دنوں بعد سالار اور یزی نے مطلوبہ فوج تیار کر لی اور رخصت ہونے لگا۔ وزیر اعظم عبدالرحمان سمیری نے اس فوج کو رخصت کرنا تھا جیسا کہ اُس زمانے میں رواج تھا۔ سمیری گھر سے نکلا اور اُس جگہ کی طرف چل پڑا جہاں فوج تیار کھڑی تھی۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس عورت زمین پر بیٹھی تڑپ رہی ہے اور زمین پر ماتھا مار رہی ہے۔ وہ روتی اور بین کرتی تھی۔

ایک آدمی اس کے پاس بیٹھ کر اسے بہلانے لگا لیکن عورت ایک ہی رٹ لگائے جا رہی تھی — ”میرا بچہ..... میرا بچہ مجھے واپس لا دو..... سلطان مرگیا ہے جو میرے بچے کو واپس نہیں لاتا“۔

عبدالرحمان سمیری نے گھوڑا روک لیا اور اس آدمی سے پوچھا کہ عورت کی یہ حالت کیوں ہو رہی ہے۔

”اس بیچاری کا ایک کم سن بچہ باطنی اٹھا کر لے گئے ہیں“ — اس آدمی نے بتایا — ”یہ کہتی ہے کہ اُن لوگوں کو جانتی ہے اور وہ ابھی شہر میں ہی ہیں لیکن اس کی فریاد کوئی نہیں سنتا“۔

عبدالرحمان سمیری سے اس عورت کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ وہ گھوڑے سے اترا، وہ اس عورت کو تسلی دلا سہ دینا چاہتا تھا کہ اس کے بچے کو برآمد کرا لیا جائے گا۔ سمیری اس عورت کے قریب گیا اور اس پر جھٹکا۔ اس عورت کے پاس جو آدمی بیٹھا ہوا تھا اس نے بڑی تیزی سے خنجر نکالا اور عبدالرحمان سمیری کی پیٹھ میں اتار دیا، پھر اسے سیدھا نہ ہونے دیا اور دو تین وار اور کئے۔ وزیر اعظم سمیری وہیں گر پڑا۔

لوگ قاتل کو پکڑنے کے لئے دوڑے لیکن قاتل نے بھاگنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی۔ اس نے دوبار خنجر پوری طاقت سے اس عورت کی پیٹھ میں مارا اور پھر خنجر اپنے دل کے مقام پر اتنی زور سے مارا کہ آدھے سے زیادہ خنجر اس کے سینے میں چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ عورت اس قاتل کی ساتھی تھی اور اسے عبدالرحمان سمیری کو جال میں لانے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اگر یہ باطنی اس عورت کو قتل نہ کرتا تو اس سے کچھ راز مل سکتے تھے۔

یہ ایک اور تاریخی شخصیت تھی جسے حسن بن صباح کے حکم سے ایک فدائی نے

قتل کر دیا..... پانچویں ہجری ختم ہونے میں پانچ سال باقی تھے۔

سالار اور یزی نے اپنی پیش قدمی ملتوی نہ کی۔ وہ قلعہ و سم کوہ کی طرف کوچ کر گیا۔ یہاں سے قتل و غارت کا ایک اور دور شروع ہو گیا جس نے تاریخ پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔

اوریزی نے یہ فوج اندھا دھند تیار نہیں کی تھی اور اُس نے کوچ کا جو حکم دیا سالار تھا، وہ بھی کوئی رسمی سا حکم نہیں تھا۔ اس نے اس فوج کی تیاری کے دوران دانشمندانہ کارروائیاں کی تھیں۔

پہلی کارروائی یہ تھی کہ اس نے اس فوج میں منتخب لڑاکے اور جانباز شامل کئے تھے۔ اُس نے اپنے جو نائب کماندار ساتھ لئے تھے، وہ بھی چُنے ہوئے تھے اور لڑائیوں کا تجربہ بھی رکھتے تھے اور ان میں حسن بن صباح اور اُس کے فرقتے کی نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سالار اوریزی نے ایک احتیاطی تدبیر اختیار کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ حسن بن صباح تک یہ خبر نہ پہنچ جائے کہ وہ قلعہ و سم کوہ پر فوج کشی کے لئے جا رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ گلی گلی کوچہ کوچہ حسن بن صباح کے جاسوس موجود ہیں اور وہ روز بروز قلعہ الموت تک خبریں پہنچا رہے ہیں۔

سالار اوریزی نے اپنی اصل مہم پر پردہ ڈالے رکھنے کا یہ انتظام کیا تھا کہ وہ جب اپنی فوج تیار کر رہا تھا، اُس نے چند آدمی شہر پھیلا دیئے تھے جو یہ خبر مشہور کر رہے تھے کہ سالار اوریزی قلعہ ملاذخان پر حملہ کرنے جا رہا ہے.... قلعہ ملاذخان فارس اور خوزستان کے درمیان واقع تھا۔ چند سال پہلے باغیوں نے یہ قلعہ دھوکے میں اپنے قبضے میں لے لیا تھا.... قلعہ و سم کوہ قلعہ ملاذخان سے کم و بیش ایک سو میل دور کسی اور ہی طرف تھا۔ حسن بن صباح کو یہ اطلاع دی گئی کہ سالار اوریزی اتنی نفرت کی فوج سے قلعہ ملاذخان پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔ یہ سن کر حسن بن صباح نے قلعہ لگایا۔ ”پگے سلجوتی“ — حسن بن صباح نے کہا — ”اگر وہ قلعہ ملاذخان لے بھی لیں

گئے تو کیا کر لیں گے؟.... وہ ابھی تک نہیں سمجھے کہ ان کی قسمت اور ان کی جانیں میری مٹھی میں ہیں۔ میں یہاں تصور میں جس کا گلا دباؤں گا وہ مرو میں یا رے میں یا وہ جہاں کہیں بھی ہوا، مارا جائے گا.... جب اوریزی مرو سے کوچ کرے اسی وقت ایک آدمی وہاں سے میرے پاس پہنچ جائے اور بتائے کہ اس کے ساتھ کتنی پیدل اور کتنی سوار نفری ہے اور اُس نے کس وقت کوچ کیا ہے۔“

حسن بن صباح نے دو تین آدمیوں کے نام لے کر کہا کہ انہیں فوراً بلایا جائے۔ وہ آدمی فوراً پہنچے۔ یہ اُس کے جنگی مشیر تھے۔ اُس نے انہیں قلعہ ملاذخان کے دفاع کے متعلق ہدایات دینی شروع کر دیں اور ساتھ یہ بھی کہا کہ مرو سے ملاذخان تک جگہ جگہ اوریزی کے لشکر پر شب خون مارے جائیں اور گھات لگا کر بھی انہیں نقصان پہنچایا جائے۔ اس نے کہا کہ کہیں بھی جم کر نہیں لڑنا، ضرب لگا کر وہاں سے نکل آئیں۔

”وہ راستے سے ہی واپس چلے جائیں گے“ — حسن بن صباح نے کہا — ”اگر وہ واپس نہ گئے اور ملاذخان تک پہنچ بھی گئے تو ان کی نفری آدمی رہ چکی ہوگی اور وہ ایسی حالت میں ہوں گے کہ محاصرہ بھی مکمل نہیں کر سکیں گے۔ ملاذخان میں ہماری نفری تھوڑی ہے۔ وہاں آج ہی جاں بازوں کی خاصی نفری بھیج دو۔ انہیں یہ بتا دینا کہ جو نہ وہ سلجوقیوں کے لشکر کو آتا دیکھیں تو قلعے سے نکل کر اور دور کا چکر کاٹ کر پہلوؤں سے اُس پر ٹوٹ پڑیں اور سپاہی سے لے کر سالار تک کوئی ایک بھی زندہ زندہ واپس نہ جائے۔“

سالار اوریزی رے میں ابو مسلم رازی اور ابوالمنظر مجید فاضل اصفہانی کے جنازے پڑھ کر آیا تھا۔ اب اُس کا لشکر کوچ کے لئے تیار تھا اور وہ عبدالرحمن سمیری کے انتظار میں تھا کہ اس نے آکر انہیں الوداع کہنا تھا لیکن اسے اطلاع ملی کہ سمیری کو ایک باطنی نے قتل کر کے خودکشی کر لی ہے۔ اس خبر سے سالار اوریزی کو بھڑک اٹھنا چاہئے تھا اور اس پر جذبات کا غلبہ ہونا ایک قدرتی بات تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو ذہنی اور جذباتی لحاظ سے قابو میں رکھا اور ٹھنڈے دل سے سوچا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اگر وہ دوڑا ہوا وہاں جا پہنچتا جہاں عبدالرحمن سمیری کو قتل کیا گیا تھا تو وہ ماتم کرنے رک جاتا اور اُس کی فوج جو کوچ کے لئے تیار تھی، انتظار میں کھڑی رہتی یا اسے واپس بلایا جاتا۔

”سلطنت اسلامیہ کے پاسبانو!“ — سالار اوریزی نے اپنی فوج سے یوں خطاب کیا — ”باطنی ایک اور وار کر گئے ہیں۔ ابھی ابھی قاصد اطلاع دے گیا ہے کہ ہمارے

وزیر اعظم عبدالرحمن سیمری کو ایک باطنی نے اُسی طرح دھوکے سے قتل کر دیا ہے جس طرح امیر ابو مسلم رازی اور ہمارے پیرو مُرشد اور عالم ابوالنظر مجید فاضل اصفہانی کو قتل کیا تھا۔ ہم اب کسی کے جنازے کے لئے نہیں رکیں گے۔ اب ہم ان مقتولوں کے خون کے ایک ایک قطرے کا انتقام لیں گے۔ اب ہمیں پیچھے نہیں دیکھنا بلکہ آگے بڑھنا ہے۔ اب دل میں عہد کر لو کہ حسن بن صباح اور اُس کے اس باطل فرقے کو ختم کرنا ہے یا خود ختم ہو جانا ہے۔ لعنت ہے اس زندگی پر جس میں اہلیس ہمارے عمائدین کا خون بہاتے پھریں۔ اللہ اکبر کا نعرہ لگاؤ اور آگے بڑھو اور اس جذبے سے آگے بڑھو کہ ہم نے اب واپس اپنے گھروں کو نہیں آنا۔

لشکر نے جب اللہ اکبر کا نعرہ لگایا تو یوں لگا جیسے آسمان کا سینہ پھٹ گیا ہو اور زمین ہل گئی ہو۔ اس نعرے میں ایمان کی گرج تھی۔

سالار اور یزی گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ لشکر کے آگے آگے نہ چلا بلکہ وہیں کھڑا رہا۔ راستے سے ذرا ہٹ کر زمین کا تھوڑا سا اُبھار تھا۔ اور یزی اپنا گھوڑا اس اُبھار پر لے گیا اور اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے لشکر کو دیکھنے لگا۔ لشکر کلمہ طیبہ کا بلند ورد کرتا ہوا جا رہا تھا.... تاریخ میں ایسے اعداد و شمار نہیں ملتے کہ اس لشکر کی نفری کتنی تھی اور اس میں پیادے کتنے اور سوار کتنے تھے۔ بہر حال یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ اس لشکر میں وہی جوش و خروش تھا جس کی اُس صورتِ حال میں ضرورت تھی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سالار اور یزی نے چُن چُن کر جذبے والے مجاہد اس لشکر میں رکھے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اسلام کے مجاہدین تھے۔ انہیں تنخواہوں کے ساتھ بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی اور مالِ غنیمت کا بھی ان کے ذہنوں میں کوئی خیال نہ تھا۔ ان میں انتقام کا جذبہ تھا۔ تھوڑے سے عرصے کی خانہ جنگی نے کئی گھرا جاڑ دیئے تھے اور بھائیوں نے بھائیوں کو قتل کر دیا تھا۔ ان فوجیوں کو جب پتہ چلا تھا کہ اس خانہ جنگی کے پیچھے بائنیوں کا ہاتھ تھا تو وہ نفرت اور انتقام کے جذبے سے اتنے بھر گئے تھے کہ بارود کے چلتے پھرتے پتلے بن گئے تھے۔ وہ اُس سے کئی گنا زیادہ بائنیوں کو قتل کرنا چاہتے تھے جتنے خانہ جنگی میں اپنے آدمی مارے گئے تھے۔

سالار اور یزی کے پیچھے بارہ چودہ گھوڑ سوار محافظ کھڑے تھے۔ اب سالاروں اور دیگر سربراہوں کی حفاظت کے انتظام پہلے سے زیادہ سخت کر دیئے گئے تھے۔ لشکر گزرتا جا

رہا تھا اور سالار اور یزی اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک محافظ نے دیکھا کہ ایک درویش سا آدمی ایک طرف سے چلا آ رہا ہے اور اُس کا رخ سالار اور یزی کی طرف ہے۔ اس محافظ نے اپنے گھوڑے کی باگ کو جھٹکا دیا اور ہلکی سی ایڑ لگائی۔ گھوڑا اس درویش کے سامنے جا کر۔

اس شخص کا صاف ستھرا لباس، پُر اثر چہرہ اور انداز بتاتا تھا کہ یہ کوئی عالم ہے اور درویش بھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں قرآن پاک تھا اور دوسرے ہاتھ میں عصا۔ اس کی داڑھی خاصی لمبی تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نہیں بلکہ خود اعتمادی تھی۔

”میرے راستے میں مت آ اے سوار!“ — درویش نے محافظ سے کہا — ”میں اُس راستے پر جا رہا ہوں جو اللہ کی اس مقدس کتاب نے مجھے دکھایا ہے“ — اُس نے قرآن پاک اوپر کر کے کہا — ”یہ قرآن مجید ہے۔ گھوڑے سے اتر اور اس کی توہین نہ کر۔ مجھے سپہ سالار کے پاس جانے دے۔“

”آپ کا احترام دل و جان سے کروں گا اے عالم!“ — محافظ نے گھوڑے سے اتر کر کہا — ”لیکن آپ کی جامہ تلاشی لئے بغیر آگے نہیں جانے دوں گا۔ کیا آپ نے سنا نہیں کہ یکے بعد دیگرے تین شخصیتوں کو باغیوں نے ایسے ہی دھوکے سے قتل کر دیا ہے۔ عالم اور درویش کا ہروپ تو کوئی بھی دھار سکتا ہے۔“

”میں تجھے فرائض سے کوتاہی نہیں کرنے دوں گا“ — درویش نے کہا — ”میری جامہ تلاشی لے لے۔ پھر بھی تجھے شک ہے کہ میں سپہ سالار کو قتل کر دوں گا تو میرے ہاتھ زنجیروں میں میری پیٹھ کے پیچھے باندھ دے۔ میں نے سپہ سالار کو اللہ کا نور دکھانا ہے۔ وہ ابلیس کو تمس نہس کرنے جا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس سپہ سالار کے پاس جسم کی طاقت بھی ہے اور دماغ کی طاقت بھی لیکن میں اس کی روح کو تقویت دینا چاہتا ہوں.... جا، پہلے اس سے پوچھ کہ مجھے اپنے پاس آنے دے گا بھی یا نہیں!“

سالار اور یزی نے اس وقت تک اس درویش کو اور اپنے محافظ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ عالم ہے یا درویش یا جو کوئی بھی ہے، اُسے ملنا چاہتا ہے۔

”انہیں آنے دو“ — سالار اور یزی نے اپنے محافظ سے کہا — ”اپنا فرض پورا کر نو۔“

فرض سے مراد یہ تھی کہ اس کی جامہ تلاشی لے لو کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ

ہو۔ محافظ نے درویش کے کپڑوں کے اندر اچھی طرح دیکھ لیا اور اسے سالار اور یزی کی طرف بھیج دیا لیکن خود اس کے ساتھ رہا۔ دو اور محافظ گھوڑوں سے اتر آئے اور سالار اور یزی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ محافظ اس طرح کھڑے تھے کہ ایک درویش کے بالکل پیچھے، دوسرا اُس کے ایک پہلو کی طرف اور تیسرا دوسرے پہلو کی طرف تھا۔

”میرے ہاتھ میں قرآن مجید ہے“ — درویش نے قرآن سالار اور یزی کی طرف بلند کر کے کہا — ”اگر سالار گھوڑے سے اتر آئے تو میں بھی قرآن مجید کی بے ادبی کے گناہ سے بچ جاؤں گا۔ قرآن مجید صرف تمہارے لئے لایا ہوں۔“

سالار اور یزی گھوڑے سے اتر آیا۔ یقیناً اُسے اور اُس کے محافظوں کو یہی توقع ہو گی کہ یہ درویش یا عالم اچھی نیت سے نہیں آیا۔ بائنیوں نے پہلے تین عمائدین کو اسی طرح قتل کیا تھا اور اب یہ سالار اور یزی کو قتل کرنے آیا ہے۔ جب اور یزی گھوڑے سے اتر کر اُس کے سامنے کھڑا ہوا تو تینوں محافظ درویش کے اور زیادہ قریب ہو گئے اور ان کی نظریں اس کے ہاتھوں پر جم گئیں۔

”میرے لئے کیا حکم ہے اے عالم؟“ — سالار اور یزی نے پوچھا۔

”حکم دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے“ — درویش نے کہا — ”مجھے کچھ نظر آیا تھا، وہ تجھے دکھانے آگیا۔ تیری جسمانی اور تیری دماغی قوت پر مجھے کوئی شک نہیں لیکن تیری روح کو تقویت کے لئے کچھ دینا ہے، میں تجھے قتل کرنے نہیں آیا۔ دیکھ لے میرے ہاتھ میں قرآن مجید ہے اور دوسرے ہاتھ میں عصا۔ اگر میں سپاہی ہوتا تو آج تیرے ساتھ جاتا لیکن میری زندگی کا راستہ کوئی اور ہے۔ میں نے تیری فتح کے لئے رات بھر چلہ کاٹا ہے۔ اللہ نے کرم کیا اور مجھے روشنی کی ایک کرن دکھادی ہے۔ وہ تیری روح میں ڈالنے آیا ہوں.... تیرا پورا نام کیا ہے؟“

”ابن ہاشم اور یزی!“ — سالار اور یزی نے جواب دیا۔

”اور تو جاکہاں رہا ہے؟“ — درویش نے پوچھا۔

”قلعہ ملاذخان!“ — سالار اور یزی نے جھوٹ بولا۔

درویش زمین پر بیٹھ گیا۔ وہاں زمین دھول والی تھی۔ اُس نے سالار اور یزی کو بھی اشارہ کر کے بٹھالیا۔ پھر زمین پر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے خاصا بڑا ستارہ بنایا۔ ایک خانے میں اور یزی کا پورا نام لکھا اور اس کے بالمقابل خانے میں ملاذخان لکھا۔ اس

کے بعد اُس نے قرآن مجید کھولا اور تھوڑی سی ورق گردانی کر کے ایک آیت پر انگلی رکھی اور وہ آیت بلند آواز سے پڑھی۔ قرآن مجید بند کیا، آسمان کی طرف دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور نیچے ستارے کو دیکھا۔ اس کے تمام خانوں میں کچھ نشان سے لگائے اور پھر سالار اور یزی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

”تیرے لشکر نے پہلے دو جگہوں پر شکست کا سامنا کیا ہے“ — درویش نے کہا —
 ”اب تو فتح یاب لوٹے گا“ — درویش نے قرآن اُسی جگہ سے کھولا جہاں سے پہلے کھولا تھا اور قرآن مجید اور یزی کے ہاتھوں میں دے کر ایک آیت پر انگلی رکھی اور کہا — ”یہ پڑھ اور اسے زبانی یاد کر لے۔“

سالار اور یزی نے وہ آیت پڑھی اور پھر چند مرتبہ پڑھ کر کہا کہ یہ اُسے یاد ہو گئی ہے۔

”اللہ بڑایا ابلیس؟“ — درویش نے پوچھا۔

”اللہ!“ — سالار اور یزی نے جواب دیا۔

”جا... اللہ تیرے ساتھ ہے“ — درویش نے اٹھتے ہوئے کہا — ”تُو نے کہا ہے کہ تُو قلعہ ملاذخان جا رہا ہے۔ اب یہ خیال رکھنا کہ راستے میں کسی اور طرف کا رخ نہ کر لیتا۔ قلعہ ملاذخان کو ہی محاصرے میں لینا اور اس قلعے کے دروازے تیرے لئے کھل جائیں گے.... یہ خیال رکھنا کوئی ایک بھی آدمی زندہ نہ رہے۔“

”ایسا نہیں ہو گا اے عالم!“ — سالار اور یزی نے کہا — ”میں نے قلعہ ملاذخان کا قصد کیا ہے اور وہی میری منزل ہے۔“

درویش نے قرآن مجید سالار اور یزی کے سر سے ذرا اوپر ایک چکر میں گھمایا۔

”گھوڑا تیرا خطر ہے“ — درویش نے کہا — ”یہی گھوڑا تجھے فتح یاب واپس

لائے گا.... میں تجھے اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ اُسی کی ذات تیری حامی و ناصر ہے۔“

سپہ سالار اور یزی گھوڑے پر سوار ہوا۔ گھوڑا لشکر کی طرف مُڑا۔ لشکر آگے نکل گیا تھا۔ اب اس کے سامنے سے وہ گھوڑا گاڑیاں، بیل گاڑیاں اور اونٹ گزر رہے تھے جن پر لشکر کا سامان وغیرہ لدا ہوا تھا۔ اور یزی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا بڑی اچھی چال دوڑنے لگا۔ اس کے محافظ اس کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ ان محافظوں کا کمانڈر اپنے گھوڑے کو سالار اور یزی کے گھوڑے کے پہلو میں لے گیا۔

”سلار محترم!“ — کمانڈر نے پوچھا — ”کیا ہم واقعی قلعہ ملاذخان جارہے ہیں؟ آپ نے ہمیں قلعہ وسم کوہ کے متعلق بتایا تھا اور یہی بتاتے رہے ہیں کہ وسم کوہ کے قلعے کی ساخت کیا ہے اور اس کے ارد گرد کیا ہے“ اس کے دروازے کیسے ہیں اور ہم اس قلعے کو کس طرح سر کریں گے۔ قلعہ ملاذخان سے تو ہمارا لشکر واقف ہی نہیں۔“

”جہاں تک اس درویش کا تعلق ہے ہم قلعہ ملاذخان ہی جارہے ہیں“ — سلار اور یزی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا — ”اور جہاں تک میرا تعلق ہے، میں قلعہ وسم کوہ جارہا ہوں۔“

محافظوں کا کمانڈر کچھ اس طرح اپنا گھوڑا پیچھے لے آیا جیسے وہ اپنے سپہ سالار کی بات سمجھ ہی نہ سکا ہو اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

درویش سلار اور یزی کو خدا حافظ کہہ کر واپس چلا گیا اور اُس نے اپنی چال میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ وہ شہر میں داخل ہوا اور پھر ایک گلی میں گیا اور ایک مکان کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اندر چار پانچ جواں سل آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

”وہ آگیا“ — ایک آدمی نے کہا پھر درویش سے پوچھا — ”کیا خبر لائے؟“

”ملاذخان ہی جارہا ہے“ — درویش نے بیٹھتے ہوئے کہا — ”تصدیق کر آیا ہوں۔ اب ایک آدمی فوراً چل پڑے اور جس قدر جلدی ہو سکے قلعہ الموت پہنچے اور شیخ الجبل کو بتائے کہ سلار اور یزی اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ ملاذخان کو ہی کوچ کر گیا ہے۔ شیخ الجبل نے حکم دیا تھا کہ آخری اطلاع اسے بہت جلدی ملنی چاہئے۔“

”میں تیار ہوں“ — ایک جواں سل آدمی نے اٹھ کر کہا — ”گھوڑا بھی تیار ہے، میں تمہارے انتظار میں تھا.... کوئی اور اطلاع؟“

”اور کچھ نہیں!“ — درویش نے کہا۔

وہ جواں سل آدمی بڑی تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ اس کا گھوڑا تیار تھا۔ وہ کود کر گھوڑے پر سوار ہوا اور نکل گیا۔

اُس وقت عام خیال یہ تھا کہ اس شہر میں کسی باطنی کو زندہ نہیں رہنے دیا گیا لیکن حسن بن صباح کا بھیجا ہوا یہ گروہ زندہ و سلامت تھا اور پوری طرح سرگرم تھا۔ انہوں نے اپنے اوپر ایسا دھیز پردہ ڈال رکھا تھا کہ ان پر کسی کو شک ہوتا ہی نہیں تھا۔ یہ سلار اور یزی کی گہری نظر تھی جس نے اس درویش کی اصلیت بھانپ لی تھی ورنہ وہ کون

مسلمان ہے جو قرآن سے متاثر نہیں ہوتا۔ سالار اور یزی نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ یہ درویش اس کے پاس آ گیا تھا۔ شکر اس لئے ادا کیا کہ اب حسن بن صباح کو مصدقہ اطلاع مل جائے گی کہ یہ لشکر قلعہ ملاذخان کو ہی جارہا ہے۔

”راستے میں صرف ایک پڑاؤ ہو گا“ — سالار اور یزی نے اپنے نائبین کو حکم دیا — ”یہ پڑاؤ بھی ایک آدھ گھڑی کے لئے ہو گا، پوری رات کے لئے نہیں۔ باقی رات کوچ میں گزرے گی اور ہمیں بہت ہی جلدی وسم کوہ پہنچنا ہے۔“



مزل آفندی اور بن یونس زخمی حالت میں سلطان کے محل کے ایک کمرے میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی جانیں تو بچ گئی تھیں لیکن زخم زیادہ تھے اور خون اتنا بہہ گیا تھا کہ ان کا زندہ رہنا ایک معجزہ تھا۔ گو خطرہ ٹل گیا تھا لیکن ابھی تک دونوں بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ اچانک شمونہ بڑی ہی تیزی سے دوڑتی ہوئی ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”مزل!“ — شمونہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا — ”وزیر اعظم عبدالرحمن سمیری بھی قتل ہو گئے ہیں.... لاش لائی جا رہی ہے۔“

مزل اور بن یونس ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھے اور اس کے ساتھ ہی دونوں کی کرناک آپہن نکل گئیں اور وہ پھر لیٹ گئے۔ اس خبر پر تو وہ اٹھ کر باہر نکل جانا چاہتے تھے لیکن زخموں نے انہیں بیٹھنے بھی نہ دیا اور وہ یوں لیٹ گئے جیسے گھائل ہو کر گر پڑے ہوں۔ ان دونوں نے شمونہ سے پوچھنا شروع کر دیا کہ سمیری کہاں قتل ہوا ہے؟ کس طرح قتل ہوا ہے؟ کس نے قتل کیا ہے؟.... شمونہ نے انہیں تفصیل سنائی۔

”اب میں اس شہر میں نہیں رہوں گی“ — شمونہ نے غصے اور جذبات کی شدت سے کاہتی ہوئی آواز میں کہا — ”میں قلعہ المکوت جاؤں گی اور حسن بن صباح کو اپنے ہاتھوں قتل کروں گی۔ تم دونوں کو اب گھروں میں بیٹھی ہوئی عورتوں کی طرح رونا نہیں چاہئے“ — شمونہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا — ”اب ہمیں کچھ کرنا پڑے گا۔ سالار اور یزی ایک لشکر لے کر قلعہ وسم کوہ کا محاصرہ کرنے چلے گئے ہیں لیکن میں کہتی ہوں کہ ایک قلعہ سر کر لینے سے کیا حاصل ہو گا؟ ہو سکتا ہے یہ قلعہ سر نہ ہی ہو سکے۔ پہلے ہمارے لشکر شکست کھا کر آچکے ہیں۔“

”ہم سمیری کی شہادت پر آنسو نہیں بہا رہے شمونہ!“ — منزل نے کہا — ”اپنی اس حالت پر رو رہے ہیں کہ جب ہمیں میدان میں ہونا چاہئے تھا ہم یہاں اس قاتل بھی نہیں کہ اپنا وزن بھی سہاڑ سکیں.... اور تم اتنی زیادہ جذباتی نہ ہو جاؤ کہ عقل سے کام لینا بھی چھوڑ دو۔ کیا میں نے تمہارے ساتھ عہد نہیں کر رکھا کہ ہم نے حسن بن صباح کو قتل کرنا ہے۔“

”ہمیں اتنا سا ٹھیک ہونے دو کہ چل پھر سکیں“ — بن یونس نے کہا — ”حسن بن صباح ہمارے ہاتھوں مرے گا۔“

شمونہ ان کے پاس بیٹھ گئی اور وہ بہت دیر یہی منصوبے بتاتے رہے کہ حسن بن صباح کو کس طرح قتل کیا جاسکتا ہے۔

”تم دونوں نے دیکھ لیا ہے“ — شمونہ نے کہا — ”باطنی اور حسن بن صباح کے فدائی زمین کے اوپر نہیں زمین کے نیچے ملتے ہیں۔ وہ میدان میں لڑنے والے لوگ نہیں بلکہ دوسروں کو میدان میں لا کر ایک دوسرے سے لڑا سکتے ہیں اور انہوں نے یہ کام کر دکھایا۔ میں حسن بن صباح کے پاس رہی ہوں۔ منزل بھی ان کے ہاں رہ چکا ہے لیکن جو میں جانتی ہوں وہ منزل، تم بھی نہیں جانتے۔ ہمیں زمین کے نیچے نیچے سے حسن بن صباح تک پہنچنا ہے۔“

یہ باتیں تھیں، ان باتوں میں ایک عزم تھا، عہد تھا اور یہ ان کا ایمان تھا لیکن اس وقت حقیقت یہ تھی کہ حسن بن صباح کا فرقہ آکاس بیل کی طرح پھیلتا ہی چلا جا رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اسلام کا ہرا بھرا شجر سوکھ جائے گا اور اس کی نشوونما رک جائے گی۔ سلطان کے محل کی سرگوشیاں بھی قلعہ الموت میں حسن بن صباح کو سنائی دیتی تھیں۔

حسن بن صباح کو جب یہ مصدقہ اطلاع ملی کہ سالار اوریزی اپنے لشکر کو قلعہ ملاذخان کے محاصرے کے لئے لے گیا ہے اس وقت سالار اوریزی قلعہ وسم کوہ کو محاصرے میں لے چکا تھا۔ حسن بن صباح اس اطلاع پر ذرا سا بھی پریشان نہیں ہوا تھا۔ اُس نے قلعہ ملاذخان کے دفاع کا انتظام پہلے ہی اتنا مضبوط کر دیا تھا کہ سالار اوریزی جتنا لشکر اپنے ساتھ لے گیا تھا اس سے دگنا لشکر بھی قلعہ ملاذخان کو فتح نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے وہاں اپنے ایک ہزار جانباز بھیج دیئے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے قلعہ ملاذخان سے کچھ دور دو تین جگہوں پر گھات کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔

سالار اور یزی کو توقع تھی کہ وہ قلعہ و سم کوہ کو بڑی آسانی سے لے لے گا لیکن اُس نے جب محاصرہ کیا تو قلعے کی دیواروں پر ہزاروں انسانوں کا ہجوم نظر آنے لگا۔ اس ہجوم نے تیروں کا مینہ برسا دیا۔ سالار اور یزی اپنے لشکر کو پیچھے ہٹانے پر مجبور ہو گیا اور قلعہ توڑنے کے منصوبے سوچنے لگا۔ وہ اتنا جان گیا کہ یہ قلعہ آسانی سے نہیں لیا جاسکے گا اور محاصرہ طول کھینچے گا۔

مستند تاریخوں میں آیا ہے کہ حسن بن صباح کا انداز ایسا تھا جیسے اسے کوئی غم نہیں کہ کوئی قلعہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اُس نے اپنے خاص آدمیوں سے کہا کہ اپنے دشمن کے مذہبی اور معاشرتی سربراہوں کو ختم کر دو۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ اسے یہ توقع ذرا کم ہی تھی کہ اس کے فدائی ابو مسلم رازی اور وزیر اعظم عبدالرحمان سمیری جیسے اہم ترین سربراہوں کو اتنی آسانی سے قتل کر دیں گے۔ فدائیوں نے یہ کارنامہ کر دکھایا تو حسن بن صباح نے حکم دیا کہ یہی کام جاری رکھو اور دشمن کے کسی بھی حکمران کو اور کسی عالم دین کو زندہ نہ رہنے دو.... حسن بن صباح اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا لیکن وہ جب دشمن کا لفظ استعمال کرتا تھا تو اس سے اس کی مراد مسلمان ہی ہوتی تھی۔ وہ کسی کے قتل کا حکم دیتا تو اس انداز سے بولتا تھا جیسے اس کی زبان سے خدا بول رہا ہو۔ اس کے پیروکار مان گئے تھے کہ اُس پر وحی نازل ہوتی ہے اور اُسے ہر حکم خدا کی طرف سے ملتا ہے۔

ابو مسلم رازی، ابوالمنظف مجید فاضل اصفہانی اور عبدالرحمان سمیری کے قتل کے فوراً بعد جو اہم ترین شخصیتیں بائنیوں کے ہاتھوں قتل ہوئیں اگر داستان گو ہر قتل کو تفصیل سے بیان کرنے لگے تو یوں نظر آئے گا کہ جیسے ایک ہی واردات ایک ہی جیسے الفاظ میں دوہرائی جا رہی ہے۔ بائنیوں کا طریقہ قتل ایک ہی جیسا تھا۔ یہ وہی طریقہ تھا جس سے ابو مسلم رازی اور دوسرے سربراہوں کو قتل کیا گیا تھا۔ مشہور و معروف تاریخ نویس ابن جوزی نے لکھا کہ چند دنوں میں ہی حسن بن صباح کے فدائیوں نے حاکم دیار بقرامانک موذود کو قتل کیا اور اس کے فوراً بعد ابو جعفر، شاطبی رازی، ابو عبید مستوقی، ابوالقاسم کرخی اور ابوالفرح قرا، لیکن کو قتل کیا۔ کچھ دنوں کا وقفہ آیا اور پھر ابلیس کے فدائیوں نے قاضی کرمان، امیر ملک بک سرامر اصفہانی اور قاضی عبداللہ اصفہانی کو قتل کیا۔ قتل کی ہر واردات میں طریقہ قتل ایک ہی استعمال کیا گیا۔ وہ اس طرح کہ فدائی بھیس بدل کر کسی بہانے مقتول تک رسائی حاصل کرتا اور اچانک خنجر نکال کر اسے قتل کر دیتا۔

پیشتر اس کے کہ اُسے پکڑا جاتا وہ خود کشی کر لیتا۔

اس کے بعد باطنی فدائیوں نے ایک طریقہ اور اختیار کیا۔ دو مورخوں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح کے فدائیوں نے سلجوقی فوج کے سالاروں اور نائب سالاروں کو یوں وارننگ دی کہ ان کے گھروں میں رُقعے پھینک دیئے جن پر تحریر تھا کہ شیخ الجبل امام حسن بن صباح کی اطاعت قبول کر کے اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لو ورنہ تمہارا حشر وہی ہو گا جو پہلے کچھ حاکموں، امیروں اور علماء دین کا کیا جا چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی سالار یا ماتحت کماندار نے حسن بن صباح کی اطاعت قبول نہیں کرنی تھی۔ ان سب نے یہ تحریریں جو ان کے گھروں میں پھینکی گئی تھیں، سلطان برکیارق کو دکھائیں۔

”ان اہلیسیوں کی دھمکیوں کو کھوکھلے الفاظ نہ سمجھنا“ — سلطان برکیارق نے سالاروں سے کہا — ”ایک احتیاط یہ کرو کہ کوئی سالار اکیلا کہیں بھی نہ جائے، اس کے ساتھ تین چار محافظ ہونے چاہئیں۔ رات کو اپنے گھروں کے ارد گرد پہرے کھڑے کر دو۔ اپنے آپ کو کسی بھی وقت غیر مسلح نہ رکھو.... دو سرا طریقہ یہ ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم ان کے قلعوں پر قبضہ کریں گے۔ تم جانتے ہو کہ سالار اور یزی و سم کوہ گیا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے باغیوں کا جو قتل عام کروایا ہے، وہ کافی نہیں۔ یہ تحریریں جو تم سب تک پہنچائی گئی ہیں، ثبوت ہیں کہ باطنی یہاں موجود ہیں اور زمین کے نیچے نیچے پوری طرح سرگرم ہیں۔ میرے مخبر اپنا کام کر رہے ہیں، تم اپنے مخبروں کو سرگرم کر دو۔“

تاریخوں میں واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ تمام سالاروں، ان کے نائبین اور اہم قسم کے ماتحت کمانداروں نے اپنے آپ کو رات کے وقت بھی مسلح رکھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنے گھروں پر پہرہ قائم کر دیئے جو رات بھر مکانوں کے ارد گرد گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ سالاروں نے اپنے مخبر سارے شہر میں پھیلا دیئے تھے۔

پچھلے کسی باب میں ایک سپہ سالار ابو جعفر حجازی کا تفصیلی ذکر آیا ہے۔ مقتولین کی مندرجہ بالا فہرست میں بھی ایک ابو جعفر کا نام شامل ہے۔ یہ ابو جعفر کوئی عالم دین تھا اور حسن بن صباح کے خلاف عملی طور پر سرگرم رہتا تھا۔ ایک فدائی نے اس کا مرید بن کر اسے قتل کر دیا تھا۔ اب داستان گو جس ابو جعفر حجازی کا ذکر کر رہا ہے، یہ سلطان کی فوج کا یعنی سلطنت سلجوقیہ کے لشکر کا سپہ سالار تھا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وہ سلطان برکیارق

کا خوشامدی تھا اور اس کا ہر غلط حکم بھی بسر و چشم مانتا اور اس کی تعمیل کرتا تھا۔ سالار اور یزی کے ساتھ تو اس کی خاص دشمنی تھی اور اور یزی کو اُس نے گرفتار تک کر لیا تھا۔ یہ ساری تفصیل پہلے ابواب میں بیان ہو چکی ہے۔

سلطان برکیارق کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے روشنی دکھائی اور وہ راہ راست پر آگیا تو اس نے وہ اہمیت جو وہ کبھی سپہ سالار حجازی کو دیا کرتا تھا، سالار اور یزی کو دینی شروع کر دی تھی۔

”سلطان محترم!“ — ایک روز خانہ جنگی کے کچھ دن بعد سپہ سالار حجازی سلطان برکیارق کے ہاں گیا اور کہا — ”گستاخی کی معافی پہلے ہی مانگ لیتا ہوں، ایک بات جو دل میں کھٹک رہی ہے، وہ ضرور کہوں گا.... ایک وقت تھا کہ آپ چھوٹی سے چھوٹی بات سے لے کر سلطنت کے بڑے سے بڑے مسئلے کے بارے میں میرے ساتھ بات کرتے اور میرے مشورے طلب کیا کرتے تھے مگر میں اب وہ وقت دیکھ رہا ہوں کہ آپ نے مجھے بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے اور یوں پتہ چلتا ہے کہ سالار اور یزی نہ ہوا تو سلطنت سلجوقیہ کی بنیادیں ہل جائیں گی۔“

”محترم ابو جعفر!“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”آپ میرے والد مرحوم کے وقتوں کے سالار ہیں۔ میرے دل میں آپ کا درجہ روحانی باپ جیسا ہے۔ آپ کا شکوہ بجا ہے کہ میں اب آپ کو وہ قدر و منزلت نہیں دیتا جو کسی وقت دیا کرتا تھا۔ آپ نے دل کی بات کہی ہے اور صاف صاف کہی ہے اور یہ بات مجھے پسند ہے۔ ایسے ہی میں دل کی گہرائیوں سے بات نکالوں گا اور آپ سے کروں گا.... آپ جس وقت کی بات کرتے ہیں، اُس وقت میں گمراہ ہو گیا تھا یا گمراہ کر دیا گیا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ ایک حسین و جمیل اور پُرکشش لڑکی نے مجھ پر اپنے حسن و جوانی کا جادو اور حشیش کا نشہ طاری کر دیا تھا۔ اُس وقت آپ نے مجھے جھنجھوڑا نہیں، بیدار نہیں کیا بلکہ میری خوشامدی کی اور میرا ہر وہ حکم بھی بسر و چشم مانتا جو سلطنت کے مفاد کے خلاف تھا۔ اللہ نے مجھے اور میری روحانی قوتوں کو بیدار کر دیا تو مجھے پتہ چلا کہ یہ سیاہ اور وہ سفید ہے، یہ غلط اور وہ صحیح ہے اور اُس وقت مجھے پتہ چلا کہ مجھے گمراہ کئے رکھنے میں آپ کا بھی ہاتھ ہے۔ میرے دل میں اگر آپ کا احترام نہ ہوتا تو میں کبھی آپ کو جلاو کے حوالے کر چکا ہوتا۔ میں آپ سے توقع رکھوں گا کہ میرے دل میں آپ اپنا یہ احترام قائم رکھنے کی کوشش کریں گے۔ میں آپ

کو صرف ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں جو آپ فوراً سمجھ جائیں گے۔ وہ یہ ہے کہ دل میں خوشنودی اللہ کی رکھیں، اپنے حاکم کی یا اپنے سلطان کی نہیں۔ کیا آپ نے یہ حدیث مبارکہ نہیں سنی کہ بہترین جہاد جابر سلطان کے منہ پر کلمہ حق کہنا ہے، مگر آپ نے جابر سلطان کو خوش رکھنے کے جتن کئے اور اللہ کی ذات باری کو نظر انداز کئے رکھا۔۔۔ یہ گناہ تھا میرے بزرگوار!

”کیا آپ میرے بدلے ہوئے کردار کو قبول کریں گے؟“ — سپہ سالار ابو جعفر حجازی نے کہا۔ ”میں آپ کا یہ الزام تسلیم کرتا ہوں کہ میں دیکھ رہا تھا کہ آپ پر کون سا جادو چلایا جا رہا تھا لیکن یہ میری لغزش تھی یا گناہ تھا کہ میں نے آنکھیں بند کئے رکھیں اور آپ کی خوشامد میں لگا رہا، لیکن سلطان محترم! اس خانہ جنگی نے اور خون کے اس دریا نے جو ہم لوگوں نے ایک دوسرے کا بہلایا ہے، میری روح کو اسی طرح بیدار کر دیا ہے جس طرح آپ کی روح بیدار ہوئی ہے۔ مجھے موقع دیں، میں اب آپ کو نہیں اللہ کی ذات باری کو راضی کروں گا۔“

اس کے بعد سپہ سالار حجازی نے جیسے عہد کر لیا ہو کہ وہ کسی باطنی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ باطنیوں کا جو قتل عام کیا گیا تھا، اس میں سپہ سالار حجازی کا خاصا ہاتھ تھا۔ اس میں قومی جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔



ابو جعفر حجازی سپہ سالار تھا اور وہ جس مکان میں رہتا تھا وہ چھوٹا سا ایک محل تھا۔ وہاں دو تین نوکر تھے، ایک ملازمہ تھی اور دو یا تین سائیس تھے۔ حجازی نے بھی اپنی حفاظت کے انتظامات بڑے سخت کر دیئے تھے اور رات کے وقت دو چوکیدار اس کے مکان کے ارد گرد گشت کرتے رہتے تھے۔ اُس نے فوج کے تربیت یافتہ مجبروں کو سارے شہر میں پھیلا رکھا تھا اور انہیں سختی سے کہہ رکھا تھا کہ زمین کے نیچے سے بھی باطنیوں کو نکل کر لاؤ اور میرے سامنے کھڑے کر دو۔ اُس نے کئی ایک باطنیوں کو اپنے سامنے قتل کروایا تھا لیکن باطنی جو بچ گئے وہ زمین کے نیچے چلے گئے تھے۔ حجازی اب انہیں زمین کے نیچے سے نکالنے کے لئے سرگرم ہو گیا تھا۔

ایک روز اُس کا ایک مخبر اس کے پاس آیا اور بتایا کہ اس کے سائیسوں میں ایک سائیس مشکوک ہے۔ اس مخبر کو تین آدمیوں نے بتایا تھا کہ یہ سائیس باطنی معلوم ہوتا

ہے۔ ان آدمیوں نے اس کے متعلق کچھ اور باتیں بھی بتائی تھیں۔ وہاں یہ عالم تھا کہ زیادہ گہرائی سے تحقیقات کی ہی نہیں جاتی تھیں۔ بہت سے آدمی تو محض شک میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ سپہ سالار حجازی نے اپنے اس منبر سے کہا کہ وہ اس سائیس کے متعلق کچھ اور شہادت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے ساتھ ہی حجازی نے اپنے ذاتی اصطبل کے دو سائیسوں کو بلا کر کہا کہ وہ اس سائیس پر نظر رکھیں اور دیکھیں کہ وہ جب گھر جاتا ہے تو اس کے گھر کے اندر کیا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بھی معلوم کیا جائے کہ اس کے گھر کا ماحول کیسا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا سارا کنبہ باطنی ہو۔ یہ سائیس حجازی کا ذاتی سائیس تھا۔ اُس کے اصطبل میں چھ سات گھوڑے تھے جن میں ایک گھوڑا اسے بہت ہی پسند تھا اور وہ عموماً اس پر ہی سواری کیا کرتا تھا۔ وہ سائیس اس گھوڑے پر مقرر تھا اور اس پر حجازی کو پورا پورا بھروسہ تھا۔ وہ تجربہ کار سائیس تھا۔ اس سائیس کا باطنی ہونا کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ وہاں تو کوئی بھی شخص باطنی ہو سکتا تھا۔ حسن بن صباح کا طلسم دُور دُور تک اور کونوں کھدروں تک بھی پہنچ گیا تھا۔

حجازی اصطبل میں اتنا زیادہ نہیں جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی جا نکلتا اور گھوڑوں کو دیکھ کر واپس آ جاتا تھا۔ اُس نے اپنی حفاظت کا انتہائی انتظام کر رکھا تھا کہ وہ اصطبل تک جاتا تو بھی اُس کے ساتھ دو محافظ ہوتے تھے۔ باہر نکلتا تو کئی محافظ اس کے آگے پیچھے دائیں اور بائیں اس کے ساتھ چلتے تھے۔ کوئی اجنبی اس کے قریب نہیں آ سکتا تھا۔ اسے قتل کرنا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ ان حالات میں جب اسے یہ اطلاع دی گئی کہ اس کا ذاتی سائیس باطنی ہے اور وہ کسی بھی وقت وار کر سکتا ہے، وہ چوکس ہو گیا۔ اس نے اپنی حفاظت کے جو انتظامات کئے تھے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ گھر کا کوئی ملازم اور سائیس اپنے پاس کوئی ہتھیار نہیں رکھ سکتا بلکہ چھوٹا سا ایک چاقو بھی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

سائیس جب صبح اصطبل میں آتے تھے تو پہنے ہوئے کپڑے اتار کر کام والے کپڑے پہن لیا کرتے تھے۔ ایک روز سپہ سالار حجازی تیار ہو کر باہر نکلا ہی تھا کہ ایک آدمی دوڑا آیا۔ وہ اس کے گھر کا ہی ایک خاص ملازم تھا بلکہ معتمد خاص تھا۔ اس نے حجازی کو بتایا کہ اس کا ذاتی سائیس آج پکڑا گیا ہے۔ بتایا یہ گیا کہ وہ اپنے کپڑے اتار کر

الگ رکھ رہا تھا تو ایک سائیس نے اس کے کپڑوں میں خنجر دیکھ لیا۔

”محترم سپہ سالار!“ — اس معتمد ملازم نے کہا — ”اسے ابھی پتہ نہیں چلنے دیا گیا کہ اس کا خنجر دیکھ لیا گیا ہے۔ آپ خود چل کر دیکھیں۔“

سپہ سالار ابو جعفر حجازی اُسی وقت ملازم کے ساتھ چل پڑا۔ اصطبل میں جا کر اس نے اپنے سائیس کو بلایا اور اسے کہا کہ اپنا خنجر اس کے حوالے کر دے۔

”خنجر؟“ — سائیس نے حیرت زدگی کی کیفیت میں پوچھا — ”محترم سپہ سالار! کون سا خنجر؟ کیسا خنجر؟“

”وہ خنجر جو تم نے اپنے کپڑوں میں چھپا رکھا ہے“ — حجازی نے کہا — ”خود ہی وہ خنجر لے آؤ۔“

”میں آپ کا بڑا ہی پرانا خادم ہوں سپہ سالار!“ — سائیس نے کہا — ”آپ کا حکم ہے کہ کوئی سائیس یا دوسرا ملازم اپنے پاس کوئی ہتھیار نہیں رکھ سکتا۔ مجھے اپنے پاس خنجر رکھنے کی کیا ضرورت تھی.... اگر آپ کو شک ہے تو میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ میرے کپڑے کہاں رکھے ہیں، خود چل کر دیکھ لیں۔“

سپہ سالار حجازی اُس کے ساتھ چل پڑا۔ سائیس نے اپنے کپڑے اُس کمرے میں رکھے ہوئے تھے جہاں باقی سائیس اپنے کپڑے اتار کر رکھتے اور کام والے کپڑے پہنتے تھے۔ سائیس نے اپنے کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ اس کے کپڑے پڑے ہیں، دیکھ لئے جائیں۔

حجازی خود گیا اور اس کے کپڑے اٹھائے تو ان میں سے ایک خنجر نکلا۔ حجازی نے خنجر نیام سے نکل کر دیکھا۔ اُس نے حسن بن صباح کے فدائین کے خنجر دیکھے تھے۔ غالباً ان پر کوئی نشان ہوتا ہو گا جو حجازی نے دیکھ لیا۔ اس سے اسے یقین ہو گیا کہ اُس کا سائیس باطنی ہے اور آج وہ اسے قتل کرنے کے لئے خنجر لایا تھا۔

سائیس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا کہ یہ خنجر اس کا نہیں نہ وہ اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کسی دشمن نے یہ خنجر اس کے کپڑوں میں رکھ دیا ہے۔

”یہاں تمہارا دشمن کون ہو سکتا ہے؟“ — حجازی کے ایک محافظ نے اس سے پوچھا — ”کیا تم اپنا کوئی دشمن دکھا سکتے ہو؟“

سائیس نے اب رونا شروع کر دیا تھا اور وہ حجازی کے قدموں میں گر پڑا اور اُس

کے پیروں پر ہاتھ مار گڑنے لگا۔ وہ رو رو کر کہتا تھا کہ یہ خنجر اُس کا نہیں لیکن حجازی اسے بخشے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

حجازی نے خنجر اپنے ایک محافظ کو دیا اور اشارہ کیا۔ محافظ اشارہ سمجھ گیا۔ وہ سائیس کی طرف بڑھا۔ سائیس کے چہرے پر خوف و ہراس کے تاثرات نمودار ہوئے اور اُس کی آنکھیں اور زیادہ کھل گئیں۔ محافظ نے دو تین قدم تیزی سے اٹھائے اور یکے بعد دیگرے سائیس کے سینے میں خنجر کے دو وار کئے۔ سائیس گرا اور ذرا سی دیر بعد اس کی آنکھیں پتھر اگئیں۔ حجازی نے کہا کہ اس کی لاش شہر سے دور جنگل میں پھینک دی جائے۔

دو دن گزرے ہوں گے کہ سپہ سالار حجازی کو اطلاع دی گئی کہ ایک آدمی اسے ملنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ تجربہ کار سائیس ہے اور کچھ عرصہ فوج میں گھوڑ سوار کی حیثیت سے ملازمت بھی کر چکا ہے۔ حجازی کو ایک سائیس کی ضرورت تھی اس لئے اُس نے اس آدمی کو بلا لیا۔ محافظوں نے اس آدمی کی جامہ تلاشی اچھی طرح کی اور حجازی کے پاس لے گئے۔ حجازی نے اُس سے پوچھا کہ وہ کتنا کچھ تجربہ رکھتا ہے۔

اس شخص نے حجازی کو بتایا کہ وہ فوج میں گھوڑ سوار کی حیثیت سے ملازمت کر چکا ہے اور اُس نے دو لڑائیاں بھی لڑی تھیں۔ اُس نے اپنے جسم پر تلواریں کے زخموں کے دو نشان دکھائے اور کہا کہ ان زخموں کی وجہ سے وہ فوج کے قاتل نہیں رہا تھا لیکن سائیس کا کام خوش اسلوبی سے کر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ اُس شخص نے حجازی کو قاتل اور متاثر کر لیا اور حجازی نے حکم دے دیا کہ اسے اصطبل میں رکھ لیا جائے۔

اس نئے سائیس نے اتنا اچھا روٹیہ اختیار کیا کہ اصطبل کے دوسرے سائیس اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ وہ خوش طبع، خوش اخلاق اور حلیم قسم کا آدمی تھا۔ ہر کسی کے ساتھ پیار سے بات کرتا تھا اور اپنے کام میں تو وہ بہت ہی ماہر تھا۔

دو تین دنوں بعد سپہ سالار حجازی اصطبل میں گھوڑے دیکھنے کے لئے گیا۔ اُس نے اپنا وہ گھوڑا دیکھا جو اس کا منظور نظر تھا۔ سائیس نے اس گھوڑے کی دیکھ بھال بڑی محنت سے کی تھی۔ حجازی نے اس گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ نیا سائیس اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور اس گھوڑے کی صفات بیان کرنے لگا۔ اچانک سائیس نے اپنے کپڑوں کے اندر سے خنجر نکالا اور پتھر اس کے کہ حجازی کے دونوں محافظ اُس تک پہنچتے اُس کا

خنجر حجازی کے دل میں اتر چکا تھا۔

سائیس محافظوں سے بچنے کے لئے دوڑ کر گھوڑے کی دوسری طرف ہو گیا اور خون آلود خنجر اپنے دل میں اتار لیا۔ تب پتہ چلا کہ یہ تو باطنی تھا۔

مروہ شہر کا وہی مکان تھا جس میں وہ درویش داخل ہوا تھا جس نے سالار اور یزیدی کو قرآن مجید کھول کر ایک آیت پڑھائی اور کہا تھا کہ یہ یاد رکھنا اور اس کا ورد کرتے ہوئے جانا، فتح تمہاری ہوگی۔ اس مکان کے اندر وہی درویش اپنے تین چار ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ باہر والا دروازہ بڑی زور سے کھلا اور اُن کا ایک ساتھی دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

”لو بھائیو!“ — اس آدمی نے کہا — ”کام ہو گیا ہے۔ ہمارے فدائی نے سپہ سالار ابو جعفر حجازی کو قتل کر کے اپنے آپ کو بھی مار لیا ہے۔“

پہلے سائیس کو مروانے والے باطنی ہی تھے۔ اس سائیس کے کپڑوں میں خنجر باغیوں نے ہی رکھوایا تھا اور پھر دوسرا سائیس صرف باطنی ہی نہیں بلکہ فدائی تھا۔

یہ ایک ہی واقعہ نہیں بلکہ تاریخوں میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں۔ مروہ کے معاشرے میں کئی سرکردہ افراد تھے جو باغیوں کے خلاف سرگرم ہو گئے تھے۔ انہیں قتل کرنا ضروری تھا لیکن ان سب نے اپنی حفاظت کے انتظامات کر لئے تھے اور وہ جہاں بھی جاتے ان کے ساتھ محافظ ہوتے تھے۔ اس صورت حال میں انہیں قتل کرنا آسان نہیں تھا۔ ان کے قتل کا یہی طریقہ اختیار کیا گیا جو حجازی کو قتل کرنے کے لئے آزمایا گیا تھا۔ کوئی فدائی کسی سرکردہ آدمی کے ہاں مظلوم اور غریب بن کر ملازمت حاصل کر لیتا اور موقع پا کر اپنے شکار کو قتل کر دیتا تھا۔ وہی علاقوں میں قبیلوں کے سردار تھے جو حسن بن صباح کی اطاعت قبول نہیں کرتے تھے نہ اپنے قبیلے کے کسی شخص کو ایسی اجازت دیتے تھے۔ کسی پر شک ہو جاتا کہ اس کا ذہنی رجحان باغیوں کی طرف ہو رہا ہے تو قبیلے کا سردار اسے قتل کروا دیتا تھا۔ ان سرداروں نے بھی اپنے ساتھ محافظ رکھے لئے تھے۔ انہیں قتل کرنے کا بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔



پہلے ذکر آچکا ہے کہ حسن بن صباح اصفہان کو اپنا مرکز بنانا چاہتا تھا۔ تاریخوں کے مطابق اس نے اپنے بے شمار فدائی اور دیگر پیروکار اصفہان بھیج دیئے تھے۔ حسن بن

صبح نے اصفہان میں مسلمانوں کو قتل کرنے کا ایک اور طریقہ اپنے فدائین کو بتایا۔ مَرُو میں اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک مسلمان قتل ہوتا تھا تو اس کے بدلے تین یا بیسوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ حسن بن صباح نے اپنے فدائین کو یوں سمجھایا کہ وہ ایک ایک دو دو مسلمانوں کو ایسے قتل کریں کہ ان کی لاشیں نہ ملیں اور پتہ ہی نہ چلے کہ وہ قتل ہو گئے ہیں۔

اصفہان کے ایک حصے میں مکان بہت ہی پرانے تھے جن میں کافی لوگ رہتے تھے۔ گلیاں تنگ تھیں اور مکانوں کی دیواریں اور چھتیں بوسیدہ ہو گئی تھیں۔ ایک گلی کے سرے پر ایک اندھا کھڑا نظر آنے لگا۔ وہ اپنے قریب سے گزرتے کسی آدمی کی آہٹ پا سکتا تو اُسے روک لیتا اور کہتا کہ اللہ کے نام پر اسے اس گلی میں ایک جگہ تک پہنچا دے۔ وہ آدمی اسے اندھا سمجھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا اور آگے آگے چل پڑتا۔ اندھا اسے کہتا کہ آگے ایک گلی دائیں کو مڑتی ہے، اسے اس گلی کے ایک مکان تک پہنچا دیں۔

یوں وہ شخص اس اندھے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس گلی کے وسط تک جاتا، ایک مکان سے دو تین آدمی نکلتے اور اس آدمی کو پکڑ کر مکان کے اندر لے جاتے اور اس کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر ڈالتے۔ وہ شخص اندھا نہیں ہوتا تھا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے آدمیوں کو دیکھ سکتا تھا اور پہچان لیتا کہ یہ باطنی نہیں مسلمان ہے۔ اس طرح ایک آدمی کو مروا کر وہ کہیں اور چلا جاتا اور اسی طرح کسی اور آدمی کو اپنا ہاتھ پکڑا کر اس کے پیچھے چل پڑتا۔ اس کے بعد وہ آدمی کسی کو نظر نہ آتا۔

ایک مہینے میں بے شمار مسلمان لاپتہ ہو گئے اور شہر بھر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ کسی گھر کا کوئی آدمی شام تک واپس گھر نہیں پہنچتا تھا تو وہاں صفِ ماتم بچھ جاتی تھی۔ اس کے گھر والے یہ سمجھ لیتے کہ وہ غائب ہو گیا ہے لیکن اس سوال کا جواب کہیں سے نہیں مل رہا تھا کہ یہ اتنے زیادہ آدمی کہاں لاپتہ ہو گئے ہیں۔ اُس زمانے میں بھی روحانی عامل، قیافہ شناس اور نجومی موجود تھے۔ لوگ ان سے پوچھتے تھے کہ وہ اپنے علم کے ذریعے معلوم کریں کہ کیا ان لوگوں کو جنت اٹھا کر لے گئے ہیں یا وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ روحانی عاملوں کو کچھ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ صرف ایک عامل نے بتایا کہ جتنے آدمی لاپتہ ہو چکے ہیں، ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں لیکن وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکا کہ وہ آدمی موت تک کس طرح پہنچے اور موت کی آغوش میں انہیں

کون لے گیا تھا۔

ایک روز ایک اندھا ایسے ہی ایک آدمی کو روک کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ آدمی بھی اس دھوکے میں آ گیا تھا کہ یہ اندھا بے چارہ مجبور ہے اس لئے اسے اس کے ٹھکانے تک پہنچانا کارِ ثواب ہے۔ اس کے بعد یہ آدمی کسی کو نظر نہیں آیا لیکن ایک بات یوں ہوئی کہ ایک آدمی نے اسے اس اندھے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ایک گلی کے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس نے کئی لوگوں کو بتایا کہ تم ہونے والے شخص کو ایک اندھا اپنی راہنمائی کے لئے ایک گلی کے اندر لے گیا تھا۔

اُسی روز یا اگلے روز اس آدمی نے جس نے اُس بد قسمت آدمی کو اندھے کے ساتھ دیکھا تھا، تین چار آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا اور انہیں ایک جگہ چھپا کر اکیلا آگے گیا اور اندھے کے قریب سے گزرا۔ اندھے نے اسے روک لیا اور کہا کہ وہ اس گلی میں جانا چاہتا ہے لیکن وہ خود راستہ نہیں دیکھ سکتا، اللہ کے نام پر اسے اس کے گھر تک پہنچادیا جائے۔ اس شخص نے اس کا بازو پکڑ لیا اور گلی میں داخل ہو گیا۔ اُس کے جو ساتھی پیچھے چھپے ہوئے تھے وہ دیکھ رہے تھے۔ جب اندھا اس آدمی کے ساتھ گلی کے اندر چلا گیا تو یہ سب آدمی اس گلی تک آ گئے اور گلی میں اُس وقت داخل ہوئے جب اندھا اس آدمی کو یہ کہہ رہا تھا کہ دائیں طرف والی گلی میں جانا ہے۔ وہ شخص اُسے اس گلی میں لے گیا۔

اس شخص کے ساتھی دبے پاؤں وہاں تک پہنچ گئے جہاں سے گلی دائیں کو مڑتی تھی۔ جب اندھا اس مکان تک پہنچا تو رک گیا۔ اندر سے تین آدمی نکلے اور اس شخص کو پکڑ لیا۔ اس کے چھپے ہوئے ساتھی تلواریں نکال کر دوڑتے ہوئے پہنچے اور ان آدمیوں کو تلواروں پر رکھ لیا۔ وہ سب اندر کو بھاگ رہے تھے لیکن وہ تینوں اور اندھا بھی تلواروں سے کٹ مرے۔ مکان کے اندر گئے تو صحن میں ایک جگہ لکڑی کے تختے رکھے ہوئے تھے اور ان پر کچھ سلمان پڑا ہوا تھا۔

وہ بہت ہی پرانے زمانے کا مکان تھا۔ اندر اس قدر بدبو تھی کہ ٹھہرا نہیں جاسکتا تھا لیکن یہ بدبو بتا رہی تھی کہ اس مکان میں مُردار گل سڑ رہے ہیں یا انسانوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ مکان بالکل خالی تھا۔ کمروں میں دیکھا گیا لیکن کچھ سراغ نہ ملا۔ ایک آدمی کے کہنے پر لکڑی کے تختے ہٹائے گئے تو دیکھا کہ ان کے نیچے ایک گہرا گڑھا کھدایا ہوا تھا جس میں بے انداز لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اوپر والی لاشیں تازہ لگتی تھیں اور بدبو سے پتہ چلتا تھا

کہ ان کے نیچے لاشیں گل سڑ رہی ہیں اور مکان میں ان کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک تو یہ طریقہ تھا کہ اس سے نہ جانے کتنے مسلمانوں کو غائب کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے کچھ کی لاشیں اس گڑھے سے ملیں اور کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ کتنے مکانوں میں ایسے اور گڑھے ہوں گے جن میں لاپتہ ہونے والے مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوں گی۔ مسلمانوں کے غائب ہونے کا سلسلہ رُکا نہیں بلکہ چلتا رہا۔ کچھ سراغ نہیں ملتا تھا کہ وہ کہاں غائب کئے جا رہے ہیں۔ مسلمان اتنے بھڑکے ہوئے تھے کہ شہر میں انہیں کوئی تابینا نظر آتا تھا تو اسے قتل کر دیتے تھے۔ پھر بھی مسلمان غائب ہوتے رہے۔ ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا گیا جس کا سراغ مل گیا۔ سراغ یوں ملا کہ ایک آدمی علی الصبح فجر کی اذان سن کر مسجد کو جا رہا تھا تو اسے یوں نظر آیا جیسے دو تین آدمی کسی آدمی کو گھسیٹ کر ایک مکان کے اندر لے جا رہے ہوں۔ وہ نہتہ تھا اس لئے اس نے اس آدمی کو چھڑانے کی کوشش نہ کی، اس کی بجائے اس نے یہ کارروائی کی کہ مسجد میں جب نمازی اکٹھے ہوئے تو اس نے نمازیوں کو بتایا کہ ایک مکان پر اسے شک ہے اور اُس نے جو دیکھا تھا وہ انہیں بتایا۔ نماز کے بعد یہ خبر مسلمانوں کے محلوں میں پھیل گئی اور ایک ہجوم اس مکان کے سامنے اکٹھا ہو گیا۔

اس ہجوم میں زیادہ تر آدمی تلواروں سے مسلح تھے۔ دروازے پر دستک دی گئی لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ آخر یہ لوگ اندر چلے گئے۔ یہ قدیم وقتوں کی حویلی تھی جو غیر آباد نظر آتی تھی۔ اس کے تمام کمروں میں جا کر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا اور یوں لگتا تھا جیسے یہ مکان ایک مدت سے غیر آباد ہے۔ وہاں بھی بدبو تھی جو صاف پتہ چلتا تھا کہ انسانی لاش یا لاشوں کی ہے۔

”ادھر آؤ“ — ایک آدمی نے بلند آواز سے کہا — ”اس کنوئیں میں دیکھو“۔ حویلی کا صحن خاصا کشادہ تھا اور اس کے ایک کونے میں کنوئیاں تھیں۔ کنوئیں میں جھک کر دیکھا تو آدھا کنوئیاں لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ اوپر سے دو تین لاشیں نکالی گئیں۔ یہ ابھی خراب نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں ایک لاش کا خون بالکل تازہ تھا۔ یہ وہی آدمی ہو گا جسے اس شخص نے دیکھا تھا کہ گھسیٹ کر اندر لے جا رہے ہیں۔ ان چند ایک لاشوں کے بعد کوئی اور لاش نہ نکالی گئی کیونکہ دانشمند بزرگوں نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ نیچے لاشوں کی حالت بہت ہی بُری معلوم ہوتی ہے، نہ ہی نکالی جائیں تو بہتر ہے ورنہ ان کے پسماندگان

کے دلوں کو بہت ہی صدمہ پہنچے گا۔ چنانچہ اس کنوئیں کو مٹی سے بھر دیا گیا۔ یہ تو بتایا ہی نہیں جاسکتا تھا کہ اس کنوئیں میں کتنے سولاشیں پڑی ہوئی ہیں۔



اس دوران بائنیوں نے جن اہم شخصیتوں کو قتل کیا ان کے نام یہ ہیں — امیر اسد ملک شہابی، امیر بخش اور امیر سیاہ پوش۔ یہ تینوں مختلف علاقوں کے امیر تھے اور انہوں نے حسن بن صباح کے خلاف اپنا اپنا محاذ قائم کر رکھا تھا۔ امیر سیاہ پوش ہمیشہ کالے رنگ کے کپڑے پہنتا اور دن رات کا زیادہ تر وقت عبادت اور تلاوت قرآن میں گزارتا تھا۔ بائنیوں کو قتل تو کیا جا رہا تھا لیکن امیر سیاہ پوش پہلا امیر اور عالم دین تھا جس نے باقاعدہ فتویٰ دیا تھا کہ حسن بن صباح اور اس کے پیروکاروں کا قتل گناہ نہیں بلکہ کارِ ثواب ہے۔ اس کے بعد حسن بن صباح کے حکم سے چند اور شخصیتوں کو قتل کیا گیا۔ ان میں امیر یوسف کے معتمد خاص طغرل بک، امیر ارعش اور بادی علی گیلانی خاص طور پر شامل ہیں۔ پھر انہوں نے سترقہ والی دہستان اور سکندر صوفی قروینی کو بھی قتل کر دیا۔

مندرجہ بالا مقتولین میں ایک خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ وہ سلطان ملک شاہ مرحوم کا غلام ہوا کرتا تھا۔ ملک شاہ نے جب حسن بن صباح اور اس کے فرقے کے خلاف انسدادی مہم شروع کی تھی تو اس غلام نے کسی کے حکم کے بغیر ہی اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بہت سے بائنیوں کو قتل کیا تھا اور ایسے طریقے وضع کئے کہ بائنیوں کے لئے کم از کم مڑ میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ سلطان ملک شاہ مرحوم نے دیکھا کہ اس شخص کو اس نے غلام بنا رکھا ہے لیکن اس میں عقل و دانش خصوصی طور پر قابلِ تعریف ہے۔ ملک شاہ نے اسے چھوٹے سے ایک علاقے کا امیر بنا دیا۔ اس نے اپنے علاقے میں کسی باطنی کو زندہ نہ چھوڑا اور اپنا سارا علاقہ ان اہلیسوں سے پاک کر دیا لیکن حسن بن صباح نے اس کے قتل کا خصوصی حکم دیا اور ایک فدائی نے اسے ایک مسجد میں دھوکے میں قتل کر دیا اور خود کشی کر لی۔

اصفہان میں ایک مشہور و معروف عالم دین تھے جن کا نام شیخ مسعود بن محمد نجندی فقیر شافعی تھا۔ اس کے پیروکاروں کا حلقہ بہت دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کا وعظ اور خطبہ سننے کے لئے لوگ اکثر دور کا سفر کر کے آیا کرتے تھے۔ اس عالم دین اور فقیر نے جب دیکھا کہ باطنی علماء کو قتل کر رہے ہیں تو اس نے ایک خطبے میں انتقامی وار کا اعلان کر

دیا۔ یہ دو سرا عالم دین تھا جس نے خطبے میں یہ فتویٰ دیا کہ حسن بن صباح اور اس کے پیروکاروں کا قتل ہر مسلمان پر فرض ہے اور اگر کوئی مسلمان اس فرض کی ادائیگی میں پس و پیش کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابلیس کی جان کا محافظ ہے۔ یہ گناہ کبیرا ہے۔ اس عالم دین نے یہ استقامت کا رویہ اختیار کیا کہ شہر کے باہر چار پانچ جگہوں پر کشتیوں اور گھرے گڑھے کھدوائے۔ ان سب میں لکڑیاں پھینک کر آگ لگا دی اور یہ آگ ہر وقت جلتی رہتی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں شیخ مسعود بخندی کا احترام بلکہ عقیدت اس قدر زیادہ تھی کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو لوگ برحق سمجھتے اور اس کے کہے ہوئے ہر لفظ کو حکم کا درجہ دیتے تھے۔ لوگوں نے اپنے کام کاج چھوڑ کر یہ گڑھے کھودے اور لکڑیاں کاٹ کاٹ کر لائے اور ان گڑھوں میں پھینکیں اور آگ لگائی۔

اگلا کام یہ تھا کہ شہر میں مخبر اور جاسوس پھیلا دیئے گئے جو باطنیوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ اصفہان میں باطنی کوئی تھوڑی تعداد میں نہیں تھے۔ ایک مؤرخ نے تو لکھا ہے کہ اصفہان کی تقریباً ”آدھی آبادی باطنیوں کی تھی۔ مسلمانوں کو جہاں پتہ چلتا کہ یہاں باطنی رہتا ہے، وہاں جاہلہ بولتے اور باطنی ایک ہاتھ آجائے، دو آجائیں یا اس سے زیادہ پکڑے جائیں، ان سب کو گھسیٹتے دھکیلتے آگ کے کسی قریبی گڑھے تک لے جاتے اور انہیں زندہ آگ میں پھینک دیتے۔ شیخ مسعود بخندی نے شہر کا قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس کے حکم سے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی کیونکہ باطنی بھاگ رہے تھے۔ مسلمانوں نے کسی باطنی کو بھاگنے نہ دیا۔ کوئی بھی بھاگنے کی کوشش کرتا اُسے پکڑ کر آگ میں پھینک دیتے تھے۔ اُس کا بھاگنا ہی ایک ثبوت ہوتا تھا کہ وہ باطنی ہے۔

شیخ مسعود بخندی کو کوئی سرکاری حیثیت حاصل نہیں تھی اس لئے اسے سرکاری طور پر محافظ نہیں دیئے گئے تھے لیکن مرید از خود ہی اس کے محافظ بن گئے تھے۔ مسجد میں جب وہ وعظ کر رہا ہوتا یا امامت، اس کے پیچھے چھ سات آدمی محافظ ہوتے تھے۔

حسن بن صباح نے جب دیکھا کہ اصفہان میں اس کے فرقے اور فداویوں کا صفایا ہو رہا ہے تو اُس نے حکم دیا کہ عراق کی طرف توجہ دی جائے اور عراق کے دار الخلافہ بغداد کو اپنا مرکز بنانے کی پوری کوشش کی جائے۔ اس حکم میں یہ خاص طور پر شامل تھا کہ وہاں بھی سب سے پہلے علمائے دین کو قتل کی جائے۔

بغداد میں بھی ایک مشہور عالم دین تھا جسے روحانی پیشوا کا درجہ حاصل تھا۔ اس کا نام

امام شیخ الشافعیہ ابو لفرج رازی روایتی تھا۔ اسے صاحب البحر کا خطاب دیا گیا تھا۔ وہ اپنے نام کے ساتھ صاحب البحر کہنے کی بجائے اہل سنت لکھا کرتا تھا۔ اسے شہرت اور مقبولیت میں شیخ مسعود بن محمد بخندی سے زیادہ اونچی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی مریدی اور عقیدہ تہندی کا حلقہ بھی بہت ہی وسیع تھا۔

اصفہان کی طرح عراق میں بھی مسلمان اس طرح قتل ہونے لگے کہ قاتل کا سراغ نہیں ملتا تھا نہ قتل کی وجہ معلوم ہوتی تھی۔ یہ قتل عام نہیں تھا بلکہ اکا دکا مسلمان قتل ہو جاتا یا لاپتہ ہو جاتا تھا۔ یہ خبریں بغداد تک پہنچیں تو فوج کے کچھ دستوں کو مختلف علاقوں میں بھیج دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی سرکاری مخبروں اور جاسوسوں کو حکم دیا گیا کہ وہ قتل کی ان وارداتوں کا سراغ لگائیں۔ اصفہان میں باغیوں نے جو خون خرابہ کیا تھا، اس کی خبریں بغداد میں بھی پہنچی تھیں۔ آخر وہاں کے حکمران کو یقین کرنا پڑا کہ یہ باغی ہیں جو مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں۔ یہ خبر بغداد کے مسلمانوں کے گھروں تک پہنچ گئی اور اس طرح لوگ چوکنے ہو گئے۔

امام شیخ الشافعیہ نے جامعہ مسجد میں اپنے ایک خطبے میں لوگوں سے کہا کہ صرف چو کس اور چو کنا ہو جانا کافی نہیں۔ ان باغیوں کا سراغ لگاؤ اور جہاں کہیں کوئی باغی نظر آتا ہے اُسے کسی حکم کے بغیر اور قانون سے ڈرے بغیر قتل کر دو۔ لوگوں کے لئے اپنے امام کے یہ الفاظ ایسے تھے جیسے یہ اللہ کا حکم اُترا ہو۔ انہوں نے باغیوں کا سراغ لگا کر انہیں قتل کرنا شروع کر دیا۔ امام شیخ الشافعیہ کے چند ایک معتقد اُس کے محافظ بن گئے اور وہ جدھر بھی جاتا، یہ محافظ اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ مسجد میں جب وہ امانت کے لئے کھڑا ہوتا تو اس کے پیچھے اس کے سات آٹھ محافظ کھڑے ہوتے اور پہلی صف کے دوسرے نمازی ان محافظوں کے دائیں بائیں کھڑے ہوتے تھے۔ کسی اور کو اجازت نہیں تھی کہ وہ پہلی صف میں امام کے پیچھے کھڑا ہو کر نماز پڑھے۔

جمعہ کا مبارک دن تھا۔ امام شیخ الشافعیہ نے خطبہ شروع کیا۔ باہر مسجد کے دروازے پر کسی نمازی نے بڑی ہی بلند اور پرجوش آواز میں اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ تمام نمازیوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور امام شیخ الشافعیہ نے اپنا خطبہ روک لیا۔ سب نے دیکھا کہ ایک آدمی مسجد میں نعرہ لگا کر داخل ہوا ہے اور اس کے کپڑوں پر خون لگا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔

”میں امام شیخ الشافعیہ کے حکم سے ابھی ابھی تین اہلیوں کو قتل کر کے آ رہا ہوں“
 — وہ نمازیوں کے اوپر سے گزرتا اگلی صف کی طرف بڑھا جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا — ”یا
 امام! گواہ رہتا میں نے آج بہت بڑا ثواب کمایا ہے۔“

”میرے اہل سنت بھائیو!“ — اُس نے خنجر والا ہاتھ بلند کر کے نمازیوں سے
 مخاطب ہو کر کہا — ”میں نے اپنے اللہ کی خوشنودی کے لئے اپنے امام کے حکم کی تعمیل
 کی ہے۔ میں تم سب کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور ان
 کی ماں ہے۔ میری زندگی دو چار دن کی رہ گئی ہے کیونکہ باطنی اپنے ساتھیوں کے خون کا
 بدلہ ضرور لیں گے اور مجھے قتل کر دیں گے۔ میں اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو تم سب کے
 سپرد کرتا ہوں۔ ان کی روزی اور باعزت زندگی کی ذمہ داری تمہیں سونپتا ہوں۔“

نمازیوں نے جزاک اللہ جزاک اللہ کا بڑا ہی بلند و درود شروع کر دیا اور اس شخص کو
 خراج تحسین پیش کرنے لگے۔ کئی آوازیں اٹھیں کہ تمہارے بچوں کی روزی کے ذمہ
 دار ہم ہیں۔ امام شیخ الشافعیہ منبر سے اتر آیا اور اس آدمی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔

”ہر ذی روح کی روزی کا ذمہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔“
 امام نے بلند آواز سے کہا — ”یہ ضروری نہیں کہ تم قتل ہو جاؤ گے، اگر ایسا ہو بھی گیا تو
 اللہ تعالیٰ تمہارے بچوں اور تمہاری بیوی کو اس کا پورا پورا اجر دیں گے۔۔۔۔۔ یہ کپڑے
 تبدیل کر کے اور غسل کر کے آؤ۔ یہ باطنیوں کا خون ہے جو خنزیر کے خون کی طرح نجس
 اور ناپاک ہے۔“

ابھی امام شیخ الشافعیہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ اس شخص نے اس کی طرف گھوم کر
 خنجر امام کے سینے میں اتار دیا اور بڑی تیزی سے دو مرتبہ خنجر امام کے سینے میں مارا۔ امام
 کے محافظ جو اگلی صف میں بیٹھے تھے بڑی تیزی سے اٹھے۔ امام گر پڑا۔ محافظ اسے
 سنبھالنے لگے تو قاتل منبر کے اوپر جا کھڑا ہوا اور اپنا خنجر ہوا میں بلند کر کے زور سے نیچے کو
 کھینچا اور اپنے دل میں اتار لیا۔

”یا امام شیخ الجبل!“ — اس نے خنجر اپنے سینے سے نکال کر کہا — ”تیرے حکم کی
 تعمیل کر کے تیری جنت سے اللہ کی جنت میں جا رہا ہوں۔“ — اُس نے ایک بار پھر خنجر
 اپنے سینے میں دل کے مقام پر مارا پھر خنجر وہیں رہنے دیا اور ہاتھ آسمان کی طرف کر
 دیئے۔ وہ منبر سے گر اور فرش پر آن پڑا۔

امام شیخ الشافعیہ مرچکا تھا کیونکہ خنجر اُس کے دل میں اُتر گیا تھا۔ محافظوں نے خنجروں اور تلواروں سے قاتل کے جسم کا قیمہ کر دیا لیکن وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ اُس کے کپڑوں پر اور خنجر پر کسی انسان کا خون نہیں تھا بلکہ یہ گہرا لال رنگ تھا۔ اس نے ایسا دھوکہ دیا تھا جسے کوئی بھی قبل از وقت سمجھ نہ سکا۔

اصفہان کے حاکم اور لوگ مطمئن ہو گئے تھے کہ انہوں نے اپنے شہر کو باغیوں سے پاک کر دیا ہے لیکن ایک روز وہاں کے ایک اور عالم دین قاضی ابو العلاء صاعد بن ابو محمد نیشاپوری جامعہ مسجد میں امامت کرانے کے لئے گئے۔ وہ بھی جمعہ کا مبارک دن تھا اور قاضی ابو العلاء خطبے کے لئے منبر پر کھڑے ہوئے بالکل ایسے ہی جیسے بغداد میں ہوا تھا، ایک آدمی نے مسجد میں داخل ہو کر نعرہ لگایا اور کہا کہ وہ چار باغیوں کو قتل کر کے آیا ہے۔ اُس کے بھی کپڑوں پر خون تھا اور اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ اُس نے بالکل ویسا ہی ٹانگ کھیلا اور قاضی ابو العلاء تک پہنچ گیا اور نمازیوں سے مخاطب ہو کر ویسے ہی الفاظ کہے جو امام شیخ الشافعیہ کے قاتل نے کہے تھے اور اس کے فوراً بعد قاضی العلاء کے سینے میں خنجر کے تین وار کئے۔ قاتل منبر پر چڑھ گیا اور اس نے خنجر سے خود کشی کر لی۔

ان تاریخی واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ باطنی تعداد میں بہت ہی زیادہ ہو گئے تھے لیکن بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ان کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی کہ وہ یوں اہم دینی اور معاشرتی شخصیتوں کو قتل کرتے پھرتے، وجہ یہ تھی کہ ان میں حسن بن صباح نے ایسا سفاکانہ جذبہ بھردیا تھا کہ اس کا ایک فدائی ایک ہجوم میں داخل ہو کر اپنے مطلوبہ شکار کو قتل کر دیتا تھا اور پھر اپنے آپ کو بھی مار لیتا تھا۔

یہ حسن بن صباح کی اُس جنت کا کمال تھا جو اس نے قلعہ الموت میں بنائی تھی۔ پہلے اس جنت کی پوری تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ اس جنت سے جسے نکال کر کسی کے قتل کے لئے بھیجا جاتا اسے یقین دلایا جاتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے جنت میں رہے گا۔ اسے یہ بھی بتا دیا جاتا تھا کہ وہ قتل کر کے اپنے آپ کو قتل کر دے گا لیکن اسے یہ یقین بھی دلایا جاتا تھا کہ وہ اس دنیا کی جنت سے نکل کر اللہ کی جنت میں چلا جائے گا جو اس سے کہیں زیادہ حسین ہوگی اور وہاں اُسے جو خوریں ملیں گی وہ اس جنت کی حوروں سے بہت زیادہ خوبصورت ہوں گی۔

آج کے سائنسی دور میں اس عمل کو برین واشنگ کہتے ہیں لیکن آج کی سائنس دل و دماغ پر وہ اثرات پیدا نہیں کر سکتی جو حسن بن صباح نے اُس دور میں پیدا کئے تھے۔ یہ ساری کرشمہ سازی حشیش کی تھی۔

پہلے تو تمام امراء اور علماء نے اپنے ساتھ محافظ رکھنے شروع کئے تھے لیکن جب باطنیوں کی قتل و غارت گری بڑھی تو امراء و وزراء اور سالاروں وغیرہ نے کپڑوں کے اندر زہر پہننی شروع کر دی۔ یہ حفاظتی اقدام ایک ضرورت بن گیا اور پھر اس نے ایک رواج کی صورت اختیار کر لی۔ عام لوگ بھی کپڑوں کے نیچے زہر پہننے لگے تاکہ خنجر یا تیر جسم تک نہ پہنچ سکے۔ ہزار ہا باطنی قتل کئے جا چکے تھے لیکن مسلمان پہلے کی طرح قتل ہو رہے تھے۔

رے کا شہر بچا ہوا تھا۔ ایک روز حجاج کا ایک قافلہ رے میں داخل ہوا۔ وہ لوگ حج کا فریضہ ادا کر کے واپس آ رہے تھے۔ اس میں کئی ملکوں کے حجاج تھے۔ اس قافلے میں ہندوستان کے مسلمان بھی تھے۔ یہ قافلہ یوں لگتا تھا جیسے ہاتھی جلوس ہو۔ ان میں بیشتر لوگ آہ و فریاد کر رہے تھے اور بہت سے ایسے تھے جن کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ رے سے تھوڑی ہی دُور ان کا قافلہ لوٹ لیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قافلے پر حملہ کرنے اور لوٹنے والے باطنی تھے۔ امیر شہر نے اُسی وقت اپنی فوج اُس طرف روانہ کر دی جس طرف سے یہ قافلہ آ رہا تھا لیکن سات آٹھ دنوں بعد فوج واپس آگئی اور پتہ چلا کہ ڈاکوؤں کا کہیں بھی سراغ نہیں ملا اور جس جگہ قافلے کو لوٹا گیا تھا وہاں بے شمار لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور ان لاشوں کو جنگل کے درندے اور گدھ کھا رہے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے گزرے تو ایک اور قافلہ رے میں داخل ہوا اور پتہ چلا کہ اس قافلے کو بھی باطنیوں نے لوٹ لیا ہے۔ اس قافلے میں تاجروں کی تعداد زیادہ تھی اور چند ایک کنبے بھی اس قافلے کے ساتھ جا رہے تھے جن میں کم عمر اور جوان لڑکیاں بھی تھیں۔ باطنی انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے.... مسئلہ یہ پیدا ہو جاتا تھا کہ قافلے کے لٹنے کی اطلاع شہر میں اُس وقت پہنچتی تھی جب لٹیرے اپنا کام کر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتے تھے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے۔

امیر شہر نے ان رہزنوں کو پکڑنے کا ایک بندوبست کیا۔ تقریباً ایک مہینے بعد رے

سے خاصی زور ایک قافلہ جا رہا تھا۔ اس قافلے میں پیدل چلنے والے لوگ بھی تھے اور اونٹوں پر سوار بھی اور گھوڑوں پر بھی کئی لوگ سوار تھے۔ قافلے کے ساتھ گھوڑا گاڑیاں اور بیل گاڑیاں بھی بے شمار تھیں جن پر سملن لدا ہوا تھا اور اس سملن کے اوپر ترپال ڈالے ہوئے تھے۔ یہ گاڑیاں خاصی زیادہ تعداد میں تھیں جنہیں دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ یہ تاجروں کا قافلہ ہے اور بے انداز سملن جا رہا ہے۔ یہ تو ایک خزانہ تھا جو جس منڈی میں لے جایا جاتا وہاں سے سونے اور چاندی کے سکے تھیلیاں بھر بھر کر حاصل کئے جاسکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس قافلے میں نوجوان لڑکیاں بھی تھیں جو اونٹوں پر سوار تھیں۔ لٹیروں کے لئے یہ بڑا ہی موٹا شکار تھا۔

قافلے والوں نے چلنے سے پہلے کوئی احتیاط نہیں کی تھی۔ سب سے بڑی احتیاط یہ کی جاتی تھی کہ پتہ ہی نہیں چلنے دیا جاتا تھا کہ قافلہ اگر کسی شہر میں رکا ہے تو وہاں سے کب چلے گا لیکن اس قافلے میں کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے اجنبیوں کو بھی بتا دیا کہ وہ فلاں دن اور فلاں وقت روانہ ہوں گے۔ قافلہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا کچھ اور تاجر اس میں شامل ہوتے گئے اور ان کی بیل گاڑیاں بھی تھیں جو سملن سے لدی ہوئی تھیں۔

قافلہ رے سے سولہ سترہ میل دور پہنچا۔ وہ اُس علاقے میں داخل ہو گیا تھا جو لٹیروں اور راہزنوں کے لئے نہایت ہی موزوں تھا۔ اس علاقے میں چٹانیں اور کچھ کم بلند پہاڑیاں تھیں جن کے درمیان کشلوہ بکھیرے تھیں اور اس علاقے میں درختوں کی بہتات تھی۔ قافلے عموماً پہاڑیوں کے درمیان اس خیال سے پڑاؤ کیا کرتے تھے کہ ایسی جگہ محفوظ ہوتی ہے لیکن یہ ان کی کم فہمی تھی۔ قافلے لوٹنے والے ایسی ہی جگہوں کو پسند کیا کرتے تھے۔ وہ دو پہاڑیوں کے درمیان رُکے ہوئے قافلے کو آگے اور پیچھے سے روک لیتے تھے۔ قافلے میں سے کوئی شخص ادھر ادھر بھاگ نہیں سکتا تھا چہر ایک آدمی کی تلاشی لے سکتے تھے۔

یہ قافلہ جو تعداد کے لحاظ سے بھی بڑا تھا اور مال و اسباب کے لحاظ سے بھی قیمتی اور پھر اس میں اونٹ اور گھوڑے بھی زیادہ تھے اس لئے بھی یہ قافلہ قیمتی تھا یہ کیوں نہ لوٹا جاتا۔ قافلہ جب اس علاقے میں داخل ہوا جو لٹیروں کے لئے موزوں تھا اُس وقت آدھا دن گزر گیا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ قافلے رات کو اُس وقت لوٹے جاتے ہیں جب یہ کسی پڑاؤ میں ہوتے ہیں لیکن اس قافلے کے ساتھ یوں ہوا کہ اچانک سامنے سے بھی اور پیچھے

سے بھی بے انداز گھوڑ سوار نمودار ہوئے اور انہوں نے قافلے کو گھیر لیا۔
 لیرے جانتے تھے کہ قافلے والے اپنے دفاع میں کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر قافلے کے
 ہر فرد کے پاس ہتھیار ہونے تو بھی وہ لوگ لڑنے سے گھبراتے تھے کیونکہ لڑنے کی صورت
 میں لیرے انہیں قتل کر دیتے تھے۔ جان بڑی عزیز ہوتی ہے۔ ہر فرد کی یہ کوشش ہوتی
 تھی کہ وہ اپنا سب کچھ لیریوں کے حوالے کر دے اور اپنی اور اپنے بچوں کی جانیں اور
 اپنی عورتوں کی عزتیں بچالے۔

”اگر اپنی جانیں بچانا چاہتے ہو تو غور سے سن لو“ — لیریوں کی طرف سے اعلان
 ہوا — ”اپنے مال و اسباب کو اور اپنے جانوروں کو چھوڑ کر تمام لوگ ایک طرف ہٹ
 جاؤ اور تم لوگوں کے پاس جتنی رقم، سونا اور چاندی ہے، وہ ایک جگہ ڈھیر کر دو۔ اگر
 ہماری بات نہیں مانو گے تو تمہاری لاشیں یہاں پڑی ہوئی ہوں گی۔“

قافلے والوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور وہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر الگ الگ
 کھڑے ہو گئے۔ لیریوں نے انہیں اور پیچھے ہٹا دیا۔ وہ اتنے پیچھے ہٹ گئے کہ پہاڑیوں
 کے دامن میں جا پہنچے.... آدھے، آدھے اور آدھے آدھے۔ لیرے جو سب کے سب گھوڑ
 سوار تھے مال و اسباب اکٹھا کرنے کے لئے آگے آگئے۔ ان کی تعداد قافلے کی تعداد کے
 تقریباً نصف تھی۔

لیرے گھوڑوں سے اترے اور بیل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں کے اوپر سے تریال
 اتار کر دیکھنے لگے کہ یہ کیا مال ہے۔ ان میں سے چند ایک اُس طرف چل پڑے جہاں
 قافلے کی نوجوان لڑکیاں سکتے کے عالم میں کھڑی تھیں اور وہ اپنے آدمیوں کے پیچھے چھپنے
 کی کوشش کر رہی تھیں۔

جوں ہی لیریوں نے تریال اٹھانے شروع کئے، تریالوں کے نیچے سے بہت سے آدمی
 نکلے اور وہ لیریوں پر ٹوٹ پڑے۔ لیریوں نے اپنی تلواریں اور خنجر وغیرہ نہیں نکالے
 تھے۔ وہ تو بہت خوش تھے کہ تلواروں کے بغیر ہی اتنا قیمتی مال انہیں مل گیا تھا لیکن جو
 آدمی تریالوں کے نیچے سے نکلے وہ تلواروں اور برہمیوں سے مسلح تھے۔ انہوں نے
 لیڑوں کا قتل عام شروع کر دیا اور انہیں ہتھیار نکالنے کی مہلت ہی نہ دی۔

قافلے کے گرد لوگوں کو الگ کھڑا کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے بھی تلواریں نکال لیں اور
 لیریوں پر حملہ کر دیا۔ لیریوں کے لئے اب فرار کے سوا کوئی راستہ نہ تھا لیکن قافلے

والے انہیں اس راستے پر جانے ہی نہیں دے رہے تھے۔

قافلہ لوٹنے والوں کو معلوم نہ تھا کہ یہ کوئی قافلہ نہیں تھا بلکہ یہ رے کی فوج ہے اور اس کے ساتھ کوئی سلمان نہیں۔ قافلے میں لڑکیاں تو لٹیروں کے لئے کشش پیدا کرنے کی خاطر شامل کی گئی تھیں۔ یہ قافلہ جہاں سے چلا تھا وہاں اسی مقصد کے لئے ہر کسی کو بتایا گیا تھا کہ قافلہ فلاں وقت یہاں سے چلے گا اور پڑاؤ فلاں جگہ ہو گا۔ یہ دراصل لٹیروں تک پیغام پہنچانے کا طریقہ تھا۔

تھوڑی سی دیر میں رے کے ان فوجیوں نے جو مختلف لباسوں میں آئے تھے، لٹیروں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ نکل سکا۔ فوجیوں نے ان کے گھوڑے پکڑ لئے اور ساتھ لے آئے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ یہ لٹیرے تمام کے تمام باطنی تھے۔ پتہ اس طرح چلا کہ ان میں جو زخمی تھے ان میں بہت سے ایسے نکلے جو موت سے ڈر گئے تھے۔ وہ منتیں کرتے تھے کہ انہیں جان سے مار دیا جائے یا اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائیں اور ان کے زخموں کی مرہم پٹی کریں اور وہ آئندہ اس کام سے توبہ کر لیں گے۔ فوجیوں نے ان زخمیوں سے کہا کہ وہ اتنا بتا دیں کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ انہوں نے بتا دیا کہ وہ باطنی ہیں اور حسن بن صباح کے حکم سے قافلے لوٹتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ قافلوں سے جو مال اور جو رقم وغیرہ لوٹی جاتی ہے وہ سب قلعہ الموت پہنچا دی جاتی ہے۔

حاکم رے نے حکم دیا تھا کہ ان لٹیروں میں سے دو تین زخمیوں کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ اُن سے وہ حسن بن صباح کے کچھ راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ ان فوجیوں نے تین زخمیوں کی عارضی مرہم پٹی کر دی اور ایک گھوڑا گاڑی میں ڈال کر انہیں رے لے آئے۔ انہیں ایک کمرے میں لٹا دیا گیا اور طبیب کو بلایا گیا۔ امیر رے بھی وہاں پہنچ گیا۔ ”اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہمیں ہر بات سچ سچ بتا دو“ — امیر رے نے ان زخمیوں سے کہا — ”اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز نہیں تو میں تمہیں بہت ہی بُری موت مرواؤں گا۔ تمہارے زخموں پر نمک چھڑکا جائے گا اور تم تڑپ تڑپ کر مرو گے۔“

تینوں نے کہا کہ وہ سب کچھ بتا دیں گے، ان کے زخموں کا کچھ علاج کیا جائے.... وہ بہت بُری طرح زخمی تھے اور نیم غشی کی حالت میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں دو نوجوان تھے اور ایک ادھیڑ عمر تھا۔ حاکم رے نے طبیب سے کہا کہ ان کی مرہم پٹی اس

طرح کی جائے کہ جیسے یہ شہلی خاندان کے افراد ہوں۔ طبیب نے اُسی وقت مرہم پٹی شروع کر دی۔

”اے امیر شہر!“ — ادھیڑ عمر آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا — ”میں آپ کو سارے راز دے دوں گا۔ میں جانتا ہوں ہمیں زندہ نہیں چھوڑا جائے گا لیکن میں پھر بھی ہریات صحیح اور سچ بتاؤں گا۔ ہمیں موت سے نہ ڈرا لے امیر اور زندگی کا لالچ نہ دے۔ میں ہریات بتاؤں گا اور اس سے پہلے میں یہ بتا دیتا ہوں کہ جو طوفان قلعہ الموت سے اٹھا ہے اسے آپ کی فوج اور اسے سلطان کی فوج اور اسے سلطنت سلجوقیہ کی ساری فوج نہیں روک سکتی۔“

امیر رے نے دیکھا کہ یہ زخمی بے ہوش نہیں اور اتنا زیادہ زخمی ہونے کے باوجود ٹھیک ٹھاک بول رہا ہے تو اس نے سوچا کہ اس سے ابھی پوچھ لیا جائے جو پوچھنا ہے۔ طبیب نے اپنے دو تین شاگردوں کو بھی بلوایا اور وہ جب آئے تو انہیں کہا گیا کہ وہ ان نوجوان زخمیوں کے زخم صاف کر کے مرہم پٹی کر دیں۔ امیر رے کے اشارے پر ادھیڑ عمر آدمی کو ایک اور کمرے میں لے گئے اور طبیب نے اس کے تمام کپڑے اتروا کر مرہم پٹی شروع کر دی۔ امیر رے بھی ان کے ساتھ تھا۔ امیر رے نے اسے کہا کہ حسن بن صباح کی یہ تنظیم کس طرح چلتی ہے کہ اتنے دور بیٹھا ہو اور اتنے بڑے علاقے میں باغیوں کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت میں لا رہا ہے اور فدائی اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔

”امیر شہر!“ — ادھیڑ عمر زخمی باطنی نے کہا — ”آپ خدا سے ڈرتے ہیں لیکن حکم ابلیس کا مانتے ہیں۔ میں آپ کی بات نہیں کر رہا۔ میں ہر انسان کی بات کر رہا ہوں۔ آپ زاہد اور پارسا ہو سکتے ہیں لیکن ہر انسان ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ نہیں سمجھ سکتے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟.... صرف اس لئے کہ خدا میں عام لوگ وہ کشش نہیں دیکھتے جو ابلیس میں ہے۔ آپ مجھے ابلیس کا پجاری کہہ لیں۔ شیخ الجبل حسن بن صباح کہتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کو وعدوں پر مالتا ہے۔ وہ جنت کا وعدہ کرتا ہے لیکن اس کے لئے مرنا ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ساری عمر نیکیوں اور ثواب کے کاموں میں گزار دو گے تو جنت ملے گی لیکن ہمارا شیخ الجبل حسن بن صباح کہتا ہے کہ وہ ہے جنت، جاؤ اس میں داخل ہو جاؤ۔ میں اس جنت میں رہ چکا ہوں۔ شیخ الجبل وعدے نہیں کرتا، وہ دیتا ہے۔ اُسے آپ ابلیس کہتے ہیں، ہم اُسے امام کہتے ہیں۔“

اس باطنی نے پُر اعتماد لہجے میں حسن بن صباح اور اس کی تنظیم اور اس کے طریقہ کار کے متعلق سب کچھ بتادیا۔ یہ بھی بتادیا کہ قلعہ الموت کے اندر کیا ہے، کتنی فوج ہے اور اس کے حفاظتی انتظامات کیا ہیں۔ یہ بھی بتادیا کہ قاتلوں کو لٹوٹنے والے باطنی الگ ہیں جن کا صرف یہی کام ہے۔ وہ جو کچھ لٹوتے ہیں قلعہ الموت چلا جاتا ہے۔ اس طرح اس شخص نے ہر ایک بات بتادی۔

”اور میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں امیر شہر!“ — اُس نے کہا — ”میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ آپ شیخ الجبل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ سلطان برکیارق کے ایک سالار اور یزی — نہ قلعہ وسم کوہ کو محاصرے میں لے رکھا ہے۔ چھ مہینے ہو چکے ہیں۔ ابھی تک وہ قلعے کی دیواروں تک نہیں پہنچ سکا۔ اُس نے پہنچنے کی کوشش کی تو اپنے بہت سے سپاہیوں کو مروا کر پیچھے ہٹ آیا۔ اس کا محاصرہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ اگر ہو بھی گیا تو شیخ الجبل کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

”کیا شیخ الجبل نے وسم کوہ کا محاصرہ توڑنے اور پسپا کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا؟“ — امیر رے نے پوچھا۔

”میں صحیح جواب نہیں دے سکوں گا“ — باطنی نے کہا — ”اگر چھ مہینے گزر جانے کے باوجود شیخ الجبل نے قلعہ وسم کوہ کو بچانے کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے معلوم ہے کہ سلجوقی سالار یہ قلعہ نہیں لے سکے گا۔ میں اپنے امام شیخ الجبل کے ساتھ رہا ہوں۔ میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس نے قلعہ وسم کوہ کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اسے پوری امید ہے کہ سلجوقی سالار اپنا ہر ایک سپاہی مروا کر خود ہی وہاں سے مایوس اور ناکام ہو کر واپس آجائے گا۔“

طیب اس باطنی کی مرہم پٹی کرتا رہا، وہ بولتا رہا اور امیر رے سنتا رہا۔ مرہم پٹی ہو چکی تو امیر رے اور طیب باہر نکل آئے۔ کچھ دور آکر امیر رے رک گیا اور طیب سے پوچھا کہ اس باطنی نے جو باتیں کہیں، ان کے متعلق اس کا کیا خیال ہے؟

”امیر محترم!“ — بوڑھے طیب نے جواب دیا — ”عمر گزر گئی ہے مریضوں اور زخمیوں کا علاج کرتے۔ آپ اس کی باتوں کے متعلق میری رائے پوچھ رہے ہیں اور آپ غالباً اس پر بھی حیران ہو رہے ہیں کہ اس نے اس قسم کی باتیں کس قدر پُر اعتماد اور بے تکلف لہجے میں کہیں لیکن میں حیران ہو رہا ہوں کہ اتنا زیادہ خون نکل چکا ہے کہ

اسے زندہ نہیں رہنا چاہئے تھا لیکن یہ زندہ ہے اور اس کا دماغ اس کے جسم سے زیادہ زندہ ہے.... اسے کہتے ہیں جذبہ اور عقیدہ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا جذبہ بھی ابلیسی اور عقیدہ بھی ابلیسی ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ ہے حسن بن صباح کی اصل قوت۔ اس شخص کو موت کا کوئی غم نہیں اور زندہ رہنے کا لالچ بھی نہیں۔ یہ مرے گا تو حسن بن صباح زندہ باد کا نعروں لگا کر مرے گا۔ اس وقت ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایسا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو حسن بن صباح کا یہ فرقہ بھی ختم ہو سکتا ہے۔ دین اسلام کو اسی جذبے سے اور ایسے ہی عقیدے کی شدت سے زندہ رکھا جاسکتا ہے۔“

امیر شہر نے طبیب کو رخصت کر دیا اور اپنے محافظ دستے کے کماندار کو بلا کر کہا کہ ان تینوں باغیوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں دُور لے جا کر ایک ہی گڑھے میں دفن کر دی جائیں۔



سالار اور یزی کو قلعہ و سم کوہ کا محاصرہ کئے چھ مہینے گزر گئے تھے۔ قلعے کا دفاع اتنا مضبوط تھا کہ قلعہ سر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ سالار اور یزی اپنے ساتھ غیر معمولی طور پر دلیر جانبازوں کا لشکر لے کر گیا تھا۔ ان جانبازوں کا ایک گروہ قلعے کا دروازہ توڑنے کے لئے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ انہوں نے ہتھوڑوں اور کلہاڑوں سے دروازے پر ضربیں لگائیں لیکن اوپر سے باغیوں نے ان پر جلتی ہوئی لکڑیاں اور انگارے پھینکے۔ چند ایک جانبازوں کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ وہ پیچھے کو بھاگے۔ اوپر سے باغیوں نے ان پر تیروں کا مینہ برسا دیا اور شاید ہی اس گروہ میں سے کوئی جانباز زندہ واپس آیا ہو گا۔

ایسی قربانی ایک بار نہیں متعدد بار دی گئی۔ جانباز کسی اور دروازے تک پہنچے لیکن زندہ واپس نہ آ سکے۔ سالار اور یزی نے سرنگ کھودنے کی بھی سوچی لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ پھر بھی اُس نے سرنگ کھدوانی شروع کر دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سرنگ دیوار کے نیچے سے قلعے کے اندر تک چلی بھی گئی تو سارے کا سارا لشکر ایک ہی بار اس سرنگ کے ذریعے قلعے تک نہیں پہنچایا جاسکے گا۔ تین تین چار چار جانباز سرنگ میں سے اندر جائیں گے اور باطنی جس جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے ہیں، انہیں ختم کرتے چلے جائیں گے لیکن سالار اور یزی کا خیال تھا کہ یہ قربانی نو دینی ہی پڑے گی۔

سالار اور یزی کو ایک خطرہ اور بھی نظر آ رہا تھا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مرو سے کوچ سے پہلے یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ سالار اور یزی اپنے لشکر کو قلعہ ملاذخان پر قبضہ کرنے کے لئے لے جا رہا ہے۔ اُسے توقع یہ تھی کہ حسن بن صباح قلعہ ملاذخان کے دفاع کو مضبوط کرنے میں لگ جائے گا اور اتنی دیر میں وہ قلعہ و سم کوہ کو سر کر لے گا لیکن وہاں تو آدھا سال گزر گیا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ حسن بن صباح کو پتہ چلے گا کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے اور اصل میں قلعہ و سم کوہ کو محاصرے میں لیا گیا ہے تو وہ اپنا ایک لشکر محاصرے پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دے گا۔ اس خطرے کے پیش نظر سالار اور یزی کی نظریں بچھے بھی رہتی تھیں۔ اُسے ہر روز یہ توقع ہوتی تھی کہ آج باغیوں کا لشکر عقب سے ضرور ہی نمودار ہو کر ہلہ بول دے گا لیکن ہر روز کا سورج غروب ہو جاتا تھا اور سالار اور یزی اور زیادہ پریشان ہو جاتا کہ رات کو حملہ آئے گا۔ اسی میں چھ مہینے گزر گئے تھے۔

حسن بن صباح کو ایک مہینے کے اندر اندر پتہ چل گیا تھا کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلتا اس کے جاسوس ہر طرف اور ہر جگہ موجود تھے لیکن حسن بن صباح کو جب یہ اطلاع دی گئی کہ یہ مشہور کر کے کہ قلعہ ملاذخان کو محاصرے میں لینے کی بجائے سالار اور یزی کا لشکر قلعہ و سم کوہ کو محاصرے میں لے چکا ہے تو حسن بن صباح کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی تھی۔

”ان سلجوقیوں کی عقل جواب دے گئی ہے“ — حسن بن صباح نے کہا تھا —

”انہوں نے ہمیں یہ دھوکا اس امید پر دیا ہو گا کہ وہ قلعہ و سم کوہ پر چند دنوں میں قبضہ کر لیں گے۔ قلعہ و سم کوہ کو محاصرے میں لیا جاسکتا ہے لیکن سلجوقی لشکر کا کوئی ایک سپاہی بھی اس قلعے کے اندر داخل نہیں ہو سکے گا.... انہیں زور آزمائی کرنے دو۔“

”یا امام!“ — اس کے جنگی مشیر نے کہا تھا — ”کیا ہم یوں نہ کریں کہ ان کے

محاصرے پر حملہ کر دیں؟“

”ابھی نہیں“ — حسن بن صباح نے کہا تھا — ”انہیں اپنی طاقت وہیں زائل کر

لینے دو۔ ہم جب دیکھیں گے کہ اب ان کا دم خم ٹوٹ گیا ہے اور ان کا آدھا لشکر و سم کوہ کے تیر اندازوں کا نشانہ بن چکا ہے تو ہم حملے کی سوچیں گے۔ انہیں اپنا دل خوش کر لینے

دو۔“

الموت بھیج دیتے ہیں۔ ظاہری طور پر تو میں ان لوگوں کو سزا دینے کے لئے آیا ہوں لیکن میرا اپنا ایک منصوبہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ قلعہ میرے ہاتھ آ جائے تو میں اسے اپنا ایک مضبوط اڈہ یا ٹھکانہ بنالوں گا۔ یہاں سے میں بائیسوں کے خلاف مہم شروع کروں گا لیکن اس قلعے کے اندر قافلے لوٹنے والے ڈاکو ہیں جو لڑنا اور مرنے جانتے ہیں۔ ان کے پاس تیروں کا ذخیرہ ختم ہی نہیں ہو رہا اور ان کے پاس پھینکنے والی برہمچیاں بھی ہیں جو شاید کچھ اور عرصہ ختم نہیں ہوں گی۔ میں تقریباً ”آدھا لشکر مروا چکا ہوں لیکن قلعہ ہاتھ آتا نظر نہیں آتا۔ مجھے نہ یہ نظر آ رہا ہے کہ کسی بھی روز میرے اس محاصرے پر عقب سے حملہ ہو جائے گا۔ میں پورا مقابلہ کروں گا لیکن میرا اور میرے لشکر کا بیچ نکلنا ممکن نظر نہیں آتا۔“

”پیچھے سے حملہ ہو جائے گا؟“ — منزل آفندی نے پوچھا۔

”ہاں منزل بھائی!“ — سالار اور یزی نے جواب دیا — ”میں حیران ہوں کہ اب تک حسن بن صباح نے یہ کارروائی کیوں نہیں کی۔ اگر میں اُس کی جگہ ہوتا تو فوراً“ محاصرے کو مزید فوج بھیج کر محاصرے میں لے لیتا۔ محاصرہ کرنے والے لشکر کو محاصرے میں لے لیا جائے تو اس لشکر کا بیچ نکلنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔“

منزل آفندی گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔ اُس نے سالار اور یزی کے ساتھ کچھ باتیں کیں اور بن یونس کو ساتھ لے کر واپس چل پڑا۔



ایک برطانوی تاریخ نویس کے مطابق، پندرہ سولہ دن گزرے ہوں گے کہ سالار اور یزی نے گھوڑوں کے ٹاپ سنے۔ اُس نے پیچھے دیکھا تو ایک گھوڑ سوار لشکر سرپٹ چلا آ رہا تھا۔ سالار اور یزی جو خطرہ محسوس کر رہا تھا وہ آگیا تھا۔ اُس نے فوری طور پر اپنے لشکر کو جو قلعے کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، محاصرے سے ہٹا کر ایک جگہ اکٹھا کر لیا اور پھر اسے ایک جنگی ترتیب دے لی۔ عقب سے یا باہر سے حملے کی صورت میں اپنے لشکر کو اس طرح اکٹھا کرنا ضروری تھا ورنہ محاصرے میں لشکر بندہ بندہ ہو کر بکھرا رہتا۔

جب گھوڑ سوار لشکر قریب آیا تو دیکھا کہ آگے آگے دو سواروں کے ہاتھوں میں حسن بن صباح کے پرچم تھے۔ سوار نعرے بھی باطنی فرقے کے لگا رہے تھے۔ سالار اور یزی نے اپنے لشکر کو قلعے سے اور پیچھے ہٹا لیا اور دیکھنے لگا کہ لڑنے کے لئے زمین کون

سی موزوں ہے۔ وہ قلعے سے زیادہ دُور نہیں ہٹا۔ بڑی پھرتی سے اس نے اپنے بچے کچے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا۔ دو کو آگے رکھا اور ایک حصے کو ان دونوں کے پیچھے بھیج دیا۔ اب اس کا لشکر مقابلے کے لئے تیار تھا۔

گھوڑ سوار لشکر قلعے کے ایک اور پہلو کی طرف چلا گیا اور رُک کر بڑی پھرتی سے جنگی ترتیب میں آگیا۔ اس لشکر سے اعلان ہونے لگے کہ قلعے کے تمام لوگ باہر آجائیں اور ان مسلمانوں کو گھیرے میں لے کر کاٹ دیں۔

باہر سے آنے والا سوار لشکر حرکت میں آیا اور سالار اور یزی کے ایک پہلو میں اس انداز سے آگیا جیسے سالار اور یزی کے لشکر کو گھیرے میں لینا چاہتا ہو۔ گھوڑ سواروں نے برچھیاں بلند کر لی تھیں اور پھر انہوں نے بر پھیوں کی انیاں آگے کر لیں اور اب انہوں نے ہلم بولنا تھا۔

قلعے کے دروازے کھل گئے اور اندر کا لشکر اس طرح باہر آنے لگا جیسے سیلابی دریا نے بند توڑ ڈالا ہو۔ وہ لشکر سالار اور یزی کے لشکر کے دوسرے پہلو کی طرف چلا گیا۔ اب کوئی شک نہ رہا کہ سالار اور یزی کے لشکر کو باغیوں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔

سالار اور یزی نے ایک حکم دیا۔ یہ حکم سنتے ہی اس کا لشکر آگے کو دوڑ پڑا اور اس کا ایک حصہ قلعے کے کھلے ہوئے دروازوں کے اندر چلا گیا اور اندر سے دروازے بند کر لئے۔ باقی دو حصے اس لشکر کی طرف آئے جو اندر سے نکلا تھا۔ باہر سے جو گھوڑ سوار لشکر آیا تھا اُس نے یہ حرکت کی کہ قلعے کے اندر سے آنے والے لشکر پر ہلم بول دیا۔ دوسرے پہلو سے سالار اور یزی نے ہلم بولا۔

اب یہ صورت بن گئی کہ اندر سے نکلنے والا باطنی لشکر گھوڑ سواروں اور سالار اور یزی کے لشکروں کے زرخے میں آگیا تھا۔ اندر سے آنے والے لشکری حیران و پریشان تھے کہ یہ کیا بنی۔ وہ تو سمجھ رہے تھے کہ حسن بن صباح نے ان کے لئے مدد بھیجی ہے اور اب محاصرہ کرنے والوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں رہے گا مگر ہوا یہ کہ وہ خود کٹنے لگے اور گھوڑوں کے قدموں تلے روندے جانے لگے۔

سالار اور یزی کے لشکر کا جو حصہ قلعے کے اندر چلا گیا تھا اس نے قلعے کے اندر والے لوگوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔ پھر دروازے کھل گئے اور سالار اور یزی کے لشکر کے باقی دونوں حصے اور باہر سے آنے والے گھوڑ سوار جنہوں نے حسن بن صباح

کے پرچم اٹھار کھے تھے قلعے کے اندر چلے گئے اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہونے لگے۔ گھوڑ سواروں نے اندر جا کر حسن بن صباح کے پرچم پھاڑے اور پھر جلا ڈالے۔ قلعہ وسم کوہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا تھا۔

یہ کامیابی ایک دھوکے سے حاصل کی گئی تھی۔ دھوکا یہ تھا کہ منزل آفندی نے سالار اور یزی سے پوچھا تھا کیا پیچھے سے حملہ آسکتا ہے اور اور یزی نے کہا تھا کہ کسی دن بھی پیچھے سے حملہ ہو جائے گا۔ منزل آفندی کے دماغ میں ایک منصوبہ آگیا تھا۔ اس نے سالار اور یزی کے ساتھ بات کی اور یہ منصوبہ طے ہو گیا۔

منزل آفندی بن یونس کو ساتھ لے کر مرو چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے سلطان برکیارق کے ساتھ بات کی اور اسے دو ہزار گھوڑ سوار دے دیئے گئے اور ان کا کمانڈر ایک سالار بھی ساتھ دیا۔ اسی رات اس گھوڑ لشکر نے مرو سے کوچ کیا اور بڑی ہی تیزی رفتاری سے جا کر اگلی رات تک قلعہ وسم کوہ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ وہیں رُکے اور رات وہیں گزاری۔

صبح طلوع ہوئی تو مرو کے ان دو ہزار سواروں نے قلعہ وسم کوہ کا رخ کیا اور اس انداز سے پیش قدمی کی جیسے وہ پیچھے سے محاصرے پر حملہ کریں گے۔ انہوں نے حسن بن صباح کے پرچم خود ہی تیار کر لئے تھے۔ قلعے کے اندر کے لشکر نے جب دیوار کے اوپر سے دیکھا تو انہوں نے حسن بن صباح کے نعرے لگائے۔ قدرتی طور پر وہ سمجھے کہ حسن بن صباح نے یہ گھوڑ سوار لشکر بھیجا ہے۔ پھر گھوڑ سوار لشکر سے اعلان ہوئے کہ اندر کے لوگ باہر آجائیں اور مسلمانوں کو کچل دیں۔

جونہی یہ اعلان ہوا اندر کے تمام لوگ جوڑنے والے تھے باہر آگئے۔ سالار اور یزی نے اپنے لشکر کا ایک حصہ قلعے کے اندر بھیج دیا اور پھر بیان ہو چکا ہے کہ گھوڑ سواروں نے اور سالار اور یزی کے لشکر نے اندر کے لشکر کو کس طرح گھیرے میں لیا اور اس کے کسی ایک آدمی کو بھی زندہ نہ رہنے دیا۔

”سالار محترم!“ — فتح کی پہلی رات منزل آفندی نے سالار اور یزی سے کہا —
 ”اگر حسن بن صباح کو شکست دینی ہے تو دھوکے سے ہی دی جاسکتی ہے.... وہ شخص سرپا دھوکا اور فریب ہے۔ اس کے لئے ہمیں بھی فریب کار بننا پڑے گا.... اللہ آپ کو فتح مبارک کرے۔“

سالار اور یزی کو یہ فتح بہت مہنگی پڑی تھی۔ تمام مورخ متفقہ طور پر لکھتے ہیں کہ وسم کوہ کا محاصرہ آٹھ مہینے اور کچھ دن رہا تھا۔ اس عرصے میں سالار اور یزی کا آدھا لشکر کٹ گیا تھا۔ اگر محاصرین کو دھوکے میں نہ مارا جاتا تو محاصرہ ابھی اور طول پکڑ سکتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلعے کے اندر خوراک اور دیگر ضروریات کا ذخیرہ اتنا زیادہ تھا کہ قلعے کے اندر کے لوگ محاصرے سے ذرا بھی پریشان نہیں ہوئے تھے۔

داستان گو یہ نہیں بتا رہا کہ فلاں اور فلاں واقعہ کے درمیان کتنا لمبا وقفہ تھا۔ حسن بن صباح کا دورِ مقبولیت اور اس کی اہلیسیّت کی تاریخ کہیں کہیں تاریکی میں چلی جاتی ہے جیسے ریل گاڑی چلتے چلتے کسی تاریک سرنگ میں داخل ہو جاتی ہے اور جب یہ تاریک روشنی میں آتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ بے شمار سال گزر گئے ہیں۔ وسم کوہ کا قلعہ جس وقت فتح ہوا، اُس وقت حسن بن صباح بڑھاپے میں داخل ہو چکا تھا۔ اسے جنہوں نے دیکھا تھا اور اس کے متعلق سینہ بہ سینہ جو باتیں سامنے آئیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ حسن بن صباح خاصا بوڑھا ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنی صحت کو ایسا برقرار رکھا تھا کہ لگتا نہیں تھا کہ اس شخص کی جوانی کو گزرے ایک مدت گزر گئی ہے۔

اور یزی نے اپنے لشکر کو قتل عام کا جو حکم دیا تھا وہ اُن شہریوں کے لئے نہیں تھا جو لڑنے میں شامل نہیں تھے۔ قلعے کے اندر سالار اور یزی کے لشکر کا جم کر مقابلہ کرنے والے شہریوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی۔ مسلمان لشکر کو یہ اجازت نہیں تھی کہ اندھا دھند قتل کرتے چلے جائیں۔ لوگ گھروں میں دُک بگئے تھے اور لڑنے والے شہری بھی گھروں میں جا چُپے تھے۔ انہیں پکڑنا ضروری تھا لیکن اس کے لئے یہ طریقہ اختیار نہ کیا گیا کہ ہر کسی کو گھسیٹ کر باہر لے آتے اور اس کی گردن مار دیتے۔ سالار اور یزی نے وہ روایت برقرار رکھی جو مسلمانوں کا طرہٴ امتیاز چلا آ رہا تھا۔ وہ روایت تھی مفتوح علاقے کے لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا اور ان کی عزت اور جان و مال کا تحفظ کرنا اور پھر عملاً ”انہیں یہ یقین دلانا کہ انہیں غلام نہیں بنایا جائے گا۔“

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ وسم کوہ کے اندر تمام لوگ حسن بن صباح کے پیروکار تھے۔ دوسرے شہروں میں مسلمانوں نے باغیوں کا قتل عام کیا تھا لیکن اس قلعے میں صورت مختلف تھی۔ وہ یوں کہ ان لوگوں کو بڑے لمبے مقابلے کے بعد شکست دی گئی تھی اور وہ مفتوحین کہلاتے تھے۔ وہ اب فاتح لشکر کے رحم و کرم پر تھے۔

قلعے کے دروازوں پر اپنے سنتری کھڑے کر دیئے گئے اور انہیں کہا گیا کہ کسی کو باہر نہ جانے دیں اور جو کوئی اندر آتا ہے اسے آنے دیں۔ سالار اور یزی نے رات گزرنے کا انتظار نہ کیا اور حکم دیا کہ گھر گھر کی تلاشی لی جائے اور تمام مردوں کو باہر لایا جائے لیکن کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اس حکم پر سالار اور یزی کے لشکری گھروں میں داخل ہو گئے اور کونوں کھدروں کی تلاشی لے کر مردوں کو باہر لانے لگے۔ چودہ پندرہ سال کے بچے سے لے کر بوڑھوں تک کو باہر لایا جا رہا تھا۔ مشعلیں اتنی زیادہ جلائی گئی تھیں کہ قلعے میں جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ ان تمام آدمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ عورتوں کی چیخ و پکار اور آہ و بکا اور ان کا واویلا اتنا بلند اور اتنا زیادہ تھا کہ آسمان کے پردے چاک ہو رہے تھے۔ لشکری کسی آدمی کو اس کے گھر سے باہر لاتے تو عورتیں اس لشکری کے قدموں میں گر پڑتیں یا اسے پکڑ لیتیں اور رو رو کر اسے کہتیں کہ ان کا آدمی بے قصور ہے اور وہ نہیں لڑا۔ ان عورتوں کو یہ ڈر تھا کہ آدمیوں کو باہر لے جا کر قتل کر دیا جائے گا۔ لشکری ان عورتوں کو تسلیاں دیتے تھے کہ ان آدمیوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ان آدمیوں میں ایسے بھی تھے جن کے کپڑوں پر خون لگا ہوا تھا اور ان کی تلواریں بھی خون آلود تھیں۔ یہ ثبوت تھا کہ وہ لڑنے کے بعد گھروں میں چھپ گئے تھے۔ ایسے آدمیوں کو الگ کھڑا کیا جا رہا تھا۔

قلعے کے اندر کا ماحول بڑا ہی بھیانک اور ہولناک تھا۔ لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور خون اتنا کہ چلنا محال تھا۔ خون سے پاؤں پھسلتے تھے۔ ان لاشوں میں ایسے زخمی بھی تھے جو اٹھنے کے قابل نہیں تھے۔ وہ بڑا ہی کریناک واویلا پا کر رہے تھے اور پانی پانی کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ سالار اور یزی نے اپنے لشکر کے ایک حصے کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ اپنے زخمیوں کو اٹھا کر اُس جگہ پہنچائیں جہاں مرہم پٹی کا انتظام تھا اور اپنے شہیدوں کی لاشیں ایک جگہ رکھ دیں۔ سالار اور یزی نے یہ بھی کہا تھا کہ کسی باطنی زخمی کو پانی نہیں پلانا۔ قلعے کے اندر سب ہی باطنی تھے اور ان کا قصور صرف یہ نہ تھا کہ انہوں نے سالار اور یزی کے لشکر کا مقابلہ کیا تھا بلکہ ان کا اصل جرم یہ تھا کہ وہ ایک لمبے عرصے سے قافلہ کو لوٹ رہے تھے، کوئی قافلہ والا مزاحمت کرتا تو اسے یہ لوگ قتل کر دیتے تھے اور ان کی جوان بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ انہیں جینے کا حق نہیں دیا جاسکتا تھا۔

جب ان لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جا رہا تھا تو عورتیں چیختی چلاتی اور بعض سینہ کوبی کرتی وہاں پہنچ گئیں اور سلار اور یزی کو گھیر لیا۔ وہ سب یہی کہہ رہی تھیں کہ ان کے آدمی بے گناہ ہیں۔ سلار اور یزی نے آگے ہو کر ان آدمیوں سے کہا کہ ان میں جو لٹیرے اور ڈاکو ہیں اور جنہوں نے قافلے لوٹے ہیں، وہ خود ہی آگے آجائیں۔ ان میں ایسے آدمی تو صاف پہچانے جا رہے تھے جن کی تلواریں خون آلود اور جن کے کپڑوں پر بھی خون کے چھینٹے تھے۔ انہیں آگے کر لیا گیا اور چند ایک اور آدمی آگے آگئے۔ سلار اور یزی نے ایک بار پھر کہا کہ خود ہی آگے آ جاؤ ورنہ جب انہیں شناخت کر لیا جائے گا تو ان کی جان بخشی نہیں کی جائے گی۔

عورتوں نے جب سلار اور یزی کا یہ حکم سنا اور دیکھا کہ کئی ڈاکو اور راہزن آگے نہیں آ رہے تو وہ ان لوگوں کے درمیان چلی گئیں اور ایک ایک کو پکڑ کر آگے دھکیلنے لگیں۔ وہ تو جانتی تھیں کہ ان میں اصل مجرم کون کون ہیں۔ ان کا لشکر اور ان کے دوسرے ساتھی قلعے کے باہر کاٹ دیئے گئے تھے۔ ان میں سے اگر کچھ نکل بھاگے ہوں گے تو ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوگی۔

بعض باغیوں کو قلعے کے برجوں میں سے نکل نکل کر لایا جا رہا تھا۔ وہ وہاں چھپے ہوئے تھے۔

مزل آفندی اور بن یونس بھی سلار اور یزی کے ساتھ تھے۔ وہ دونوں تو بہت ہی مسرور تھے۔ ان کی چال سو فیصد کامیاب رہی تھی۔

”میرے بھائیو!“ — سلار اور یزی نے انہیں کہا — ”میں قلعہ الموت سے آنے والی ہواؤں میں یہ خطرہ اب بھی سو نگھ رہا ہوں کہ حسن بن صلیح ہم پر حملہ ضرور کرے گا۔ اسے یہ اطلاع تو مل ہی جائے گی کہ قلعہ دسم کوہ اس کے ہاتھ سے نکل کر ہمارے ہاتھ میں آ گیا ہے۔“

”اس کی پیش بندی کر لینی چاہئے“ — مزل نے کہا — ”اگر آپ چاہیں تو میں صبح ہی مرو کو روانہ ہو جاؤں گا اور وہاں سے کمک لے آؤں گا۔“

”میں مرو سے مزید فوج نہیں منگوانا چاہتا“ — سلار اور یزی نے کہا — ”مرو میں فوج کم ہوئی تو وہ شہر بھی خطرے میں آ سکتا ہے۔ ہم یوں کریں گے کہ صبح اپنے سوار لشکر کو قلعے کے باہر مقیم کر دیں گے تاکہ اچانک حملہ آ جائے تو وہ محاصرے تک نوبت ہی



قلعہ و سم کوہ و سمیع و عریض تھا۔ اس میں غیر فوجی آبادی بھی خاصی زیادہ تھی۔ ایک کشلوہ میدان تھا جس میں لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جا رہا تھا اور ان کی شناخت ہو رہی تھی۔ سالار اور یزی کی فوج کا ایک عہدیدار تھا جس کا نام شمیر ابلک تھا۔ تاریخ میں اس کا یہ نام تو آیا ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔ نام سے ظاہر ہے کہ وہ سلجوقی یعنی ترک نسل سے تھا۔ اُس کا دادا اُن سلجوقیوں میں سے تھا جنہوں نے سلطنت سلجوقیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اُس کے ساتھ چار سپاہی تھے اور وہ دیوار پر جا کر قلعے کے بُرجوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو سپاہیوں کے ہاتھوں میں مشطیں تھیں۔ وہ دو بُرجوں میں سے تین چار باغیوں کو پکڑ کر نیچے بھیج چکا تھا۔

قلعے کے بڑے دروازے کے اوپر ایک اور کمرہ نما بُرج بنا ہوا تھا جو اونچا بھی تھا اور لمبا چوڑا بھی۔ شمیر ابلک اپنے سپاہیوں کے ساتھ اس بُرج میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس کے اندر سیڑھیاں تھیں جو اس بُرج کی اوپر والی منزل کو جاتی تھیں۔ وہ جب سیڑھیاں چڑھنے لگا تو اس کے ایک سپاہی نے سیڑھیوں کے نیچے دیکھا۔ وہاں کچھ سلمان اور بستر وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ اس سپاہی کو یوں شک ہوا تھا جیسے اُس نے ان اشیاء کے انبار کے پیچھے دو چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھی ہوں۔ سپاہی سیڑھیوں پر جانے کی بجائے سیڑھیوں کے نیچے جھک کر دیکھنے لگا۔ وہاں واقعی ایک آدمی تھا جو چھپا ہوا تھا۔ سپاہی کے کہنے پر وہ باہر نکل آیا۔ اُس کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے تھے لیکن اُس کے ہاتھ میں تلوار نہیں تھی۔ سپاہی نے اسے کہا کہ اپنی تلوار لے کر آؤ ورنہ اسے زندہ جلا دیا جائے گا۔ وہ پھر سیڑھیوں کے نیچے گیا اور اشیاء کے انبار کے نیچے سے تلوار اٹھا کر لے آیا۔ تلوار خون آلود تھی۔ اُس نے تلوار فرش پر پھینک دی۔

شمیر ابلک آدمی سیڑھی چڑھ چکا تھا۔ وہ وہیں سے نیچے اُتر آیا۔ یہ آدمی شمیر ابلک کی ہی عمر کا تھا اور بڑا صحت مند تھا۔ اس کے چہرے پر کرخت سے تاثرات تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ جلا دیا ہو۔

”تم بے گناہ نہیں ہو سکتے“ — شمیر ابلک نے اسے کہا — ”تمہارا چہرہ بتا رہا ہے

کہ تم ڈاکو اور راہزن ہو اور نہ جانے کتنے لوگوں کو اب تک قتل کر چکے ہو گے.... تمہاری تلواریں ہمارے خلاف لڑے تھے.... چلو نیچے!

”ہاں میں ڈاکو ہوں“ — اُس نے کہا — ”اور میں حسن بن صباح کا پیروکار بھی ہوں۔ میں لڑا بھی ہوں اور تمہارے تین آدمی قتل کئے ہیں.... انتقام لے لو۔ میں قتل ہونے کے لئے تیار ہوں۔ میں جانتا تھا کہ میرا انجام یہی ہو گا لیکن ایک بات سن لو، مجھے قتل کرو گے تو اپنا نقصان کرو گے اور اگر زندہ رہنے دو گے تو تمہیں اتنا خزانہ ملے گا کہ ایک قلعہ خرید سکو گے۔“

”زندہ رہنے کی اب کوئی ترکیب کامیاب نہیں ہوگی اے باطنی!“ — شمیر ابلیک نے کہا — ”حسن بن صباح تمہیں چھڑانے نہیں آئے گا۔ تم جس خزانے کی بات کر رہے ہو، وہ ہمیں مل گیا ہے۔ اُس تمہ خانے کی نشاندہی ہو چکی ہے جس میں اس قلعے کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔“

”میں جانتا ہوں میرا امام شیخ الجبل مجھے چھڑانے نہیں آئے گا“ — اُس نے کہا — ”مجھے یقین ہے کہ میں تمہارے ہاتھوں قتل ہوں گا لیکن ایک بات سن لو۔ میں اُس خزانے کی بات نہیں کر رہا جو یہاں تمہ خانے میں پڑا ہے۔ وہ خزانہ جو میں بتا رہا ہوں، یہاں سے دُور پڑا ہے اور میرے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تم لے لو.. کیا تم ان سپاہیوں سے ذرا الگ ہو کر میری بات سننا پسند کرو گے؟.... اچھی طرح دیکھ لو، میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں نہ میں تمہیں کوئی دھوکا دوں گا اور میں دھوکا دے ہی کیا سکتا ہوں۔ تم پانچ مسلح آدمی ہو اور میں اکیلا اور نبتہ ہوں۔“

معلوم ہوتا ہے اس شخص کی زبان میں کوئی خاص تاثر تھا یا اس سلجوقی عہدیدار کی شخصیت کمزور تھی کہ اس نے اس ڈاکو کا اثر قبول کر لیا اور اس کی بات سننے پر رضامند ہو گیا۔ اُس نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ وہ بُرج سے نکل کر دروازے کے ساتھ ہی کھڑے رہیں۔ سپاہی نکل گئے تو سلجوقی نے اس ڈاکو کو اپنے پاس بٹھالیا لیکن بٹھانے سے پہلے اس نے اس ڈاکو کی جامہ تلاشی لے لی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ باطنی کس طرح قاتلانہ وار کیا کرتے ہیں۔

”میں شامی ہوں“ — ڈاکو نے کہا — ”میرا نام ابو جندل ہے۔ میں اپنے ساتھ ایک ذمہ داری لئے پھرتا ہوں۔ وہ میری دو یتیم بھتیجیاں ہیں۔ دونوں جوان ہیں اور بہت

ہی خوبصورت۔ مجھے میرے ساتھیوں نے مشورے دیئے تھے اور اب بھی کہتے رہتے ہیں کہ میں ان دونوں کو اپنے امام حسن بن صباح کو پیش کر دوں تو وہ مجھے اپنے ہاں بڑا اونچا رتبہ دے دے گا.... میرے سلجوقی دوست! میں نے دوسروں کی بیٹیاں اغوا کر کے امام کو بھیجی ہیں لیکن جب اپنی ان بھتیجیوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنا مرا ہوا بھائی یاد آ جاتا ہے۔ میں انہیں چھپا چھپا کر رکھتا ہوں۔“

”میں مسلمان ہوں“ — شمیر ابلک نے کہا — ”میں خوبصورت لڑکیوں کے لالچ میں نہیں آؤں گا نہ ہمیں اجازت ہے کہ کسی عورت کو اپنی مرضی سے اپنے پاس رکھ لیں۔“

”یہ میں جانتا ہوں“ — ابو جندل نے کہا — ”مجھے معلوم ہے کہ تم ان لڑکیوں کو اپنے سالار کے حوالے کر دو گے اور وہ چاہے گا تو خود ان کے ساتھ نکاح پڑھالے گا یا اپنے دو لشکریوں کے ساتھ ان کی شادیاں کر دے گا لیکن کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ ان دونوں کو تم اپنے پاس رکھ لو؟ ایک کو بیوی اور دوسری کو داشتہ بنا لو۔ میں نے جس خزانے کا اشارہ دیا تھا وہ انہی لڑکیوں کی خاطر ہے۔ مجھے تو قتل ہونا ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ ان لڑکیوں کو خالی ہاتھ اس دنیا میں چھوڑ جاؤں۔“

”کیا تم میری بات نہیں سمجھتے؟“ — شمیر ابلک نے کہا — ”میں اپنی مرضی سے کسی عورت کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اگر تم ان دونوں لڑکیوں کو میرے حوالے کر دے گے تو مجھے یہ لڑکیاں چھوڑنی پڑیں گی یا اپنی فوج چھوڑنی پڑے گی۔“

”کیا ملتا ہے تمہیں اس فوج میں؟“ — ابو جندل نے کہا — ”اور کیا ملا ہے تمہیں مسلمان ہو کر!.... تم سمجھتے ہو کہ تم نے اپنی عاقبت سنواری ہے لیکن میں تمہاری دنیا بھی سنوار دوں گا.... پہلے میری پوری بات سن لو پھر انکار یا اقرار کرنا۔“

”وہ خزانہ تم خود کیوں نہیں لے لیتے؟“ — شمیر ابلک نے پوچھا۔

”یہ میری زندگی کی آخری رات ہے“ — ابو جندل نے جواب دیا — ”صبح تک میں قتل ہو چکا ہوں گا۔ اگر تم مجھے قتل ہونے سے بچا لو گے تو بھی میں اکیلا اس خزانے تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ میرے تمام ساتھی مارے جا چکے ہیں۔ مجھے کم از کم چار آدمیوں کی ضرورت ہے۔ وہ خزانہ یہاں قلعے کے کہیں قریب نہیں ہے۔ تم میرا ساتھ دو گے اور چار پانچ سپاہی رازداری سے ساتھ لے آؤ گے تو ہم اس خزانے تک پہنچ کر وہاں سے

نکل لیں گے۔“

”اور وہاں لے جا کر تم مجھے اور میرے سپاہیوں کو بڑی آسانی سے قتل کر سکو گے۔“
— شمر ابلک نے کہا — ”اور اگر میں وہ خزانہ تمہارے ساتھ مل کر نکال بھی لوں تو کیا
میں واپس اپنی فوج میں آسکوں گا؟“

”پھر فوج میں واپس آنا ہی نہیں۔“ — ابو جندل نے پُر اعتماد لہجے میں کہا — ”ہم
دونوں ملک ہندوستان یا دیارِ حجاز یا مصر کو چلے جائیں گے اور وہاں شاہانہ زندگی بسر کریں
گے.... پہلے میرے گھر چلو اور میری بھتیجیوں کو دیکھ لو۔ مجھ سے ڈرو نہیں، میں تمہیں
دھوکا نہیں دوں گا۔ مجھے باطنی اور ڈاکو سمجھ کر قتل کر دو۔ قتل سے پہلے میں تمہیں اُس
جگہ کا راستہ اور نقشہ اچھی طرح سمجھا دوں گا لیکن تم میرے بغیر وہاں تک پہنچ نہیں سکو
گے۔“

”وہ خزانہ آیا کہاں سے؟“ — شمر ابلک نے پوچھا — ”اور وہ اُس جگہ کیوں
رکھا ہے جہاں تم بتا رہے ہو؟“

”آج میں ہر بات سچی اور کھری کر رہا ہوں۔“ — ابو جندل نے کہا — ”میں پیشہ در
ڈاکو اور راہزن ہوں۔ یہ میرا آبائی پیشہ ہے۔ میرے باپ کا بھی یہی کام تھا اور دادا کا
بھی اور شاید دادے کا دادا بھی یہی کام کرتا ہو گا۔ اس علاقے میں حسن بن صباح کا عقیدہ
پھیل گیا اور اس کے اپنے ڈاکو قافلوں کو لوٹنے لگے تو میں مجبور ہو کر اس کے گروہ میں
شامل ہو گیا۔ اب ہم لوگ الگ تھلگ قافلوں کو نہیں لوٹ سکتے تھے۔ ہمیں حسن بن
صبح کی پشت پناہی اور مدد حاصل ہے۔ میں نے حسن بن صباح کے پاس جا کر اس کے
ہاتھ پر بیعت کر لی اور اُس کا مُرید ہو گیا لیکن آج تک مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ ہم
جتنا مال لوٹتے تھے وہ سارے کا سارا قلعہ الموت بھیجنا ہوتا تھا۔ اس میں سے ہمیں تھوڑا
ساحصہ مل جاتا تھا۔ میں نے اپنے پرانے گروہ کے آدمیوں سے کہا کہ لوٹ مار ہم کریں
اور خطرے میں ہم اپنے آپ کو ڈالیں اور مال سارا دوسرے لے جائیں تو کیوں نہ ہم یہ
کام ہی چھوڑ دیں یا اپنے امام کو دھوکا دیں اور آدھے سے زیادہ مال خود رکھا کریں....

”میرا پرانا گروہ بھی امام کے گروہ کے ساتھ مل گیا تھا۔ میں نے اپنے ان پرانے
ساتھیوں کے ساتھ یہ بات کی تو انہیں میری بات اچھی لگی۔ ہم نے یوں کرنا شروع کر دیا
کہ کسی قافلے کو لوٹتے تھے تو لوٹ مار کے دوران میرے گروہ کے دو تین آدمی سونا

چاندی اور نقدی اپنے پاس چھپا کر وہاں سے کھسک جاتے اور بہت دُور نکل جاتے تھے۔ یہ مال وہ کہیں زمین میں دبا دیتے تھے۔ کچھ دنوں میں اپنے کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں جاتا اور مال نکال کر اُس جگہ پر پہنچا دیتا تھا جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔ ہم لوگ ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دیا کرتے۔ آج تک میرے کسی آدمی نے یوں نہیں کیا کہ یہاں سے غائب ہو جاتا اور اُس جگہ سے خزانہ نکال لے جاتا۔ یہ ہے حقیقت اس خزانے کی۔“

”یہ تو مان لیا“ — شمیر ابلک نے کہا — ”لیکن میں تم پر اعتبار کس طرح کروں؟ تم باطنی ہو اور باطنی پر بھروسہ کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ انسان قتل ہو جاتا ہے۔“

”میرے بھائی!“ — ابو جندل نے کہا — ”میرا کوئی مذہب نہیں نہ کوئی عقیدہ ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ حسن بن صباح ہماری پشت پناہی کرتا تھا اور پناہ بھی دیتا تھا.... اب ایک کھری سی بات سن لو۔ تم مسلمان ہو اور اس امید پر کوئی بُرا کام نہیں کرنا چاہتے کہ مرجاؤ گے تو خدا تمہیں جنت میں داخل کر دے گا۔ خدا نے آسمانوں میں جنت بنائی ہے لیکن ساری عمر نیک پاک رہو گے تو تم اس جنت کے حقدار بن سکو گے۔ اس کا کیا اعتبار کہ خدا کی جنت کا وجود ہے کہ نہیں۔ تم یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتے کہ تم نے کبھی گناہ نہیں کیا۔ انسان نادانستہ طور پر بھی گناہ کر گزرتا ہے۔ حسن بن صباح نے زمین پر جنت بنا دی ہے۔ میں نے یہ جنت دیکھی ہے لیکن اس میں جانے کی کبھی خواہش نہیں کی۔ کیوں نہ ہم اپنی جنت خود بنالیں۔ ہم بنا بھی سکتے ہیں۔ وہ خزانہ ایسا ہے جو ہماری تین نسلیں عیش کرتی رہیں تو بھی ختم نہ ہو گا۔“

شمیر ابلک کو چپ سی لگ گئی اور اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف پتہ لگتا تھا کہ وہ قائل ہو گیا ہے اور گہری سوچ میں چلا گیا ہے۔

”میرے سلجوقی دوست!“ — ابو جندل نے کہا — ”میں تمہیں ایک اور بات بھی بتا دیتا ہوں۔ خوش نہ ہو کہ تم نے قلعہ فتح کر لیا ہے۔ امام شیخ الجبل کا لشکر آہی رہا ہو گا۔ اس لشکر میں وہ فدائی ضرور ہوں گے جو شیخ الجبل کے نام پر جانیں قربان کرنے پر فخر کیا کرتے ہیں۔ تمہارے لشکر میں کوئی ایک آدمی بھی زندہ نہیں رہے گا۔ اس قلعے میں خزانہ بھرا ہوا ہے جو تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ تہہ خانے میں ہے لیکن تمہیں یہاں

سوائے موت کے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ سارا خزانہ اگر یہاں سے مرو چلا بھی گیا تو تمہیں کیا ملے گا؟.... کچھ بھی نہیں.... یہ سلطان کی ملکیت ہو گا۔ میرے گھر چلو، تم دیکھو گے کہ میری دو بھتیجیوں کے سوا وہاں کوئی بھی نہیں۔ ویسے بھی ہمیں گھر جانا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری بھتیجیوں کو تمہارے دوسرے لشکری لے جائیں اور سلار کے حوالے کر دیں۔ تم جب ان لڑکیوں کو اپنے سلار کی ملکیت میں دیکھو گے تو پچھتاؤ گے کہ تم نے پہلے انہیں کیوں نہ دیکھ لیا اور کیوں نہ انہیں غائب کر دیا۔“

”ہاں!“ — شمیر ابلک نے کہا — ”ہمیں چلنا چاہئے۔ میرے سپاہی یہ نہ سوچیں کہ معلوم نہیں ہم آپس میں کیا ساز باز کر رہے ہیں۔ تم یہیں بیٹھو، میں ان کے ساتھ بات کر لوں۔“

شمیر ابلک ابو جندل کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر باہر نکلا اور اس نے اپنے چاروں سپاہیوں کے ساتھ یہ ساری بات کی جو اس کے ساتھ ابو جندل نے کی تھی۔ وہ خود ذمہ دار عہدیدار تھا لیکن قائل ہو گیا تھا، یہ تو سپاہی تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کا عہدیدار خزانے اور دو لڑکیوں کے چکر میں آ گیا ہے تو اس کا ساتھ دینا ہی بہتر ہے۔

”کیا آپ نے یقین کر لیا ہے کہ یہ شخص ہمیں دھوکا نہیں دے گا؟“ — ایک سپاہی نے پوچھا۔

”یہ اکیلا ہے اور ہم پانچ ہیں“ — شمیر ابلک نے کہا — ”اور ہم نے اسے نتہ کر دیا ہے.... میرا ساتھ دو اور اس بات کو راز میں رکھنا۔“

شمیر ابلک بُرج میں گیا اور ابو جندل کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ شمیر ابلک نے اسے کہا کہ وہ ایسے راستے سے اپنے گھر کو چلے کہ انہیں کوئی دیکھ نہ سکے۔ ابو جندل اس قلعے کی بھول حلیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ انہیں قلعے کی دیوار کے ایسے جیسے میں لے گیا جہاں کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ ابو جندل انہیں ادھر سے اتار کر ایک اندھیرے راستے سے اپنے گھر لے گیا۔

اُس نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے بار بار دستک دی تو بھی اندر خاموشی رہی۔ وہ سمجھ گیا کہ لڑکیاں ڈر کے مارے دروازہ نہیں کھول رہیں۔ آخر اس نے بلند آواز سے لڑکیوں کو پکارا تب دروازہ کھلا۔

ابو جندل نے اندر جاتے ہی کہا کہ گھبراہٹ میں یہ اپنے دوست ہیں۔
 شمیر ابلیک نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ وہ صحن میں ہی رہیں اور خود وہ ابو جندل
 کے ساتھ ایک کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں فانوس جل رہا تھا۔ ابو جندل نے دونوں
 لڑکیوں کو بلایا۔ شمیر ابلیک نے لڑکیوں کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ تو بالکل جوان اور بہت
 ہی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔

”دیکھو لڑکیو!“ — ابو جندل نے لڑکیوں سے کہا — ”یہ مسلمان فوج کے کماندار
 ہیں۔ انہوں نے میری جان بخشی کر دی ہے اور تمہاری ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی
 ہے۔“

دونوں لڑکیاں شمیر ابلیک کی طرف لپکیں اور اپنے بازو اس کے گلے میں ڈال دیئے
 اور ایک اس کے ایک طرف اور دوسری دوسری طرف بیٹھ گئی اور اپنے گال اس کے
 گالوں سے ملنے لگیں جیسے وہ ان کے خون کے رشتے کا کوئی عزیز ہو۔ ان لڑکیوں نے ایسے
 والہانہ پن کا عملی طور پر اظہار کیا کہ شمیر ابلیک تو جیسے پھٹا ہوا ہو گیا ہو۔

باہر کا دروازہ بڑی زور سے کھلا اور کسی کی آواز آئی — ”کہاں ہے ابو جندل....
 باہر آ جاو باطنی ڈاکو“ — دو آدمی بڑی تیز تیز چلتے اس کمرے میں آ گئے جہاں شمیر ابلیک
 ابو جندل کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ان آدمیوں کے آنے سے پہلے ہی شمیر ابلیک اٹھ کھڑا
 ہوا تھا اور لڑکیاں دوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ان آدمیوں نے شمیر ابلیک
 کو دیکھا تو ٹھٹھک کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ اس کے اپنے لشکر کے دو لشکری تھے۔

”میں اس گھر کی تلاشی لے چکا ہوں“ — شمیر ابلیک نے کہا — ”میرے ساتھ
 چار لشکری ہیں۔ یہاں کوئی باطنی نہیں نہ کوئی ڈاکو ہے۔ یہ شخص تاجر ہے اور چند دنوں
 بعد یہاں سے چلا جائے گا.... تم لوگ جاؤ۔ میں ذرا اور تسلی کر کے آؤں گا۔“
 لشکریوں نے دیکھا کہ ان کا ایک عہدیدار پہلے ہی یہاں موجود ہے تو وہ اس کو سلام
 کر کے چلے گئے۔

”اب بتاؤ ابو جندل!“ — شمیر ابلیک نے پوچھا — ”وہ جگہ کہاں ہے؟“
 ابو جندل نے اسے بتانا شروع کر دیا کہ وہ جگہ کتنی دور ہے اور وہاں تک ہم کس
 طرح پہنچیں گے اور وہ علاقہ کیسا ہے وغیرہ وغیرہ۔

”یہ دونوں لڑکیاں ہمارے ساتھ ہوں گی“ — ابو جندل نے کہا — ”ہم سب

گھوڑوں پر سوار ہوں گے۔ دو گھوڑے فالتو ساتھ ہونے چاہئیں۔ دو بڑے وزنی بکس ہیں۔ ایک ایک ان گھوڑوں پر لاد لیں گے اور کچھ سہلان ہم اپنے اپنے گھوڑوں پر رکھ لیں گے۔“

”ہمیں ایک دو دنوں میں ہی نکل جانا چاہئے“ — شمیر ابلیک نے کہا — ”دو تین دن اور باہر سے لاشیں اٹھانے اور انہیں ٹھکانے لگانے کا کام ہوتا رہے گا۔ یہاں سے نکل جانے کے لئے یہ موقع اچھا ہے۔“

ابو جندل نے کہا کہ دو فالتو گھوڑوں کا انتظام وہ کر لے گا اور راستے کی خوراک کا بندوبست بھی وہی کرے گا۔ اُس کے پاس گھوڑوں کی کمی نہیں تھی۔ شمیر ابلیک اپنے چاروں سپاہیوں کو ساتھ لے کر وہاں سے چلا گیا۔ اُس نے سپاہیوں کو بھی تیار کر لیا تھا۔ انہوں نے تیار تو ہونا ہی تھا کیونکہ شمیر ابلیک نے انہیں اچھا خاصا حصہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔



سلطنت سلجوقیہ کے دار الحکومت مرو میں سلار اور یزی کی کامیابی کی دعائیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں لیکن سلطان کے محل میں مایوسی بھی پیدا ہونے لگی تھی۔ محاصرے کو آٹھ مہینے گزر چلے تھے اور وسم کوہ سے اموات کی جو اطلاعاتیں آرہی تھیں، وہ حوصلہ شکن تھیں۔ آخر منزل اور بن یونس دو ہزار گھوڑ سوار لے کر ایک خاص منصوبے کے تحت گئے تو مایوسی میں کمی آنے لگی لیکن ابھی تک وسم کوہ سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ سلطان برکیارق اور اس کے دونوں بھائی محمد اور سنجر صبح اٹھتے تو سب سے پہلے یہ پوچھتے کہ وسم کوہ سے کوئی قاصد آیا ہے یا نہیں۔ آخر ایک روز قاصد آگیا اور وہ بازو لہرا کر اعلان کرتا چلا آ رہا تھا کہ وسم کوہ کا قلعہ فتح کر لیا گیا ہے اور بانیوں کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔

سلطان تک خبر نہیں پہنچی تھی کہ یہ جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ شہر میں جشن کا سماں پیدا ہو گیا اور جب یہ خبر سلطان کے محل میں پہنچی تو وہاں بھی خوشیاں منانے لگیں۔ شمونہ اور اس کی ماں میمونہ بھی دوڑی دوڑی سلطان برکیارق تک گئیں۔ سلطان کے محل میں شمونہ کو خصوصی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

”میں وہاں خود جاؤں گا“ — سلطان برکیارق نے کہا — ”ان مجاہدین کو خراج

تحسین پیش کرنے کے لئے میں خود وہاں جاؤں گا۔ یہ فتح کوئی معمولی فتح نہیں۔“
 ”میں بھی ساتھ جاؤں گی سلطان محترم!“ — شمونہ جو پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی بولی
 — ”میں حسن بن صبح کے پیروکاروں کی لاشیں اور ان کی ہڈیاں دیکھنا چاہتی ہوں۔“
 شمونہ دراصل منزل آفندی کے لئے پریشان تھی۔ منزل اور شمونہ نے عہد کر رکھا
 تھا کہ پہلے حسن بن صبح کا بیڑہ غرق کریں گے اور اس کے بعد شلوی کریں گے۔ منزل
 نے ایک فتح حاصل کر لی تھی۔ سلطان برکیارق نے شمونہ کو اجازت دے دی کہ وہ اس
 کے ساتھ جاسکتی ہے۔

جس وقت سلار اور یزی کا لشکر اور وہ گھوڑ سوار لشکر جسے منزل آفندی لے کر گیا
 تھا، دسم کوہ کے باہر مانیوں کو گھیرے میں لے چکے تو ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ کسی کو
 کسی کا ہوش نہ رہا، اس قیامت خیزی میں تین باطنی لڑائی سے نکل گئے۔ تینوں زخمی
 تھے۔ انہوں نے قلعہ الموت کا رخ کر لیا۔ وہ حسن بن صبح کو بتانا چاہتے تھے کہ ان کے
 ساتھ کیا ہوا ہے۔

حسن بن صبح تو جیسے قلعہ دسم کوہ کو بھول ہی گیا تھا۔ وہ کبھی پوچھ لیتا تھا کہ دسم کوہ
 کا محاصرہ ٹوٹا کہ نہیں۔ اُسے ہر بار اچھی خبر سنائی جاتی تھی کہ محاصرہ ٹوٹا بھی نہیں اور
 کامیاب بھی نہیں ہوا اور مسلمانوں کے لشکر کا جلدی نقصان مسلسل ہوتا چلا جا رہا ہے۔
 ”یہ محاصرہ کامیاب نہیں ہو گا“ — حسن بن صبح ہر بار یہی کہتا تھا۔

ایک دن یہ تینوں زخمی قلعہ الموت پہنچ گئے اور انہیں فوراً حسن بن صبح کے
 کمرے میں بھیج دیا گیا۔ انہوں نے کہا، یا امام! ہم دھوکے میں مارے گئے ہیں۔ انہوں
 نے تفصیل سے سنایا کہ ان کے ساتھ کیا دھوکا ہوا ہے اور وہ سلجوقی فوج کی گھوڑ سوار
 کمک کو اپنی فوج سمجھ بیٹھے تھے اور سلجوقیوں کی باتوں میں آ گئے۔

”یا شیخ الجبل!“ — ایک مشیر نے کہا — ”اگر ہم پہلے ہی محاصرے پر حملہ کر
 دیتے تو آج یہ خبر نہ سننا پڑتی۔ اب بھی کچھ نہیں گیا، ہمیں اسی وقت کوچ کر جانا چاہئے
 اور ہم قلعہ چھڑوا لیں گے۔“

”میں اپنی طاقت ضائع نہیں کروں گا“ — حسن بن صبح نے مسکراتے ہوئے کہا
 — ”ہمارے پاس ایسی فوج ہے ہی نہیں جس سے ہم حملہ کریں۔ نہ میں ایسی فوج
 بناؤں گا۔ ہمارا ہر آدمی لڑ سکتا ہے لیکن ہم فوج کی طرح نہیں لڑیں گے۔ ہمارے ہر

فدائی کے پاس ایک خنجر یا ایک چھری ہونی چاہئے۔ اس سے زیادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس ابھی چودہ قلعے ہیں۔ یہ کلنی ہیں۔ سلجوقی سلار نے مجھے بھی دھوکا دیا تھا کہ وہ قلعہ ملاذخان کی طرف ہرشدی کر رہا ہے لیکن میں نے توجہ نہیں دی اور نہ کبھی توجہ دوں گا۔

”تو کیا ہم اس نقصان کو برداشت کر لیں یا الام؟“ — ایک اور مشیر نے پوچھا۔
 ”ضروری نہیں کہ ہم ایک قلعے کے بدلے قلعہ ہی لیں گے“ — حسن بن صلیح نے کہا۔
 ”ہم اس قلعے کی پوری قیمت سلجوقیوں سے وصول کر لیں گے اور دسم کوہ میں ہمارا جو مل و دولت گیا ہے وہ بھی ہم پورا کر لیں گے.... اب میری بات غور سے سن لو اور اسی وقت اس پر عمل شروع ہو جائے.... اب اپنے گروہ رے اور شلہ در والی شاہرہ پر بھیج دو۔ دسم کوہ کی قیمت مسلمان قلعوں سے وصول کرو اور وہ جس خزانے پر قابض ہو گئے ہیں اس سے دگنا خزانہ لے کر پورا کرو۔ لے شہروں کے اندر کسی امیر کبیر تاجر یا جاگیردار کے گھر ڈاکہ ڈالنا پڑے تو یہ کام بھی کر گزرو۔ مسلمانوں کی قتل و غارت اور تیز کرو۔“

حسن بن صلیح کے دماغ کو اس کے وہ مشیر اور مصاحب بھی نہیں سمجھ سکتے تھے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ بڑ نہیں ہانکا کرتا تھا اور کوئی بات غصے کی حالت میں بلا سوچے سمجھے زبان پر نہیں لاتا تھا۔ اس کی فطرت میں سوائے اہلیست کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے صحیح فیصلے پر پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ اس کی فطرت اس کے دماغ کی رہنمائی کرتی تھی۔

اس نے رے اور شلہ در کے ارد گرد کے علاقوں کو رہنمی، لوٹ مار اور قتل و غارت کے لئے اس لئے منتخب کیا تھا کہ رے تو مسلمانوں کی اکثریت کا شہر تھا اور اس شہر کا الگ حاکم یا امیر تھا۔ شلہ در کی اہمیت یہ تھی کہ اس شہر میں تقریباً آدمی آبلوی مسلمانوں کی تھی اور یہ مسلمان باغیوں سے باہم متعلوم رہتے تھے۔ اس کے علاوہ شلہ در میں اس کا استوا احمد بن غفارش رہتا تھا اور حسن بن صلیح نے سغلی عمل اور اہلیست کی تربیت یہیں سے حاصل کی تھی اور اس کی اہمیت کا سفر یہیں سے شروع ہوا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سلجوقی سلطان کی نظر شلہ در پر لگی رہتی ہے اور کسی بھی روز شلہ در پر سلجوقی حملہ کر دیں گے۔

ابو جندل پیشہ ور ڈاکو تھا اور اس کا اثر و رسوخ چلتا تھا۔ اس کے گروہ کا کوئی ایک بھی آدمی زندہ نہیں رہا تھا لیکن وہ پھر بھی انتظامات کر لیتا تھا۔ دسم کوہ کی جو صورت حل بنی ہوئی تھی، اس میں انتظامات کر لیتا کوئی مشکل نہیں تھا۔ وہاں اندر اور باہر لاشیں ہی لاشیں تھیں اور ان لاشوں میں ابھی تک زخمی بے ہوش پڑے تھے جنہیں مرا ہوا سمجھا جا رہا تھا۔ شہر کی عورتیں اور بچے ان لاشوں کو پہچانتے پھر رہے تھے۔ سلجوقی فوج کے آدمی بھی اپنے سالار کے حکم کے مطابق ان لاشوں میں مسلمانوں کی لاشیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لا رہے تھے۔

سورج غروب ہونے ہی والا تھا جب شمیر ابلک ایک گھوڑے پر سوار ان بکھری ہوئی لاشوں کے ارد گردیوں پھر رہا تھا جیسے نگرانی کر رہا ہو۔ اس نے گھوڑے کا رخ ایک طرف کیا اور آہستہ آہستہ گھوڑے کو چلاتا کچھ آگے ایک ٹیکری کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہاں اس نے گھوڑے کو ہلکی سی ایڑ لگائی اور گھوڑا دوڑا دیا۔

اُس کے چاروں سپاہی ایک ایک کر کے مختلف سمتوں سے نکلے اور اسی طرح دوڑ جا کر گھوڑے دوڑائے اور اُس جگہ پہنچ گئے جہاں ابو جندل پہلے موجود تھا۔ اُس کی دونوں ہتھیلیاں اُس کے ساتھ تھیں اور اُس کے ساتھ دو کی بجائے تین فالتو گھوڑے تھے۔ وہاں گھوڑوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لڑائی میں جو گھوڑا سوار تھے مارے گئے تھے، ان کے گھوڑے میدان جنگ سے بھاگ کر ارد گرد کے جنگل میں چلے گئے تھے۔ سالار اور یزی کے نوجوان گھوڑوں کو پکڑ پکڑ کر لا رہے تھے لیکن ابو جندل نے اس سے پہلے ہی تین گھوڑے پکڑ لئے اور اُس جگہ لے گیا تھا جو جگہ ان سب نے مقرر کی تھی۔

ابو جندل نے شمیر ابلک سے کہا تھا کہ دو کمائیں اور تیروں کے چار پانچ ترکش بھرے ہوئے ہونے چاہئیں۔ یہ چاروں سپاہی تجربہ کار تیر انداز تھے۔ وہ دو کمائیں اور پانچ سات ترکش ساتھ لے گئے تھے۔ ان کے پاس تلواریں تھیں اور برچھیاں بھی۔ ایک گھوڑے پر کھانے پینے کا سامان لدا ہوا تھا جو بہت دنوں کے لئے کافی تھا۔ وہاں پانی کی کمی نہیں تھی۔

وہ جو نہی اکٹھے ہوئے، اپنی منزل کو چل پڑے۔ انہوں نے گھوڑوں کی رفتار خاصی تیز رکھی۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ صبح ہونے تک اتنی دور نکل جائیں کہ تعاقب کا

خطرہ نہ رہے۔ تعاقب کا خطرہ بہت ہی کم تھا کیونکہ یہ سب جس طرح ایک ایک کر کے وسم کوہ سے نکلے تھے، انہیں کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ وہ جب اکٹھے ہوئے تھے تو ان پر شام نے اپنا دھندلا پردہ ڈال دیا تھا جو بڑی تیزی سے رات کی تاریکی جیسا سیاہ ہو گیا تھا۔ ان کے پاس تین چار مشطیں بھی تھیں جو انہوں نے جلائی نہیں کیونکہ مشعلوں کے شعلے دور سے ان کی نشاندہی کر سکتے تھے۔ ان مشعلوں کی ضرورت منزل پر پیش آنی تھی۔

”شمیر ابلک!“ — راستے میں ابو جندل نے کہا — ”اگر تمہیں میری نیت پر شک ہے تو میری تلوار اپنے پاس رکھ لو۔ یہ دل میں بٹھا لو کہ ہم اب ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ ہمارا انجام اچھا ہو گا یا بُرا، وہ ہم سے کسی ایک کے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے ہو گا۔“

”نہیں میرے ہم سفر!“ — شمیر ابلک نے کہا — ”ہم مسلمان ہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کے خلاف دل میں ذرا سا بھی شک و شبہ یا کدورت رکھیں گے تو ہم اپنی منزل تک پہنچ ہی نہیں سکیں گے اور اگر پہنچ گئے تو اس مہم میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔“

”ایک بات اور کہوں گا شمیر!“ — ابو جندل نے کہا — ”جس طرح تم نے دل سے شک و شبہ اور کدورت نکال دی ہے اسی طرح دل سے یہ بھی نکال دو کہ تم مسلمان ہو اور میرا مذہب یا عقیدہ کچھ اور ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں کسی مجبوری کے تحت حسن بن صباح کا پیروکار بنا تھا۔ میں اُسے دھوکا دیتا رہا ہوں۔ تم بھی مذہب کی اس لکیر کو مٹا ڈالو۔ اگر یہ تمہارے لئے مناسب نہیں تو مجھے بھی مسلمان سمجھ لو۔“

”ہاں ابو جندل!“ — شمیر ابلک نے کہا — ”یہ میرے لئے مشکل ہے کہ مذہب کی لکیر کو مٹا ڈالوں۔ اس سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ میں تمہیں مسلمان سمجھوں اور تم بھی اپنے آپ کو دلی طور پر مسلمان سمجھتے رہو۔“

”اپنے آپ کو فریب نہ دو شمیر!“ — ابو جندل نے کہا — ”تم نے شاید ابھی محسوس نہیں کیا کہ تم اب نام کے مسلمان رہ گئے ہو۔ دل پر جب زرو جواہرات کا اور خوبصورت عورت کا قبضہ ہو جاتا ہے تو دل میں مذہب پرانے زخم کے نشان کی طرح باقی رہ جاتا ہے۔ اب اپنے آپ کو یہ دھوکہ نہ دو کہ تم وہ مسلمان رہ گئے ہو جو وسم کوہ کی روانگی سے پہلے ہوا کرتے تھے۔ میں نے تمہیں اُس رات کو بھی کہا تھا جب ہم پہلے ملے تھے کہ حسن بن صباح نے جو جنت بتائی ہے وہ عارضی ہے۔ یہ شخص مرجائے گا تو آہستہ

آہستہ اس کی جنت بھی اُڑ جائے گی اور وہ جنت جس کا وعدہ ہمیں خدا نے دیا ہے وہ آسمانوں میں ہے اور معلوم نہیں کہ ہے بھی یا نہیں۔ جنت وہی ہوتی ہے جو انسان اپنے ہاتھوں بناتا ہے۔ میں تمہاری زندگی کو جنت کا نمونہ بنادوں گا۔

شمیر اب تک لشکری تھا یا اسے مجاہد کہہ لیں، عالم دین نہیں تھا کہ یہ قلعہ سمجھ سکتا کہ انسان مل اور مذہب میں سے ایک ہی چیز کا پیجاری ہو سکتا ہے۔ مسلمان کے لئے ملدار ہونا گناہ نہیں لیکن دل میں مل و دولت کا لالچ رکھنا ایسی گمراہی ہے کہ انسان صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے۔ وہ اپنے مذہب کو بھی دل میں زندہ رکھنا چاہتا تھا لیکن یہ حقیقت قبول نہیں کر رہا تھا کہ دل میں جب زر و جواہرات کی چمک آ جاتی ہے تو اس دل میں دین کی شمع بجھ جایا کرتی ہے۔ شمیر اب تک مسرور اور مطمئن چلا جا رہا تھا۔ قافلے کم ہو رہے تھے اور رات گزرتی جا رہی تھی۔

صبح طلوع ہوئی تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ ہر ابھرا جنگل اور سرسبز ٹکریاں دُور پیچھے رہ گئی تھیں اور وہ ایسے علاقے میں داخل ہو گئے تھے جہاں دیواروں کی طرح چھوٹی بڑی پہاڑیاں اور چٹانیں کھڑی تھیں۔ ان کا رنگ کہیں سیلیٹی، کہیں نیلا اور کہیں سیاہی مائل تھا۔ ان کی شکلیں بھی عجیب و غریب تھیں۔ ابو جندل اس علاقے سے واقف تھا اور اس میں سے گزرنے کا راستہ بھی جانتا تھا۔ شمیر اب تک اور اس کے سپاہیوں کے لئے یہ علاقہ اور اس کے خدوخل ڈراؤنے سے تھے۔ کہیں کہیں ایک آدھ درخت کھڑا نظر آتا تھا ورنہ وہاں گھاس کی پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔

”یہ تو جنت اور بدروحوں کا دیس معلوم ہوتا ہے“ — شمیر اب تک نے ابو جندل سے کہا — ”میں نے ایسا بھد اور ڈراؤنا علاقہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔“

”ہاں شمیر!“ — ابو جندل نے کہا — ”لوگوں میں یہی مشہور ہے کہ اس علاقے میں بدروحیں اور چڑیلیں اور جنت رہتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک سچ ہے لیکن اس کے اندر زہریلی چیزیں رہتی ہیں.... اب ہمیں کچھ دیر آرام کر لینا چاہئے۔ تعاقب کا خطرہ ختم ہو گیا ہے۔“



یہ سارا علاقہ پتھر ملا تھا۔ اس کے اندر جا کر ابو جندل نے ایک جگہ دیکھی جو ذرا ہموار تھی اور وہاں پتھر بھی کم تھے۔ وہاں دو درخت بھی تھے جن کی صرف شاخیں تھیں، پتا

ایک بھی نہیں تھا۔ انہوں نے گھوڑے ان دو درختوں کے ساتھ باندھ دیئے اور الگ ہٹ کر بیٹھ گئے۔

رات بھر کے جاگے ہوئے مسافر زمین پر لیٹ گئے اور کچھ ہی دیر بعد گہری نیند سو گئے۔

اچانک ایک گھوڑا بڑی زور سے ہنسیا اور فوراً بعد تمام گھوڑے اس طرح ہنسنے لگے جیسے کوئی بہت بڑا خطرہ آپڑا ہو۔ ان کے سوار جاگ اٹھے اور دیکھا کہ گھوڑے رسیاں تڑانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کی اچھل کود سے پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے کچھ دیکھ لیا ہے۔ وہ سب دوڑ کر گئے اور دیکھا۔ دس بارہ قدم دور ایک سیاہ کالا ناگ آہستہ آہستہ رینگتا جا رہا تھا۔

سانپ کو دیکھ کر ہر جانور اسی طرح ڈر جاتا اور بھاگ اٹھتا ہے۔ بعض گھوڑے تو سانپ کو دیکھ کر چلتے چلتے رک جاتے اور اس طرح کانپنے لگتے ہیں کہ ابھی گر پڑیں گے۔ ابو جندل نے ایک کمن اٹھائی اور اس میں تیر ڈالا۔ سانپ پر تیر چلایا لیکن تیر اس کے قریب لگا۔

سانپ کو بھاگ جانا چاہئے تھا لیکن وہ رک گیا اور اس نے پھن پھیلا دیا اور پھنکارنے لگا۔ اس سے اس کے غصے کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک سپاہی نے ابو جندل کے ہاتھ سے کمن لے لی اور اس میں تیر ڈال کر چلایا تو سانپ کے پھن کے پار ہو گیا۔ سانپ کچھ دیر ٹوٹ پوٹ ہوتا رہا اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔

آسمان پر گہرے بادل تو پہلے ہی منڈلا رہے تھے لیکن ان مسافروں کو معلوم نہ تھا کہ جس بے آب و گیلہ پہاڑی کے دامن میں انہوں نے پڑاؤ کیا ہے اس کے پیچھے سے سیاہ کالی گھٹا اٹھتی آرہی ہے۔ لوہر سانپ مرا اور بڑی زور کی گرج سنائی دی اور پھر بجلی اور اس کے ساتھ ہی اس کی ایسی کڑک سنائی دی جیسے چٹکن ٹوٹ پھوٹ گئی ہو۔ سب کے دل دھل گئے۔ گھوڑے جو سکون میں آگئے تھے پھر بدکنے لگے۔

بجلی رہ رہ کر چمکتی اور کڑکتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بجلیوں کو اس کالے ناگ کی موت پر غصہ آگیا ہو۔ آسمان بڑی تیزی سے تاریک ہونے لگا اور گھٹا دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کے خوبصورت بادلوں کے ٹکڑوں کو ٹگتی آگے ہی آگے بڑھتی گئی اور جب بارش شروع ہوئی تو لگتا تھا گھٹا کا سینہ پھٹ گیا ہو۔ ایسی موسلا دھار بارش کہ ایک ہاتھ دور کچھ

نظر نہیں آتا تھا اور جل تھل ہو گیا۔

وہاں بارش سے بچنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ابو جندل نے انہیں بتایا کہ یہاں غار ہیں لیکن خاصا آگے ہیں جہاں تک ہم اتنی جلدی نہیں پہنچ سکیں گے، اتنی دیر میں یہ گھٹا آگے نکل جائے گی..... وہ وہیں کھڑے رہے اور بارش کے قطرے ان پر اس طرح پڑتے رہے جیسے کوئی کنکریاں مار رہا ہو۔

”یہ سانپ کسی کی بدروح معلوم ہوتی ہے“ — ایک سپاہی نے کہا — ”اسے تیر لگائی تھا کہ ہم پر یہ طوفان ٹوٹ پڑا“۔

”کسی وہم میں نہ پڑو میرے دوستو!“ — ابو جندل نے کہا — ”میں اس علاقے میں سے اتنی بار گزرا ہوں کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا اور یوں لگتا ہے جیسے یہ میری زندگی کا راستہ ہے۔ ڈرو نہیں بارش تھم جائے گی۔“

”میں نے اتنی تیز بارش پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی“ — شمیر البلک نے کہا۔
”شمیر بھائی!“ — ابو جندل نے اسے بڑی ہی دھیمی آواز میں کہا جیسے وہ راز کی کوئی بات کہہ رہا ہو — ”میں ڈرانا نہیں چاہتا لیکن یہ سن لو کہ یہ کالا سانپ اور یہ کلی گھٹا اور یوں کڑکتی ہوئی بجلیاں اچھا شگون نہیں۔ خدا کرے ہماری مہم کامیاب ہو جائے لیکن سفر کی ابتدا اچھی نہیں ہوئی۔“

”میں دعا کروں گا“ — شمیر البلک نے کہا — ”خدا ہمیشہ میری دعا سن لیا کرتا ہے۔“

”تم پہلے کی باتیں کرتے ہو“ — ابو جندل نے کہا — ”اب خدا تمہاری نہیں سنے گا۔ اب کوئی مصیبت آپڑے تو مجھے بتاؤ یا خود اس کا مقابلہ کرو۔ تم خدا کے راستے سے ہٹ گئے ہو۔ اب میری طرح زندگی گزارو۔“

ڈیڑھ دو گھنٹوں بعد بارش تھمنے لگی اور گھٹا کچھ تو بکھر گئی اور باقی جو تھی وہ آگے نکل گئی۔ کم ہوتے ہوتے بارش رک گئی اور ان لوگوں نے چلنے کا ارادہ کیا لیکن وہاں پانی ہی پانی جمع ہو گیا تھا۔ یہ جگہ کشادہ تو تھی لیکن دو چٹانوں کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے دریا بن گئی تھی۔ سب گھوڑوں پر سوار ہوئے اور چل پڑے۔

آگے گئے تو جگہ تنگ ہوتی چلی گئی کیونکہ دونوں طرف ہی چٹانیں ایک دوسری کے قریب آگئی تھیں۔ وہاں پانی اس طرح آ رہا تھا جیسے سیلابی دریا ہو۔ پانی کا بہاؤ بڑا ہی تیز

تھا۔ ابو جندل نے کہا کہ یہ پانی گہرا نہیں ہے کہ اس میں کوئی ڈوب جائے لیکن گھوڑوں کے لئے اس میں چلنا خاصا مشکل ہو گا۔

گھوڑے یوں تو آگے بڑھتے جا رہے تھے، پانی کا زور زیادہ ہی ہوتا جا رہا تھا اور نظر ایسے ہی آتا تھا کہ گھوڑے آگے نہیں جاسکیں گے لیکن پانی کم ہونے لگا اور آگے جگہ بھی ذرا کھلی سی آگئی جس سے پانی پھیل گیا اور گھوڑے نکل گئے۔



یہ پتھر والا اور چٹانی علاقہ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ چٹانوں کے درمیان چلتے چلتے آدھا دن گزر گیا اور آگے جا کر ان دو چٹانی پہاڑیوں میں جن کے درمیان وہ جا رہے تھے، راستہ ہی نہ رہا کیونکہ دونوں پہاڑیاں آگے جا کر مل گئی تھیں۔ ابو جندل اس راستے سے واقف تھا۔ وہ آگے آگے جا رہا تھا۔ اس نے اپنا گھوڑا دائیں طرف کر لیا اور پہاڑی کے دامن میں چلا گیا۔ وہاں کوئی راستہ نہیں تھا لیکن گھوڑے پہاڑی چڑھ سکتے تھے۔ ابو جندل کا گھوڑا پہاڑی چڑھنے لگا لیکن سیدھا اوپر جانے کی بجائے پہلو کے ساتھ ساتھ چڑھ رہا تھا۔ باقی گھوڑے اس کے پیچھے پیچھے قطار میں جا رہے تھے۔

شمیر ابلک اور اس کے سپاہیوں کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ فوج کے آدمی تھے اور فوجی گھوڑ سواری کی مہارت رکھتے تھے لیکن ایسی گھوڑ سواری انہوں نے کم ہی کبھی کی تھی۔ پہاڑی پتھریلی تھی اور گھوڑوں کے پاؤں پھسلتے تھے۔ اوپر جاتے جاتے وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں گھوڑا بمشکل پاؤں رکھ سکتا تھا۔ یہ اس پہاڑی کا ایک حصہ تھا جو اس کے سامنے تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت اونچی دیوار ہے اور گھوڑے اس دیوار پر جا رہے ہوں یا اس طرح جیسے بازی گر رسے یا تار پر چلا کرتے ہیں۔ کسی گھوڑے کا پاؤں ذرا سا پھسل جاتا تو دائیں یا بائیں سوار سمیت لڑھکتا ہوا دوڑ نیچے جا پہنچتا اور سوار کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ زیادہ مشکل دونوں لڑکیوں کو پیش آرہی تھی۔ انہوں نے گھوڑ سواری تو کئی بار کی تھی لیکن وہ اتنی ماہر نہیں تھیں۔

”دائیں بائیں مت دیکھو“ — ابو جندل نے آگے چلتے ہوئے بلند آواز سے کہا — ”یہ سمجھو کہ گھوڑے میدان میں چلے جا رہے ہیں ورنہ ڈر سے کانپتے کانپتے گھوڑے سے گر پڑو گے۔“

یوں لگتا تھا جیسے سوار نہیں بلکہ گھوڑے ڈر رہے ہوں۔ وہ تو پھونک پھونک کر قدم

رکھتے تھے اور ان کے جسموں کی حرکت بتا رہی تھی کہ گرنے سے ڈر رہے ہیں اور شاید آگے جانے سے انکار ہی کر دیں۔

”کسی کا گھوڑا رک جائے تو لگام کو جھٹکانہ دینا“ — ابو جندل نے ایک اور اعلان کیا — ”ایسا نہ ہو کہ گھوڑا بدک کر پاؤں دائیں یا بائیں رکھ دے۔“

آخر اس پہاڑی کی یہ چوٹی ذرا چوڑی ہونے لگی لیکن اب بھی ہموار نہیں تھی اس لئے گھوڑوں کے پاؤں پھسلتے تھے۔ آگے جا کر یہ چوٹی زیادہ چوڑی ہو گئی اور اب گھوڑے دوسری پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ خطرناک حصہ ختم ہو گیا تھا اور اب جہاں گھوڑے چل رہے تھے یہ خاصی چوڑی جگہ تھی اور یہ پچھلا پہاڑ تھا جس کے اوپر جا کر آگے نیچے اترتا تھا۔

یہ قافلہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا اور ابو جندل نے گھوڑا روک لیا۔ وہاں اوپر اتنی لمبی اور چوڑی جگہ تھی کہ سبھی گھوڑے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو گئے۔ نیچے دیکھا تو بڑا ہی خوبصورت منظر نظر آیا۔ ہر ابھرا جنگل تھا، درختوں کی چوٹیاں نظر آرہی تھیں اور اودے اودے بادل منڈلا رہے تھے۔ مغرب کی طرف سورج کچھ نیچے چلا گیا تھا اور اس کی کرنیں درختوں پر پڑتی تھیں تو بارش کے قطرے چمکتے تھے۔ کسی آبادی کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ اس خوبصورت منظر کے دائیں بائیں ذرا اونچی پہاڑیاں تھیں لیکن بہت ہی دور دور۔ ان پر بھی سبزہ اور درخت تھے۔

”سبحان اللہ!“ — شمیر ابلک نے بے ساختہ کہا — ”یہ تو جنت کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اللہ نے اس خطے کو کیسا حسن بخشا ہے!“

”اللہ کا دیا ہوا یہ حسن بڑا ہی خطرناک ہے شمیر بھائی!“ — ابو جندل نے کہا — ”یہاں سے دیکھنے سے تو یہ جنت کا ٹکڑا ہی لگتا ہے اور یہ کوسوں دور تک پھیلا ہوا ہے لیکن اس میں وہ شیر پایا جاتا ہے جس پر لمبی لمبی دھاریاں ہوتی ہیں۔ اس میں بھڑیے بھی ہوتے ہیں جو اکیلے دکیلے نہیں بلکہ آٹھ آٹھ دس دس کے گروہ میں حملہ کرتے ہیں۔ یہاں اپنی برچھیاں اور تلواریں تیار رکھنا۔ اس خطے کے اندر کوئی آبادی نہیں۔ آبادیاں بہت دور ہیں۔ یہاں کبھی کوئی شکاری بھی نہیں آیا اس لئے شیروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے کم نہیں ہوتی۔“



پھاڑی سے اترنا چڑھنے سے زیادہ خطرناک لگتا تھا۔ گھوڑے آخر اتر گئے اور اس خوبصورت خطے میں داخل ہو گئے۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ سورج غروب ہونے کے لئے آفتاب تک پہنچنے ہی والا تھا اور ان لوگوں نے دن بھر کچھ کھلایا پیا نہیں تھا۔ وہاں کوئی خشک جگہ نظر آتی نہیں تھی لیکن ابو جندل ان علاقوں سے واقف تھا اس لئے وہ ذرا سا بھی پریشان نہیں لگتا تھا۔ اُس نے اپنے قافلے سے کہا کہ اب دن اور رات کا کھانا ایک ہی بار کھائیں گے اور ایک جگہ مجھے معلوم ہے جہاں ہم رات آرام بھی کریں گے۔

وہ چلتے چلے گئے۔ جنگل کچھ کم گھنا ہوتا جا رہا تھا اور اب جو زمین آگئی تھی اس میں اونچے نیچے ٹیلے تھے اور گھٹیاں بھی تھیں۔ کئی نشیبی جگہوں پر پانی بھرا ہوا تھا۔ ایک جگہ بائیں طرف ایک ٹیلہ تھا جو دیوار کی طرح اونچا چلا گیا تھا اور اس کی شکل نیم دائرے جیسی تھی۔ اس کے وسط میں ایک غار صاف نظر آ رہا تھا جس کے آگے مٹی کا ڈھیر جم گیا تھا۔ اس کے سامنے پانی جمع تھا جو زیادہ لمبائی چوڑائی میں نہیں تھا۔

”وہ غار دیکھتے ہو؟“ — ابو جندل نے آگے آگے جاتے پیچھے مڑ کر اپنے ساتھیوں سے کہا — ”وہاں شیر رہتے ہیں اور اسے کچھار کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس وقت شیر اندر موجود ہو۔ وہ ایک بھی ہو سکتا ہے اور ایک سے زیادہ بھی۔“

”کیا شیر ہم اتنے آدمیوں پر حملہ کرے گا؟“ — شیر ابلک نے پوچھا۔
 ”اگر بھوکا ہو تو!“ — ابو جندل نے کہا — ”شیر کا پیٹ بھرا ہوا تو اس کے قریب سے گزر جاوے تو بھی وہ کچھ نہیں کہے گا۔“

اُس وقت یہ سب اس ترتیب میں جا رہے تھے کہ ابو جندل سب سے آگے تھا اُس کے پیچھے دونوں لڑکیوں کے گھوڑے تھے پھر شیر ابلک کا گھوڑا تھا اور اس کے پیچھے سپاہی تھے۔ تین گھوڑوں کی زینوں کے ساتھ تین فالتو گھوڑوں کی رسیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ ابو جندل ابھی انہیں بتا ہی رہا تھا کہ شیر بھوکا نہ ہو تو وہ حملہ نہیں کرے گا کہ پیچھے سے زبردست آوازیں سنائی دیں جن میں ایک یہ تھی کہ ایک گھوڑا بہت ہی بُری طرح ہنستیا اور اس کے ساتھ ہی غراہٹ سنائی دی تھی۔ سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑا ہی خوفناک منظر نظر آیا۔ ایک دھاری دار شیر نے آخری خلی گھوڑے پر حملہ کر دیا تھا اور شیر کی پوزیشن یہ تھی کہ اس نے اوپر سے گھوڑے کی گردن اپنے منہ میں لے رکھی تھی اور اسے غنیمت سمجھ کر رہا تھا۔ یہ گھوڑا ایک سپاہی کے گھوڑے کے پیچھے

بندھا ہوا تھا۔ سپاہی کا گھوڑا ڈر کر دوڑ پڑا لیکن شیر نے اس کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کو بڑی مضبوطی سے دانتوں میں جکڑ رکھا تھا۔

شمیر ابلك نے نہایت پھرتی سے اپنا گھوڑا پیچھے موڑا اور ایڑ لگادی۔ سپاہیوں کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ شمیر ابلك نے سپاہی کے ہاتھ سے برچھی چھین لی اور شیر کے قریب سے گزرتے برچھی پوری طاقت سے ماری جو شیر کی پیٹھ میں اتر گئی۔ گھوڑے کی گردن سے شیر کے دانت اکھڑ گئے اور شیر پیٹھ کے بل گرا۔

شمیر ابلك نے آگے جا کر گھوڑا روکا اور پیچھے کو مڑا۔ شیر ایک ہی برچھی کے وار سے نہیں مرا کرتا۔ زخمی ہو کر وہ آخری وار کیا کرتا ہے۔ شیر برچھی کا زخم کھا کر پیٹھ کے بل گرا اور تیزی سے اٹھا۔ شمیر ابلك نے برچھی اس کی پیٹھ سے نکال لی تھی۔ شیر زخمی حالت میں بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ شیر نے شمیر ابلك کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس پر جھپٹنے کے لئے دوڑا لیکن اپنے گھوڑے کو موڑ کر اس کے قریب پہنچ چکا تھا اس نے شیر کو برچھی ماری جو اس کی گردن میں اتر گئی۔ ادھر سے شمیر ابلك نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور شیر کے قریب سے گزرتے اسے برچھی ماری۔ اُس وقت شیر پہلو کے بل ہو گیا تھا۔ شمیر ابلك کی برچھی اس کے پہلو میں داخل ہو گئی۔ شمیر ابلك نے برچھی کھینچ لی اور آگے جا کر گھوڑا پھر موڑا لیکن اتنے میں دوسرے سپاہیوں نے برچھیوں سے شیر کو بے بس کر دیا اور شیر اٹھ نہ سکا۔

جس گھوڑے پر شیر نے حملہ کیا تھا وہ ٹھیک حالت میں معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ زخمی بھی ہو گیا تھا اور خوفزدہ اتنا کہ بھاگنے کے لئے رستی تڑوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابو جندل نے آکر اس کی رستی کھول دی۔ گھوڑا اتنا ڈرا ہوا تھا کہ ایک طرف سر پٹ دوڑ پڑا۔

”گھوڑوں کے متعلق تو تم سب کچھ ضرور جانتے ہو گے“ — ابو جندل نے کہا —

”لیکن تم شاید دیکھ ہی نہیں سکے تھے کہ یہ گھوڑا اب ہمارے کام کا نہیں رہا۔ اس کی گردن کی ہڈی اگر ٹوٹی نہیں تھی تو ہل ضرور گئی تھی۔ تم نے دیکھا نہیں گھوڑا گردن اوپر نہیں اٹھا رہا تھا اور پھر یہ اتنا ڈر گیا تھا کہ ہم اسے ساتھ رکھتے تو ہمارے لئے مصیبت بنا رہتا۔ جانے دوا سے!“

گھوڑا اتنا خوف زدہ ہی لیکن خوفزدگی کی سب سے زیادہ شکار دوڑ لیاں ہوئی تھیں جو قہر قہر کانپ رہی تھیں۔ شمیر ابلك اور اس کے سپاہی فوجی تھے وہ موت سے ڈرنے

والے نہیں تھے اور ابو جندل ایسا مرو تھا جو ان جنگلوں میں سے اکثر گزرا تھا اور وہ ڈاکو تھا جو زندگی اور موت کا کھیل نہ جانے کب سے کھیل رہا تھا۔ ابو جندل انہیں کچھ اور آگے لے گیا اور ایسی جگہ جا کر رُکا جہاں ایسا ہی ایک ٹیلہ تھا اور ٹیلے کے اندر کسی نے کھدائی کر کے چو کوڑ سا کمرہ بنا رکھا تھا اور یہ مسافروں کے رکنے اور قیام کرنے کے کام آتا تھا۔ ابو جندل نے انہیں بتایا کہ اس علاقے میں سے کبھی کوئی مسافر نہیں گزرا۔ قلعوں کے راستے بہت دُور تھے۔ ان علاقوں میں قلعوں کو ٹوٹنے والے ہی آیا کرتے تھے۔

وہ اُس جگہ رُک گئے اور کھانا کھانے لگے۔ سورج غروب ہو گیا اور شام کا دھند لگا رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو گیا تو انہوں نے مشعلیں جلا کر اس غار کے سامنے زمین میں گاڑ دیں۔ یہ مشعلیں روشنی کے لئے نہیں بلکہ درندوں کو ڈرانے اور انہیں دُور رکھنے کے لئے باہر گاڑی گئی تھیں۔

”ایک بات بتاؤ ابو جندل!“ — شمیر ابلک نے پوچھا — ”تم نے اپنا خزانہ ایسی جگہ کیوں رکھا ہوا ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے موت کے منہ میں داخل ہونا پڑتا ہے؟“

”خزانے ایسی ہی جگہوں پر رکھے جاتے ہیں“ — ابو جندل نے جواب دیا — ”اگر اتنے زیادہ زر و جواہرات اور اتنی زیادہ رقیں گھروں میں رکھی جائیں یا آبادیوں کے قریب کہیں زمین کے اندر چھپا دی جائیں تو ڈاکو اس سے واقف ہو جاتے ہیں اور پھر خزانے کے مالک کی زندگی دو چار دن ہی رہ جاتی ہے۔ اسے قتل کر دیا جاتا ہے اور اس کا خزانہ قاتل بے اڑتے ہیں۔“

پرانے زمانے کی کئی کہانیوں میں بادشاہوں اور ڈاکوؤں کے متعلق یہ ضرور پڑھایا جاتا ہے کہ فلاں بادشاہ یا فلاں ڈاکو نے فلاں جگہ اپنا خزانہ دبا کر رکھ دیا تھا۔ ان کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ خزانے ایسی جگہوں پر لے جا کر چھپائے جاتے تھے جہاں تک پہنچنا بعض اوقات ناممکن ہو جاتا تھا۔ حین قزاق تو اپنے خزانے اور ہی زیادہ دشوار گزار علاقوں میں لے جا کر کہیں چھپایا کرتے تھے کیونکہ ان کی زندگی سمندر میں گزرتی تھی۔ لوٹ مار کر کے کبھی کبھی خشکی پر آیا کرتے تھے۔

خزانوں کے مالک اکثر اُس جگہ تک راستے کا نقشہ بنا کر اپنے پاس رکھتے تھے جس جگہ وہ خزانہ دباتے تھے۔ بعض اوقات مالک مر جاتا اور نقشہ کسی اور کے ہاتھ چڑھ جاتا تو وہ اس خزانے تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایسے مدفون خزانوں کے متعلق پُر اسرار

کہانیاں بھی سنائی جاتی ہیں جو غلط معلوم نہیں ہوتیں۔ عام طور پر کہانیوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مالک خود یا اس کے بعد کوئی اور خزانہ نکالنے گئے تو وہیں ان پر ایسی مصیبت نازل ہوئی کہ وہ مارے گئے یا آپس میں لڑ پڑے اور انہوں نے ایک دوسرے کو ختم کر دیا۔ ان کہانیوں کو فرضی اور افسانوی سمجھا جاتا رہا ہے اور ان میں اکثر افسانوی ہی ہوا کرتی ہیں لیکن ابو جندل اور شمیر ابلیک کی کہانی کو تاریخ میں جو مقام ملا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم یہ ایک سچی کہانی ہے۔ اسے حسن بن صلیح کے دور کی ایک اہم واردات بنا کر غالباً اس لئے تاریخ میں شامل کیا ہے کہ لوگ سمجھ سکیں کہ مل و دولت اور عورت کی چکا چوند اچھے بھلے مرد مومن کو کن رفعتوں سے گرا کر پرستیوں میں غائب کر دیتی ہے۔



رات وہیں گزار کر صبح وہ چل پڑے اور آدھا دن گزر جانے کے بعد ایک سیلابی ندی نے ان کا راستہ روک لیا۔ ابو جندل نے انہیں بتایا کہ وہ ایسے وقت یہیں پہنچے ہیں جب ندی میں سیلاب آیا ہوا ہے، ورنہ یہ ندی تو بڑی خوبصورت اور پیاری ہے، اس کا پانی شفاف اور کم گہرا ہوتا ہے جس میں سے گھوڑے تو کیا آدمی بھی آہلانی سے گزر جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر ابو جندل نے اپنا گھوڑا ندی میں ڈال دیا۔ یہ فوج کا گھوڑا تھا جو سیلاب سے لڑتا جھگڑتا پار چلا گیا۔ اس کے پیچھے باقی گھوڑوں نے بھی ندی پار کر لی۔ ندی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ چند قدم گھوڑوں کو اس میں تیرنا پڑا تھا۔ پار جا کر شمیر ابلیک نے اپنا گھوڑا ابو جندل کے ساتھ کر لیا۔

”شمیر بھائی!“ — ابو جندل نے کہا — ”مجھے ان جنگلوں میں گھومنے پھرنے اور ان میں سے راستہ بنانے کا اور پھر قافلے لوٹ کر انہی جنگلوں میں غائب ہو جانے کا اتنا زیادہ تجربہ ہے کہ میں ہوا میں خطرے کی بُو سونگھ لیا کرتا ہوں۔ میں ان ہی جنگلوں میں سے نہ جانے کتنی بار گزرا ہوں۔ ان خطروں میں سے ہمیشہ آگھ رہا ہوں لیکن یوں نہیں ہوا جیسے اب ہو رہا ہے۔ نہ کبھی کسی بدروح نے میرا راستہ روکا تھا نہ کبھی شیر نے حملہ کیا تھا۔ میں یہاں ناگ بھی دیکھتا رہا ہوں اور شیر بھی اور بھیڑیے بھی لیکن میں یہاں سے ہر بار زندہ گزر گیا ہوں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ سفر کی ابتدا ہی ایک بہت بڑے شگون سے ہوئی ہے۔ پھر ایک شیر نے ہم پر حملہ کیا اور پھر معصوم سی ندی نے ہمارا راستہ روکنے کی

کوشش کی۔

”تو پھر کیا کرنا چاہئے؟ — کیا ہمیں واپس چلے جانا چاہئے یا ان خطروں میں بڑھتے ہی چلے جائیں؟“

”میں نے تمہیں پہلے بتایا ہے کہ میں پیشہ ور قزاق ہوں“ — ابو جندل نے کہا — ”پیشہ ور قزاقوں کے اپنے عقیدے اور اپنے وہم ہوتے ہیں۔ ہم پر جب خطرے منڈلاتے ہیں اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ خطرے ہمیں دبوچ کر ہمیں ختم کر دیں گے تو ہم ایک کنواری لڑکی کی جان کی قربانی دیا کرتے ہیں لیکن یہاں میں ایسی قربانی نہیں دے سکتا۔ اگر یہ دو لڑکیاں میرے مرے بھائی کی بیٹیاں نہ ہوتیں تو میں ان میں سے ایک کی قربانی دے دیتا۔ میں اس سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ منزل تک پہنچ جاؤں اور ضرورت پڑے تو اپنی جان کی قربانی دے دوں.... میں اس لئے خبردار کر رہا ہوں کہ ہر وقت چوکس اور چوکے رہنا۔ معلوم نہیں کس وقت کیا ہو جائے۔ اس جنگل کے حسن کو ہی نہ دیکھتے رہنا۔ تم نے جس طرح شیر مار لیا تھا اسی طرح ہر خطرے پر قابو پا لو گئے۔ رات سوؤ بھی اس طرح جیسے تمہاری ایک آنکھ کھلی ہوئی ہو۔ رات کو مجھ پر بھروسہ نہ کرنا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں رات حشیش پی کر سوتا ہوں اور مجھے اس دنیا کی کوئی ہوش نہیں رہتی۔“

اُس رات اس قافلے نے ایسی جگہ پڑاؤ کیا کہ ان پر چند ایک درختوں کا چھاتہ اور اوپر آسمان تھا۔ وہ الگ الگ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سوئے۔ آدھی رات سے کچھ پہلے شمیر الیک کو ایک لڑکی نے جگایا وہ ہڑبڑا کر اٹھا جیسے کوئی خطرہ آگیا ہو۔ لڑکی نے کہا کہ گھبرانے والی کوئی بات نہیں اور وہ اس کے ساتھ تھوڑی دور تک چلے۔ وہ اٹھا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ چند قدم دور اس لڑکی کی دوسری بہن ایک درخت کے تنے کی کوکھ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ دونوں بھی اس کے قریب بیٹھ گئے۔ اس کا ایک ہاتھ ایک لڑکی نے اور دوسرا دوسری لڑکی نے پکڑ لیا۔ دونوں لڑکیوں نے اُس کے ہاتھ چومے۔

”ہمارے بچے نہ ڈرو“ — ایک لڑکی نے کہا — ”وہ حشیش پی کر سوتا ہے اور صبح ہوش میں آتا ہے۔ ہم دونوں صرف یہ بتانا چاہتی ہیں کہ ہم باقی عمر تمہارے ساتھ گزاریں گی۔ ہمیں لونڈیاں بنا کر رکھ لو چاہے شادی کر لو اور اگر تم ہمیں داشتہ بنا کر رکھو گے تو بھی ہمیں منظور ہے۔ ہم اپنے بچے کو اپنی ذمہ داری سے آزاد کرنا چاہتی ہیں اور

حقیقت یہ ہے کہ تم نے ہمارے دل جیت لئے ہیں۔“

”تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں تم دونوں کی خاطر تمہارے بچا کے ساتھ آیا ہوں۔“ شمیر ابلک نے کہا۔ ”ورنہ اس شخص پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”لیکن ہمیں ایک ڈر ہے۔“ دوسری لڑکی نے کہا۔ ”تمہیں جب خزانہ مل جائے گا تو تم ہمیں بھول جاؤ گے۔“

”ایسا نہیں ہو گا۔“ شمیر ابلک نے کہا۔ ”میں ڈرتا ہوں کہیں تم مجھے دھوکہ نہ دے جاؤ۔“

دونوں لڑکیوں نے بڑے ہی والہانہ انداز سے محبت کا اظہار کیا۔ ان کا رویہ ایسا تھا جیسے دونوں نے اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا ہو۔ شمیر ابلک کی ایک ہی بیوی تھی جس سے اس کے تین بچے تھے اور اس کی عمر چالیس برس ہو چکی تھی۔ اس پر تو دونوں لڑکیوں نے خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دی۔ ابو جندل تو حشیش کے نشے میں گہری نیند سویا ہوا تھا، شمیر ابلک پر ان لڑکیوں کے حسن کا اور ان کی جوانی کا نشہ طاری ہو گیا۔ اُس نے چاہا کہ باقی رات یہ لڑکیاں اسی طرح اس کے پاس بیٹھی رہیں اور وہ ان کے نشے میں بدست ہوتا چلا جائے۔ اُس کے ذہن میں اگر ابو جندل کے خلاف کچھ تھوڑا سا شک رہ گیا تھا تو وہ ان دونوں لڑکیوں نے صاف کر دیا۔

لڑکیاں چلی گئیں اور شمیر ابلک کچھ دیر وہیں بیٹھا ان لڑکیوں کے طلسماتی خیال میں کھویا رہا۔ اس سے پہلے سفر کے دوران یہ لڑکیاں اسے دیکھ دیکھ کر اس طرح مسکراتی رہی تھیں جیسے وہ اسے بہت پسند کرتی ہوں اور اس کے ساتھ الگ تہائی میں بیٹھنا چاہتی ہوں۔ ان کا یہی انداز شمیر ابلک کو دیوانہ بنائے ہوئے تھا مگر اب لڑکیاں رات کی تاریکی تہائی میں اس کے پاس آ بیٹھیں اور اس کے اتنا قریب ہو گئیں کہ وہ ان کے جسموں کی بو سونگھ سکتا تھا تو وہ کسی اور ہی دنیا پہنچ گیا۔

کہیں قریب سے ہی اسے بھینڑیوں کی لمبی ہو کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں اچانک اٹھی تھیں اور تمام بھینڑیے ایک ہی بار بولنے لگے تھے۔ شمیر ابلک بیداری کے خواب سے یک لخت ہزیزا کر بالکل ہی بیدار ہو گیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا اس جگہ پہنچا جہاں وہ سویا ہوا تھا۔ وہاں لینا اور اس نے باقی رات جاگتے گزار دی۔



صبح ابھی دھندلی تھی جب یہ قافلہ جاگا اور بڑی تیزی سے سہلن سمیٹ کر اور گھوڑوں پر زینیں ڈال کر چل پڑا۔ جوں جوں صبح کا اُجلا نکھرتا آ رہا تھا زمین کے خدوخل بدلتے جا رہے تھے۔ درخت بہت کم ہو گئے تھے اور گھاس بھی کم ہوتی جا رہی تھی اور تھوڑی ہی دور آگے زمین ایسی آگنی جیسے نہ جانے کتنی مدت سے پانی کی بوند کو ترس رہی ہو۔ درخت تو کہیں کہیں نظر آتے تھے اور یہ درخت بالکل خشک تھے جن کے ٹن تو تھے لیکن شبنیاں نہیں تھیں۔ جھاڑیاں بالکل خشک اور خاردار تھیں۔ زمین کٹی پھٹی تھی۔ کہیں زمین ابھری ہوئی تھی اور کہیں نشیب میں چلی جاتی تھی اور کہیں ٹیلے یوں کھڑے تھے جیسے زمین پر گاڑے ہوئے منحنی اور بھدے اور بد صورت سے ستون ہوں۔ زمین پر کسی گھوڑے یا اونٹ یا کسی انسان کا تازہ یا پرانا نقش پانہ تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ ادھر سے کبھی کوئی نہیں گزرا اور یہ پہلے انسان ہیں جو اس طرف آ نکلے ہیں۔

جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے مٹی ریت میں تبدیل ہوتی گئی اور دو تین میل آگے گئے تو لوق و دق صحرا شروع ہو گیا۔ وہاں بھر بھرے سے ٹیلے بھی تھے اور دو منزلہ مکان جتنے اونچے ریت کے ڈھیر بھی تھے اور یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے یہ گول گول ڈھیر بڑی محنت سے یہاں لگائے ہوں۔

”یہ ہے صحرا کا اصل خطرہ!“ — ابو جندل نے اپنے ساتھیوں کو بتایا — ”تاواقف مسافر ان ڈھیروں میں داخل ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ ان میں سے نکل جائے گا لیکن ان کے اندر ایسی بھول بھلیاں ہیں کہ بعض مسافر ان ڈھیروں میں سے دو تین کے ارد گرد ہی گھومتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بہت فاصلہ طے کر لیا ہے لیکن وہ وہیں کے وہیں ہوتے ہیں حتیٰ کہ پیاس اور پھر بھوک انہیں وہیں گرا لیتی ہے اور ریت ان کے جسموں سے زندگی کا رس چوس لیتی ہے.... میں ان سے واقف ہوں اس لئے میں جب بھی ادھر آیا ہوں دور کا چکر لگا کر گیا ہوں۔“

ابو جندل انہیں ایک طرف لے گیا۔ اس طرف زمین اوپر ہی اور اٹھتی جا رہی تھی۔ نظر تو یوں آتا تھا جیسے یہ زمین پکی ہے اور پاؤں کے نیچے مٹی ہے لیکن جب پاؤں رکھتے تھے تو ریت میں دھنس جاتا تھا۔ بلندی پر جا کر ریت کی ان ڈھیروں کو دیکھا تو وہ میلوں وسعت میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ابو جندل اپنے قافلے کو دور دور سے نکال کر آگے لے گیا۔

سورج سر پر آگیا تو آگے یوں نظر آتا تھا جیسے زمین جل رہی ہو اور اس سے شعلے اٹھ رہے ہوں۔ ان میں سے آگے کچھ نظر نہیں آتا تھا کیونکہ یہ شفاف سے شعلے جھل جھل کرتے تھے۔ قافلہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا تھا یہ جھللاتے ہوئے شفاف شعلے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

پیاس ایک قدرتی امر تھا۔ ابو جندل نے پچھلے پڑاؤ سے روانگی سے پہلے ہی پانی کا ذخیرہ چھوٹے چھوٹے مشکیزوں میں بھر لیا تھا۔ ہر گھوڑے کے ساتھ ایک مشکیزہ بندھا ہوا تھا۔ سب نے پانی پیا اور چلتے چلے گئے۔

ابو جندل نے انہیں بتایا کہ یہ ریگستانی خطہ شام سے بہت پہلے ختم ہو جائے گا اور کچھ ہی دور آگے ایک نخلستان آئے گا جہاں رُک کر کھانا کھائیں گے اور تھوڑا سا آرام کر کے آگے چلے جائیں گے۔

سورج جب مغرب کی طرف چلا گیا تو دُور سے کھجور کے درخت نظر آنے لگے۔ گھوڑے پیاس سے بے چین ہوئے جا رہے تھے اور تھک بھی گئے تھے کیونکہ ان کے قدم ریت میں دھنس رہے تھے.... آخر نخلستان آ ہی گیا۔ وہاں پانی کا چھوٹا سا تالاب تھا اور کھجور کے درختوں کی اتنی افراط کہ سلیہ ہی سلیہ تھا حالانکہ کھجور کے درخت کا سلیہ بے کار ہوتا ہے۔ گھوڑے سواروں کے اُترتے ہی پانی کی طرف دوڑ پڑے اور پانی پینے لگے۔

قافلے نے کھانا کھایا، پانی پیا اور تھوڑا سا آرام کر لیا۔ گھوڑے پانی پی چکے تھے۔ یہ لوگ اٹھے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر چل پڑے۔ گھوڑے تو تھکے ہوئے لگتے ہی تھے لیکن ان کے سواروں کے چروں سے پتہ چلتا تھا کہ خزانے کا لالچ نہ ہوتا تو وہ وہیں تھکن سے گر پڑتے اور گہری نیند سو جاتے۔ ان کے جسم تو جیسے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ زیادہ بُری حالت لڑکیوں کی تھی۔ ابو جندل انہیں اچھی اچھی اور پُر امید باتیں سناتا جا رہا تھا تاکہ یہ لوگ ذہنی طور پر بیدار اور مستعد رہیں۔

آگے پھر ویسا ہی صحرا تھا لیکن کچھ آگے جا کر ریت مٹی میں تبدیل ہونے لگی تھی اور دو اڑھائی میل دُور ہرے بھرے درخت نظر آنے لگے تھے۔ ابو جندل آگے آگے جا رہا تھا۔ اس نے اچانک لگام کھینچ کر گھوڑا روک لیا اور ایک ہاتھ بلند کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ سب رُک جائیں۔ وہ گھوڑے سے کود کر اُترا اور چند قدم آگے جا کر زمین پر جھک

گیل۔ شمیر ابلک بھی گھوڑے سے اتر اور اُس تک پہنچا۔

”یہ دیکھو شمیر!“ — ابو جندل نے زمین کی طرف اشارہ کر کے کہا — ”کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ گھوڑوں کے نشان نہیں؟“

”ہاں ابو جندل!“ — شمیر ابلک نے کہا — ”یہ بلا شک و شبہ گھوڑوں کے قدموں کے نشان ہیں.... اور یہ نشان پرانے نہیں ایک دو روز پہلے کے لگتے ہیں۔“

ابو جندل اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اُس طرف کچھ دُور تک چلا گیا جدھر سے یہ گھوڑے آرہے تھے۔ کھڑوں کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے کہ گھوڑے کدھر سے آئے ہیں اور کدھر گئے ہیں۔ ابو جندل رک گیا۔ شمیر ابلک بھی گھوڑے پر سوار ہو کر اُس کے پیچھے چلا گیا تھا۔

”ادھر سے عام لوگ نہیں گزرا کرتے“ — ابو جندل نے کہا — ”ادھر کسی فوج کے گھوڑ سوار نہیں آسکتے۔ یہ خطہ سلطانوں اور بادشاہوں اور اماموں کی دنیا سے بہت دُور ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اس خطے پر خدا کا قبر برستار ہوتا ہے۔ ادھر سے کوئی مجھ جیسا قزاق اور ڈاکو ہی گزر سکتا ہے۔ ہمیں اب زیادہ ہوشیار ہو کر آگے جانا پڑے گا۔“

وہ قافلے کے باقی افراد کو لے کر آگے چل پڑے اور سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا کہ وہ پھر ہرے بھرے خطے میں داخل ہو گئے۔ ابو جندل اور شمیر ابلک راستے میں زمین ہی دیکھتے آئے تھے کہ قدموں کے اور نشان بھی ملیں گے۔ نشان ملے تھے لیکن وہ دوسری طرف چلے گئے تھے۔

انہوں نے اس سرسبز جگہ پر رات کو پڑاؤ کیا۔ زمین خشک تھی اور گھاس بڑی ملائم اور نرم تھی۔ ابو جندل نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ چاروں رات کو اس طرح پہرہ دیں کہ ایک آدمی پہرے پر کھڑا رہے اور دوسرے باری باری پہرہ دیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جو بھی پہرے پر کھڑا ہو اس کے پاس کمان اور ترکش ضرور ہونے چاہئیں۔ ابو جندل خطرہ محسوس کر رہا تھا جس کی نشاندہی گھوڑوں کے ان قدموں کے نشانوں نے کی تھی جو اس نے دیکھے تھے۔

کھانے کے بعد وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور جب سونے لگے تو ایک سپاہی پہرے پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک جگہ کھڑا ہی نہیں رہنا تھا۔ انہوں نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں آٹے سامنے دو ہری بھری ٹیکریاں تھیں اور ایک ٹیکری آگے تھی۔

پہرے والے سپاہی کو بتایا گیا تھا کہ وہ اپنے پہرے کے دوران ان ٹیکریوں کے پیچھے بھی جائے اور اوپر جا کر بھی دیکھے اور پوری طرح بیدار رہے۔



چاروں سپاہیوں نے باری باری رات بھر گھوم پھر کر پہرہ دیا اور صبح کا اُجالا آہستہ آہستہ نکھرنے لگا۔ آخری سپاہی جو پہرے پر تھا، وہ ایک ٹیکری کے پیچھے تھا۔ اسے غالباً معلوم تھا کہ اس کے ساتھی دیر سے جاگیں گے اس لئے اس نے پہرے پر ہی رہنا بہتر سمجھا۔ اُسے ٹیکری کے اُس طرف جدھر اس کے ساتھی سوئے ہوئے تھے، کچھ آوازیں اور آہٹیں سی سنائی دیں۔ وہ سمجھا کہ اس کے ساتھی جاگ اٹھے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ٹیکری کے اُس سرے پر آیا جہاں ٹیکری ختم ہوتی تھی۔ وہاں دو چوڑے تنوں والے درخت تھے۔ اس نے جب اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا تو وہاں کوئی اور ہی منظر نظر آیا۔ آٹھ آدمی تھے جنہوں نے منہ اور سر سیاہ پگڑیوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ انہوں نے لمبے بچے پہن رکھے تھے جو ان کے گھٹنوں تک گئے ہوئے تھے۔ آٹھ گھوڑے کچھ دور کھڑے گھاس کھا رہے تھے۔

دو آدمیوں نے دونوں لڑکیوں کو پکڑ رکھا تھا اور باقی آدمیوں نے تلواریں ہاتھوں میں لے رکھی تھیں اور ہر ایک نے تلوار کی نوک ایک ایک آدمی کی شہ رگ پر رکھی ہوئی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ کوئی ڈالو تھے جنہوں نے اس قافلے کو نیند میں دبوچ لیا تھا اور انہیں ہتھیار اٹھانے کی مہلت نہیں دی تھی۔ وہ لڑکیوں کو لے جانا چاہتے تھے جس میں کوئی شک ہی نہیں تھا۔ وہ ابو جندل اور شمیر ابلک سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ لڑکیاں ان دونوں آدمیوں کی گرفت میں تڑپ رہی تھیں۔

پہرے والے سپاہی نے اپنی کمان میں ایک تیر ڈالا۔ فاصلہ بیس بائیس گز ہو گا۔ اُس نے تیر کھینچ کر جو چھوڑا تو وہ ایک آدمی کی گردن میں اتر گیا۔ اُس آدمی نے ایک لڑکی کو پکڑ رکھا تھا۔ اس نے فوراً لڑکی کو چھوڑا اور اپنی گردن پر دونوں ہاتھ رکھے۔

سپاہی نے بڑی تیزی سے کمان میں دو سرا تیر ڈالا اور جس آدمی نے دوسری لڑکی کو پکڑا ہوا تھا، اس کو شست میں لے کر تیر چھوڑ دیا۔ اس کا نشانہ بے خطا تھا۔ تیر اپنے شکار کے گال کے ایک طرف لگا اور دوسری طرف باہر ہو گیا۔ اس نے بھی لڑکی کو چھوڑا اور اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لئے۔

سپاہی نے اسی تیزی سے تیسرا اور چوتھا تہر چلایا اور اس کا ایک تہر بھی خلی نہ گیا۔ ان ڈاکوؤں میں ہڑوٹنگ پٹا ہو گئی۔ انہیں یہ تو پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ تیر کس طرف سے آرہے ہیں۔ ان کی ہڑوٹنگ سے قافلے والوں کو ہتھیار اٹھانے کا موقع مل گیا۔ ادھر سے سپاہی تیر اندازی کر رہا تھا۔ اس نے پانچ آدمیوں کو مار لیا۔

تین ڈاکو بچ گئے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ابو جندل، شمیر الملک اور بلی تین سپاہیوں نے تلواریں اور برچھیاں اٹھالی ہیں تو وہ تینوں بہت تیزی سے دوڑ پڑے۔ ان کا تعاقب کیا گیا لیکن وہ کود کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ایڑ لگا دی۔ گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ اس طرح ڈاکو اپنے پانچ ساتھیوں کی لاشیں اور پانچ گھوڑے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

”میرے دوستو!“ — ابو جندل نے کہا — ”ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ گئے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور بھی ہماری منزل کے قریب آگیا ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اب کیا ہو گا لیکن ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں، البتہ پوری طرح ہوشیار اور بیدار رہنے کی ضرورت ہے۔ ہر وقت ہتھیار پاس ہونا چاہئے اور ایک ہاتھ اپنے ہتھیار پر رکھو گے تو خطرے کی صورت میں بچ سکو گے.... اور تم دونوں لڑکیاں سن لو.... تم کسی مسلمان شہزادے کے حرم کی لڑکیاں نہیں ہو جن کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے آقا کو خوش رکھیں۔ تم میری بھتیجیاں ہو۔ اپنے باپ کو یاد کرو۔ وہ بڑا جری اور جابر مرد تھا۔ تم تیغ زنی جانتی ہو۔ اگر کوئی خطرہ آ پڑا تو مردوں کی طرح لڑنا ہے، عورتوں کی طرح ڈرنا نہیں۔“

”یہ تو ہم نیند میں پکڑی گئی تھیں“ — ایک لڑکی نے کہا — ”میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھی تو ایک آدمی نے میرے بازو پیٹھ پیچھے جکڑ دیئے تھے۔ اگر ہم دونوں بیدار ہوتیں اور ہم پر ڈاکو حملہ کرتے تو پھر تم دیکھتے کہ ہم کیا کر سکتی ہیں۔“

ابو جندل نے انہیں کہا کہ فوراً ”کوچ کرو“ تاکہ ہم شام سے پہلے پہلے منزل پر پہنچ جائیں۔



سورج غروب ہونے میں ابھی دو اڑھائی گھنٹے باقی تھے جب وہ اُس خطے میں پہنچ گئے جو ان کی منزل تھی۔

وہ بھی بے آب و گیاہ خطہ تھا۔ وہ ویسا ہی تھا جیسا یہ لوگ پہلے ایک جگہ دیکھ آئے تھے۔ ریلوں والی گہری سلیٹی رنگ کی چٹانیں تھیں اور کچھ اونچی پہاڑیاں بھی تھیں اور پتھریلی ٹیکریاں بھی تھیں لیکن وہاں گھاس کی ایک پتی بھی نظر نہیں آتی تھی یوں لگتا تھا جیسے ان چٹانوں اور پہاڑیوں سے آگ کی طرح سورج کی تپشی خارج ہو رہی ہو۔ بہت ہی تیز چل رہی تھی جو تیز ہی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یہ جب ریلوں والی چٹانوں سے ٹکرا کر گزرتی تھی تو ہلکی ہلکی چٹخیں سنائی دیتی تھیں جو انسانی چیخوں جیسی تھیں۔ کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے عورتیں اور بچے ان پہاڑیوں کے اندر کہیں کسی مصیبت میں پڑے ہوئے ہیں اور چیخ چلا رہے ہیں۔

یہ خطہ بھی بدروحوں کا مسکن لگتا تھا۔ یہ سارا ماحول دل پر گھبراہٹ اور خوف کا تاثر پیدا کرتا تھا لیکن ابو جندل کا چہرہ پُر سکون تھا اور اس کا انداز ایسا جیسے وہ یہاں ذرا سی بھی اجنبیت محسوس نہ کر رہا ہو۔

”اب ذرا ہوشیار رہنا شمیر ابلک!“ — ابو جندل نے کہا — ”ہمیں ادھر ادھر گھوم پھر کر اور اچھی طرح دیکھ بھال کر کے اندر جانا چاہئے تھا لیکن اتنا وقت نہیں۔ رات آگئی تو مشعلوں کے باوجود ہمارا کام مشکل ہو جائے گا۔ میں تم سب کو سیدھا اندر لے جا رہا ہوں۔ اب جو ہوتا ہے ہوتا رہے، مقابلہ کریں گے۔“

”بات ذرا صاف کرو ابو جندل!“ — شمیر ابلک نے کہا — ”وہ خطرہ ہے کیسا جو تم محسوس کر رہے ہو؟ مجھے الفاظ میں بتا دو تاکہ میں اس کے مطابق خود بھی تیار رہوں اور اپنے ان سپاہی ساتھیوں کو بھی تیار رکھوں۔“

”آسمان سے کوئی آفت نہیں گرے گی“ — ابو جندل نے کہا — ”یہ خطرہ انسانوں کا ہی ہو گا۔ وہ جو تین آدمی زندہ نکل گئے تھے، وہ کہیں دور نہیں چلے گئے، یہیں کہیں ہوں گے اور وہ یہاں آسکتے ہیں۔“

”آنے دو“ — شمیر ابلک نے کہا — ”آنے دو انہیں.... اب ہم سوئے ہوئے نہیں ہوں گے.... چلو آگے!“

ابو جندل آگے آگے تھا۔ وہ چٹانوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گیا۔ باقی سب پیچھے ایک قطار میں جا رہے تھے۔ اب ان کے پاس فالتو گھوڑے سات تھے۔ وہ ڈاکوؤں کے گھوڑے بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

ابو جندل کبھی دائیں مڑتا کبھی بائیں مڑتا اور یہ لوگ بھول ہی گئے کہ وہ کدھر سے آئے ہیں اور کتنے موڑ مڑ چکے ہیں۔ صرف ابو جندل راستے سے واقف تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ واپس کس طرح آنا ہے۔ وہاں اندر چھوٹی بڑی بے شمار چٹانیں تھیں۔ ان کے ساتھ اونچی پہاڑی تھی۔ ہوا کی چٹخیں اور بلند ہو گئی تھیں۔

آخر جگہ ایسی آگئی کہ دائیں طرف اونچی پہاڑی تھی اور اس کے دامن میں ذرا ہٹ کر لمبی چٹان تھی اور ان کے درمیان گھوڑے گزارنے کے لئے کچھ جگہ تھی۔ پچاس ساٹھ گز آگے یہ چٹان پہاڑی کے دامن سے مل جاتی تھی اور وہاں ایک بڑی بلند چٹان نے راستہ روک لیا تھا۔ ابو جندل آگے ہی آگے بڑھتا گیا اور وہاں تک پہنچ گیا جہاں راستہ بند ہو جاتا تھا۔

وہ گھوڑے سے اُترا اور سب کو اُترنے کے لئے کہا اور یہ بھی کہ گھوڑے یہیں چھوڑ دیں۔ آگے دیکھا کہ یہ راستہ اس طرح نیچے کو چلا گیا تھا جس طرح کسی عمارت کے تہ خانے میں سیڑھیاں اترتی ہیں۔ ابو جندل نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ مشعلیں جلا کر نیچے آجائیں۔ وہ شمیر ابلک اور لڑکیاں نیچے اتر گئیں اور سپاہیوں نے مشعلیں جلا لیں اور ان کے پیچھے پیچھے نیچے چلے گئے۔

وہ آٹھ دس گز نیچے چلے گئے۔ یہ تہ خانے کی طرح بنا ہوا ایک غار تھا جس کی چھت بیس پچیس گز اونچی تھی اور یہ غار بہت ہی کشادہ تھا۔

غار کی چھت سے چٹانوں کے لمبو ترے اور عجیب و غریب ٹکڑے لٹک رہے تھے۔ جو نہی مشعلیں اندر داخل ہوئیں، بڑی ہی زور سے ایسی آواز آئی جیسے طوفان آگیا ہو اور اس کے ساتھ چڑچڑ کی آوازیں آئیں جو ایک شور و غل کی طرح بلند ہوتی چلی گئیں۔ یہ چنگوڑ تھے جو غار کے اندر سے اُڑ کر باہر نکل گئے تھے۔ یہ چند ایک نہیں بلکہ سینکڑوں تھے۔ ابو جندل نے بلند آواز سے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ چنگوڑ ہیں، ان سے بے بس نہیں۔

اس غار کے فرش پر بھی چٹانیں تھیں جن کی اونچائی دو گز یا تین گز تھی۔ مشعلوں کی روشنی میں ایک طرف ایک اور غار کا دہانہ سا نظر آیا۔ ابو جندل اس میں داخل ہو گیا۔ یہ دہانہ تو اتنا کشادہ نہیں تھا لیکن اندر جا کر دیکھا، غار خاصا کشادہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مشعلوں کی روشنی خاصی زیادہ تھی اور اندر کنکریاں بھی نظر آرہی تھیں۔

پچیس تیس قدم گئے ہوں گے کہ آگے ایک اور دہانہ نظر آیا۔ ابو جندل اس میں داخل ہو گیا اور اب یہ لوگ ایک اور غار میں چلے گئے تھے۔ ابو جندل نے کہا کہ مشعلیں آگے لاؤ۔ مشعلیں آگے گئیں تو سب نے دیکھا کہ وہاں تین بکس رکھے ہوئے تھے جو لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور ان پر لوہے کی مضبوط پتیاں چڑھی ہوئی تھیں۔

”یہ لو شمیر بھائی!“ — ابو جندل نے کہا — ”یہ ہے میرے باپ کی اور میری کمائی۔ یہ خزانہ اب صرف میرا نہیں، ہم سب کا ہے“ — اس نے سپاہیوں سے کہا — ”مشعلیں لڑکیوں کو دے دیں اور یہ بکس اٹھائیں۔“

سپاہی آگے بڑھ کر ایک بکس کو اٹھانے لگے تو شمیر ابلیک نے کلن کھڑے کر لئے اور ابو جندل سے کہا کہ اسے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی ہے۔ ابو جندل نے اسے کہا کہ اس کے کلن بج رہے ہیں۔ یہاں اور کوئی نہیں آسکتا۔

ابو جندل ابھی یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ غار میں آواز آئی — ”ان صندوقوں سے پیچھے ہٹ جاؤ۔“

سب نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ ایک آدمی جس نے منہ اور چہرہ کالے رنگ کی پگڑی میں لپیٹ رکھا تھا، ہاتھ میں تلوار لئے کھڑا تھا۔ سب نے تلواریں نکال لیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے غار میں دس بارہ آدمی آگئے۔ ان سب کے سر اور چہرے کالی پگڑیوں میں لپیٹے ہوئے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔

”سب پیچھے کھڑے رہو دوستو!“ — ابو جندل نے آگے بڑھ کر ان ڈاکوؤں سے کہا — ”تم زندہ ان صندوقوں تک نہیں پہنچ سکو گے اور جب تک ہم زندہ ہیں ان صندوقوں کو ہاتھ تک نہیں لگا سکو گے۔“

”ابو جندل!“ — کالی پگڑی والے ایک آدمی نے کہا — ”تم بھی ہم میں سے ہو اور ہم تمہیں جانتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم ہمارے ہاتھوں مرو۔ یہ صندوق اور دونوں لڑکیاں ہمیں چھوڑ جاؤ اور خود کو اور اپنے ساتھیوں کو زندہ لے جاؤ۔“

”اوہ یہ تم ہو“ — ابو جندل نے اس آدمی کو پہچانتے ہوئے کہا — ”میرا خیال تھا کہ تم سب مارے گئے ہو یا کسی اور طرف نکل گئے ہو.... نہ تم ہمارے ہاتھوں مرو نہ ہم تمہارے ہاتھوں مرنا چاہتے ہیں۔ ان صندوقوں میں جو کچھ ہے، آؤ برابر برابر بانٹ لیتے ہیں۔“

”یہ مال اُس کا ہے جس کے پاس طاقت ہے“ — کللی پگڑی والے نے کہا —
”ہم تمہیں باتوں کا وقت نہیں دیں گے۔ ہم سارا مال لے جانے آئے ہیں۔“

ابو جندل نے شمیر ابلیک کو اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے اور چاروں
سپاہیوں نے اور لڑکیوں نے بھی ڈاکوؤں پر حملہ کر دیا۔ ڈاکو تیار تھے۔ وہ تو لڑنے اور
مرنے کے لئے آئے تھے۔

پھر اس غار میں تلواریں ٹکرانے کی آوازیں آتی رہیں، زخمی گرتے رہے، خون بہتا
رہا۔ مشعلیں زمین پر پڑی جل رہی تھیں۔ دو تین زخمی جلتی مشعلوں پر گرے اور ان کے
کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ وہ اٹھ کر ادھر ادھر دوڑے اور آگ بجھانے کی کوشش کرنے
لگے لیکن ناکام رہے۔ وہ پہلے ہی زخمی تھے، پھر کپڑے جل کر ان کے جسموں کو جلانے
لگے تو وہ جلدی ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اتنے میں تین چار اور زخمی مشعلوں پر
گرے اور اسی انجام کو پہنچے۔ لڑنے والے لڑتے لڑتے مشعلوں پر آئے تو ان کے کپڑوں
کو بھی آگ لگ گئی۔

غار میں اگر کسی کو فتح حاصل ہوئی تو وہ آگ کو ہوئی۔ اندر آگ کے شعلے تھے اور
غار دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ کچھ تو تلواروں کے زخموں سے مر گئے اور جو زخموں سے نہ
مرے انہیں مشعلوں کی آگ نے مار ڈالا اور تھوڑی ہی دیر بعد غار میں صرف شعلوں کی
ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔

قافلوں سے لوٹا ہوا خزانہ موت کے ہاتھ آیا۔

جب غار میں قتل و غارت ہو رہی تھی، دھٹکوں کے شعلے لڑنے، مرنے اور زخمی ہو کر گرنے والوں کو چاٹ رہے تھے، اُس وقت سورج اونچی چٹانوں کی اوٹ میں چلا گیا پھر غار کے ہولناک راز کو اپنے جلتے ہوئے سینے میں چھپائے اُفق میں اتر گیا۔ بھول بھلیوں جیسی بدرنگ اور بد شکل چٹانوں نے شام کے دھندلکے کو تھوڑی سی دیر میں گہرا کر دیا۔ ان میں بعض چٹانیں ستونوں کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور کچھ میناروں کی طرح اوپر سے نوکیلی تھیں۔ شام کے تیزی سے گہرے ہوتے دھندلکے میں یہ چٹانیں بھوتوں جیسی لگتی تھیں۔ ان میں پُر اسراریت اور خوف کا نمایاں تاثر تھا۔

غار کے اندر جو آگ لگی ہوئی تھی، اس کی ہلکی سی، بڑی ہی مدھم سی روشنی غار کے دہانے تک آتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے یہ روشنی رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی کے ڈر سے باہر نہیں آ رہی.... ایک سلیہ سا حرکت کر رہا تھا۔ اس سائے کو غار نے اُگل کر باہر پھینک دیا تھا جیسے موت نے اسے قبول نہ کیا اور اُگل دیا تھا۔ یہ سلیہ غار کے دہانے سے نکلا تھا اور غار کے اندر کسی مرنے والے کی بدروح جیسا لگتا تھا۔

چٹانوں کے درمیان بس اتنی سی ہی جگہ تھی کہ ایک انسان چل سکتا تھا۔ یہ سلیہ اس تنگ و تاریک راستے پر سرکنا رہی لگتا جا رہا تھا۔ یہ کوئی سیدھا راستہ نہیں تھا یا ایسا بھی نہیں تھا کہ کچھ دُور جا کر اُدھریا اُدھر مڑتا ہو۔ یہ تو ہر دس پندرہ قدموں پر مڑتا تھا اور کہیں دو اطراف کو مڑتا تھا اور کہیں یہ چورستہ بن جاتا تھا۔ چلنے والا جان ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ کدھر کو مڑے تو ان بھول بھلیوں سے نکل جائے گا۔

یہ سلیہ سا سرکتے ریختے دیکھا کہ آگے سے ایک اور چٹان نے راستہ روک رکھا ہے

تو وہ ذرا رکتا، دائیں بائیں دیکھتا اور کسی بھی طرف مڑ جاتا۔ ایسے کئی موڑ مڑ کر اس نے اپنے آپ کو چٹانوں کے نرغے میں ہی پایا۔ کچھ آگے جا کر ایک جگہ ایسی آگئی کہ راستے دونوں بلکہ تین اطراف کو جاتے تھے۔ سلیہ رُک گیا اور اُس کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے۔ ایک انسانی آواز بلند ہوئی — ”یا اللہ“ تو نے زندگی عطا کی ہے تو وہ راستہ بھی دکھا دے جو زندہ انسانوں کی دنیا کی طرف جاتا ہے۔ میرا چچا باطنی ابلیس کا بچاری تھا تو اس کی سزا مجھے نہ دے جس نے آج تک اپنی عصمت کو بے داغ رکھا ہے۔ گناہگار چچا کی یتیم بھتیجی نے اپنے دامن کو گناہوں سے پاک رکھا ہے..... یا اللہ..... یا اللہ“ — اور اس کی آواز رندھیا کر رات کی خاموشی میں تحلیل ہو گئی۔

وہ ابو جندل کی بڑی بھتیجی شافیہ تھی۔ اُس کی عمر پچیس چھبیس سال تھی۔ اُس کی چھوٹی بہن جس کی عمر بیس اکیس سال تھی، غار کے اندر ماری گئی تھی۔ جب غار میں ڈاکو اور لٹیرے آگئے اور کشت و خون شروع ہو گیا تھا، اُس وقت شافیہ غار کے اندر ہی ذرا بلند ایک چٹان کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ غار خاصا کشادہ تھا۔ اس کے اندر چھوٹی چھوٹی نوکیلی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں اور کہیں گڑھے سے بھی بنے ہوئے تھے۔ شافیہ اتنی الگ ہٹ کر چھپی تھی کہ جب مشعلوں نے لڑنے والوں اور گرنے والوں کے کپڑوں کو آگ لگادی اور غار روشن ہو گیا تو بھی وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔ وہ یہ خونچکاں منظر دیکھتی رہی تھی لیکن جس چیز کو وہ زیادہ دیکھ رہی تھی وہ نکل بھاگنے کا راستہ تھا۔ راستہ ایک ہی تھا اور وہ غار کا دہانہ تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس دہانے سے لڑنے والے ذرا ایک طرف ہوں تو وہ چھپ کر نکل بھاگے۔ اُس نے اپنی چھوٹی بہن کو مرتے دیکھا تھا۔

شافیہ چٹان کے پیچھے سے اپنی حسین و جمیل اور نوجوان بہن کو دیکھ رہی تھی کہ وہ نکل بھاگنے کے لئے ادھر ادھر دوڑ رہی ہے اور کہیں چھپنے کی کوشش نہیں کر رہی۔ روشنی اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ غار میں کنکر بھی نظر آرہے تھے۔ ایک ڈاکو نے شافیہ کی چھوٹی بہن کا بازو پکڑ لیا۔ ایک اور ڈاکو نے اُس کا دوسرا بازو پکڑ لیا اور دونوں اُسے اپنی اپنی طرف کھینچنے لگے۔ لڑکی چیخنے چلانے لگی لیکن اُسے ان لٹیروں سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ سب ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔ اُس وقت تک ابو جندل مارا جا چکا تھا۔ شافیہ نے اپنے چچا کو بُری طرح زخمی ہو کر مرتے دیکھا تھا۔

ایک لٹیرے نے دیکھا کہ اُس کے دو ساتھی ایک لڑکی کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہے

ہیں اور آخر ہو گا یہ کہ دونوں اس لڑکی کی ملکیت پر ایک دوسرے کا خون بہا دیں گے۔ اُس نے آگے بڑھ کر اپنی تلوار سیدھی لڑکی کے پیٹ میں اتار دی اور اتاری بھی اتنی زور سے کہ اس کی نوک پیٹھ کی طرف سے باہر آگئی۔

”بد بختو!“ — اُس نے لڑکی کے پیٹ سے تلوار نکال کر کہا — ”ایک لڑکی کے پیچھے ایک دوسرے کے دشمن نہ بنو۔ پہلے یہ خزانہ باہر نکالو پھر تمہارے لئے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں رہے گی۔“

تھوڑی ہی دیر بعد یہ تینوں بھی تلواروں اور برہمیوں سے کٹ کر گر پڑے اور ان کے کپڑوں کو بھی آگ لگ گئی۔ شافعیہ کو نہ کوئی دیکھ سکا نہ کوئی اس تک پہنچا۔ اُس نے جب دیکھا کہ صرف دو آدمی ایک دوسرے کا خون بہانے کے لئے رہ گئے ہیں تو وہ جھکی جھکی سی اور کچھ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل وہاں سے نکلی اور غار کے دہانے سے باہر آ گئی۔



شافعیہ چٹانوں کی جن بھول بھلیوں میں پھنس گئی تھی ان سے اُس کا صرف چچا ابو جندل واقف تھا جو سب کو بڑی آسانی سے غار تک لے گیا تھا لیکن وہ چچا غار میں ہی رہ گیا تھا اور وہ زندہ نہیں تھا۔ شافعیہ کو تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ کدھر سے اندر آئے تھے۔ اگر دن کی روشنی ہوتی یا چاند پوری طرح روشن ہوتا تو شاید اسے یہاں سے نکلنے میں اتنی دشواری نہ ہوتی لیکن رات بڑی ہی تاریک تھی۔ وہ اب سوائے اللہ کے کسی سے بھی مدد نہیں مانگ سکتی تھی۔ اللہ ہی تھا جو اُسے راستے پر ڈال سکتا تھا۔ اُس کا یہ کہنا صحیح تھا کہ گناہگار چچا کے پاس رہتے ہوئے اُس نے اپنا دامن گناہوں سے پاک رکھا تھا۔ داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ ابو جندل نے شمیر الہک کو بتایا تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں اُس کی اپنی بیٹیاں ہوتیں تو وہ انہیں حسن بن صباح کی جھولی میں ڈال دیتا لیکن یہ دونوں اُس کے مرے ہوئے بھائی کی بیٹیاں تھیں اور انہیں وہ امانت سمجھتا تھا۔ شافعیہ کی چھوٹی بہن کے انداز کچھ اور تھے لیکن گمراہ ہونے سے پہلے ہی وہ تلوار کے ایک ہی وار سے مر گئی تھی۔ شافعیہ نے اپنے ایمان کو اور اپنی عصمت کو اللہ کی امانت سمجھ کر محفوظ رکھا تھا۔ اب وہ اللہ سے ہی رہنمائی اور روشنی مانگ رہی تھی۔

اُسے چلتے سرکتے خاصی دیر گزر گئی تھی۔ اُسے اچانک ایک گھوڑے کے ہنسنے

کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک کر رُک گئی اور فوراً ”بعد تین چار گھوڑے اکٹھے ہنسنائے۔ شافعیہ نے ان آوازوں سے سمت کا اندازہ کیا اور اُسے یہ اندازہ ہوا کہ گھوڑے زیادہ دور نہیں اور ہیں کس طرف۔ ان گھوڑوں میں اس کے اپنے گھوڑے بھی تھے جن پر یہ پارٹی یہاں آئی تھی۔ ان میں اُن ڈاکوؤں کے گھوڑے بھی تھے جو بعد میں غار تک پہنچے تھے۔ نہ جانے کیا وجہ تھی کہ گھوڑے اندر نہیں لے جائے جاتے تھے۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک دو گھوڑے ہنسناتے تھے۔ اس سے شافعیہ کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ کس سمت کو جارہی ہے اور کس سمت کو جانا چاہئے۔ اس کے مطابق وہ مڑتی اور آگے بڑھتی رہی اور آخر وہ ان بھول محلیوں سے نکل گئی۔ باہر اگر کچھ روشنی تھی تو وہ ستاروں کی تھی۔ اُسے گھوڑے نظر آ گئے۔ تاریکی میں اپنا گھوڑا پہچاننا آسان نہ تھا۔ پہچاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تمام گھوڑے تنومند اور اچھی نسل کے تھے۔

شافعیہ نے دو گھوڑے پکڑے، ایک کی باگ دو سرے گھوڑے کی زین کے پیچھے باندھ لی پھر تین چار گھوڑوں سے کھانے پینے کی اشیاء کے تھیلے اتارے اور پانی کے دو مشکیزے بھی اتار لئے۔ ان تھیلوں اور مشکیزوں کو اُس نے پیچھے بندھے ہوئے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا اور اگلے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اُس کے پاس دو ہتھیار تھے۔ ایک تلوار اور دو سراخنجر۔ گھوڑ سواری کی وہ بڑی اچھی سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔ اُس زمانے میں بچہ جب بھاگنے دوڑنے کے قابل ہو جاتا تھا تو اُسے جو کام سب سے پہلے سکھایا جاتا وہ گھوڑ سواری تھی۔

شافعیہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی لیکن ایسی نہیں کہ گھوڑا سرپٹ دوڑ پڑتا۔ وہ یہ خطرہ محسوس کر رہی تھی کہ غار میں سے کوئی ڈاکو زندہ نکل آیا ہو گا۔ وہ اگر دوڑتے گھوڑے کے ٹاپ سناتا تو اُس کے تعاقب میں آ جاتا۔ شافعیہ نے گھوڑے کو عام چال پر رکھا۔ ذہن پر زور دے کر اسے یاد کرنا پڑا کہ وہ اپنے چچا کے ساتھ کس طرف سے ادھر آئی تھی۔ اُسے صحیح طور پر سمت یاد نہیں رہی تھی۔ اُس نے بہت سوچا اور بہت یاد کیا، آخر ایک طرف چل پڑی اور اپنے آپ کو یہ یقین دلایا کہ ادھر سے ہی آئی تھی۔ وہ اگر مرد ہوتی تو کوئی خوف نہ ہوتا۔ اُس کے پاس تلوار تھی، خنجر تھا اور اُس کے پاس دو گھوڑے بھی تھے۔ وہ خنجر اور تلوار چلانا جانتی تھی لیکن اُس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ بڑی ہی حسین اور

جوان لڑکی تھی۔ حسین بھی ایسی کہ کوئی اچھے کردار کا آدمی بھی اُسے دیکھتا تو نظر انداز نہ کر سکتا اور اُسے روک لیتا۔

وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ ریگستان میں چلی جا رہی ہے۔ کوئی ایک بھی درخت نظر نہیں آتا تھا۔ اُس کے دل پر خوف ہراس تھا جس نے اُس کی نیند غائب کر دی تھی۔ یہ بھی اچھا تھا کہ وہ غنودگی میں نہ گئی اور بیدار رہی۔ وہ کان کھڑے کر کے سننے کی کوشش کر رہی تھی کہ اُس کے تعاقب میں کوئی آتو نہیں رہا۔ زمین خاموش تھی، آسمان خاموش تھا اور رات پر ایسا سکوت طاری تھا کہ وہ اپنے دل کی دھڑکن بھی سن رہی تھی۔ اُس نے گھوڑے کو دوڑایا نہیں تاکہ گھوڑا تھک نہ جائے۔

صبح طلوع ہونے لگی اور شافعیہ کو زمین و آسمان نظر آنے لگے۔ وہ صحرا میں جا رہی تھی جہاں افق تک ریت ہی ریت تھی۔ صرف ایک طرف اسے افق پر یوں نظر آیا جیسے عمارتیں کھڑی ہوں۔ وہ اُسی طرف جا رہی تھی۔ سورج اوپر آتا چلا گیا اور تپش میں اضافہ ہوتا گیا۔ سورج جب سر پر آ گیا تو اُس نے گھوڑا روک لیا اور نیچے اُتری۔ دوسرے گھوڑے کے ساتھ ہندھے ہوئے تھیلے میں سے کھانے کو کچھ نکالا اور مشکیزہ کھول کر پانی پیا اور پھر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ وہ چلتے گھوڑے پر کھاتی رہی۔ وہ زیادہ رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے صرف یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ گھوڑوں نے نہ جانے کب سے پانی پیا ہوا ہے اور یہ پیاس محسوس کریں گے جو صحرا میں ایک خطرہ بن سکتا ہے۔ اصل خطرہ تو وہ محسوس کرنے ہی لگی تھی۔ وہ یہ تھا کہ وہ جب اپنی پارٹی کے ساتھ ادھر آئی تھی تو ایک صحرا راستے میں آیا تو تھا لیکن وہ یہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ غلط راستے پر چل نکلی تھی۔ وہ جدھر دیکھتی، اُسے صحرا نظر آتا اور جب پیچھے دیکھتی تو اُسے وہ پہاڑیاں اور چٹانیں نظر آتی تھیں جن میں وہ غار تھا اور جہاں سے وہ آ رہی تھی۔ وہ رات بھر سوئی نہیں تھی اور اُس پر خوف بھی طاری تھا اور پھر اُس نے جو کشت و خون دیکھا تھا، وہ یاد آتا تو وہ اندر باہر سے کانپنے لگتی تھی۔ ہوا یہ کہ اُس کا دماغ سوچنے کے قابل رہا ہی نہیں تھا۔

وہ اللہ کو یاد کرتی جا رہی تھی۔ اُس میں تبدیلی صرف یہ آئی تھی کہ پہلے وہ اللہ سے بددماغی تو رو پڑتی لیکن اب اس نے اپنا حوصلہ اتنا مضبوط کر لیا کہ رونا چھوڑ دیا اور اپنے آپ میں دلیری پیدا کر لی۔ اب وہ اللہ سے یہی کہتی تھی کہ صرف اُس کی ذات اُسے دُست دکھا سکتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتی کہ اللہ مجھے ہمت و استقلال دے کہ میں ہر مصیبت کا

سورج غروب ہو رہا تھا جب وہ اُس جگہ پر پہنچ گئی جو اس نے دیکھی اور اُسے عمارتیں سی نظر آئی تھیں۔ یہ صحرا کے اندر ٹیلے تھے جن کی ساخت دو منزلہ اور سہ منزلہ عمارتوں جیسی تھی۔ ان میں سے بعض ٹیلے ایسی شکل کے تھے جیسے کسی اونچی عمارت کا سامنے والا حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہو۔ یہ جگہ نشیبی علاقے میں تھی اور وہاں ریت کم اور مٹی زیادہ تھی۔ کہیں کہیں چھوٹے بڑے پتھر بھی نظر آتے تھے۔ ان بڑے ٹیلوں میں چھوٹے ٹیلے بھی تھے جن کی شکلیں عجیب و غریب تھیں۔ یہ سارا ماحول بڑا ہی ڈراؤنا تھا۔ گھاس کی ایک پتی نظر نہیں آتی تھی۔ جوں جوں شام کا دھند لگا گہرا ہوتا جا رہا تھا، ان چھوٹے ٹیلوں کی شکلیں یوں لگتا تھا تبدیل ہوتی جا رہی ہوں۔ ان میں کوئی انسانی شکل کا اور کوئی ہاتھیوں جیسا تھا۔

شافعیہ کا گھوڑا اپنے آپ ہی تیز ہو گیا۔ تیز ہوتے ہوتے گھوڑا دوڑنے لگا اور آگے جا کر ایک ٹیلے سے بائیں کو گھوم گیا۔ وہاں ٹیلہ ختم ہوتا تھا۔ کچھ دُور ہی جا کر ایسی جگہ آ گئی جس کے ارد گرد ایسے ہی ٹیلے کھڑے تھے اور درمیان میں کچھ ہرے پودے تھے۔ شافعیہ سمجھ گئی کہ گھوڑے نے پانی کی مشک پالی ہے۔ صحراؤں میں چلنے والے گھوڑے پانی کی بو پالیا کرتے ہیں۔ شافعیہ نے لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور گھوڑا دوڑتا ہوا پانی پر جا کھڑا ہوا۔ یہ تھوڑا سا پانی جمع تھا اور اس کے ارد گرد ہری جھاڑیاں تھیں۔ پانی میں آسمان کا عکس نظر آ رہا تھا۔ شافعیہ گھوڑے سے اُتر آئی اور اس گھوڑے کی زین سے اُس نے دوسرے گھوڑے کو بھی کھول دیا تاکہ دونوں گھوڑے پانی پی لیں۔

گھوڑے پانی پی رہے تھے اور شافعیہ سوچ رہی تھی کہ اُسے رات یہیں گزارنی چاہئے لیکن پانی کے قریب نہیں کیونکہ اتنا وہ جانتی تھی کہ صحرائی درندے رات کو پانی پینے آتے ہیں اور وہ اُس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

شافعیہ نے گھوڑے سے ایک تھملا کھولا اور پانی کا متکیرہ بھی اتارا اور ایک طرف بیٹھ کر کھانے لگی۔ اُس نے پانی پیا اور دیکھا کہ گھوڑے بھی پانی پی چکے تھے اور جھاڑیاں کھا رہے تھے۔ اُس نے گھوڑوں کو آزاد ہی رہنے دیا تاکہ وہ پیٹ بھر لیں۔

رات پوری طرح تاریک ہو گئی تھی۔ شافعیہ اُٹھی اور گھوڑوں کو پکڑ کر ایک طرف چل پڑی۔ وہ پانی سے دُور رہنا چاہتی تھی۔ اُس نے رات وہیں بسر کرنی تھی اور گھوڑوں

کو کہیں باندھنا تھا لیکن وہاں کوئی درخت نہیں تھا نہ کوئی اتنا بڑا پتھر تھا جس کے ساتھ وہ گھوڑے باندھ دیتی۔ اُس نے سوچا گھوڑوں کو اللہ کے سپرد کر کے سو جائے گی۔ ایک جگہ جا کر وہ لیٹ گئی اور گھوڑوں کو چھوڑ دیا۔ وہ اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ لیٹتے ہی اُس کی آنکھ لگ گئی۔

کوئی گھوڑا ذرا سا بھی ہلتا تھا تو شافعیہ کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی اور اندھیرے میں ہر طرف دیکھتی۔ گھوڑے جہاں اُس نے چھوڑے تھے وہیں کھڑے تھے۔ اس طرح چار پانچ مرتبہ اُس کی آنکھ کھل اور اُس نے بیٹھ کر ہر طرف دیکھا اور جب دیکھا کہ گھوڑے وہیں کھڑے ہیں تو پھر لیٹ گئی۔



آخری بار اُس کی آنکھ اُس وقت کھلی جب سورج کی پہلی کرنیں ٹیلوں کے اس خطے میں داخل ہو چکی تھیں اور یہ خطہ اللہ کے نور سے منور ہو گیا تھا۔ شافعیہ ہر بڑا کرانٹھی۔ دیکھا، دونوں گھوڑے غائب تھے۔ وہ اُس طرف دوڑ پڑی جدھر پانی تھا اور گھنی جھاڑیاں بھی تھیں۔ دونوں گھوڑے جھاڑیاں کھا رہے تھے۔ اُس کے پاس کھانے کا سامان کافی تھا۔ اس نے گھوڑے کی زین سے ایک تھیلا کھولا اور اس میں سے کھانے کی اشیاء نکال کر ایک طرف بیٹھ گئی اور اطمینان سے کھانے لگی۔ پھر پانی پیا اور ایک گھوڑے کو دوسرے کے پیچھے باندھ کر سوار ہوئی اور چل پڑی۔ وہ اب اللہ کے بھروسے جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہیں نہ کہیں تو جا ہی نکلے گی۔

زمین کو دیکھا تو اُسے کچھ اطمینان ہونے لگا۔ وہ اس لئے کہ زمین اب پہلے کی طرح ریتلی نہیں رہی تھی بلکہ مٹی بڑھتی جا رہی تھی اور گھوڑے کے سُموں سے دھول اڑتی تھی۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ زمین پر کسی انسان کے نقش پا نہیں تھے نہ کسی جانور کے پاؤں کے نشان نظر آتے تھے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس راستے سے کبھی کوئی نہیں گزرا یا عرصے سے ادھر سے کسی مسافر کا گزر نہیں ہوا۔ زمین اوپر کو جا رہی تھی اور ٹیلے کم ہوتے جا رہے تھے۔

کچھ اور آگے گئی تو اُسے سورج نظر آیا جو افق سے کچھ اور اوپر اٹھ آیا تھا۔ اُس نے گھوڑا روک لیا اور اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس نے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور آسمان کی طرف دیکھا۔

”رات کی سیاہ کللی تاریکیوں سے اتنا روشن سورج طلوع کرنے والے اللہ!“ —
 اُس نے بلند آواز سے اللہ کو پکارا — ”میری زندگی کو اتنا تاریک نہ ہونے دینا اور مجھے جو
 تاریکیاں نظر آرہی ہیں ان میں سے اپنے نور کی صرف ایک کرن عطا کر دینا۔ میری آبرو
 کی حفاظت کرنا، جان جاتی ہے تو چلی جائے۔“

دعا سے اُسے روحانی تسکین سی محسوس ہوئی اور اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اُس کا
 حوصلہ جو دم توڑتا جا رہا تھا، پھر سے مضبوط ہو گیا ہے اور ایک نئی ہاتھ ہے جو اُس کی
 حفاظت کر رہا ہے.... اُس کے نیچے گھوڑا عام چال سے چلا جا رہا تھا۔ شافیہ نے یہ نہ سوچا
 کہ گھوڑے کو دوڑائے اور جہاں کہیں بھی پہنچنا ہے جلدی پہنچ جائے۔ اس نے دماغ
 حاضر رکھا۔ وہ جانتی تھی گھوڑا دوڑایا تو راستے میں ہی جواب دے جائے گا۔ اُس نے
 دوسرا گھوڑا اس لئے ساتھ لے لیا تھا کہ ایک تھک جائے تو دوسرے پر سوار ہو جائے۔
 اب اس جگہ سے چلی تو دوسرے گھوڑے پر سوار ہوئی تھی۔ اب تو اسے امید کی ایک
 کرن نظر آنے لگی جو یہ کہ زمین ذرا ذرا اوپر جا رہی تھی اور کہیں کہیں ہری گھاس
 بھی نظر آنے لگی تھی۔ اسی طرح اکاؤ کا درخت بھی دکھائی دینے لگا لیکن ان درختوں کی
 شکل و صورت ویسی نہیں تھی جیسی جنگلات کے درختوں کی ہوتی ہے۔ ٹن تھے اور کچھ
 شبنیاں تھیں لیکن پتے بہت ہی تھوڑے۔

آخر ٹیلوں کا خطہ ختم ہو گیا اور وہ جب بلندی پر پہنچی تو اس کے سامنے ایسی زمین
 تھی جس پر درخت بھی تھے اور ہریالی بھی نظر آرہی تھی۔ اُس نے رُک کر پیچھے دیکھا تو
 اُسے ایسا لگا جیسے جنم سے نکل آئی ہو اور آگے اس کے لئے جنت ہی جنت ہے۔ وہاں
 اونچی نیچی ٹیکریاں بھی تھیں اور زمین ہموار تو نہیں تھی لیکن اس کی جیسی بھی شکل تھی،
 اچھی لگتی تھی کیونکہ اس میں ہریالی تھی۔ وہ ٹاک کی سیدھ میں چلتی چلی گئی۔

سورج اوپر آ کر مغرب کی طرف چل پڑا تھا اور اُس وقت شافیہ ایک جنگل میں
 داخل ہو چکی تھی۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ اب گھوڑوں کے بھوکا اور پیاسا رہنے کا کوئی
 خطرہ نہیں رہا تھا البتہ یہ خطرہ بڑھ گیا تھا کہ وہ حسین اور جوان لڑکی ہے اور اس جنگل میں
 اُسے ضرور کوئی نہ کوئی آدمی ملے گا۔ اُس نے اپنے آپ کو ایسے خطرے کے لئے ذہنی
 طور پر تیار کرنا شروع کر دیا۔ اُس نے یہ بھی سوچا کہ خزانے والی پہاڑیوں تک پہنچنے سے
 پہلے ایک ایسی پہاڑی آئی تھی جس پر وہ سب چڑھے تھے اور اس کی پُل صراط جیسی چوٹی

پر کچھ دُور تک گئے تھے جہاں ذرا سا پاؤں پھسل جاتا تو گھوڑا اپنے سوار سمیت دور نیچے تک لڑھکتا چلا جاتا۔ یہ پہاڑی ایک روز پہلے آجانی چاہئے تھی لیکن اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ یہ تو شافیہ نے پہلے ہی قبول کر لیا تھا کہ وہ بھٹک گئی ہے لیکن اس پہاڑی کو نہ دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا کہ وہ راستے سے بہت دُور چلی آئی ہے اور اب نہ جانے کہاں جا نکلے یا کس انجام کو پہنچے۔

اُسے آسمان پر برسات کے بادلوں کے ٹکڑے منڈلاتے نظر آنے لگے۔ اُس نے دل ہی دل میں دعا کی کہ مینہ نہ برس پڑے۔ خزانے والے غار کی طرف جاتے ہوئے موسلا دھار مینہ برسا تھا اور اُس کی پارٹی کو بڑی ہی سخت دشواری بھی پیش آئی تھی۔ اب وہ اکیلی تھی اور ڈرتی تھی کہ آگے سیلابی ندی آگئی تو اس کے لئے ایسی مشکل پیش آئے گی جو اس کے بس سے باہر ہوگی۔

وہ ایک بڑی اچھی جگہ رک گئی۔ گھوڑے سے کھانا کھول کر کھانے بیٹھ گئی اور گھوڑوں کو کھلا چھوڑ دیا کہ وہ بھی اپنا پیٹ بھر لیں۔ وہاں تو اب گھاس ہی گھاس تھی اور جھاڑیوں کی بھی بہتات تھی۔ اُسے غنودگی آنے لگی لیکن دن کے وقت وہ سونے سے گریز کر رہی تھی.... یہ خطرہ تو اُس کے ذہن میں ہر وقت موجود رہا کہ اُس کے تعاقب میں کوئی آ رہا ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی اُس کے ذہن سے اٹھا کہ اس غار میں کوئی ڈاکو لٹیرا زندہ بھی رہا تھا یا نہیں؟ اُسے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ وہ ڈرتی اس لئے تھی کہ تعاقب میں اگر کوئی آ رہا ہے تو گھوڑوں کے قدموں کے نشان دیکھتا اس طرف پہنچ جائے گا۔ پھر وہ اپنے آپ کو یوں تسلی دیتی کہ کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ آرام کر کے وہ پھر گھوڑے پر سوار ہوئی اور چل پڑی۔ شام تک اسے دو ندیوں میں سے گزرنا پڑا۔ دونوں کی گہرائی گھوڑوں کے گھٹنوں تک ہی تھی۔ اُسے وہ ندی یاد آئی جس میں سے گزر کر وہ گئی تھی۔ وہ سیلابی تھی اور خاصی گہری تھی۔ یہ دو ندیاں جواب دیکھ رہی تھی، جاتے وقت یہ دو ندیاں راستے میں نہیں آئی تھیں۔ جنگل خوبصورت ہوتا جا رہا تھا۔

سورج غروب ہو گیا اور جنگل کے حُسن پر رات کا سیاہ پردہ پڑتا چلا گیا۔ اب اُس کے دل میں یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ رات کو سوئی تو درندے آ جائیں گے۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے جنگلوں میں شیر اور بھیڑیے ہوتے ہیں۔ خزانے کی طرف جاتے ہوئے ان کا تصادم ایک

شیر کے ساتھ ہوا تھا اور پھر انہوں نے بڑا زہریلا اور بڑا ناگ بھی دیکھا تھا۔ انہوں نے مل جل کر ناگ کو مار لیا تھا اور شیر کو بھی لیکن ایک گھوڑا ضلع ہو گیا تھا۔ اُس نے سوچا کوئی ایسا درخت نظر آجائے جس کا ٹن خلاصا چوڑا ہو اور وہ اس پر چڑھ کر سو جائے لیکن یہ خیال اس خطرے سے ذہن سے نکل دیا کہ سوتے سوتے اوپر سے گر پڑے گی اور ہو سکتا ہے اتنی چوٹ لگے کہ وہ سفر کے قاتل ہی نہ رہے۔

اللہ توکل وہ ایک ٹیکری کے دامن میں رُک گئی اور دونوں گھوڑے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیئے۔ وہ جہاں بیٹھی تھی وہاں ٹیکری تھوڑی سی عمودی تھی۔ اس نے وہیں ٹیکری کے اس حصے کے ساتھ پیٹھ لگالی اور ارادہ کیا کہ جتنی دیر جاگ سکتی ہے جاگے گی۔ اس نے تلواریں سے نکل کر اپنے پاس رکھ لی.... اس نے جاگنے کا ارادہ کیا تھا لیکن جوں کی عمر تھی اور تھکن بھی تھی، بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی۔



گھوڑے بڑی زور سے ہنسنائے اور بد کے۔ شافعیہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھی اور اُس کا ہاتھ تلواریں کے دستے پر گیا اور بڑی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھوڑے رتیاں تڑوا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی شافعیہ نے دوڑتے قدموں کی آوازیں اور ایسی آوازیں سُنی جیسے کتے غرا اور بھونک رہے ہوں۔ چاند اوپر آگیا تھا۔ اُن دنوں چاند آدمی رات کے بعد اوپر آتا تھا۔ اس چاندنی میں اُسے ایک ہرن نظر آیا جو بھاگا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے چار پانچ بھیڑیے لگے ہوئے تھے۔

ہرن اور بھیڑیے گھوڑوں کے قریب سے گزرے تھے۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی کہ ہرن گر پڑا۔ ابھی وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ بھیڑیے اُس پر جا پڑے اور پھر اُسے بھاگنے نہ دیا۔ شافعیہ مطمئن ہو گئی کہ بھیڑیوں کو پیٹ بھرنے کے لئے شکار مل گیا ہے۔ درندہ بھوکا ہو تو بہت بڑا خطرہ بن جاتا ہے۔ اس لحاظ سے بھیڑیوں والا خطرہ ٹل گیا تھا لیکن گھوڑے بُری طرح بد کے تھے۔ شافعیہ گھوڑوں تک گئی اور ان کے درمیان کھڑے ہو کر دونوں کی گردنوں کو تھپتھپانے لگی اور باری باری ان کے منہ کے ساتھ منہ لگایا جس سے گھوڑے کچھ سکون میں آ گئے۔ اچانک شافعیہ کو خیال آیا کہ جہاں بھیڑیے ہیں وہاں شیر بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ ڈرنے لگی کہ شیر آگیا تو وہ بھیڑیوں سے ان کا شکار چھینے گا اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شیر جب دیکھے کہ وہ شکار تو بھیڑیوں نے مار لیا ہے تو وہ گھوڑوں کی طرف آ

اس خیال نے اسے خلاصہ ڈرایا لیکن اس کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا سوائے اس کے کہ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی اور اس نے گھوڑوں پر پھرتا شروع کر دیا۔ اُس نے دوسرے ہاتھ میں خنجر لے لیا۔ اُسے چاند سے اندازہ ہوا کہ رات آدمی سے کچھ زیادہ گزر گئی ہے۔ اس نے اللہ کو یاد کرنا شروع کر دیا اور اپنے دل میں سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔ جب ٹہلٹے ٹہلٹے تھک گئی تو بیٹھ گئی اور پیٹھ اسی درخت کے ساتھ لگائی جس کے ساتھ گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ اُس نے نیند پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی اور بیٹھے بیٹھے اُس کی آنکھ لگ گئی۔

بہت دیر گزر گئی تو گھوڑے ایک بار پھر بد کے اور ہنسنے لگے۔ شافعیہ بڑی تیزی سے اٹھی اور تلوار اور خنجر آگے کر لئے۔ اُس نے دیکھا پندرہ بیس قدم دور بھیڑیے بڑے آرام سے واپس جا رہے تھے۔ انہیں اب کسی اور شکار کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے پیٹ بھر گئے تھے۔ شافعیہ نے چاند کو دیکھا جو خلاصہ آگے نکل گیا تھا۔ وہ پھر درخت کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور ایک بار پھر نیند نے اُسے خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو اس دن کا سورج افق سے اٹھ آیا تھا۔ شافعیہ اٹھی اور اُس نے گھوڑوں کی رسیاں کھول دیں تاکہ یہ چر چک لیں۔ اُسے اب آگے جانا تھا۔ معلوم نہیں یہ کون سا خطہ تھا کہ اسے کوئی آبوی، کوئی چھوٹی سی بستی اور ایک بھی انسان نظر نہیں آیا تھا نہ کسی انسان کے قدموں کے نشن نظر آتے تھے۔

گھوڑے گھاس چر رہے تھے اور شافعیہ ایک تھملا کھول کر اپنا پیٹ بھرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور پہلے کی طرح ایک گھوڑے کو دوسرے کے پیچھے باندھ کر سوار ہو گئی اور اللہ کا نام لے کر چل پڑی۔

جنگل ویسا ہی تھا جیسا وہ دیکھتی چلی آ رہی تھی، اب یہ تبدیلی آئی تھی کہ ٹیکریاں ذرا بڑی ہو گئی تھیں اور ان ٹیکریوں پر بھی گھاس تھی، جھاڑیاں تھیں اور درخت بھی تھے۔ وہ چلتی چلی گئی اور تقریباً آدھا دن گزر گیا۔ وہ کچھ دیر کے لئے رکنے کی سوچ رہی تھی کہ اُسے دوڑتے گھوڑے کے ٹاپ سنائی دینے لگے۔ پہلے تو اُس نے اپنے آپ کو یہ دھوکا دیا کہ اُس کے کان بج رہے ہیں لیکن دوڑتے گھوڑے کے قدموں کی دھمک بلند ہوتی جا رہی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ گھوڑا اسی طرف آ رہا ہے۔

شافعیہ نے اُدھر اُدھر دیکھا کہ چھپنے کی کوئی جگہ نظر آجائے لیکن دو گھوڑوں کو چھپانا ناممکن تھا۔ وہ اکیلی ہوتی تو کسی گھنی جھاڑی کے پیچھے چھپ سکتی تھی۔ شافعیہ کو اس گھوڑ سوار کا سامنا کرنا ہی تھا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ جس ٹیکری کے ساتھ لگ کر وہ بیٹھی تھی، اسی کی لوٹ میں یعنی پچھلی طرف چلی جائے۔ وہ یہ ارادہ اس امید پر باندھ رہی تھی کہ گھوڑ سوار اس طرف سے آگے نکل جائے گا لیکن اب چھپنے کو وقت گزر گیا تھا۔ ایک ہرن اپنی پوری رفتار سے دوڑا آ رہا تھا اور پہ ہرن اُس کے قریب سے گزر گیا۔ شافعیہ نے دیکھا کہ ہرن کی دم کے ساتھ پیٹھ پر تیرا ترا ہوا تھا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ جو گھوڑ سوار اس کے تعاقب میں آ رہا ہے، تیرا اسی نے اس پر چلایا ہو گا اور وہ کوئی شکاری ہو گا۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کھڑی رہے یا وہاں سے ہٹ جائے کہ اتنے میں ایک گھوڑ سوار ایک ٹیکری کے عقب سے سامنے آیا جس کا گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے شافعیہ کے قریب آ گیا اور شافعیہ کو دیکھ کر اُس نے باگ کھینچی۔ گھوڑا دو چار قدم پاؤں جماتے جماتے آگے نکلا اور رُک گیا۔ گھوڑ سوار سیاہ فام تھا۔ اُس کے پیچھے دو اور گھوڑ سوار آ گئے۔ وہ بھی سیاہ فام تھے۔ آگے والے گھوڑ سوار کا لباس ظاہر کرتا تھا کہ وہ کسی قبیلے کا سردار یا سردار ہے اور جو گھوڑ سوار اس کے پیچھے آ رہے تھے، وہ اس کے نوکر یا غلام لگتے تھے۔

شافعیہ کو یاد آیا کہ اُسے کسی نے بتایا تھا کہ جنگلوں میں کچھ قبیلے ہیں جو تہذیب و تمدن سے دور رہتے ہیں اور یہ قبیلے خاصے وحشی ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ان قبیلوں کا اپنا ہی تہذیب و تمدن اور اپنا ہی مذہب ہے۔ کبھی یہ بُت پرست ہوا کرتے تھے لیکن انہوں نے اسلام کا اتنا سا ہی اثر قبول کیا کہ بُت پرستی چھوڑ دی لیکن اپنے اپنے عقیدوں اور مذہبی رسم و رواج کو نہ چھوڑا۔

وہ گھوڑ سوار وحشی تھا یا تہذیب یافتہ، اس سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ شافعیہ کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جس میں حیرت بھی تھی اور ہوس کاری کا تاثر بھی تھا۔ شافعیہ اُسے چپ چاپ دیکھے جا رہی تھی۔ اُس نے خوف و ہراس جھٹک ڈالا اور چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہ آنے دیا جس سے پتہ چلتا کہ وہ اس سیاہ فام سے خوف و ہراس محسوس کر رہی ہے۔ یہ سوار گھوڑے سے اُتر آیا اور آہستہ آہستہ شافعیہ کے قریب آ گیا۔ اُس کے دونوں نوکر گھوڑوں سے اُترے اور اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے آقا ابھی انہیں کوئی حکم

دے لگ آقا نے اپنی زبان میں شافعیہ کے ساتھ بات کی۔ شافعیہ نے سر ہلایا جس کا مطلب تھا کہ وہ اُس کی زبان نہیں سمجھتی۔ وہ مسکرایا۔
 ”کیا تم انسان ہو؟“ — گھوڑ سوار نے اب اس خطے کی زبان میں پوچھا — ”یقین نہیں آتا۔“

”ہاں میں انسان ہوں“ — شافعیہ نے جواب دیا۔
 شافعیہ کے لب و لہجے اور انداز میں ذرا سا بھی خوف و ہراس نہیں تھا۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ ذرا سے بھی خوف کا اظہار کیا یا اس پر اپنی مجبوری اور بے بسی ظاہر کی تو یہ شخص شیر ہو جائے گا۔

”کون ہو تم؟“ — سوار نے جو یقیناً ”اپنے قبیلے کا سردار تھا“ پوچھا — ”اور اس جنگل میں اکیلی کیا کر رہی ہو؟..... معلوم ہوتا ہے تمہارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔“

”ہوں تو انسان لیکن روح سمجھ لو“ — شافعیہ نے کہا — ”حسن بن صلیح کا نام تو تم نے سنا ہی ہو گا؟“

”شیخ الجبل..... امام!“ — سردار نے کہا — ”میں نے اُس کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ وہ آسمان سے آگ کی آغوش میں زمین پر اُتر آتا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے اور ٹھیک سنا ہے کہ وہ آسمانی جنت کو زمین پر لے آیا ہے۔“

”میں اس جنت کی حور ہوں“ — شافعیہ نے کہا اور اس سے پوچھا — ”کیا تم نے امام کی بیعت نہیں کی؟“

”نہیں!“ — سردار نے جواب دیا — ”ہمارا اپنا مذہب ہے۔ ہمارا یہ رواج ہے کہ جو قبیلے کا سردار ہوتا ہے وہ مذہبی پیشوا بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے قبیلے کا سردار اور مذہبی پیشوا ہوں..... تم اکیلی کیوں ہو؟“

”شکار کے لئے آئی تھی“ — شافعیہ نے کہا — ”ایک ہرن کے تعاقب میں یہاں تک آنکلی۔ میں دانستہ چھپ گئی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میرے ساتھ جو آدمی شکار کھیلنے آئے تھے وہ مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مایوس ہو جائیں اور واپس چلے جائیں۔ میں دراصل آزاد گھومنا پھرنا چاہتی تھی۔ اب واپس جا رہی ہوں لیکن راستہ یاد نہیں رہا۔“
 شافعیہ نے کچھ اور ایسے ہی جھوٹ بولے اور اپنا دل غ حاضر رکھا۔

”میں نے اس جنگل میں کسی اور آدمی کو نہیں دیکھا“ — سردار نے کہا — ”کیا وہ لوگ تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے؟“

”چلے گئے ہوں گے!“ — شافیہ نے جواب دیا — ”میں اکیلے جانا چاہتی ہوں لیکن ابھی میں واپس نہیں جاؤں گی کیونکہ میں ایک اور جگہ جانا چاہتی ہوں۔ میں بھٹک نہ جاتی تو اب تک یہاں سے نکل گئی ہوتی۔ مجھے کچھ خیال نہیں رہا ہم کس طرف سے آئے تھے۔“

”کہاں جانا چاہتی ہو؟“ — سردار نے پوچھا۔

”قلعہ وسم کوہ!“ — شافیہ نے جواب دیا — ”کیا تم مجھے وہاں تک کا راستہ بتا سکتے ہو؟.... میں نہیں جانتی میں کس سمت کو جا رہی ہوں۔“

”کیا شیخ الجبل میں اتنی روحانی طاقت نہیں؟“ — سردار نے پوچھا اور کہا — ”اے تو گھریٹھے معلوم ہو جانا چاہئے کہ تم کہاں ہو۔ میں نے تو سنا ہے کہ اُس میں ایسی روحانی قوت ہے کہ زمین کی ساتویں تہ تک کے راز پالیتا ہے۔“

”اُسے کوئی بتائے گا تو وہ میرا پتہ چلائے گا“ — شافیہ نے کہا — ”اُسے کوئی بھی نہیں بتائے گا کہ میں جنگل میں اکیلی رہ گئی ہوں.... کیا تم مجھے راستہ بتا سکتے ہو؟“

”بتا سکتا ہوں“ — سردار نے جواب دیا — ”لیکن یہاں نہیں بتاؤں گا۔ تم میرے علاقے میں ہو اور میں تمہارا میزبان ہوں۔ میں تمہیں اپنی بستی میں نہیں لے جاؤں گا، بستی بہت دُور ہے۔ یہاں میں ایک جگہ خیمہ زن ہوں، تمہیں وہاں لے جاؤں گا اور وہاں تمہیں راستہ سمجھاؤں گا۔“

”اگر میں تمہارے خیمے میں نہ جاؤں تو؟“ — شافیہ نے پوچھا۔

”تو پھر اس جنگل میں بھٹکتی رہو“ — سردار نے مسکراتے ہوئے کہا — ”اس جنگل سے لکھنا آسان کام نہیں اور یہاں خطرہ یہ ہے کہ یہاں بھڑیئے بھی ہیں، شیر بھی ہیں اور ایک سیاہ رنگ کا شیر بھی دیکھنے میں آیا ہے جو بہت خطرناک درندہ ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری تلاش میں آنے والوں سے پہلے ان درندوں میں سے کوئی تم تک پہنچ جائے۔... تمہیں خیمے میں اس لئے لے جا رہا ہوں کہ تم زہلی وسم کوہ تک کا راستہ نہیں سمجھ سکو گی۔ میں سفید کپڑے پر راستہ بنا کر تمہیں دوں گا اور جو نم لیاں نشانیاں راستے میں آئیں گی وہ نشان لگا کر تمہیں بتاؤں گا۔ بہتر ہے میرے ساتھ چلی چلو۔“

شافعیہ نے کچھ دیر سوچا اور بہتر یہی سمجھا کہ یہ خطرہ مول لے لیا جائے اور اس شخص سے راستہ سمجھ لیا جائے۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ اُس نے اس سیاہ فام سردار کے ساتھ جانے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔



شافعیہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئی اور اُس کے ساتھ چل پڑی۔ اُس کا سیاہ فام میزبان اپنے شکار کو بھول گیا اور واپس اپنے خیمے کی طرف چل پڑا۔ وہ بولتا کم تھا اور شافعیہ کو اوپر سے نیچے تک بار بار دیکھتا اور حیران بھی ہوتا اور خوش بھی۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس ہرن کے ساتھ اُسے کوئی دلچسپی نہیں رہی جس کی پیٹھ میں اس کا تیرا ترا ہوا تھا۔ اُسے بڑا ہی خوبصورت شکار مل گیا تھا۔ شافعیہ شاید اس کی نظروں کو سمجھ رہی تھی۔

”میرا نام زرتوش ہے“ — راستے میں سردار نے شافعیہ کو بتایا — ”میں ابھی تین چار دن اسی جنگل میں رہوں گا۔ جب واپس جاؤں گا تو میرے ساتھ دو تین ہرن ہوں گے اور شاید ایک شیر بھی ہو۔“

شافعیہ کو اُس کے شکار کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس سے صرف راستہ سمجھنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ اس جنگل سے خیریت سے نکل بھی جائے گی یا نہیں!

”میں اپنے آدمی تمہارے ساتھ بھیج دوں گا“ — زرتوش نے کہا — ”وہ تمہیں خطرناک علاقے سے نکل کر واپس آئیں گے۔“

زرتوش کی خیمہ گاہ وہاں سے بہت دُور تھی۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ وہاں چار پانچ خیمے لگے ہوئے تھے اور ان کے باہر پانچ سات آدمی کوئی نہ کوئی کام کر رہے تھے۔ زرتوش نے شافعیہ کو بتایا کہ وہ سب اس کے نوکر چاکر ہیں اور ان میں باورچی بھی ہے.... ایک خیمہ جو دو سروں سے بڑا اور شکل و صورت میں مختلف تھا، الگ تھلگ نظر آ رہا تھا۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی، یہ زرتوش کا خیمہ تھا۔ زرتوش اور شافعیہ گھوڑوں سے اترے اور نوکر دوڑے آئے اور گھوڑے انہوں نے پکڑ لئے۔ زرتوش شافعیہ کو اپنے خیمے میں لے گیا۔

فرش پر ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ نیچے روئی کے گدے تھے اور ان پر بڑی خوبصورت اور قیمتی چادر پکھی ہوئی تھی۔ خیمے میں کچھ اور چیزیں بڑے قرینے سے اور سلیقے سے

رکھی ہوئی تھیں۔ زرتوش نے شافعیہ کو بستر پر بٹھایا اور ایک خلوم کو بلا کر کہا کہ وہ کھانا لے آئے۔

کھانا آیا تو شافعیہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ بھنے ہوئے مختلف پرندے تھے۔ یہ اتنے زیادہ تھے کہ دس بارہ آدمی کھا سکتے تھے۔ ان کے ساتھ روٹی نہیں تھی۔

”شکار پر آکر میں صرف شکار کھایا کرتا ہوں“ — زرتوش نے کہا — ”تم بھی یہ پرندے کھاؤ گی، روٹی نہیں ملے گی نہ تمہیں روٹی کی ضرورت محسوس ہوگی۔“

خلوم پھر آیا اور ایک صراحی اور دو پیالے رکھ کر چلا گیا۔ زرتوش نے صراحی سے دونوں پیالے بھرے اور ایک پیالہ شافعیہ کے آگے کر دیا۔ شافعیہ بو سے سمجھ گئی کہ یہ شراب ہے۔ اُس نے شراب پینے سے انکار کر دیا۔

”کیوں؟“ — زرتوش نے حیرت سے کہا — ”شیخ الجبل حسن بن صباح کی حور ہو کر تم شراب پینے سے انکار کرتی ہو؟.... کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

”ہاں اس کی ایک وجہ ہے“ — شافعیہ نے کہا — ”مجھے ایک بزرگ نے بتایا تھا کہ شراب چہرے کی رونق ختم کر دیتی ہے۔ میں بڑھاپے میں بھی جوانوں جیسی رہنا چاہتی ہوں۔“

شافعیہ محتاط تھی کہ اُس کے منہ سے یہ نہ نکل جائے کہ وہ مسلمان ہے۔ وہ کھانا کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ زرتوش نے بہت اصرار کیا کہ وہ تھوڑی سی شراب پی لے لیکن اُس نے نہ پی۔ کھانے سے فارغ ہوئے اور نوکر برتن اٹھا کر لے گیا تو شافعیہ نے زرتوش سے کہا کہ اب وہ اُسے راستہ سمجھا دے۔

”کیا جلدی ہے؟“ — زرتوش نے کہا — ”تم اسی وقت تو روانہ نہیں ہو سکتیں!“

”میں اسی وقت روانہ ہونا چاہتی ہوں“ — شافعیہ نے کہا — ”صبح تک میں اپنی منزل کے کچھ اور قریب ہو جاؤں گی۔ میں رات ضائع نہیں ہونے دوں گی۔“

”میری میزبانی کا تقاضہ کچھ اور ہے“ — زرتوش نے کہا — ”میں اپنے قبیلے کے رسم و رواج کا پابند ہوں۔ میرے خادم سارے قبیلے میں مشہور کر دیں گے کہ میں نے مہمان کو رات کو رخصت کر دیا تھا۔ مجھ پر لعنت ہے کہ میں مہمان کو اور وہ بھی ایک عورت کو رات کو ہی رخصت کر دوں۔“

”تو پھر مجھے راستہ بنا کر دکھائیں“ — شافعیہ نے کہا۔

سورج غروب ہو گیا تھا اور خیمے میں مٹی کے دو دیئے جلا کر رکھ دیئے گئے تھے۔ زرتوش نے ایک نوکر کو بلایا اور اُسے کہا کہ وہ گز بھر سفید کپڑا لے آئے اور جلی ہوئی لکڑیوں کے دو تین کوئلے بھی لیتا آئے۔

کپڑا آگیا جو ایک چادر سے پھاڑا گیا تھا۔ نوکر تین چار کوئلے بھی رکھ کر خیمے سے نکل گیا۔ زرتوش نے یہ کپڑا لکڑی کی اُس چوکی پر رکھا جس پر کچھ دیر پہلے انہوں نے کھانا کھلایا تھا۔ کپڑے کو ہر طرف سے کھینچ کر زرتوش اس پر کوئلے سے لیکریں ڈالنے لگا۔ اس دوران اس نے شافعیہ کو کچھ بھی نہ بتایا سوائے اس کے کہ جہاں سے اس کی لکیر شروع ہوئی تھی وہ بتایا کہ تم اس وقت یہاں ہو۔ پھر وہ لکیر ڈالتا ہی چلا گیا۔ یہ سیدھی لکیر نہیں تھی بلکہ ٹیڑھی میڑھی سی تھی اور زرتوش اس پر کچھ نشان سے بھی لگاتا جا رہا تھا۔

بہت دیر بعد کپڑے پر کئی ایک لکیریں اس طرح بن گئیں جس طرح نقشے پر دریا دکھائے جاتے ہیں۔ اُس نے یہ کپڑا شافعیہ کو دکھایا اور کہا کہ یہ کپڑا وہ اپنے ساتھ لے جائے گی اور اس کے بغیر وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکے گی۔ زرتوش نے اُسے بتانا شروع کر دیا کہ اس راستے پر اس سمت کو جائے گی تو اتنی دور ایک چشمہ ملے گا۔ اس طرح وہ اُسے تفصیلات بتا رہا اور پھر یہ بھی بتایا کہ اس مقام پر آکر کوہستانی علاقہ شروع ہو گا اور اس میں فلاں فلاں نشانیاں دیکھ کر راستہ دیکھنا ہو گا۔

شافعیہ نے محسوس کیا کہ راستہ زبانی یاد نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ کپڑا ساتھ ہونا لازمی تھا۔ اُسے امید یہی تھی کہ اس کا میزبان اُسے کہے گا کہ یہ کپڑا اپنے پاس رکھنا اور اسے دیکھ دیکھ کر چلنا لیکن میزبان نے کپڑا تمہ کر کے اپنے چغے کی اندروالی جیب میں رکھ لیا۔

”کیا یہ کپڑا مجھے نہیں دو گے؟“ — شافعیہ نے پوچھا۔

”تمہارے لئے ہی تو یہ ٹیڑھی سیدھی لکیریں ڈالی ہیں“ — زرتوش نے جواب دیا

— ”لیکن ایک شرط ہے جو پوری کر دو گی تو یہ کپڑا تمہارے حوالے کر دوں گا اور اپنے دو آدمی تمہارے ساتھ محافظوں کے طور پر بھیجوں گا۔ کھانے پینے کا ایسا سامان ساتھ دوں گا جو تم نے حسن بن صباح کی جنت میں بھی کبھی نہیں کھایا ہو گا۔“

شافعیہ نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اس شخص کا لب و لہجہ بدلا ہوا ہے۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں بھی کوئی اور ہی تاثر آگیا تھا۔ اُس پر شراب کا نشہ بھی طاری

تھل۔

”شرط کیا ہے؟“ — شافیہ نے پوچھا۔

”آج رات تم میری مہمان ہو گی“ — زرتوش نے بازو لہا کر کے شافیہ کو اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا — ”کل رات بھی تم میرے ساتھ گزارو گی۔ اب خود ہی سمجھ لو میری شرط کیا ہے۔“

”ہاں میں سمجھ گئی ہوں“ — شافیہ نے کہا — ”تم میری عصمت اور آبرو کا سودا کر رہے ہو۔ اگر میں یہ سودا قبول نہ کروں تو؟“

”تو ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی“ — زرتوش نے کہا — ”میں تمہیں اپنی لونڈی بنا کر رکھوں گا۔ اگر مجھے پریشان کرو گی یا بھاگنے کی کوشش کرو گی تو میں تمہیں بڑی ہی بُری موت ماروں گا۔“

”کیا تم بھول گئے ہو میں کون ہوں؟“ — شافیہ نے کہا — ”میں شیخ الجبل کی بڑی قیمتی ملکیت ہوں۔ تم جانتے ہو حسن بن صلیح اللہ کا اُتارا ہوا المام ہے اور اس میں اتنی طاقت ہے کہ اُسے پتہ چل جائے گا میں کہاں ہوں۔ تم یہ نہیں جانتے کہ وہ تمہیں کس انجام کو پہنچائے گا۔ آدھا زمین میں گاڑ کر وہ تم پر خونخوار کتے چھوڑ دینے کا حکم دے گا اور تمہارے قبیلے کی تمام لڑکیوں کو یہاں سے اٹھوا کر قلعہ الموت میں اکٹھا کر لے گا۔“

”جانتا ہوں“ — زرتوش نے کہا — ”بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ حسن بن صلیح اللہ کا نہیں ابلیس کا بھیجا ہوا المام ہے اور اس کے پاس وہی طاقت ہے جو ابلیس کے پاس ہوتی ہے اور مجھ جیسے سردار ایسی طاقت سے محروم ہوتے ہیں۔ تم جس عصمت اور آبرو کا سودا قبول نہیں کر رہیں وہ عصمت اور آبرو تمہارے پاس ہے ہی نہیں۔ میں نے تم جیسی حسین لڑکیاں تو دیکھی ہیں لیکن کبھی کسی کو ہاتھ لگا کر نہیں دیکھا۔ میں تمہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ زندگی میں پہلی بار تم جیسی شگفتہ کلی میرے ہاتھ آئی ہے۔ میں تمہارے حسن اور جوانی سے پورا پورا لطف اٹھاؤں گا۔.... کیا تم میری اس شرافت کی قدر نہیں کرو گی کہ میں نے تمہیں صرف دو راتیں رکھنے کے لئے کہا ہے؟ اس کے بعد تم آزاد ہو گی اور میرے آدمی تمہارے ساتھ جائیں گے۔“

”میں نے بڑے ہی بد صورت اور شیطان فطرت آدمی دیکھے ہیں“ — شافیہ نے

کہا — ”لیکن کبھی کسی کے ساتھ واسطہ نہیں پڑا تھا۔ تم پہلے بد صورت آدمی ہو جس کے جل میں پھنسی ہوں۔ تم دو راتیں کہتے ہو؟ میں دو لمحے بھی یہاں ٹھہرنا گوارا نہیں کروں گی.... اپنا انجام سوچ لو۔“

زرتوش طنزیہ سی ہنسی ہنس پڑا اور شافعیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میں نے تمہیں پہلی نظر دیکھا تو یقین نہیں آیا تھا کہ تم انسان ہو“ — زرتوش نے کہا — ”پھر یقین ہو گیا کہ تم انسان ہی ہو.... یہ بتا دو کہ تم یہاں اکیلی کس طرح آئی ہو اور کس طرح راستہ بھول گئی ہو؟ یہ سن لو کہ تم میری شرط پوری کئے بغیر یہاں سے جا نہیں سکو گی۔ اگر جل کی بازی لگاؤ گی تو میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا.... بولو، کہاں سے آئی ہو اور کہاں جا رہی ہو!“

شافعیہ گہری سوچ میں کھو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ اس شخص کو اپنی اصلیت بتا دے اور یہ بھی کہ وہ اپنے چچا وغیرہ کے ساتھ ایک خزانہ اٹھانے گئی تھی اور وہاں سب قتل ہو گئے ہیں۔ خزانے کے خیال سے شافعیہ کا دماغ روشن ہو گیا۔ اُس نے سوچا کہ اس شخص کو خزانے کا لالچ دیا جائے تو یہ بہت خوش ہو گا اور جل بخشی کر دے گا.... شافعیہ نے اُسے خزانے کے متعلق سب کچھ بتا دیا اور یہ بھی کہ کس طرح وہ بھی اپنے چچا کے ساتھ اس غار تک گئی تھی اور کس طرح کچھ ڈاکو اور لٹیرے آگئے جو جانتے تھے کہ یہاں خزانہ ہے۔ شافعیہ نے اسے یہ ساری واردات سنا دی لیکن اپنے متعلق یہی بیان رکھا کہ وہ حسن بن صباح کی جنت کی حور ہے اور خزانے کے لالچ میں آگئی تھی۔

”میں تمہیں اس جگہ کا راستہ بتا دیتی ہوں“ — شافعیہ نے کہا — ”دو دنوں کی مسافت ہے۔ وہاں اب سوائے کئی اور جلی ہوئی لاشوں کے کچھ نہیں ہو گا۔ جاؤ اور وہ بکس اٹھا کر لے آؤ۔“

”بد قسمت اور بے عقل لڑکی!“ — زرتوش نے کہا — ”میں جانتا ہوں تم جھوٹ نہیں بول رہیں۔ تم جانتی ہو میں خزانے کی طرف چل پڑا تو تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ تم نے مجھے دھوکہ نہیں دیا لیکن وہ سب لوگ جو اس غار میں خزانے پر مارے گئے ہیں، انہوں نے اپنے آپ کو دھوکا دیا تھا۔ ہم لوگ اس خزانے کے لالچ میں کبھی نہیں آئے۔ ان خزانوں پر بڑے بڑے جابر بادشاہ کٹ مرے ہیں۔“

”تم وہاں جاؤ تو سہی!“ — شافعیہ نے کہا — ”اب وہاں مرنے مارنے والا کوئی

نہیں آئے۔ وہ جو آئے تھے وہ اس خزانے کے حصہ دار تھے اور وہ تمام خزانہ خود لے جانا چاہتے تھے۔“

”میں کہہ رہا ہوں یہ لالچ مجھے نہ دو“ — زرتوش نے کہا — ”ہم لوگ تمہاری تہذیب سے تمہارے رہن سہن سے اور تمہارے شہانہ طور طریقوں سے دُور جنگلوں میں رہنے والے لوگ ہیں۔ تم ہمیں جنگلی کہہ لو، وحشی اور درندے کہہ لو لیکن ہم جو کچھ بھی ہیں، اپنے آپ میں خوش اور مطمئن ہیں.... تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ یہ لوگ چُھپا ہوا خزانہ اٹھانے گئے تو سب مارے گئے بلکہ جل بھی گئے۔ ہمارے بزرگ ہمیں بتا گئے ہیں کہ کبھی کسی چُھپے ہوئے اور مدفون خزانے کے لالچ میں نہ آنا۔ لوٹا ہوا خزانہ جہاں کہیں بھی چُھپا کر رکھا جائے، وہاں بدروحوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ یہ بدروحیں ساتیوں کی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہیں یا بڑے زہریلے پچھوین جاتی ہیں۔ خزانے تک پہنچنے والے جو نئی خزانے پر ہاتھ رکھتے ہیں، سانپ یا پچھو نکل آتے ہیں اور دُس کر انہیں وہیں ختم کر دیتے ہیں۔ کما تو یہ بھی جاتا ہے کہ بدروحیں نہ ہوں تو وہاں جنت پہنچ جاتے ہیں جو انسانوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں اور خزانے کی حفاظت کرتے ہیں۔ تمہارے آدمیوں پر جن لوگوں نے حملہ کیا تھا، انہیں بدروحیں یا جنت لائے تھے اور وہاں تک پہنچایا تھا۔ چونکہ وہ بھی خزانہ اٹھانے گئے تھے اس لئے آپس میں لڑ مرے اور بدروحوں یا جنت نے مشعلوں سے انہیں جلا ڈالا۔ کیا تم نے کبھی سنا نہیں کہ مدفون خزانوں پر سانپ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں؟“

”میں تمہیں جانے پر اکسا نہیں رہی“ — شافعیہ نے کہا — ”میں نے ایک خزانے کی نشاندہی کی ہے۔ کبھی دل میں آئے تو وہاں چلے جانا۔“

”میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گا“ — زرتوش نے کہا — ”تم جس حسن بن صلیح کو اللہ کا بھیجا ہوا الم کہتی ہو، اُس کے بڑے ہی دلکش اثرات میرے قبیلے تک آئے تھے۔ مجھے بڑی ہی حسین لڑکیوں کے اور ایسے ہی خزانوں کے لالچ دیئے گئے تھے۔ حسن بن صلیح کے بھیجے ہوئے آدمی اس امید پر آئے تھے کہ قبیلے کا سردار جل میں آگیا تو سمجھو پورا قبیلہ ہاتھ آگیا۔ میرا قبیلہ جنگجو ہے، شہسوار ہے، حسن بن صلیح مجھے اور قبیلے کو اپنی طاقت بنانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا مذہب نہیں چھوڑا۔ ہمارے کچھ اپنے عقیدے ہیں۔ ہاں، اسلام کا کچھ اثر قبول کیا ہے۔ وہ اس لئے کہ اسلام کوئی لالچ نہیں دیتا، اسلام کوئی

لالچ قبول نہیں کرتا۔ اگر مسلمانوں کے سلطان حکمرانی کو دماغ پر سوار کر لیں اور ان کے امیر مارت کو اپنا نشانہ بنالیں تو پھر حسن بن صباح جیسے ابلیس کامیاب نہ ہوں تو کیوں نہ ہوں۔ ان کی نسبت تو ہم جنگلی اور وحشی اچھے ہیں جنہوں نے حسن بن صباح کی ابلیست کو قبول نہیں کیا۔

”ایک بات سنو“ — شافعیہ نے کہا — ”تم باتیں کتنی اچھی اور عقل کی کرتے ہو لیکن ایک بے بس، بھکی ہوئی اور کمزور سی لڑکی پر رحم نہیں کرتے۔“

”تو نے مجھے حسن بن صباح سے ڈرانے کی کوشش کی ہے“ — زرتوش نے کہا۔
 ”اگر میں کہوں کہ میں مسلمان ہوں اور حسن بن صباح کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تو میرے ساتھ تمہارا سلوک کیا ہو گا؟“ — شافعیہ نے کہا۔

”میں کہوں گا تم مجھے دھوکہ دے رہی ہو“ — زرتوش نے کہا — ”مجھے کچھ بھی کہہ لو.... میں وحشی ہوں، درندہ ہوں.... میں دو راتیں تمہیں اپنے پاس رکھوں گا۔ کیا یہ رحم نہیں کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا قیدی نہیں بناتا رہا؟.... تم مجھے اس خواہش سے محروم نہیں کر سکو گی۔ تمہاری نجات اسی میں ہے کہ دو راتوں کے لئے مجھے قبول کر لو۔“

شافعیہ پھر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اُسے اپنے حُسن کا اچھی طرح اندازہ تھا وہ جب اُس سیاہ قام شخص کو دیکھتی تھی تو اُس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ سوچتے سوچتے اسے ایک روشنی نظر آئی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ — زرتوش نے کہا — ”میں تم پر کوئی ظلم نہیں کر رہا۔ اس کے بعد تم آزاد ہو گی اور یہ ایک مرد کا وعدہ ہے۔“

”صرف آج کی رات!“ — شافعیہ نے کہا — ”میری یہ شرط مان لو.... صرف آج کی رات.... صبح مجھے رخصت کر دینا۔“

”چلو، مان لیا“ — زرتوش نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کپڑا مجھے دے دو“ — شافعیہ نے کہا۔

”کپڑا صبح ملے گا“ — زرتوش نے کہا — ”یہ کپڑا صبح تمہارا ہو گا۔ رات کو یہ میرا ہے۔“

اس دوران زرتوش شراب ایک ایک گھونٹ پیتا رہا تھا۔ شافعیہ کو رضامند دیکھ کر

اُس نے کچھ اور شراب چڑھالی۔ اُس نے بڑے پیار سے شافیہ کو بستر پر لٹا دیا۔ اُس پر ایک تو شراب کا نشہ طاری تھا اور اس کے ساتھ شافیہ کے حُسن و جوانی کا نشہ بھی شامل ہو گیا۔ وہ دیکھ نہ سکا کہ شافیہ کا دایاں ہاتھ اپنے نیپے کے اندر چلا گیا ہے۔ زر توش اُس کے اوپر جھکا تو شافیہ نے پوری طاقت سے خنجر اُس کے دل کے مقام پر اتار دیا۔ زر توش پیچھے ہٹا۔ شافیہ بڑی تیزی سے انھی اور خنجر کا ایک وار اور کیا۔ زر توش پیٹھ کے بل گرا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ وہاں رکھ لئے تھے جہاں اس کو خنجر لگے تھے۔ اُس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ خنجر صحیح مقام پر لگے تھے۔ خون کا فوارہ پھوٹ آیا تھا۔ شافیہ اسے دیکھتی رہی۔ زر توش کے دونوں ہاتھ جو سینے پر رکھے ہوئے تھے ڈھیلے پڑ گئے اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

شافیہ نے اس کے چنے کے اندر ہاتھ ڈالا اور وہ کپڑا نکال لیا جس پر زر توش نے کونلے سے راستے بنائے تھے۔ یہ کپڑا اس نے اپنے کپڑوں کے اندر نیپے میں اڑس لیا۔ اب اسے یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ زر توش کے نوکر چاکر جاگ رہے ہوں گے۔ وہ آہستہ آہستہ باہر نکلی۔ باہر خاموشی تھی۔ کسی اور خیمے میں روشنی نہیں تھی۔ وہ سب شاید سو گئے تھے اور وہ اس خیال سے سو گئے ہوں گے کہ ان کے سردار کو بڑا خوبصورت شکار مل گیا ہے اور وہ اب شراب اور بدکاری میں مگن ہو گا۔ شافیہ دبے پاؤں گھوڑوں تک پہنچی۔

زینیں قریب ہی رکھی تھیں۔ اس نے اپنے دونوں گھوڑوں پر زینیں رکھیں اور اچھی طرح کس لیں۔ خیمے میں جا کر اُس نے اپنی تلوار اٹھائی اور کمر کے ساتھ باندھ لی۔ باہر جا کر اُس نے دیکھا کہ ایک گھوڑے پر اس کے کھانے والے تھیلے بندھے ہوئے تھے اور ایک مشکیزے میں پانی اچھا خاصا موجود تھا۔ اب اسے پانی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ یہ جنگل تھا اور جنگل میں پانی کی کمی نہیں ہوتی۔

اسے ایک خیال آ گیا۔ یہ تو اس نے دیکھا نہیں تھا کہ کس طرف جانا ہے۔ وہ پھر خیمے میں چلی گئی۔ دو دیئے جل رہے تھے۔ شافیہ نے کپڑا نیپے سے نکال کر اپنے سامنے زمین پر پھیلایا اور دیکھا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ یہ راستہ اچھی طرح دیکھ لیا۔ کپڑا لپیٹ کر پھر نیپے میں اڑس لیا اور خیمے سے نکل آئی۔

وہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور گھوڑا چل پڑا لیکن اُس نے گھوڑے کو زیادہ تیز نہ چلنے

دیا تاکہ اس کے قدموں کی آواز خیموں کے اندر تک نہ پہنچ سکے۔ خاصی دُور جا کر اُس نے باگوں کو جھٹکا دیا تو گھوڑے کی رفتار تیز ہو گئی۔



دسم کوہ میں امن قائم ہو چکا تھا۔ باطنیوں کی لاشیں گھسیٹ کر قلعے سے دور چند ایک لمبے چوڑے گڑھے کھود کر ان میں پھینک دی گئیں اور اوپر مٹی ڈال دی گئی تھی۔ سالار اور یزی کے لشکر کے شہیدوں کو الگ الگ قبروں میں پورے احترام سے دفن کیا گیا تھا۔

سلطان برکیارق اپنے دونوں بھائیوں محمد اور سبخر کے ساتھ دسم کوہ پہنچ گیا تھا اور مثنیوں بھائیوں نے سالار اور یزی، منزل آفندی اور بن یونس کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا تھا۔

”لیکن سالار اور یزی!“ — برکیارق نے پہلے روز یہاں پہنچ کر کہا تھا — ”صرف قلعہ سر کر کے ہمارا کام ختم نہیں ہو جاتا۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے اثرات کو اور اس کے پھیلائے ہوئے غلط عقائد کو ختم کیا جائے۔ اس کے لئے قلعہ الموت کو سر کرنا ضروری ہے ورنہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔“

”آپ پوری سلطنت کا لشکر قلعہ الموت کے محاصرے کے لئے لے جائیں۔“ — منزل آفندی نے کہا — ”آپ اس قلعے کو سر نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے نہیں کہ باطنی بڑے زبردست جنگجو ہیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ قلعہ بلندی پر بنایا گیا ہے اور اس کے تین اطراف سے دریا گزرتا ہے۔ آپ ایک بار اس قلعے کو دیکھ لیں۔“

”میں نے یہ قلعہ بڑی اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔“ سالار اور یزی نے کہا — ”میں خود کہا کرتا ہوں کہ اس قلعے کو سر کرنا اگر ناممکن نہیں تو بہت ہی مشکل ضرور ہے۔۔۔ لیکن سوچنے والی بات یہی ہے کہ اصل طاقت کہاں ہے۔ وہ ہے حسن بن صباح۔ اگر اس ایک شخص کو سر کر لیا جائے تو صرف قلعہ الموت ہی نہیں بلکہ ان باطنیوں کے تمام قلعے اور ان کے تمام اسرار ہمارے قدموں میں آگریں گے۔ ہمیں تین چار ایسے جانبازوں کی ضرورت ہے جو قلعہ الموت میں داخل ہو کر حسن بن صباح کو اُسی طرح قتل کر دیں جس طرح حسن بن صباح کے فدائی ہمارے علماء اور حاکموں کو قتل کر چکے ہیں اور کرتے جا رہے ہیں۔“

”میں آج تک کیا کتا آ رہا ہوں“ — منزل آتھدی نے کہا — ”دو جہاز تو یہاں بیٹھے ہیں۔ ایک میں ہوں اور دوسرا بن یونس.... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم سیدھے جا کر حسن بن صلیح کو قتل نہیں کر سکتے۔ ہمیں کچھ چال بازیوں کرنی پڑیں گی۔ آپ اجازت دیں تو میں کچھ اور جہاز تیار کر لوں۔“

اس مسئلے پر بہت دیر جھلنے خیالات ہو تا رہا اور یہ سب اس نتیجے پر پہنچے کہ جس طرح حسن بن صلیح زمین دوز دار کرتا ہے اور سامنے لڑنے کے لئے نہیں آتا، اسی طرح اسے ختم کرنے کے لئے بھی کوئی طریقہ کار طے کرنا پڑے گا.... تاریخ کے دامن میں جو واقعات اب تک محفوظ ہیں، ان سے یہ شہوت ملتی ہے کہ مسلمان سلاار اور دوسرے حاکم آپس میں اس قسم کی باتیں تو کر لیتے تھے لیکن عملی طور پر وہ ایسے طریقے اختیار نہیں کرتے تھے جو حسن بن صلیح کے طریقوں کے توڑ ثابت ہو سکتے۔ مسلمان میدان جنگ میں لڑنے کی مہارت اور جذبہ رکھتے تھے لیکن حسن بن صلیح لشکروں کی دُور دُور لڑائی کا قائل نہیں تھا۔ وہ ساتھیوں اور پچھوؤں کی طرح ڈنک مارا کرتا تھا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اُس نے اپنے فدائی تیار کر رکھے تھے اور وہ فدائی زہریلے ناگوں اور پچھوؤں جیسے ہی تھے۔

سلطان برکیارق نے اپنا ایک مسئلہ پیش کر دیا۔ اس نے کہا کہ اُس کی صحت اس قتل نہیں رہی کہ سلطانی کے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکے۔ مسلمان مؤرخوں میں سے اکثر نے تو سلطان برکیارق کی بیماری کا ذکر ہی نہیں کیا اور جن دو مسلمان مؤرخوں نے ذکر کیا ہے، وہ اتنا ہی کیا ہے کہ سلطان برکیارق علیل ہو گیا تھا۔ البتہ ایک یورپی تاریخ دان جیمز سٹیفن نے تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ سلطان برکیارق ذہنی طور پر ٹھیک نہیں رہا تھا۔

اس نے لکھا ہے کہ سلطان برکیارق ایک باطنی لڑکی کے زیر اثر آ گیا تھا اور اس نے اس دوران بڑے غلط فیصلے کئے تھے اور اپنی ماں تک کی بے ادبی کی تھی۔ برکیارق نے اس لڑکی کو جو اس کی بیوی بن گئی تھی، اپنے ہاتھوں قتل کیا تھا اور اس سے برکیارق کے ضمیر سے گناہ کا بوجھ اتر جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔

خانہ جنگی کا بوجھ بھی برکیارق نے اپنے ضمیر پر لے رکھا تھا۔ اس نے اپنی ماں کے قدموں میں جا سر رکھا تھا اور معافیاں مانگی تھیں۔ اُس نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی بہت

عبادت کی تھی اور وہ اپنے گناہوں کی بخشش مانگتا رہتا تھا لیکن خانہ جنگی میں جو لوگ مارے گئے تھے، برکیارق اپنے آپ کو ان سب کا قاتل سمجھتا تھا۔ اس نے سلطنت کے امور کے سلسلے میں بڑے اچھے فیصلے کئے تھے اور اس نے اپنی زندگی سلطنت کے استحکام کے لئے اور عوام کی خوشحالی کے لئے اور حسن بن صباح کی تباہی کے لئے وقف کر دی تھی۔ اسے علماء نے یقین دلایا تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کے گناہ معاف کر دیئے ہیں لیکن جب وہ تنہا ہوتا تو اپنے ضمیر کا سامنا کرنے سے گھبراتا اور پریشان ہو جاتا تھا۔ یہ ایسا ذہنی مرض تھا جس نے اس کے دماغ پر یعنی سوچنے کی قوت پر اور جسم پر بھی اثر کیا۔ اس کی جسمانی حالت یہ ہو گئی تھی کہ جوانی میں ہی وہ بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ طبیوں نے اس کے علاج میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ اسے ایسی دوائیاں تیار کر کے دی تھیں جن کا کوئی عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن مرض بدھتا ہی گیا اور برکیارق ایسے مقام پر آ پہنچا جہاں اس نے محسوس کیا کہ وہ جسمانی اور ذہنی لحاظ سے معذور ہو گیا ہے۔

”ہم تینوں بھائیوں نے سلطنت آپس میں تقسیم کر لی تھی“ — برکیارق نے کہا — ”مجھے توقع تو یہ تھی کہ یہ تقسیم سلطنت کے اندرونی مسائل اور دفاعی ضروریات کے لئے اچھی ثابت ہوگی۔ یہ اچھی ہی ثابت ہو رہی تھی کیونکہ ہم تینوں بھائیوں میں اتفاق اور اتحاد قائم رہا اور انہوں نے میرے ہی فیصلوں کو تسلیم کیا لیکن میں اب شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ میں اب سلطنت کا کاروبار سنبھالنے کے قابل نہیں رہا۔ میں تم سب سے مشورہ نہیں لے رہا بلکہ فیصلہ بنا رہا ہوں کہ آج سے میرے دونوں بھائی، محمد اور سبخر سلطنت کے سلطان ہوں گے اور سلطنت تین کی بجائے دو حصوں میں تقسیم ہو گی لیکن اس کا مرکز مرو میں ہی رہے گا۔“

سب پر سناٹا سا طاری ہو گیا۔ برکیارق کا یہ فیصلہ اچانک اور غیر متوقع تھا۔ سالار اور یزی نے برکیارق کے اس فیصلے کے خلاف کچھ کہا اور دوسروں نے اس کی تائید کی لیکن برکیارق اپنے فیصلے پر قائم رہا اور اس نے یہ بھی کہا کہ تم لوگ میرے معاملے میں جذبات میں آگئے تو اس کا سلطنت کو نقصان ہو سکتا ہے۔ کچھ دیر بحث مباحثہ جاری رہا لیکن برکیارق نے سختی سے اپنا آخری فیصلہ ایک بار پھر سنایا اور سب کو خاموش کر دیا۔

”میں سلطنت سے لا تعلق نہیں ہو جاؤں گا“ — برکیارق نے کہا — ”جہاں

کہیں تمہیں میری ضرورت محسوس ہوئی، میں پہنچوں گا اور میری جان اور میرا مل سلطنت کے لئے وقف رہے گا۔

برکیارق بظاہر خوش و خرم نظر آتا تھا اور وہ ہر بات بڑے ہی خوشگوار انداز میں کرتا تھا۔ اس نے اگر کبھی اپنی بیماری کا ذکر کیا تو اس میں مایوسی اور اوس کی جھلک نہیں تھی۔ اُس نے منزل کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”منزل!“ — برکیارق نے مسکراتے ہوئے کہا — ”شمونہ میرے ساتھ آئی تھی اور وہ میرے ساتھ واپس نہیں جائے گی۔ میں حیران ہوں کہ راستے میں اس نے میرے ساتھ کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ اب تمہارے ساتھ شادی کر رہی لیٹا چاہتی ہے بلکہ وہ ایک ہی بات کرتی ہے کہ وہ جو جہلو کرنا چاہتی ہے اس کا اسے موقع نہیں مل رہا.... کیا تم پسند نہیں کرو گے کہ وسم کوہ کی فتح کی خوشی میں تمہارا نکلج آج ہی پڑھا دیا جائے؟“

سب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے برکیارق کی تائید کی۔ یہ شادی بہت عرصہ پہلے ہو جانی چاہئے تھی اور ہونی ہی تھی لیکن منزل اور شمونہ پر ایسی کیفیت طاری رہتی تھی کہ شادی کو وہ نظر انداز کرتے چلے آ رہے تھے۔ دونوں نے اپنی زندگی کا ایک ہی مقصد بنا لیا تھا اور وہ تھا حسن بن صلیح کا قتل اور بانیوں کا قلع قمع.... منزل اور شمونہ جوانی کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکے تھے۔ شمونہ کو جب اطلاع ملی تھی کہ وسم کوہ فتح کر لیا گیا ہے اور اس میں منزل آندی اور بن یونس کا خلاصہ ہاتھ ہے اور ان دونوں نے کامیابی سے بانیوں کو دھوکا دیا ہے تو وہ اُڑ کر منزل کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی لیکن اکیلے وہیں تک جانا ممکن نہیں تھا۔ اسے پتہ چلا کہ سلطان برکیارق وسم کوہ جا رہا ہے تو وہ فوراً ”برکیارق کے پاس جا پہنچی اور کہا کہ وہ بھی جانا چاہتی ہے۔ اس طرح برکیارق اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

اسی شام وسم کوہ میں منزل اور شمونہ کی شادی ہو گئی۔

اگلے روز برکیارق نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے محمد اور سنج کے ساتھ ایک روز بعد مَرُو کے لئے روانہ ہو جانا تھا۔ یہ لوگ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ کوئی سلطان پسند نہیں کرتا کہ وہ جب کھانے پر بیٹھا ہو تو دربار اندر آ کر اسے اطلاع دے کہ فلاں شخص آیا ہے یا فلاں واقعہ ہو گیا ہے لیکن برکیارق نے اپنے درباروں کو کہہ رکھا تھا کہ وہ

کھانے پر بیٹھا ہوا یا گہری نیند سویا ہوا ہو، کوئی خاص واقعہ ہو جائے یا کوئی خاص آدمی اسے ملنے آجائے تو اسے جگا لیا جائے۔ یہ دربانوں کی صوابدید پر تھا کہ وہ ملاقاتیوں کی چھان بین کر کے دیکھیں کہ یہ ملاقات فوری طور پر ضروری ہے یا نہیں۔

قلعہ و سم کوہ میں برکیارق کھانے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کے دو بھائی تھے، سلار اور یزی تھا، حُزُل آندہ اور بن یونس تھے اور وسم کوہ کا نیا امیر بھی تھا جسے برکیارق نے مقرر کیا تھا۔ دربان اندر آیا اور کہا کہ ایک خاتون بہت ہی بُری حالت میں آئی ہے اور کہتی ہے کہ بہت عرصے سے سفر میں تھی اور مرتے مرتے منزل پر پہنچی ہے۔ برکیارق نے کہا کہ اسے فوراً اندر بھیج دو۔

ایک جواں سل عورت کھانے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کے کپڑوں پر گرد لٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا جیسے لاش قبر سے نکل کر آئی ہو۔ اُس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور اُس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اگر دربان اُسے سہارا نہ دیتا تو وہ گر پڑتی۔ برکیارق کے کہنے پر اسے بٹھا دیا گیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔

”میرا نام شافعیہ ہے“ — عورت نے بڑی ہی مشکل سے یہ الفاظ باہر کو دھکیلے — ”میں یہیں کی رہنے والی ہوں اور ابو جندل کی بھتیجی ہوں....“ — اتنا کہہ کر وہ ایک طرف کو لڑھک گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

”اسے اٹھا کر فوراً طبیب کے پاس لے جاؤ“ — برکیارق نے کہا — ”یہ بیمار تو ہے ہی، بھوک اور پیاسی بھی لگتی ہے۔ یہ ہوش میں آجائے تو اسے کھانے کو کچھ دے دیتا۔ اس کے بعد میں اگر یہاں ہوا تو مجھے بتاؤ۔ میں چلا گیا تو سلار اور یزی کو اطلاع دے دیتا۔“

شافعیہ سولہ سترہ دنوں کے بعد وسم کوہ پہنچی تھی۔



برکیارق مرنے پہنچا تو اس نے پہلا کلام یہ کیا کہ ہر طرف اعلان کروادیا کہ وہ اب سلطان نہیں اور اب محمد اور سبخر سلطان ہیں۔ برکیارق نے عوام میں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ لوگوں نے یہ فیصلہ سنا تو چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ بعض یہ سمجھے کہ بھائیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور چھوٹے دونوں بھائی جیت گئے ہیں اور انہوں نے بڑے بھائی کو سلطانی سے معزول کر دیا ہے۔

عوام کا یہ ردِ عمل برکیارق تک پہنچا تو اس نے یہ انتظام کیا کہ سرکاری اہلکار لوگوں کو تمام سلطنت میں بتادیں کہ یہ فیصلہ اس نے خود بیماری کی وجہ سے کیا ہے اور لوگ محمد اور سحر کے وفادار ہو جائیں۔

لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ برکیارق بیمار ہے تو مسجدوں میں اس کی صحت یابی کی دعائیں ہونے لگیں۔ اس کی بیماری کی خبر تمام تر سلطنت میں پھیل گئی اور اصفہان تک بھی پہنچی۔

اصفہان کی جامعہ مسجد کا خطیب اُس وقت کا ایک بڑا ہی مشہور عالم قاضی ابو العلاء صلحہ بن ابو محمد نیشاپوری تھا۔ عالم ہونے کے علاوہ وہ مردِ میدان بھی تھا۔ اس کے خطبوں میں جملہ کی تلقین زیادہ ہوتی تھی۔ وہ جب خطبہ دیتا تو اس میں الفاظ کا ہیر پھیر اور پیچیدگی نہیں ہوتی تھیں بلکہ ایسی سادہ زبان میں خطبہ دیا کرتا کہ معمولی سے ذہن کے لوگ بھی اصل بات سمجھ جاتے تھے۔ وہ باطنیوں کا بہت بڑا دشمن تھا۔ اسے پتہ چلا کہ برکیارق بیمار ہو گیا ہے اور بیماری نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ اس نے سلطنتی چھوڑ دی ہے تو وہ اُسی وقت مرو کے لئے روانہ ہو گیا۔

بڑے ہی لمبے سفر کے بعد وہ مرو پہنچا اور برکیارق کا مہمان ٹھہرا۔ برکیارق اسے اپنا دینی اور روحانی پیشوا سمجھا کرتا تھا۔ قاضی ابو العلاء نے برکیارق سے پوچھا کہ اس کی بیماری کیا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ برکیارق وقت سے پہلے مرجھا گیا ہے لیکن اسے ظاہری طور پر کوئی بیماری نہیں۔ برکیارق نے اسے بتایا کہ وہ خود نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے ذہن پر کیا اثر ہو گیا ہے کہ وہ کھویا کھویا سا رہتا ہے اور یوں خوف سا محسوس کرتا ہے جیسے کوئی ناخوشگوار واقعہ یا حادثہ ہونے والا ہو۔

قاضی ابو العلاء نے اس سے تمام علامات پوچھیں اور اس کے طبیب کو بلایا۔ طبیب آیا تو قاضی نے طبیب سے پوچھا کہ اس نے برکیارق میں کیا بیماری دیکھی ہے۔ ”یہ پتہ چل جاتا تو میں اب تک انہیں صحت یاب کر چکا ہوتا“ — طبیب نے کہا — ”میں اپنا تمام تر علم اور تجربہ آزما چکا ہوں لیکن سلطان ٹھیک نہیں ہو رہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے ذہن اور دل پر کوئی ایسا بوجھ ہے جسے یہ بیان نہیں کر سکتے یا سمجھ ہی نہیں سکتے۔“

قاضی نے برکیارق سے بہت پوچھا کہ وہ دل پر کیا بوجھ لئے ہوئے ہے لیکن برکیارق

نے بیانا مناسب نہ سمجھایا وہ بیان ہی نہ کر سکا کہ اسے اندر ہی اندر کیسی دیمک کھا رہی ہے۔

”مجھے اچھی طرح یاد ہے“ — قاضی ابو العلاء صلحد نے کہا — ”آپ کے والد محترم ملک شہ کو بانیوں نے دھوکے میں ایسا زہر پلا دیا تھا جو آہستہ آہستہ انہیں کھاتا رہا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو بھی بانیوں نے کوئی چیز کھلا دی ہے جس کا آپ کو پتہ ہی نہیں چلا۔“

”میں نے اس شک کے پیش نظر بھی دوائیاں دی ہیں“ — طبیب نے کہا — ”اگر انہیں کسی بھی قسم کا زہر پلا دیا گیا ہو تا تو اس کے اثرات ان دوائیوں سے ختم ہو جاتے۔ یہ کچھ اور ہی ہے۔“

”میں آج رات تنہائی میں بیٹھوں گا“ — قاضی نے کہا — ”اللہ نے مجھے کشف کی کچھ طاقت عطا فرمائی ہے۔ مجھے کچھ شک ہے کہ یہ سفلی تعویذ کا اثر ہے۔ حسن بن صباح سفلی عمل سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ وہ یہ عمل اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال بھی کرتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے آج رات پتہ چل جائے گا۔“

برکیارق نے قاضی ابو العلاء صلحد کے لئے ایک خاص کمرہ تیار کروایا جس میں مصلیٰ قرآن پاک اور جو کچھ بھی قاضی نے کہا رکھ دیا گیا۔ رات عشاء کی نماز کے بعد قاضی ابو العلاء نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور مصلیٰ پر بیٹھ گیا.... وہ رات کے آخری پہر تک مراقبے میں رہا اور پھر تہجد ادا کی، اذان کے بعد فجر کی نماز پڑھی اور سو گیا۔ طلوع آفتاب کے کچھ دیر بعد وہ کمرے سے نکلا اور برکیارق کے پاس گیا۔

”میرا شک صحیح نکلا ہے“ — اس نے برکیارق سے کہا — ”یہ سفلی تعویذ کا اثر ہے لیکن یہ حسن بن صباح نے نہیں کیا بلکہ یہاں کوئی آدمی ہے جس نے اپنے طور پر آپ کو ختم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ میں اس کا توڑ کر دوں گا لیکن یہاں نہیں۔ میں کل صبح اصفہان کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔ اس تعویذ کے لئے کم از کم تین راتوں کا چلہ کرنا پڑے گا پھر تعویذ لکھا جائے گا۔ جب یہ تعویذ تیار ہو گیا تو میں آپ کو بھیج دوں گا۔ اسے کس طرح استعمال کرنا ہو گا وہ میں تعویذ لانے والے کو بتا دوں گا۔“

برکیارق کو باطنی معاف نہیں کر سکتے تھے۔ داستان گو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہے کہ برکیارق ایک لڑکی کے ساتھ شادی کر کے نوانستہ طور پر حسن بن صباح کا آلہ کار بن گیا

تھا۔ یہ اس لڑکی کا مکمل تھا لیکن وقت نے ایسا پلٹا کھلایا کہ برکیارق کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کی عقل سے پردہ اُٹھ گیا۔ یہ شمونہ کا مکمل تھا۔ برکیارق نے اپنی اس بیوی کو اپنے ہاتھوں قتل کیا اور اس کے بعد اس نے حکم دے دیا کہ جہاں کہیں کوئی باطنی نظر آئے اسے قتل کر دیا جائے۔ باطنی اپنے اتنے زیادہ ساتھیوں کا خون کیسے معاف کر دیتے! انہوں نے جس طرح دوسری کئی ایک شخصیات کو قتل کیا تھا، برکیارق کو بھی قتل کر دیتے لیکن انہیں موقع نہیں مل رہا تھا کیونکہ برکیارق جدھر بھی جاتا تھا، اس کے ارد گرد محافظوں کا حصار ہوتا تھا۔ اگر قاضی ابو العلاء کی تشخیص صحیح تھی تو یہ عمل بانیوں نے ہی کیا تھا۔

قاضی ابو العلاء اگلے روز فجر کی نماز کے فوراً بعد واپس اصفہان کو چل پڑا۔ اُس کے ساتھ دس بارہ آدمی تھے جو اس کے ایسے مرید تھے کہ اس پر جانیں قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ قاضی کو کہیں اکیلا نہیں جانے دیتے تھے کیونکہ اُس وقت تک باطنی کئی ایک علماء دین کو قتل کر چکے تھے۔

اصفہان میں اہل سنت کی اکثریت تھی۔ وہ اپنے خطیب قاضی ابو العلاء صاعد کی غیر حاضری بڑی بُری طرح محسوس کر رہے تھے۔ وہ پوچھتے تھے خطیب کہاں گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ سلطان برکیارق بیمار ہے اور اس کی عیادت کو گئے ہیں۔ یہ تو لوگوں کو پہلے پتہ تھا کہ برکیارق بیمار ہے لیکن جب انہیں یہ پتہ چلا کہ جامع مسجد کا خطیب اس کی عیادت کو گیا ہے تو لوگ متفکر ہوئے کہ برکیارق کچھ زیادہ ہی بیمار ہو گیا ہے۔ وہاں کے لوگ برکیارق کو اس لئے زیادہ عزیز رکھتے تھے کہ اس نے بانیوں کے قتلِ عام کا حکم دیا تھا۔ اصفہان میں بانیوں نے مسلمانوں کا اچھا خاصا کشت و خون کیا تھا۔

آخر ایک روز اصفہان کے لوگوں کو پتہ چلا کہ ان کا خطیب واپس آ گیا ہے۔ کئی لوگ اس کے گھر جا پہنچے اور برکیارق کی صحت کے متعلق پوچھا۔ قاضی ابو العلاء نے انہیں کہا کہ اتفاق سے کل جمعہ ہے، میں مسجد میں سب کو بتاؤں گا کہ برکیارق کس بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے اور اب اس کی حالت کیا ہے۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ جمعہ کے روز تو جامع مسجد نمازیوں سے بھر جایا کرتی تھی لیکن اس جمعہ کی نماز کے وقت یہ حالت ہو گئی تھی کہ مسجد کے اندر تل دھرنے کو جگہ نہیں رہی تھی اور بہت سے نمازیوں کو مسجد کے باہر صفیں بچھانی پڑیں۔ سب سلطان برکیارق

کی بیماری کے متعلق تازہ اطلاع سنئے آئے تھے۔ خطبے سے پہلے قاضی ابوالعلاء صاعد منبر پر کھڑے ہو کر بڑی ہی بلند آواز سے برکیارق کی بیماری کے متعلق بتانے لگے۔ ”برکیارق بن ملک شاہ کو کوئی جسمانی بیماری نہیں“ — قاضی ابوالعلاء نے کہا — ”میں نے مراقبے میں بیٹھ کر کشف کے ذریعے معلوم کیا ہے۔ برکیارق پر سفلی تعویذ کا اثر ہو گیا ہے اور یہ کارستانی کسی باطنی کی ہے۔ سب لوگ برکیارق کی صحت یابی کے لئے دعا کریں۔ کوئی پتہ نہیں کس کی اللہ سُن لے اور برکیارق کی صحت بحال ہو جائے۔ میں اس کے لئے ایک تعویذ تیار کر رہا ہوں جس میں تین چار دن لگ جائیں گے۔ اس تعویذ سے انشاء اللہ اس پر جو سفلی اثرات ہیں رفع ہو جائیں گے۔“

نماز کے بعد برکیارق کی صحت یابی کے لئے خصوصی دعا کی گئی۔ قاضی ابوالعلاء نے یہ اعلان کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی کہ وہ تعویذ تیار کر رہا ہے۔ اس کے ذہن سے شاید یہ حقیقت نکل گئی تھی کہ باطنی نظر نہ آنے والے سائے کی طرح ہر جگہ موجود رہتے ہیں اور ذرا ذرا خبر اوپر پہنچا کر اس کے خلاف جو کارروائی ضروری ہو کرتے ہیں۔

اگلے روز فجر کی نماز کے وقت جماعت کھڑی ہوئی تو قاضی ابوالعلاء امامت کے لئے مصلے پر جا کھڑا ہوا۔ عموماً ”یوں ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے پہلی صف میں اُس کے خاص آدمی کھڑے ہوتے تھے تاکہ قاضی پر کوئی حملہ نہ کر سکے۔ اُس روز فجر کی نماز کے وقت جب قاضی مصلے پر کھڑا ہوا اور تکبیر پڑھی جا رہی تھی تو دو سری صف سے ایک آدمی بڑی تیزی سے آگے بڑھا اور اگلی صف کے دو آدمیوں کو زور سے دھکا دیا۔ دونوں آدمی اس دھکے سے سنبھل نہ سکے اور امام کے ساتھ ٹکرائے۔ اس شخص نے اتنی دیر میں خنجر نکل لیا تھا۔ قاضی ابوالعلاء چونک کر پیچھے مڑا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ پھر اس کے کہ اُسے پتہ چلتا یہ کیا ہوا ہے خنجر اس کے دل میں اتر چکا تھا۔ خنجر باہر نکلا اور پھر اُس کے دل میں اتر گیا۔

نمازی تو کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ ادھر قاضی مصلے پر گر اُدھر اس کا قاتل منبر پر چڑھ گیا اور خنجر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر کیا اور بڑی زور سے نعرہ لگایا — ”شیخ الجبل امام حسن بن صباح کے نام پر“ — اور اس نے خنجر نیچے کو کھینچا اور اپنے سینے میں اتار لیا۔ ایک اور عالم دین باطنیوں کی نذر ہو گیا.... یہ پانچویں صدی ہجری کا آخری سال



قاضی ابو العلاء صلح بن ابو محمد نیشاپوری کے قتل کی اطلاع مرو پہنچی تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ سلطان کے محل میں کیا ردِ عمل ظاہر ہوا ہو گا۔ وہ تو ایک دھماکہ تھا جس نے پہلے تو سب کو سُن کر دیا اور اس کے بعد سب شعلوں کی طرح بھڑک اٹھے۔ برکیارق کا سب سے چھوٹا بھائی سخر کچھ زیادہ ہی جوشیلا تھا لیکن وہ ایسا جذباتی نہیں تھا کہ عقل پر جذبات کو غالب کر دیتا۔ پھر اسے فنِ حرب و ضرب میں بہت ہی دلچسپی تھی اور اس میں قیادت کے جوہر بھی تھے۔ ابھی وہ جوان تھا اور جوانی نے ایسا جوش مارا کہ اُس نے اعلان کر دیا کہ وہ باغیوں کے قلعوں پر حملے کرے گا اور واپس مرو میں اس وقت آئے گا جب باغیوں کا نام و نشان مٹ چکا ہو گا۔

اُس وقت سلطنت سلجوقیہ کا وزیرِ اعظم فخر الملک ابو المنظر علی تھا۔ وہ اس سلطنت کے مشہور وزیرِ اعظم نظام الملک خواجہ طوسی مرحوم کا بیٹا تھا۔ ہندو برس پیشتر ایک باطنی نے نظام الملک خواجہ طوسی کو قتل کر دیا تھا۔ اب اس کا بیٹا ابو المنظر علی وزیرِ اعظم تھا اور سلطان نے اسے فخر الملک کا خطاب دیا تھا۔ وہ اپنے باپ جیسا دورِ اندیش اور دانشمند تھا۔ اُسے قاضی ابو العلاء کے قتل کی خبر ملی تو وہ اُسی وقت سلطان کے محل پہنچا۔

وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سلطان محمد اور سلطان سخر کا ردِ عمل کیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ردِ عمل بڑا ہی شدید ہے تو اسے خطرہ محسوس ہوا کہ یہ دونوں بھائی غم و غصے سے مغلوب ہو کر کوئی غلط فیصلہ یا جلد بازی کر گزریں گے۔ اس نے انہیں مشورہ دیا کہ یہ منصوبہ اسے بنانے دیں کہ انتقامی کارروائی کیسے کی جائے اور کب کی جائے۔

”اب ہم سوچنے میں مزید وقت ضائع نہیں کریں گے“ — محمد نے کہا — ”اب ہمیں قلعہ الموت پر یا باغیوں کے دوسرے بڑے اڈے قلعہ شاہ در پر حملہ کر دینا چاہئے۔ میں یہی فیصلہ کرتا ہوں اور میں اس فیصلے کی تائید چاہتا ہوں۔ قلعہ شاہ در میں حسن بن صباح کا استاد رہتا ہے۔ ہم پہلے اس اڈے کو تباہ کریں گے۔“

شاہ در وہ قلعہ بند شہر تھا جہاں سے حسن بن صباح اپنے استاد احمد بن غفارش سے تربیت حاصل کر کے نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک وسیع و عریض علاقے پر چھا گیا تھا اور اس نے الموت میں جنت بھی بنالی تھی۔

وزیر اعظم ابوالمنظر علی اپنے مرحوم باپ کی طرح صرف وزیر اعظم ہی نہیں تھا بلکہ سالار بھی تھا یعنی جنگجو تھا اور میدان جنگ میں قیادت کی اہلیت بھی رکھتا تھا۔ اُس نے برکیارق، محمد اور سخر سے کہا کہ اسے اجازت دیں کہ وہ قلعہ شاہ در کے محاصرے کا منصوبہ تیار کرے اور اپنے لشکر کو اپنی نگرانی کے تحت تیار کرے۔

”آپ ضرور کریں“ — محمد نے کہا — ”لیکن تین چار دنوں سے زیادہ وقت ضائع نہ ہو۔ اس حملے اور محاصرے کی قیادت میں خود کروں گا۔ آپ منصوبہ تیار کر لیں اور لشکر کو بھی ضروری تربیت دے لیں۔“

اُدھر قلعہ وسم کوہ میں شافعیہ اگلے روز ہوش میں آئی۔ اُس نے ہوش میں آتے ہی پہلی بات طبیب کو یہ بتائی کہ وہ چار پانچ دنوں سے بھوکی ہے اور صرف پانی پیتی رہی ہے۔ طبیب نے اپنے ایک آدمی سے کہا کہ وہ مریضہ کے منہ میں قطرہ قطرہ شہد اور قطرہ قطرہ دودھ پکاتا رہے۔ اسے فوراً اتنی غذا نہیں دینی تھی جس سے پیٹ بھر جاتا کیونکہ اس کا جسم اتنی زیادہ غذا کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس وقت برکیارق مَرُو جانے کے لئے وسم کوہ سے رخصت ہو چکا تھا۔

طبیب نے سالار اور یزی کو اطلاع دی کہ مریضہ ہوش میں آگئی ہے۔ سالار اور یزی اُسی وقت پہنچا اور مریضہ کی حالت دیکھی۔ وہ تو زندہ لاش تھی۔ ابھی کچھ کہنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ شافعیہ کو تسلی دلا سہ دے کر وہاں سے آگیا۔ اس نے بہتر یہ سمجھا کہ مریضہ کے ساتھ کوئی عورت ہونی چاہئے۔ وہاں عورتوں کی تو کمی نہیں تھی لیکن محسوس یہ کیا گیا کہ اس لڑکی کے ساتھ کوئی عقل والی عورت ہو۔ اور یزی نے اس لئے یہ محسوس کیا تھا کہ شافعیہ نے سرگوشی میں ایک آدھ بات بڑی مشکل سے کہی تھی اور یہ بات ایسی تھی کہ اور یزی سمجھ گیا کہ یہ کوئی عام سی قسم کی لڑکی نہیں اور اس کا کوئی خاص پس منظر ہے۔ اسے یہ شک بھی ہوا تھا کہ یہ بانیوں کی ہی لڑکی ہوگی۔

سالار اور یزی نے منزل کے ساتھ بات کی تو منزل نے کہا کہ وہ شمونہ کو لڑکی کے پاس بھیج دے گا جس کا یہ فائدہ بھی ہو گا کہ عورت عورت کے ساتھ دل کی ہریات کر دیا کرتی ہے۔ شمونہ تجربہ کار عورت تھی جس سے یہ امید رکھی جاسکتی تھی کہ وہ شافعیہ کے سینے سے راز کی کوئی بات اگر ہوئی تو نکال لے گی۔

دن گزر گیا اور رات گہری ہونے لگی۔ شافعیہ کو اتنا زیادہ شہد اور دودھ دیا جا چکا تھا

کہ اس کے جسم میں جان آگئی اور وہ تھوڑا تھوڑا بولنے لگی۔ رات کو اُس نے اپنے ہاتھ سے شہد ملا دودھ پیا اور پھر اسے تھوڑی سی ٹھوس غذا دی گئی۔ شمونہ اس کے ساتھ رہی۔ شافعیہ بے ہوشی کی نیند سو گئی اور اگلے روز سورج نکل آنے کے خاصا بعد جاگی۔ شمونہ نے دیکھا کہ اب وہ اچھی طرح بول سکتی تھی۔

شمونہ نے اس سے پوچھا وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ شافعیہ نے کہا کہ وہ یہیں سے گئی تھی اور واپس یہیں آگئی ہے۔

”یہاں سے گئی تھی تو میرے ساتھ میری چھوٹی بہن تھی اور چچا بھی تھا“ — شافعیہ نے کہا — ”واپس آئی ہوں تو اکیلی ہوں۔“

شافعیہ نے شمونہ کو اپنی پوری داستان سنا ڈالی کہ وہ کس طرح اور کیوں یہاں سے رخصت ہوئی تھی اور کہاں تک گئی اور کس طرح واپس آئی ہے۔ اُس نے کسی بات پر پردہ نہ ڈالا۔

شمونہ اُسی وقت گھر گئی اور منزل کو شافعیہ کی ساری داستان سنائی۔ منزل اُسی وقت سالار اور یزی کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ لڑکی نے اپنے متعلق کیا سنایا ہے۔ سالار اور یزی نے کہا کہ وہ حیران تھا کہ اس کا یہ عہدیدار شمیر ابلک کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اُس کی کہیں لاش نہیں ملی تھی نہ ہی وہ کہیں زخمی حالت میں پڑا تھا۔ اب شافعیہ نے سالار اور یزی کو اس سوال کا جواب دے دیا۔

شافعیہ زرتوش کو قتل کر کے وہاں سے نکلی تو نقشے نے اُس کی صحیح رہنمائی کی۔ وہ تین چار دن گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھی سفر طے کرتی رہی۔ اسے اس جنگل میں کوئی بستی اور کوئی انسان نہ ملا۔ اس نے بہت مشکلات برداشت کیں۔ اسے یہ احساس رہا ہی نہیں تھا کہ کتنے دن اور کتنی راتیں گزر گئی ہیں۔ وہ جنگل سے نکل کر بنجر ویرانوں میں داخل ہوئی جہاں پانی کا ایک قطرہ بھی نظر نہیں آتا تھا نہ وہاں کوئی سبز پتہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ وہاں سے بھی نکل آئی۔

سفر کے آخری آٹھ دس دن اس کے لئے قیامت کے دن تھے۔ اُس پر ایک آفت یہ پڑی کہ ایک گھوڑے کو رات کے وقت زہریلے سانپ نے ڈس لیا اور گھوڑا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اب اس کے پاس ایک گھوڑا رہ گیا تھا۔ وہ اس پر سوار ہوئی اور دو دنوں بعد پھر ایک ہرے بھرے جنگل میں داخل ہوئی اور طوفانِ باران میں پھنس گئی۔ بڑا

ہی خوفناک طوفان تھا۔ بجلی کڑکتی تھی اور دو مرتبہ بجلی دو درختوں پر گری اور ٹھن ٹوٹ کر نیچے آ پڑے۔ آگے ایک ندی تھی جس میں سیلاب آگیا تھا۔ شافعیہ نے رکنے کی بجائے گھوڑا ندی میں اتار دیا لیکن سیلاب اس قدر تیز و تند تھا کہ گھوڑے کو اپنے ساتھ بہانے لگا۔ بہت دور جا کر پانی پھیلا تو گھوڑا پانی میں چل کر باہر نکل آیا لیکن شافعیہ یہ معلوم نہ کر سکی کہ وہ اب کہاں ہے۔ اس نے کپڑا نکالا۔ اس کپڑے پر کونٹے کی لکیریں ڈالی گئی تھیں۔ مصیبت یہ آ پڑی کہ وہ سیلاب میں اتری تھی اور تمام کپڑے بھیگ گئے تھے اس لئے اس کپڑے سے کونٹے کی لکیریں مٹ گئی تھیں۔

وہ اللہ کے بھروسے آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ ایک اور دن کی مسافت کے بعد اس کے راستے میں ایک اور چشمہ آگیا۔ وہاں وہ گھوڑے کو پانی پلانے کے لئے رُک گئی۔ اس نے خود بھی پانی پیا لیکن اس کے پاس کھانے کا سامان ختم ہو چکا تھا۔ وہ جب پانی پی چکی تو اسے یاد آیا جب وہ خزانے والی غار کی طرف جا رہی تھی تو یہ چشمہ راستے میں آیا تھا۔ اس چشمے کے قریب ایک اونچی ٹیکری تھی۔ وہ اس ٹیکری پر چڑھ گئی اور ادھر ادھر دیکھا۔ اسے دو اور نشانیوں نظر آگئیں اور یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ وہ ایک دن زیادہ سے زیادہ دو دن کی مسافت دور رہ گئی ہے اور اب اس کی منزل آئی کہ آئی۔

پھریوں ہوا کہ وہ ایک جنگل میں جا رہی تھی۔ اب اس کے دل پر ایسا بوجھ نہیں تھا کہ وہ ایک بار پھر راستہ بھول گئی ہے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ صحیح راستے پر جا رہی ہے۔ پہلے وہ اللہ کی مدد اور رہنمائی مانگتی تھی، اب اس نے اللہ کا شکر ادا کرنا شروع کر دیا۔ وہ جا رہی تھی کہ اچانک سلت آٹھ بھیڑیے کہیں سے نکلے اور اُس کی طرف دوڑ پڑے۔ گھوڑے کو ایڑ لگانے کی ضرورت نہیں تھی، گھوڑا ڈر کر ہی خود بھاگ اٹھا اور بہت ہی تیز بھاگا۔ بھیڑیے بھی رفتار کے بہت تیز تھے اور یقیناً ”بھوکے تھے اس لئے وہ دوڑے ہی چلے آ رہے تھے اور فاصلہ بہت کم ہوتا جا رہا تھا۔

شافعیہ نے سوچا کہ بھیڑیوں نے گھوڑے کو پکڑ لیا تو گھوڑا گرے گا اور وہ بھی گھوڑے کے ساتھ گرے گی اور کچھ بھیڑیے گھوڑے کو اور کچھ اسے مار کر کھانا شروع کر دیں گے۔ وہ سوچنے لگی کہ گھوڑے سے کس طرح کود کر اترے اور کسی اور طرف دوڑ پڑے لیکن کوئی تا شاید آسان تھا لیکن خطرہ یہ تھا کہ دو چار بھیڑیے اس کے پیچھے دوڑ کر اسے پکڑ لیں گے۔

شافعیہ نے سامنے دیکھا ایک پھیلا ہوا بہت بڑا درخت راستے میں آ رہا تھا۔ درخت کا ایک ٹن زمین سے متوازی تھا۔ شافعیہ نے سوچ لیا کہ وہ اس ٹن کو پکڑ لے گی اور گھوڑا اس کے نیچے سے نکل جائے گا۔ گھوڑا پوری رفتار سے جا رہا تھا اور بھیڑیے اس کے اتنے قریب آ گئے تھے کہ آدھے دائیں طرف اور آدھے بائیں طرف ہو گئے تھے۔ درخت قریب آ گیا۔ شافعیہ نے رکبوں سے پاؤں نکل لئے اور جب وہ درخت کے نیچے سے گزری تو ہاتھ اوپر کر کے ٹن پکڑ لیا۔ اس کا خیال تو یہ تھا کہ ٹن بڑے آرام سے اُس کے ہاتھ میں آ جائے گا اور گھوڑا نیچے سے نکل جائے گا لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ وہ کس رفتار سے جا رہی ہے۔ اُس نے ٹن پکڑ لیا اور ٹن نے جب اُسے اتنی زیادہ رفتار سے روک لیا تو اسے یوں لگا جیسے اس کے بازو ٹن کے ساتھ رہ گئے ہیں اور باقی جسم گھوڑے کے ساتھ چلا گیا ہے۔ اسے اپنے بازو کندھوں سے الگ ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ وہ گر پڑی۔ کچھ چوٹ گرنے سے آئی اور دونوں بازو کندھوں سے شدید درد کرنے لگے۔ اُسے حاصل صرف یہ ہوا کہ بھیڑیوں سے بچ گئی تھی۔ گھوڑا اور بھیڑیے دُور نکل گئے تھے۔

شافعیہ نے ذرا بلند زمین پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ اسے کچھ ایسی امید تھی کہ شاید گھوڑا اتنا تیز دوڑے کہ بھیڑیے ہار کر اسے چھوڑ دیں اور گھوڑا واپس آ جائے لیکن یہ امید ایک جھوٹی امید تھی۔ گھوڑا ایک طرف مڑا تھا اور بھیڑیے لپک جھپٹ کر اُس کی ٹانگوں پر منہ ڈال رہے تھے۔ آخر شافعیہ نے اپنے گھوڑے کو گرتے دیکھا۔ وہ ایک بار اٹھا لیکن بھیڑیوں نے اسے پھر گرا لیا اور اس کے بعد وہ اُٹھ نہ سکا۔

اب شافعیہ نے منزل تک پیدل پہنچنا تھا۔ وہ گھوڑے کی پیٹھ پر رہتی تو ایک یا زیادہ سے زیادہ دو دن بعد منزل پر پہنچ جاتی لیکن نہ جانے کتنے دن اسے اپنا جسم اپنی ٹانگوں پر گھسیٹنا تھا۔ وہ بھیڑیوں کی طرف سے مطمئن ہو گئی تھی کیونکہ بھیڑیوں کو پیٹ بھرنے کے لئے اتنا بڑا اور اتنا تندرست گھوڑا مل گیا تھا۔ اب بھیڑیوں کو شافعیہ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ پھر بھی شافعیہ اس راستے سے ہٹ کر چلے گئی۔

وہ چھٹے یا ساتویں دن وسم کوہ پہنچی لیکن اس حالت میں جیسے وہ اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے وہاں پہنچی ہو۔

سلار اور یزی نے شافعیہ کی یہ داستان سنی تو اُس نے کہا کہ اس لڑکی کو سرکاری

حیثیت دے کر خصوصی مہمان بنا کر رکھا جائے۔



مرو میں روز و شب بڑے ہی سرگرم تھے۔ فوج کو محاصرے کی اور قلعہ توڑنے کی اور پھر دست بدست لڑائی لڑنے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ یہ راز چھپایا نہ گیا کہ قلعہ شہر کو محاصرے میں لیا جائے گا۔ اس ٹریننگ کی نگرانی وزیراعظم فخرالملک ابوالمنظف علی کر رہا تھا۔ محمد اور سخر اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ وہ لشکر کو فوراً ”کوچ کے لئے تیار کرے لیکن ابوالمنظف علی جلد بازی کا قائل نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ بے شک قیادت محمد اور سخر ہی کریں لیکن وہ خود ساتھ ہو گا۔ وہ لوگوں کو بھی ترغیب دے رہا تھا کہ اپنی فوج میں شامل ہو جائیں اور بانیوں کے خلاف جہاد میں شریک ہوں۔

لوگ جوق در جوق فوج میں شامل ہو رہے تھے اور ابوالمنظف علی ان سب کو بڑی تیزی سے ٹریننگ دلوا رہا تھا۔ برہمچیاں اور تیرالگ بن رہے تھے اور وزیراعظم ان کی بھی نگرانی کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ ہر طرف ابوالمنظف علی ہی نظر آتا تھا۔ اپنے عوام میں وہ پہلے ہی مقبول تھا لیکن اب لوگوں نے اسے بانیوں کے خلاف ان تیاریوں میں دیکھا تو اس کے کردار کے اور زیادہ قائل ہو گئے اور اسے بڑی ہی اونچی اور قلیل قدر شخصیت سمجھنے لگے۔ وہ لوگوں سے کہتا تھا کہ خانہ جنگی میں جو لوگ مر گئے تھے ان کا انتقام لینے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ ایک ایسی غلط تھی جو لوگوں کو فوج میں شامل ہونے پر اکسارہی تھی۔

مشہور تاریخ دان ابن اثیر نے ایک بڑا ہی دردناک واقعہ لکھا ہے۔ وہ یوں ہے کہ محرم کی دس تاریخ تھی، اُس روز ابوالمنظف علی نے روزہ رکھا۔ صبح کے وقت وہ روزمرہ معمولات کے لئے باہر نکلا تو اُس نے محمد اور سخر سے اور اپنے تین چار احباب سے کہا کہ گزشتہ رات اُس نے حضرت حسینؑ کو خواب میں دیکھا ہے۔ حضرت حسینؑ اسے کہتے ہیں — ”جلدی آ جاؤ“ آج کا روزہ تم نے ہمارے پاس آ کر افطار کرنا ہے۔

”فخرالملک!“ — ایک بڑے قریبی دوست نے ابوالمنظف علی سے کہا — ”ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ خواب مبارک ہے لیکن میری ایک بات مان لیں۔ آج کا دن اور آنے والی رات آپ گھر سے باہر نہ نکلیں۔ مجھے کچھ خطرہ سا محسوس ہو رہا ہے۔“

”حضرت حسینؑ یاد فرمائیں اور میں گھر میں چھپ کر بیٹھ جاؤں!“ — ابوالمنظف

علی نے مسکراتے ہوئے کہا — ”بلاوا آیا تو میں حاضری ضرور دوں گا“۔

اُس روز ابوالمنظف علی نے روزمرہ معمول سے ہٹ کر یوں کیا کہ گھر چلا گیا اور زیادہ وقت نفل پڑھنے اور تلاوت قرآن میں گزارا۔ کچھ صدقہ بھی دیا۔ عصر کے وقت گھر سے باہر نکلا۔ اسے گھر کے سامنے ہی ایک مفلوک الحال شخص ملا جو روئی صورت بنائے اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”مسلمان تو جیسے ختم ہی ہو گئے ہیں“ — اس شخص نے مایوسی کے لہجے میں کہا — ”کوئی ایک بھی نہیں رہا جو مجھ مظلوم کی فریاد سنے۔“

”میں سنوں گا میرے بھائی!“ — ابوالمنظف نے اُس کے اور قریب ہو کر پوچھا — ”بتاؤ تو سہی تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟“

اس شخص نے اپنی جیب میں سے ایک کانڈ نکالا اور ابوالمنظف علی کی طرف بڑھا کر بولا کہ میں نے اپنی فریاد لکھ لی ہے اور یہ پڑھ لے۔ ابوالمنظف علی اس کے ہاتھ سے کانڈ لے کر پڑتے لگا تو اس شخص نے بڑی تیزی سے کپڑوں کے اندر سے چھری نکالی اور ابوالمنظف علی کے پیٹ میں گھونپ کر ایسی پھیری کہ ابوالمنظف علی کا پورا پیٹ چاک ہو گیا۔ ابوالمنظف علی تو گر پڑا لیکن اتفاق سے کچھ آدمی وہاں سے گزر رہے تھے، انہوں نے دیکھ لیا، یہ پہلا باطنی تھا جس نے فوراً ”ہی اپنے آپ کو مار نہ لیا۔ اسے شاید خودکشی کی مہلت نہ ملی کیونکہ ان آدمیوں نے اسے پکڑ لیا تھا اور اس کے ہاتھ سے چھری بھی لے لی تھی۔

فخر الملک ابوالمنظف علی کے قتل کی خبر فوراً ہی شہر میں پھیل گئی اور لوگ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ برکیارق، محمد اور سبیر بھی پہنچ گئے۔ اُس وقت ابوالمنظف علی فوت ہو چکا تھا۔ قاتل ابھی وہیں تھا۔ سلطان سبیر نے کہا کہ اسے اسی چھری سے یہیں اس طرح قتل کیا جائے کہ اس کی گردن کاٹ کر اور سر الگ کر کے پھینک دیا جائے۔

”ابو باطنی کافر!“ — محمد نے اُس سے پوچھا — ”تو نے دوسرے باطنی قاتلوں کی طرح خودکشی کیوں نہیں کر لی؟“

”میں جانتا ہوں مجھے قتل کے بدلے قتل کیا جائے گا“ — قاتل نے کہا — ”میں مرنے سے پہلے تم لوگوں کے ساتھ ایک نیکی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تمہارے اپنے ارد گرد ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں تم اپنا مخلص اور ہمدرد سمجھتے ہو لیکن وہ باطنی ہیں اور

وہ ایک ایک آدمی کو قتل کریں گے۔“

باطنی نے سات آٹھ آدمیوں کے نام لئے۔ وہ کوئی اونچے عہدوں والے آدمی نہیں تھے لیکن ان کی کچھ نہ کچھ سرکاری حیثیت تھی۔ اُس وقت برکیارق، محمد اور سب پر ایسی کیفیت طاری تھی کہ ان کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ انہوں نے اُسی وقت ان سات آٹھ آدمیوں کو بلوالیا اور جلاؤ کو بھی بلا کر حکم دیا کہ اس باطنی کے قتل سے پہلے ان سات آٹھ آدمیوں کی گردنیں اُڑادی جائیں۔ وہ سب آدمی چیختے چلاتے رہے کہ یہ سب جھوٹ ہے لیکن ان کی گردنیں اُڑادی گئیں۔ جلاؤ آخری آدمی کو قتل کر چکا تو ابوالمنظفر علی کے قاتل نے پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ اُس سے پوچھا وہ کیوں ہنسا ہے۔

”ہنسوں نہ تو اور کیا کروں!“ — باطنی نے کہا — ”یہ سب بے گناہ تھے۔ میں نے یہ سوچ کر ان کے نام لئے تھے کہ میں تو مری رہا ہوں تو کیوں نہ چند مسلمانوں کو ساتھ لے کر مروں۔ تم سب جلیل اور گنوار ہو کہ عقل سے ذرا بھی کلام نہیں لیتے۔“

سلطان کے حکم سے اسے بھی جلاؤ کے حوالے کر دیا گیا۔ جلاؤ نے اس کی گردن اپنی تلوار سے نہ کلٹی بلکہ حکم کے مطابق اُسے نیچے گرایا اور اسی کی چھری سے اس کا سر اس کے جسم سے الگ کر دیا گیا۔

”اب ہم قلعہ شاہ در کا محاصرہ کریں گے“ — سب نے انتہائی غصے کے عالم میں کہا — ”کل صبح کوچ ہو گا۔“

ابو المنظر علی کے قتل نے مرو کی آبادی کو تو جیسے آگ لگا دی تھی۔ لوگ مقتول کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ روکے ہوئے سیلاب کی طرح یہ ہجوم بے قابو ہوا جا رہا تھا اور انتقام انتقام کے فلک شکاف نعرے زمین و آسمان کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ ابو المنظر علی کے قتل کی خبر صحیح معنوں میں جنگل کی آگ کی طرح شہر سے نکل کر مضافاتی علاقوں میں پہنچ گئی۔ وہاں کے لوگ بھی شہر کی طرف دوڑ پڑے۔

برکیارق کے چھوٹے بھائی سبخر نے ابو المنظر کی لاش کے قریب کھڑے ہو کر اعلان کر دیا تھا کہ اب قلعہ شاہ در کا محاصرہ ہو گا اور کل کو چھ کیا جائے گا لیکن ان کے بزرگ مشیروں نے کہا کہ ایسے فیصلے غصے اور جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کئے جاتے ورنہ جلد بازی میں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ان مشیروں کا مشورہ یہ تھا کہ اطمینان سے بیٹھ کر کوچ کا اور محاصرے کا منصوبہ تیار کر لیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کوچ چند دنوں بعد کیا جائے کیونکہ شہریوں کا جوش و خروش اور جذبہ انتقام ایسا نظر آ رہا ہے کہ لشکر میں کچھ اور شہری شامل ہو جائیں گے۔

محاصرے کا منصوبہ تو بالکل تیار تھا جو ابو المنظر علی مرحوم نے بنایا تھا۔ اس کے مطابق لشکر کو اُسی کی نگرانی میں ٹریننگ دی گئی تھی۔ اب کوچ کا دن ہی مقرر کرنا تھا۔ مقتول وزیر اعظم کی تجبیروں تکلفین ہو چکی تو برکیارق، محمد، سبخر اور جنگی امور کے مشیروں کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں سالاروں کو بھی شامل کیا گیا۔ اسی کانفرنس میں ضروری امور طے کر لئے گئے اور کوچ کا دن بھی مقرر ہو گیا۔ اس روز مرو میں اور ارد گرد کے علاقوں میں

منادی کرا دی گئی کہ جو لوگ لشکر میں شامل ہونا چاہتے ہیں وہ فوراً ”مرو پہنچ جائیں....“
 تین چار دنوں میں اس لشکر کی نفری بے انداز ہو گئی اور کوچ کا دن آگیا۔ کسی بھی مورخ
 نے یہ نہیں لکھا کہ اس لشکر کی تعداد کتنی تھی اور اس میں سوار کتنے اور پیادے کتنے
 تھے۔ صرف یہ لکھا ہے کہ ایک تو باقاعدہ فوج تھی اور اس کے ساتھ ایک لشکر غیر فوجیوں
 کا تیار کیا گیا تھا۔ یہ لوگ گھوڑے اپنے لائے تھے اور ہتھیار بھی ان کے اپنے تھے۔
 ایک فیصلہ یہ بھی کیا گیا کہ اس لشکر کی قیادت سبھر نہیں بلکہ اس کا بڑا بھائی محمد کرے
 گا۔

پھر صبح طلوع ہوئی۔ تمام تر لشکر جس میں باقاعدہ فوج بھی تھی اور تربیت یافتہ شہری
 بھی، میدان میں ترتیب سے کھڑا ہو گیا۔ محمد گھوڑے پر سوار لشکر کے سامنے آیا اور اُس
 نے لشکر سے خطاب کیا۔

”اسلام کے مجاہدو!“ — محمد نے بلند آواز میں کہا — ”یہ بتانے کی ضرورت نہیں
 کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ ہم کوئی ملک فتح کرنے نہیں جا رہے۔ ہم
 ابلہیت کو جڑوں سے اکھاڑنے جا رہے ہیں۔ یہ کسی سلطان کی جنگ نہیں اور یہ کسی
 سلطنت کی بھی جنگ نہیں۔ یہ ہم سب کی ذاتی جنگ ہے۔ ہم سب کا اللہ ایک، رسول
 ایک اور ایمان ایک ہے۔ ہم سب ایک ہی جذبے سے سرشار ہو کر ایک ہی ہدف پر جا
 رہے ہیں۔ ہم نے کوئی ملک فتح نہیں کرتا۔ فتح ہو گی تو یہ اسلام کی فتح ہو گی اور اگر
 خدا نخواستہ ہم پسپا ہو آئے تو ہم پر اللہ کی لعنت پڑے گی۔ میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں
 کہ ہم نے حسن بن صباح کے ابلہی فرقے کو ختم کرنا ہے، بیگمابوں کے خون کا انتقام لینا
 ہے، خون خرابہ روکنا ہے اور مت بھولو کہ یہ وہ ابلہی فرقہ ہے جس نے یہاں بھائی کو
 بھائی کا دشمن بنا دیا اور بھائی نے بھائی کا خون بہا دیا تھا۔ ان بائیسوں نے ہمارے علمائے
 دین کو قتل کیا، نظام الملک خواجہ حسن طوسی جیسی شخصیت کو قتل کیا اور اب ان کے بیٹے
 ابوالمنظف علی کو قتل کر دیا ہے.... اور یہ تو تم جانتے ہو کہ اس فرقے نے اصفہان میں شاہ
 در میں اور کئی دوسری جگہوں پر کس بے رحمی سے مسلمانوں کو قتل کیا ہے۔ تم نے لڑنا
 ہے اور کسی اجر کے لالچ کے بغیر لڑنا ہے۔ فتح تبھی حاصل کر سکو گے جب اللہ کی راہ میں
 خون کے نذرانے پیش کرو گے۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ اللہ کسی کا جذبہ جہاد اور جذبہ ایثار
 فراموش نہیں کیا کرتا۔ میں ایک آخری بات کہوں گا۔ تم میں سے کسی کے دل میں کوئی

شک اور شبہ ہے یا کوئی وہم ہے یا وہ دلی طور پر اس جہاد کے لئے تیار نہیں تو میں اُسے اجازت دیتا ہوں کہ وہ ابھی لشکر سے نکل جائے۔ کوچ شروع ہو گیا اور کسی نے پیٹھ دکھانے کی کوشش کی تو اُسے وہیں قتل کر دیا جائے گا۔

ایک فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ اس نعرے میں اُن عورتوں اور بچوں کی آوازیں بھی شامل تھیں جو لشکر کو رخصت کرنے کے لئے اور خدا حافظ کہنے کے لئے وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ مکانوں کی چھتوں پر بھی عورتیں کھڑی تھیں۔ لشکر وہاں سے چلا تو عورتوں نے ہاتھ پھیلا کر اللہ سے لشکر کی سلامتی اور فتح کی دعائیں مانگیں۔



قلعہ الموت میں حسن بن صباح کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ وزیر اعظم ابوالمنظف علی کو قتل کر دیا گیا ہے اور قاتل نے خود کشی کر لی ہے۔ کچھ دنوں بعد اسے دوسری اطلاع یہ دی گئی کہ سلطنت سلجوقیہ کا ایک بہت بڑا لشکر شاہ در کی طرف کوچ کر گیا ہے اور اب تک وہاں پہنچ چکا ہو گا.... یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ حسن بن صباح مسکرایا نہیں بلکہ اس کے چہرے پر سنجیدگی کا تاثر آ گیا۔ اس سے پہلے اسے اطلاع ملتی تھی کہ مسلمانوں نے فلاں قلعے کا محاصرہ کر لیا ہے تو وہ یوں مسکرا اٹھتا تھا جیسے اسے کوئی غم اور کوئی فکر نہ ہو۔ مسلمان کوئی قلعہ فتح کر لیتے تو بھی حسن بن صباح کے چہرے پر پریشانی کا ہلکا سا بھی تاثر نہیں آتا تھا لیکن اب یہ سن کر کہ سلطنت سلجوقیہ کا لشکر شاہ در پہنچ چکا ہو گا تو وہ خلاؤں میں دیکھنے لگا۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح کے پاس فدائیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ تو ایک لشکر تھا۔ حسن بن صباح کسی بھی فدائی کو اشارہ کر دیتا تو وہ فدائی اپنی جان اپنے ہاتھوں لے لیتا تھا لیکن یہ فدائی ایک منظم فوج کی طرح لڑنے کا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ فدائیوں کے خنجر اور ان کی چھریاں چلتی تھیں۔ وہ دھوکے میں قتل کرتے تھے یا زمین کے نیچے سے وار کر جاتے تھے۔ حسن بن صباح نے سلطنت سلجوقیہ میں خانہ جنگی کرا دی تھی۔ اس نے ایسی بہت سی شخصیات کو قتل کروا دیا تھا جنہیں کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ اُس وقت تک دو وزیر اعظم فدائیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔ یہ حسن بن صباح کا ہی کمال تھا لیکن اس کے ایک اشارے پر جانیں قربان کر دینے والا فدائیوں کا لشکر میدان میں آ کر جنگ نہیں لڑ سکتا تھا۔

حسن بن صباح کو قلعہ شاہ در کے محاصرے کی اطلاع ملی تو وہ متفکر ہو کر گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے سر اٹھایا اور اپنے مشیروں وغیرہ کو بلایا۔

”شاہ در بڑا ہی مضبوط قلعہ بند شہر ہے“ — حسن بن صباح نے کہا — ”لیکن اب ہمیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ ہم نے سلجوقیوں کو جتنی ضربیں لگائی ہیں، وہ ان کی برداشت سے باہر ہو گئی ہیں۔ اب وہ زخمی شیر کی طرح انتقام لینے نکلے ہیں۔ یہ مت بھولو کہ شاہ در میرے لئے قلعہ الموت سے زیادہ مقدس ہے۔ وہاں میرا پیر و مرشد عبد الملک بن عطاش رہتا ہے۔ شاہ در کو ہر قیمت پر بچانا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلجوقی اس شہر کو فتح کر لیں۔ اگر انہوں نے یہ قلعہ سر کر لیا تو وہ میرے پیر و مرشد کی بڑی ہی تذلیل اور توہین کریں گے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی منظم لشکر نہیں جو یہاں سے کوچ کر جائے اور محاصرے کو محاصرے میں لے لے۔ ہمیں اپنا طریقہ کار اختیار کرنا پڑے گا۔ یہاں سے دس فدائی بھیج دو۔ وہ اپنے آپ کو اہل سنت کہلائیں گے اور مبلغ بن کر جائیں گے۔ وہ سلطان محمد کو قتل کریں گے اور سپہ سالار کو بھی قتل کریں گے اور اگر دو اور سالاروں کو قتل کر دیں تو محاصرہ نہ صرف ٹوٹ جائے گا بلکہ پورے کا پورا لشکر بھاگ جائے گا۔“

”اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا“ — ایک معمر مشیر نے کہا — ”صرف سلطان مارا گیا تو محاصرے میں ذرا سی بھی جان نہیں رہے گی۔ میں اپنے منتخب کئے ہوئے فدائی بھیجوں گا۔“

”میرا پیر و مرشد عبد الملک بن عطاش اتنا کچا نہیں کہ وہ شہر سلجوقیوں کو دے دے گا۔“ — حسن بن صباح نے کہا — ”وہ کوئی نہ کوئی ڈھنگ کھیلے گا اور میرا خیال ہے وہ سلجوقیوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جائے گا، پھر بھی میں اسے فرض سمجھتا ہوں کہ باہر سے اُس کی مدد کروں۔ میں دس قلعے دے سکتا ہوں، شاہ در نہیں دوں گا.... فدائیوں کو فوراً ”بھیج دو“۔“

اُس زمانے میں ایسے ہی ہوتا تھا۔ سپہ سالار مارا جاتا تو پورے کا پورا لشکر بد دل ہو جاتا تھا۔ بادشاہ خود اپنے لشکروں کی قیادت کیا کرتے تھے لیکن بادشاہ مارا جاتا تو سارا لشکر بھاگ اٹھتا تھا۔ حسن بن صباح کی یہ سوچ بے بنیاد نہیں تھی کہ محمد کو قتل کر دیا جائے۔ محمد سلطان تھا جس کے مارے جانے سے محاصرے نے ٹوٹ جاتا تھا۔ باطنی فدائیوں کے

لئے کسی کو قتل کر دینا معمولی سا کرتب تھا۔ فدائیوں کو پکڑے جانے کا اور سزا کا تو کوئی ڈر ہی نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے شکار کو قتل کر کے اپنے آپ کو بھی مار ڈالتے تھے۔

شاہ در قلعہ بند شہر تھا اور یہ قلعہ الموت کے بعد باغیوں کا بڑا مضبوط اڈہ تھا۔ اس شہر کا جو قلعہ تھا وہاں بہت سے برج اور برجیاں تھیں۔ شہر کے ارد گرد جو شہر پناہ تھی وہ کوئی معمولی سی دیوار نہ تھی بلکہ خاصی چوڑی تھی، بلند بھی تھی اور بہت ہی مضبوط۔ یہ شہر ایسی جگہ آباد کیا گیا تھا کہ اس کے پیچھے اور ایک پہلو پر اونچی پہاڑی تھی۔ ان اطراف سے قلعے پر حملہ کرنا خود کشی کے برابر تھا۔ دوسری دو اطراف میں دیوار پر چھوٹی بڑی برجیاں تھیں جن میں ہر وقت تیر انداز اور برہمچیاں پھینکنے والے تیار رہتے تھے۔ شہر کی چاروں اطراف کی لمبائی تاریخ میں چھ کوس لکھی ہے۔

اس شہر کا حکمران حسن بن صباح کے پیر استاد عبد الملک بن عطاش کا ایک بیٹا احمد بن عبد الملک تھا۔ اس کا ایک بھائی احمد بن عطاش بھی وہیں تھا۔ دونوں جنگجو تھے اور دھوکہ دہی اور فریب کاری میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

سلطان برکیارق نے جب باغیوں کے قتل عام کا حکم دیا تھا تو حسن بن صباح نے اس کے جواب میں غم دے دیا تھا کہ مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا جائے۔ داستان گو یہ قتل اور انتقامی قتل کا سلسلہ سنا چکا ہے۔ باطنی قافلوں کو لوٹا کرتے تھے اور اس طرح انہوں نے بے پناہ مال و دولت اکٹھا کر لیا تھا۔ سلجوقی سلطانوں نے یہ لوٹ مار کا سلسلہ خاصی حد تک روک دیا تھا۔ دو شہروں مرز اور رے میں سلطان کے حکم سے کسی باطنی کو زندہ نہیں رہنے دیا گیا تھا۔ اس کے جواب میں شاہ در میں عبد الملک بن عطاش کے حکم سے مسلمانوں کو قتل کیا جانے لگا اور وہاں سے مسلمان بھاگ کر دوسرے شہروں میں چلے گئے تھے۔ اس سے پہلے شاہ در میں مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی تھی اور اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ عبد الملک بن عطاش نے قافلے لوٹنے کا حکم بھی دے دیا تھا۔ ان لوگوں نے تین چار قافلے لوٹے تھے جن میں سے ایک قافلہ حجاج کا تھا۔ اس قافلے میں بہت سے ملکوں کے حاجی تھے، ہندوستان کے حاجی بھی اس میں شامل تھے۔ یہ خبریں سلجوقی سلطنت کے سلطان تک پہنچی رہی تھیں اور اس کا ایک ہی حل سوچا گیا تھا کہ شاہ در پر حملہ کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر دی جائے۔

اب اس شہر کو محاصرے میں لے لیا گیا تھا۔

شاہ در کو محاصرے میں لینے کی اطلاع وسم کوہ سلار اور یزی کو بھی مل گئی۔ وہ تو قلعہ الموت پر حملے کے منصوبے بنا رہا تھا اور اس مقصد کے لئے وہ زمین ہموار کر رہا تھا اور اس نے ایک فوج بھی تیار کرنی شروع کر دی تھی۔ اسے جب شاہ در پر محاصرے کی اطلاع ملی تو اس نے منزل آفندی اور بن یونس کو بلایا۔ یہ دونوں ابھی تک وہیں تھے۔ ان دونوں نے بھی بائنیوں کو تمس نہس کر دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

”میں نے تم دونوں کی مدد سے وسم کوہ کو فتح کر لیا ہے“ — سلار اور یزی نے کہا — ”لیکن مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں یہاں ہوں، مجھے اس وقت شاہ در ہونا چاہئے تھا۔ میں اس قلعے کو اپنے ہاتھوں تباہ کرتا۔ ان بائنیوں نے وہاں کسی ایک بھی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑا۔ زندہ وہی رہا جو وہاں سے بھاگ آیا تھا۔“

”الموت کو فتح کرنے کی تیاریاں جاری رکھیں“ — منزل نے کہا — ”اگر آپ نے الموت فتح کر لیا تو آپ کا یہ کارنامہ تاریخ قیامت تک لوگوں کو سناتی رہے گی اور یہ تاریخ اسلام کا ایک درخشاں باب ہو گا۔۔۔۔۔ لیکن میں ایک بات سوچتا ہوں۔ میں نے الموت اچھی طرح دیکھا تھا۔ اب سنا ہے کہ الموت ایک بند شہر بن گیا ہے اور کوئی اجنبی وہاں چلا جائے تو اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے یا وہ کس طرف سے آیا تھا۔ یہ بھی سنا ہے کہ اس کا دفاع اور زیادہ مضبوط کر دیا گیا ہے لیکن اس شہر کے اب دو حصے بن گئے ہیں۔ ایک جو شہر ہے اوپر نظر آتا ہے اور دوسرا شہر اس کے نیچے ہے جسے آپ زمین دوز کہہ لیں۔ سنا ہے نیچے ایسی بھول بھلیاں ہیں جن میں گیا ہوا آدمی نکل نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے الموت پر حملے سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ اس شہر کے اندر کیا ہے اور اسے کس طرح فتح کیا جاسکتا ہے۔“

”تم وہاں کس طرح جا کر دیکھ سکتے ہو؟“ — سلار اور یزی نے پوچھا۔

”اتفاق ابھا ہوا ہے کہ یہ بات آج ہی ہو گئی ہے“ — منزل نے کہا — ”میں آپ کے ساتھ یہ بات کرنا ہی چاہتا تھا۔ میں اور بن یونس الموت جائیں گے۔ ہمارا جانے کا سب سے بڑا مقصد حسن بن صباح کا قتل ہو گا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ کام تقریباً ناممکن ہے لیکن میں دوسرا کام ضرور کروں گا۔ وہ یہ کہ اس شہر کے نیچے جا کر دیکھوں گا کہ وہاں کیا ہے اور پھر شہر کے ارد گرد گھوم کر دیکھوں گا کہ اس میں کس طرح لشکر کو داخل

کیا جاسکتا ہے۔ جب تک یہ پتہ نہیں چلے گا، ہم کتنا ہی بڑا لشکر لے جائیں، کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔“

”شہر کے اندر جانے کے لئے تمہارا روپ بہروپ کیا ہو گا؟“ — سالار اور یزی نے پوچھا۔

”فدائی!“ — مزل نے جواب دیا — ”ہم دونوں حسن بن صباح کے فدائی یا پیروکار بن کر جائیں گے۔“

”یہ بات ہم پر چھوڑیں“ — بن یونس نے کہا — ”ہم نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ ہم مارے جائیں گے۔ اگر آپ اہلبیت کے اس طوفان کو روکنا چاہتے ہیں تو کسی نہ کسی کو تو اپنی جان قربان کرنا پڑے گی.... اُن ہزار ہا جانوں کو یاد کریں جو حسن بن صباح کے حکم سے بائنیوں کے ہاتھوں ضائع ہوئیں اور پھر مرو کی خانہ جنگی کو یاد کریں جس میں بے حساب خون بہہ گیا تھا۔ ہم نے اس خون کا حساب چکاتا ہے۔ ہم جس روز ان جانوں کو اور خون کو بھول گئے اُس روز ہمارے عظیم دین اسلام کا زوال شروع ہو جائے گا۔“

مزل اور بن یونس کا عزم اور منصوبہ یہ تھا کہ جس طرح باطنی مسلمانوں کے معاشرے میں مذہب اور سرکاری انتظامیہ میں کسی نہ کسی بھیس اور بہروپ میں مخلص اور بے ضرر افراد کی حیثیت سے داخل ہو کر ڈنک مار جاتے ہیں اسی طرح ایک جماعت تیار کی جائے جو حسن بن صباح کے اندرونی حلقوں تک پہنچ جائے اور پہچانی نہ جاسکے اور اسی طرح بائنیوں کی جڑوں میں بیٹھ کر ان کا خاتمہ کیا جائے۔ مزل کی بیوی شمونہ بھی یہی مشن اپنے دل میں لئے بیچ و تاب کھاتی رہتی تھی۔ اب اسے پتہ چلا کہ مزل اور بن یونس الموت جا رہے ہیں تو وہ بھی تیار ہو گئی۔ شافیہ کے دل میں شمونہ کی ایسی محبت پیدا ہو گئی تھی کہ جب اس نے سنا کہ شمونہ الموت جا رہی ہے اور کیوں جا رہی ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس کے دل میں بھی بائنیوں کے خلاف زہر پیدا ہو گیا تھا۔ ویسے بھی وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ وہ تھی تو نو عمر لیکن خزانے والے غار سے تنہا واپسی کے دوران اسے جو تجربات ہوئے تھے ان سے اس کی شخصیت میں پختگی پیدا ہو گئی تھی اور پھر اس کے اندر ایک عزم بھی پیدا ہو گیا تھا جسے وہ اچھی طرح سمجھ نہیں سکی تھی لیکن شمونہ کے ساتھ رہتے سے اس کے سامنے ہر ایک چیز واضح ہو گئی۔ اس نے

شمنہ سے کہا کہ وہ بھی ان کی مہم میں شامل ہونا چاہتی ہے۔

شمنہ نے منزل اور بن یونس کے ساتھ بات کی تو انہوں نے اس خیال سے شافعیہ کو اپنے ساتھ لے جانا بہتر سمجھا کہ وہ جس بہروپ میں جائیں گے، اس میں ایک نوجوان لڑکی کا رآمد ثابت ہوگی۔۔۔۔۔ ان چاروں نے زیادہ انتظار نہ کیا۔ پانچ گھوڑے لئے۔ چار گھوڑوں پر یہ پارٹی سوار ہوئی اور پانچویں گھوڑے پر کھانے پینے کا اور دیگر سامان لاد لیا گیا۔ ان کی منزل قلعہ الموت تھی۔ الموت دراصل موت کی منزل تھی۔ زیادہ تر امکان یہی تھا کہ وہ زندہ واپس نہیں آسکیں گے۔ منزل کو پہلے وہاں کا تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ تو زندہ ہی آیا تھا لیکن وہ جس جذبے والا منزل تھا وہ مر گیا تھا۔ شمنہ نے شافعیہ کو ذہن نشین کرا دیا تھا کہ وہ جہاں جا رہے ہیں وہاں موت زیادہ قریب ہوگی اور اگر وہ زندہ رہی تو ذلت و خواری میں زندہ رہے گی۔ شافعیہ نے یہ سنا تو اس نے کہا کہ وہ جو عزم ساتھ لے کر چلی ہے، اس پر وہ اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہے۔



شاہ در کا محاصرہ مکمل ہو چکا تھا اور شہر میں داخل ہونے کے لئے حملے بھی شروع ہو گئے تھے۔ محمد نے اور اس کے سالاروں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ بہت ہی مضبوط ان کی توقعات سے بھی زیادہ مستحکم قلعہ ہے جسے چند دنوں یا چند مہینوں میں سر نہیں کیا جاسکے گا۔ شہر پناہ پر تیر اندازوں اور برہمچیاں پھینکنے والوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ ان کے سامنے پتھروں کی بڑی مضبوط آڑیں تھیں۔

محمد نے لشکر کے ساتھ یہاں پہنچتے ہی جاسوسوں سے رپورٹیں لی تھیں۔ سلجوقیوں کا جاسوسی کا نظام مضبوط اور کارآمد تھا۔ شاہ در میں بھی جاسوس موجود تھے جو محاصرے سے پہلے ہی باہر نکل آئے تھے کیونکہ انہوں نے محمد کو اندر کی ساری صورت حال اور احوال و کوائف بتانے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ شاہ در میں کوئی باقاعدہ فوج نہیں لیکن ہر شہری لڑنے کے لئے تیار ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان شہریوں کو قلعے سے باہر لایا جائے تو یہ باقاعدہ جنگ لڑنے کے قابل نہیں اور نہ ہی انہیں ایک لڑنے والے لشکر کی ترتیب اور تنظیم کا علم ہے، البتہ ان میں جذبہ بڑا ہی سخت ہے۔ جاسوسوں نے یہ بھی بتایا کہ اس شہر میں مسلمان نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کو اس شہر سے قتل عام اور لوٹ مار کے ذریعے بھگا دیا گیا یا قتل کر دیا گیا تھا۔

اندر کی ایک اور بات معلوم ہوئی۔ یہ جاسوسوں نے نہیں بتائی تھی، ایک اور ذریعے سے معلوم ہوئی تھی۔ داستان گو یہ ذریعہ بعد میں بتائے گا.... شاہ در کے باغیوں نے چند مہینے پہلے ایک قافلہ لٹا تھا۔ اس قافلے میں زیادہ تر حجاج تھے جو حج سے واپس آ رہے تھے۔ اس میں امیر کبیر تاجر بھی تھے۔ مال و دولت کے علاوہ باغیوں نے قافلے سے کچھ نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں بھی اغوا کر لی تھیں۔ تاریخ میں ایسی ایک مغویہ لڑکی کا ذکر ملتا ہے جس کا نام نور تھا۔ وہ عراق کی رہنے والی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ حج کا فریضہ ادا کرنے گئی تھی۔ باپ کے علاوہ اس کے ساتھ اس کی ماں بھی تھی اور ایک بھائی بھی۔ ماں اور بھائی باطنی ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ باپ بچ گیا تھا وہ کسی طرح شاہ در اپنی بیٹی کے پیچھے آ گیا تھا۔

اُس وقت نور کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی اور وہ کچھ زیادہ ہی حسین تھی۔ اس قسم کی لڑکیوں کو قلعہ الموت بھیج دیا جاتا تھا جہاں انہیں حسن بن صباح کی جنت کی حوریں بنایا جاتا اور خاص تربیت دی جاتی تھی۔ ان لڑکیوں میں اگر کوئی اور خصوصی ذہانت ہوتی تو انہیں دوسرے علاقوں میں تخریب کاری کے لئے بھیج دیا جاتا تھا۔ نور کچھ ایسی حسین لڑکی تھی کہ یہ حسن بن صباح کے پیر استاد عبد الملک بن عطاش کے چھوٹے بھائی احمد بن عطاش کو پسند آ گئی اور اس نے نور کے ساتھ شادی کر لی۔ اس وقت احمد بن عطاش کی عمر پچاس سال تھی۔

لڑکی روز و شب روتے گذارتی تھی۔ اس کی ماں ماری گئی تھی اور اس کا بھائی بھی قتل ہو گیا تھا۔ اس کا باپ اپنی اس بیٹی کے ساتھ اتنی محبت اور پیار کرتا تھا کہ وہ بھی ساتھ آ گیا اور احمد بن عطاش کا ملازم بن گیا۔ نور اپنے باپ کو اس روپ میں دیکھتی تو اور زیادہ روتی اور کڑھتی تھی۔ نور کے باپ نے احمد بن عطاش کا اعتماد حاصل کر لیا۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ یہاں سے اپنی بیٹی کو کسی طرح نکال کر لے جائے لیکن کوئی ذریعہ اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

آخر ایک روز باپ بیٹی کو خبر ملی کہ لشکر نے شہر کا محاصرہ کر لیا ہے۔ نور نے وضو کیا اور اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے نفل پڑھنے لگی۔ وہ روتی جاتی اور نفل پڑھتی جاتی تھی۔ آخر اُس نے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور سبکیں لے لے کر اللہ کو پکارا اور کہا، یا اللہ اپنے اُس گھر کی لاج رکھ لے جس کا حج کر کے آئی ہوں۔ شیطان

کے ان چیلوں کو تباہ کر دے۔ اُس نے اللہ سے شکوہ بھی کیا کہ اللہ نے اسے حج کا کیا اجر دیا ہے۔ وہ بار بار کہتی تھی کہ شیطان کے ان چیلوں کو تباہ کر دے۔ اُس کی آواز بلند ہوتی چلی گئی اور اتنے میں احمد بن عطاش کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے نور کی یہ دعا سن لی تھی۔

”اللہ اس گھر کی لاج رکھے گا جہاں تم موجود ہو“ — احمد بن عطاش نے طنزیہ کہا — ”غوراً“ اٹھو اور یہ دعا ختم کر دو.... تم میری بیوی ہو اور تم آزاد نہیں ہو سکتیں۔“ — ”اگر میرا اللہ سچا ہوا تو تم ذلیل ہو کر مرو گے“ — نور نے احمد بن عطاش سے کہا — ”تم نے مجھے اللہ کی عبادت سے روکا ہے۔ تم ذلیل ہو کر مرو گے.... میں تمہیں ذلت کی موت مرتا دیکھوں گی۔“

نور نے پہلی بار اپنے خاوند کے خلاف زبان کھولی تھی۔ اس کی آواز میں غصہ اور انتقام تھا اور اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ احمد بن عطاش نے اس کے منہ پر بڑا ہی زوردار تھپڑ مارا۔ نور چپ ہو گئی اور احمد بن عطاش کمرے سے نکل گیا۔



داستان گو اس داستان کے آغاز میں سنا چکا ہے کہ عبد الملک بن عطاش کسی سفلی عمل کا یا ایسے ہی کسی اور عمل کا ماہر تھا جس سے دوسروں کو نقصان پہنچایا جاسکتا تھا یا دوسروں پر اثر انداز ہوا جاسکتا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس نے یہ عمل حسن بن صباح کو بھی سکھایا تھا لیکن بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے یہ عمل کم ہی استعمال کیا تھا اس کی شخصیت کا اور کردار کا اپنا ہی ایک جلاو تھا جس کے زور پر اس نے وہ مقبولیت حاصل کی تھی جس نے تاریخ میں ایک نئے اور انوکھے باب کا اضافہ کر دیا تھا۔

عبد الملک بن عطاش ضعیف العمر تھا۔ اس نے شہر اور دیگر امور اپنے بیٹوں کے حوالے کر دیئے تھے اور وہ خود اسی سفلی عمل میں لگا رہتا تھا۔ ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ اس کا ایک خاص کمرہ تھا جس میں کوئی اجنبی چلا جاتا تو اس پر غشی طاری ہونے لگتی تھی کیونکہ اس کمرے میں ایک تو بدبو ناک قاتل برداشت تھی اور دوسرے یہ کہ اس میں انسانی کھوپڑیاں اور دوسری ہڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کمرے میں چند ایک پنجرے رکھے ہوئے تھے۔ کسی میں سانپ بند تھا اور کسی میں الو بند کئے ہوئے تھے۔

تاریخ میں ایسی کوئی شہوت نہیں ملتی کہ اس نے کوئی ایسا عمل کیا ہو کہ فلاں شہریا فلاں سلطان یا فلاں بادشاہ تباہ ہو جائے اور وہ تباہ ہو گیا ہو لیکن اس کے ہاتھ میں کوئی تھوڑی بہت طاقت ضرور تھی جسے مؤرخین نے سفلی عمل کہا ہے۔

اسے جب اطلاع ملی کہ سلجوقی لشکر نے شہر کو محاصرے میں لے لیا ہے اور لشکر اتنا زیادہ ہے کہ شہر کو فتح کر ہی لے گا تو وہ اپنے اس خاص کمرے میں پہنچا اور ایک پنجرے میں سے ایک آلو نکالا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اس کا خاص نوکر ہر وقت کمرے کے دروازے کے باہر موجود رہتا تھا جسے وہ کسی ضرورت کے تحت اندر بلا لیا کرتا تھا۔ یہ خاص نوکر نور کا باپ تھا۔

عبد الملک بن عطاش دو دن اور دو راتیں کمرے میں بند رہا۔ اس دوران نوکر اسے صرف دودھ پلاتا رہا جس میں شہد ملا ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس نے نوکر سے کہا کہ وہ فلاں اور فلاں آدمی سے کہے کہ ایک ٹائینا آدمی کہیں سے پکڑ کر لایا جائے۔ یہ حکمران خاندان تھا جس کا حکم چلتا تھا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک بھکاری سا ٹائینا پکڑ کر لایا گیا اور اسے عبد الملک بن عطاش کے حوالے کر دیا گیا۔ عبد الملک اسے اپنے کمرے میں لے گیا اور دو دن اور دو راتیں اُسے اپنے ساتھ رکھا۔ معلوم ہوا کہ عبد الملک اس ٹائینا کے جسم پر چھڑی کی نوک مارتا تھا اور وہاں سے جو خون نکلتا تھا وہ اس آلو کو پلاتا تھا۔

یہ ٹائینا جب اس کمرے سے نکلا تو اس کے جسم پر بہت سے زخم تھے جو ایسے ہی تھے کہ وہاں چھڑی بار بار چھوئی گئی تھی۔ عبد الملک بن عطاش نے نوکر سے کہا کہ اسے طبیب کے پاس لے جا کر اس کی مرہم پٹی کروادے اور پھر اسے اس کے بیٹے احمد بن عبد الملک کے پاس لے جائے اور کہے کہ اسے اچھی خاصی رقم انعام کے طور پر دے دی جائے۔۔۔۔۔ یہ کارروائی مکمل ہو گئی تو نوکر پھر واپس عبد الملک کے پاس آیا۔

عبد الملک نے اسے اندر بلایا اور کہا کہ اس آلو کو پکڑ کر رکھے۔ نوکر نے آلو پکڑا اور عبد الملک کے کہنے پر اس کا منہ کھولا۔ عبد الملک نے اس کھلے ہوئے منہ میں چھوٹا سا ایک کانڈ تہہ در تہہ کر کے ڈال دیا اور نوکر سے کہا کہ اس کا منہ کلے دھاگے سے اچھی طرح باندھ دے۔ نوکر نے باندھ دیا۔ پھر عبد الملک بن عطاش نے یہ آلو پنجرے میں بند کر دیا اور نوکر کے ساتھ کچھ باتیں کیں۔ اس نوکر پر اسے پورا پورا اعتماد تھا اور کچھ

رازداری بھی تھی۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس نوکر نے یہ اعتماد اس مقصد کے لئے پیدا کیا تھا کہ اسے کبھی یہ موقع مل جائے کہ اپنی بیٹی نور کو اس سے آزاد کرا کے نکل بھاگے اور سلجوقیوں کے پاس پہنچ جائے۔

محمد نے اپنے تیر اندازوں کو کئی بار دیوار کے قریب جا کر اوپر کے ہجوم پر تیر چلانے کے لئے بھیجا لیکن اوپر سے بارش کی طرح تیر آتے تھے اور محمد کے تیر انداز پیچھے ہٹ آتے تھے۔ محمد نے حکم دیا کہ فوری طور پر بڑی کمائیں تیار کی جائیں جن سے نکلے ہوئے تیر دور سے دیوار کے اوپر تک پہنچ جائیں۔

محمد اپنے ایک سالار کے ساتھ قلعے کے ارد گرد گھوم رہا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اور دیکھ رہا تھا کہ کوئی ایسی جگہ نظر آجائے جہاں سے دیوار توڑنے کی کوشش کی جائے یا کوئی اور ذریعہ نظر آجائے۔ محمد چونکہ سلطان تھا اور اس لشکر کا کمانڈر بھی تھا اس لئے سلجوقی پرچم بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے پیچھے، دائیں بائیں اور آگے اس کے سوار محافظ تھے جنہوں نے اسے حصار میں لے رکھا تھا۔

پرچم اور محافظ دو ایسی نشانیاں تھیں کہ دور سے پتہ چل جاتا تھا کہ وہ بادشاہ ہے، سلطان ہے یا اس لشکر کا سپہ سالار ہے۔ پھر دشمن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اسی پر حملہ کیا جائے یا زیادہ تر تیر وہیں پھینکے جائیں اور اسے مارا جائے تاکہ پرچم گر پڑے۔ پرچم گرنے کی صورت میں یا لشکر کے کمانڈر یا بادشاہ کے مارے جانے کی صورت میں پورا لشکر بد دل ہو کر پسپا ہو جایا کرتا تھا۔

محمد کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا۔ وہ جدھر جاتا تھا تیر اُدھر ہی زیادہ آتے تھے لیکن وہ تیروں کی زد سے باہر تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک درخت کے قریب پہنچا تو ایک تیر درخت کے تنے میں آن لگا اور وہیں کھب گیا۔ وہاں تو تیروں کی بارش آرہی تھی اس لئے ایک ایک تیر کو دیکھنے کا کوئی مطلب نہیں تھا لیکن یہ تیر جو درخت کے تنے میں زمین سے ذرہ اوپر لگا تھا، محمد کی نظروں میں آگیا۔ اس تیر کے ساتھ کوئی کانڈیا کپڑا بندھا ہوا تھا۔ محمد رُک گیا اور اس نے ایک محافظ سے کہا کہ یہ تیر تنے سے نکال لائے۔ محافظ گھوڑے سے اترا اور وہ تیر تنے سے نکال کر محمد کو دے دیا۔

محمد نے ٹھیک دیکھا تھا۔ تیر کے درمیان میں تہہ کیا ہوا ایک کانڈیا چھوٹا سا کپڑا دھاگے سے لپٹا ہوا تھا۔ محمد نے جلدی جلدی سے دھاگا اتارا اور دیکھا، یہ کانڈیا جیسے باریک

چمڑے کا چند انچ چوڑا اور اتنا ہی لمبا ٹکڑا تھا اور اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ محمد نے تحریر پڑھی۔ اس میں لکھا تھا کہ آج یا کل یا کسی بھی وقت شہر سے ایک الو اڑے گا جو آپ کے لشکر کی طرف آئے گا اور شاید یہ الو تمام تر لشکر کے اوپر سے چکر کٹ کر شہر میں واپس آجائے یا کہیں غائب ہو جائے۔ یہ الو جو نہی نظر آئے اسے تیروں سے مار گرائیں اور جہاں یہ گرے وہیں اس پر خشک گھاس وغیرہ ڈال کر آگ لگا دینا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

یہ شہادت بھی ملتی ہے کہ عبد الملک بن عطاش نے کہا تھا کہ اس نے جو عمل کیا ہے اس سے سلجوقیوں کا پورا لشکر نہیں تو لشکر کا کمائنڈر اندھا ہو جائے گا۔ اگر آنکھوں سے اندھا نہ ہو تو عقل سے اندھا تو ضرور ہی ہو جائے گا اور پھر وہ جو بھی فیصلہ یا جو بھی کارروائی کرے گا وہ اس کے خلاف جائے گی۔

محمد نے اس پیغام کو بے معنی اور فضول سمجھ کر پھینک نہ دیا۔ اسے معلوم تھا کہ باطنی اور خصوصاً "عبد الملک بن عطاش کالا جادو جانتے ہیں اور انہوں نے ضرور کچھ عمل کیا ہو گا اور یہ پیغام اپنے ہی کسی جاسوس نے باہر پھینکا ہو گا۔ محمد نے یہ پیغام اپنے سالاروں کو پڑھ کر سنایا اور کہا کہ تمام لشکر میں یہ پیغام پہنچا دیا جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ جو نہی انہیں الو اڑتا ہوا اپنی طرف آتا نظر آئے اس پر تیر چلائیں اور اسے گرانے کی کوشش کریں اور وہ جب گر پڑے تو اس کو وہیں جلا ڈالیں..... پیغام فوراً تمام لشکر تک پہنچ گیا۔

اس پیغام کے بعد لشکر کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ شہر کی دیوار پر کھڑے تیر اندازوں پر تیر چلاتے تھے اور بار بار اوپر بھی دیکھتے تھے.... وہ دن گزر گیا اور رات کو بھی سپاہی اوپر دیکھتے رہے۔ پھر اگلا دن طلوع ہوا۔ ایک طرف سے شور اٹھا کہ وہ الو اڑا۔ سب نے دیکھا کہ ایک الو شہر میں سے اڑا اور ایک طرف سے سلجوقی لشکر کے اوپر گیا۔ لشکر کے مجاہدین نے اس پر تیر چلائے اور اتنے تیر چلائے کہ اس کا بچ کر ٹکنا ممکن نہیں تھا۔ الو گرا اور سب نے دیکھا کہ چار پانچ تیر اس کے جسم میں اتر گئے تھے۔

محمد کو اطلاع دی گئی تو وہ گھوڑا سرپٹ دوڑاتا وہاں پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ الو کا منہ کالے دھاگے سے بندھا ہوا تھا۔ محمد نے حکم دیا کہ ابھی گھاس وغیرہ لائی جائے اور آگ لگا دی جائے۔ وہاں خشک گھاس کی کمی نہیں تھی۔ مجاہدین گھاس لے آئے اور خشک

شہنشاہ بھی اٹھائے اور آلو کے اوپر ڈھیر کر کے آگ لگا دی۔

کیا اللہ نے نور کی دعا سن لی تھی؟.... کیا یہ معجزہ تھا؟.... آخر یہ کون تھا جس نے دشمن کے گھر سے یہ پیغام پھینکا تھا؟.... ہر حال یہ اللہ کا خاص کرم تھا کہ خطرہ ٹل گیا تھا۔



ادھر مزل، بن یونس، شمونہ اور شافعیہ الموت کی طرف جا رہے تھے۔ الموت میں خطرہ شمونہ اور مزل کے لئے تھا۔ حسن بن صباح کے خاص آدمی ان دونوں کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ مزل حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا اور حسن بن صباح نے اس کا دماغ اٹا چلا دیا تھا اور وہ واپس مرویہ ارادہ لے کر گیا تھا کہ سلطان ملک شاہ کو قتل کر دے گا۔

شمونہ تو حسن بن صباح کی خاص چیز بنی رہی تھی۔ اب شمونہ جوان نہیں تھی بلکہ جوانی کی آخری حد پر تھی پھر بھی حسن بن صباح اور اس کے آدمی اسے اچھی طرح پہچان سکتے تھے۔ اس طرح مزل اور شمونہ نے بہت بڑا خطرہ مول لے لیا تھا۔ مزل نے داڑھی پوری طرح بدھالی تھی اور شمونہ نقاب میں تھی۔ شافعیہ کا چہرہ بھی نقاب میں تھا لیکن انہیں الموت پہنچ کر کہیں نہ کہیں بے نقاب ہونا ہی تھا۔ انہوں نے اپنے بچاؤ کی کچھ ترکیبیں سوچ لی تھیں لیکن جو خطرہ انہوں نے مول لیا تھا وہ کوئی معمولی خطرہ نہیں تھا۔ پہلے دن کے سفر کے بعد انہوں نے سورج غروب ہونے کے بعد ایک بڑی خوبصورت جگہ پر قیام کیا۔ یہ ایک ندی تھی جس کے کنارے انہوں نے ڈیرہ ڈال دیا۔ انہیں رات بھر وہیں رکنا تھا۔ گھنے درخت تھے، خود رو پودے تھے اور سامنے ایک ٹیکری تھی۔ وہ بھی سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ انہوں نے گھوڑوں کو کھول دیا۔ گھوڑوں نے پانی پیا اور پھر گھاس کھانے لگے۔

شام تاریک ہو گئی تو انہوں نے دو مشعلیں جلا لیں اور زمین میں گاڑ دیں۔ کھانا کھولا اور دسترخوان بچھا دیا۔ چاروں کی نظریں دسترخوان پر لگی ہوئی تھیں۔ مزل نے ویسے ہی اوپر دیکھا تو اسے سات اٹھ قدم دور ایک آدمی کھڑا نظر آیا۔ اس آدمی کے قدموں کی آہٹ نہیں سنائی دی تھی۔ یوں معلوم ہوا جیسے زمین میں سے اوپر سے اٹھ آیا ہو۔ یہ شک بھی ہوتا تھا کہ یہ کوئی جن ہے جو انسان کے روپ میں ظاہر ہوا ہے۔ اس نے لمبی سفید عبا پہن رکھی تھی اور اس کے سر پر عمامہ تھا۔ وہ جواں سال تھا اور اس کی داڑھی

بڑی اچھی طرح تراشی ہوئی تھی۔ وہ جس لباس میں تھا، یہ اس علاقے کے معززین کا لباس تھا۔

”آؤ بھائی!“ — مزل نے اسے کہا — ”دستر خوان تیار ہے، آؤ ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔“

”میں مہمان نہیں“ — اس آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا — ”میں پہلے سے یہاں موجود ہوں۔ تم لوگ ابھی ابھی پہنچے ہو اس لئے تم مہمان ہو اور میں میزبان ہوں۔ ہم دس آدمی ہیں جو اس ٹیکری کے دوسری طرف پڑاؤ کئے ہوئے ہیں۔ کھانا مجھے پیش کرنا چاہئے تھا۔“

مزل اور شمونہ اسے بڑی ہی غور سے دیکھ رہے تھے۔ یہ دونوں ہلتی ہوئی جھاڑیوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔

”میں ابھی آیا“ — اس سفید پوش نے کہا اور وہاں سے چل پڑا۔ یہ ٹیکری کوئی زیادہ لمبی نہیں تھی۔ مٹی کے اونچے ڈھیر کی مانند تھی۔ وہ آدمی اس ٹیکری کے پیچھے چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آیا۔ اس کے واپس آنے تک مزل اور اس کی پارٹی حیران و پریشان رہی اور یہ لوگ کچھ بھی نہ سمجھ سکے کہ یہ شخص آیا کیوں تھا اور یہ چلا کیوں گیا ہے۔ خطرہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ ایک بڑی ہی خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی۔ اس آدمی نے کہا تھا کہ وہ دس آدمی ہیں۔ دس آدمی ان دو آدمیوں پر آسانی سے قابو پا سکتے تھے اور شمونہ اور شافیہ کو اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے۔

وہ آدمی آیا تو اس نے ہاتھوں میں کچھ اٹھا رکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ان لوگوں کے پاس آکر دو زانو ہوا اور جو کچھ اُس نے ہاتھوں میں لے رکھا تھا وہ ان کے دسترخوان پر رکھ دیا۔ وہ بھنے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے تھے۔ وہ چمڑے کا ایک چھوٹا سا مشکیزہ بھی لایا تھا۔ بڑا ہی خوبصورت مشکیزہ تھا اور یہ بھرا ہوا تھا۔ پانی ہی ہو سکتا تھا۔

”یہ مشکیزہ اپنے پاس رکھیں“ — اس نے کہا — ”یہ ایک خاص شربت ہے۔ یہ پی کر دیکھیں۔ تمہاری طبیعت ہشاش بشاش ہو جائے گی اور تمہکن کا تو نام و نشان نہیں رہے گا۔۔۔۔ میں تمہارے کھانے میں اور زیادہ نخل نہیں ہونا چاہتا۔“

وہ اٹھا اور چلا گیا۔ وہ ٹیکری کی اوٹ میں ہوا تو مزل اٹھا اور دبے پاؤں تیز تیز چلتا

ٹیکری پر چڑھ گیا اور ٹیکری کے اوپر جا کر لیٹ گیا۔

مزل نے دیکھا کہ ٹیکری سے بیس میچیں قدم دور تین شعلیں جل رہی تھیں۔
اسی کے لباس جیسے دس آدمی نیم دائرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ مزل چھپتا چھپاتا
پھونک پھونک کر قدم رکھتا ٹیکری سے اتر گیا۔ وہ ان لوگوں کی باتیں سنتا چاہتا تھا۔

جب وہ نیچے اُتر اتو وہ کھڑا نہ رہا بلکہ بیٹھ کر آہستہ آہستہ سر کٹا گیا۔ وہ آدمی جو انہیں
گوشت دے گیا تھا، وہ اپنے ساتھیوں کے پاس جا پہنچا تھا اور وہ ہنس بھی رہا تھا۔ مزل اٹھا
اور جھک کر ایک چوڑے تنے والے درخت تک جا پہنچا اور اس طرح چھپتا چھپاتا ان کے
قریب چلا گیا جہاں سے وہ ان کی باتیں سن سکتا تھا۔

”کمال کی چیز ہے بھائیو!“ — اس آدمی نے کہا — ”دوسری بھی بُری نہیں لیکن
اس کی عمر شاید تیس برس سے ذرا اوپر ہو گئی ہے۔ پھر بھی اچھی چیز ہے۔“
”شیخ الجبل کی نظر کرم ہے بھائی!“ — ایک نے کہا — ”یہ اُنسی کا کرم ہے کہ
ہمیں سفر میں اتنی خوبصورت چیز مل گئی ہے۔“

”اب سوچو انہیں یہاں لائیں کیسے!“ — ایک نے کہا۔

”یہ اپنی چیزیں سمجھو بھائی!“ — ایک اور بولا — ”دو آدمی یہ رہیں گے؟
پہلے کھانا کھا لو اور انہیں بھی کھانا کھانے دو۔ مشکیزہ بھی انہیں ہمارا یاد دے آیا ہے۔
تھوڑی دیر بعد انہیں اس دنیا کی ہوش بھی نہیں رہے گی۔“

مزل نے اور کوئی بات نہ سنی۔ اس کا شک رفع ہو گیا تھا۔ وہ جس طرح چھپتا چھپاتا
وہاں تک پہنچا تھا اُسی طرح دبے پاؤں جھکا جھکا ایک درخت سے دوسرے درخت تک
اوٹ میں چلتا ٹیکری تک پہنچا اور ٹیکری کے اوپر جانے کی بجائے ایک طرف سے ٹیکری
سے گھوما اور اپنے ساتھیوں تک پہنچ گیا۔

اس کی غیر حاضری میں شمونہ نے مشکیزہ کھولا تھا اور پھر اسے سونگھا تھا۔ اس کا تو
لڑکپن اور نوجوانی کا زیادہ حصہ ان باتنیوں کے ساتھ اور حسن بن صباح کے ساتھ گزرا
تھا۔ اس نے مشکیزہ سونگھا تو اٹھی اور مشکیزہ ندی میں اندیل دیا۔

”ہو شیار رہنا بھائی!“ — مزل نے کہا — ”شیخ الجبل کے آدمی ہیں.... حسن بن
صبح کے.... اب یہ دیکھنا ہے کہ حسن بن صباح کے ہاں ان کی کیا حیثیت ہے اور یہ
کہاں جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے فدائی ہوں لیکن ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”باطنی ہی معلوم ہوتے ہیں“ — شمونہ نے کہا — ”میں نے مشکیزہ کھول کر ا
سو نکھا۔ اس میں حشیش ملا ہوا شربت تھا۔ میں ندی میں انڈیل آئی ہوں۔ اب یہ آدمی
آئے تو انہیں یہی بتائیں گے کہ ہم نے مشکیزہ خالی کر دیا ہے اور شربت واقعی اچھا تھا۔“
”ان کا گوشت بھی نہ کھاؤ“ — بن یونس نے کہا — ”اس میں بھی کچھ ملا ہوا ہو
گا۔ میں سمجھتا ہوں ان کی نظر شافعیہ اور شمونہ پر ہے۔ ہم سے انہوں نے کیا لینا ہے۔“
مزل نے گوشت کے تمام ٹکڑے بیٹھے بیٹھے ندی میں پھینک دیئے اور اپنا کھانا کھا
لیا۔ اتنے میں ان دس میں سے تین آدمی آگئے۔ مزل اور بن یونس نے انہیں بیٹھنے کو
کہا اور وہ تینوں بیٹھ گئے۔

مشکیزے والا شربت پی لیا ہے؟“ — ایک نے پوچھا۔

”پی لیا ہے“ — مزل نے جواب دیا اور مسکراتے ہوئے کہا — ”اس شربت
نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم اور تم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایسے دو مشکیزے اور دے دو“
ہم وہ بھی پی جائیں گے“ — مزل نے ان کے ذرا قریب سرک کر رازدانہ لہجے میں کہا
— ”ہم شاہ در سے آرہے ہیں اور شیخ الجبل کے پاس جارہے ہیں۔ ہم دونوں بھی فدائی
ہیں۔ اس لڑکی کو شیخ الجبل کی خدمت میں پیش کرنا ہے۔“
”تم لوگ محاصرے سے کس طرح نکل آئے ہو؟“ — ایک سفید پوش نے
پوچھا۔

”ہم محاصرے سے ایک روز پہلے نکل آئے تھے“ — مزل نے کہا —
”محاصرے کی اطلاع تو ہمیں پہلے ہی مل چکی تھی۔ شیخ الجبل امام حسن بن صباح کے پیرو
مُرشد عبد الملک بن عطاش نے ہمیں ایک پیغام دے کر امام کی طرف بھیجا ہے۔“
”پیغام کیا ہے؟“ — ایک نے پوچھا۔

”یہ جانتے ہوئے کہ تم ہمارے ہی بھائی ہو، یہ راز تمہیں نہیں بتاؤں گا“ — مزل
نے کہا — ”اور تم مجھ سے پوچھو گے بھی نہیں۔ اپنا آپ تم پر اس لئے ظاہر کر دیا ہے
کہ تمہارے متعلق یقین ہو گیا ہے کہ تم اپنے ہی آدمی ہو۔“
”کیا شاہ در کے فدائی حملہ آوروں کے سالاروں کو ختم نہیں کر سکتے تھے؟“ —
ایک اور سفید پوش بولا۔

”کیون نہیں کر سکتے تھے!“ — مزل نے کہا — ”لیکن ہمیں حکم ہی کچھ اور دیا

گیا ہے اور ہم اس حکم کی تعمیل کے لئے جارہے ہیں.... اگر ہم دونوں کو حکم ملتا تو ہم برکیارق، محمد اور سخر کو اور ان کے ایک دو سالاروں کو ختم کر چکے ہوتے۔“
 ”وہ ہم کر لیں گے“ — ایک سفید پوش نے بے اختیار کہہ دیا — ”دیکھتے ہیں محاصرہ کس طرح قائم رہتا ہے۔“

”یہ وہی دس فدائی تھے جو حسن بن صباح کے حکم سے بھیجے جارہے تھے اور ان کا کام یہ تھا کہ انہوں نے محمد اور اس کے سالاروں کو قتل کرنا تھا۔ ان کے قتل کا طریقہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ یہ ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔“



یہ تینوں فدائی کچھ دیر باتیں کر کے اور اپنی اصلیت بے نقاب کر کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مزل نے اپنے ساتھیوں کو بتایا آج رات سونا نہیں۔ بتایا نہیں جاسکتا کہ آج رات کیا ہو جائے۔

اُس رات بہت کچھ ہو گیا۔ انہوں نے مشعلیں جلتی رکھیں۔ انہیں جلائے رکھنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ درندے آگ کے قریب نہیں آتے۔ اس کے علاوہ انہیں روشنی کی ضرورت تھی۔

آدھی رات سے کچھ پہلے تک سبھی جاگ رہے تھے۔ وہ بیٹھے ہوئے نہیں بلکہ لیٹے ہوئے تھے۔ انہیں اس طرح محسوس ہوا جیسے کوئی ٹیکری کے قریب آ رہا ہے۔ وہ جنگل کا کوئی جانور اور درندہ بھی ہو سکتا تھا لیکن مزل اور بن یونس کو کچھ اور ہی شک تھا۔ مزل نے سرگوشی میں سب سے کہا کہ اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے گہری نیند سوئے ہوئے ہوں۔

وہ دو آدمی تھے۔ مزل اور بن یونس آنکھیں ذرا سی کھول کر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے لیٹنے کا یہ انتظام کیا تھا کہ مزل تھا اس کے قریب شافعیہ تھی پھر بن یونس تھا اور اس سے ذرا پرے شمونہ تھی۔ دونوں آدمی دبے پاؤں ان کے بالکل قریب آ گئے۔ ایک مزل کے اوپر جھکا اور دوسرا بن یونس کے اوپر۔ دونوں نے آہستہ آہستہ خراٹے لینے شروع کر دیئے۔

پھر دونوں اکٹھے ہو کر شافعیہ پر جھکے۔ وہ رکوع کی پوزیشن میں چلے گئے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے سرگوشی کی — ”انہیں کوئی ہوش نہیں.... آرام سے اٹھاؤ“ —

اور وہ دونوں اپنے اپنے بازو شافیہ کے نیچے کر کے اٹھانے لگے۔

پیشتر اس کے ان دونوں کو پتہ چلا کہ یہ کیا ہوا ہے ایک کی پیٹھ میں منزل کا اور دوسرے کی پیٹھ میں بن یونس کا خنجر اتر چکا تھا۔ ان دونوں نے ان پر ایک ایک اور وار کیا اور پھر دونوں کو گھسیٹ کر ندی میں پھینک دیا۔ ندی تو ایسی گہری نہیں تھی لیکن پہاڑی ندی ہونے کی وجہ سے اس کا بہاؤ بڑا تیز تھا۔ ندی چند قدم ہی دور تھی۔ منزل اور بن یونس بڑے اطمینان سے آکر پھر اسی طرح لیٹ گئے۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ تین اور سفید پوش آ گئے۔ انہوں نے بھی وہی کارروائی کی جو پہلے ان کے دو ساتھی کر چکے تھے۔ ان میں سے بھی ایک نے سرگوشی کی کہ یہ ہوش میں معلوم نہیں ہوتے۔ دوسرے نے سرگوشی میں کہا کہ معلوم نہیں وہ دونوں کہاں چلے گئے ہیں۔ پھر یہ بھی شافیہ کو اٹھانے کے لئے جھکے اور پھر منزل اور بن یونس کے خنجر حرکت میں آ گئے۔ وہ تینوں فدائی تھے جو زندگی اور موت کو کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کے ساتھ جو ہوا وہ ان کے لئے غیر متوقع تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا یا ذرا سا بھی شک ہوتا تو وہ اپنے ہتھیار ہاتھوں میں تیار رکھتے لیکن ان پر جو حملہ ہوا وہ اچانک تھا۔

”منزل بھائی!“ — بن یونس نے کہا — ”اب باقی جو پانچ رہ گئے ہیں، ان کا انتظار یہاں نہ کرو۔ چلو ان لڑکیوں کو بھی تلواریں یا خنجر دو۔ پہلے وہ آئے تھے اب ہم چلتے ہیں۔“

پیشتر اس کے باقی پانچ یا ان میں سے دو تین آتے، ان چاروں نے جلدی جلدی سے ایک سکیم تیار کر لی اور سامنے والی ٹیکری کے اوپر چلے گئے۔ دونوں لڑکیوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ منزل اور بن یونس خنجروں سے مسلح تھے۔

ٹیکری پر جا کر وہ بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ سرکتے آگے بڑھے اور اس طرف اتر گئے۔ ان کی مشعلیں بھی جل رہی تھیں اور وہ پانچوں کھڑے اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے۔

منزل کی قیادت میں اس کے ساتھی چھپتے چھپاتے آگے بڑھتے گئے اور اتنی آگے چلے گئے جہاں سے وہ ان کی باتیں سن سکتے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے ہمارے اپنے بھائی ہمیں ایک لڑکی کے پیچھے دھوکہ دے

رہے ہیں۔

”سب چلو اور ان کو دیکھتے ہیں“ — ایک نے کہا — ”اگر وہ کوئی گڑبڑ کر رہے ہوئے تو انہیں یہیں ختم کر دیں گے۔“

پانچوں چل پڑے۔ منزل اور اس کے ساتھی وہیں جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گئے۔ وہ پانچوں ان کے قریب سے گزرے۔ منزل کے اشارے پر سب نے ان پر خنجروں اور تلواریں سے حملہ کر دیا۔ منزل کی بد قسمتی کہ اس کا پاؤں کسی جھاڑی میں یا درخت کی جڑ کے ساتھ انک گیا اور وہ منہ کے بل گرا۔ اس کے ساتھیوں نے حملہ بھرپور کیا تھا لیکن ان پانچ سفید پوشوں میں سے ایک الگ ہو گیا اور وہ منزل کے قریب اس حالت میں آیا کہ منزل اٹھ رہا تھا۔ اس سفید پوش فدائی نے بڑی تیزی سے اپنا خنجر نکالا اور منزل پر وار کیا۔ منزل نے وار بچا تو لیا لیکن خنجر اس کے دائیں کندھے میں اتر گیا اور یوں لگا جیسے ہنسی کٹ گئی ہو۔ منزل نے جوابی وار ایسا کیا کہ فدائی پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ منزل نے بڑی تیزی سے دو تین خنجر مارے اور اسے گرا لیا۔ اس کے ساتھیوں نے باقی چار کو گرا لیا اور ان سب پر اتنے وار کئے گئے کہ ان کا زندہ رہنا ممکن ہی نہ رہا۔

انہوں نے بہت بڑا اور خطرناک شکار مارا تھا لیکن منزل ایسا زخمی ہوا کہ اس کا خون اندامہ کر باہر آ رہا تھا۔ وہ اب آگے کو سفر کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ بن یونس نے اس کے زخم میں کپڑا ٹھونس کر اوپر ایک اور کپڑا باندھ دیا اور سب نے فیصلہ کیا کہ ہمیں سے اور اسی وقت واپسی کا سفر اختیار کیا جائے تاکہ دوپہر تک دسم کوہ پہنچ جائیں۔ منزل کا اتنا زیادہ خون ضائع نہیں ہونا چاہئے تھے۔ انہوں نے اسی وقت رخت سفر باندھا اور واپسی کے سفر کو روانہ ہو گئے۔ انہوں نے ان دس فدائیوں کا سلمان دیکھا ہی نہیں نہ ہی اسے یہ ہاتھ لگانا چاہتے تھے، البتہ ان کے گھوڑے اور ہتھیار اپنے ساتھ لے لئے۔ یہ ان کا مال غنیمت تھا۔ انہیں غالباً ”یہ اندازہ نہیں ہو گا کہ انہوں نے ان دس فدائیوں کو قتل کر کے شاہ در کے محاصرے میں کیسی جان ڈال دی ہے۔ یہ دس فدائی وہاں پہنچ جاتے تو محمد بھی نہ ہوتا اور وہاں کے سالار بھی مارے جاتے پھر محاصرے نے بُری طرح ناکام ہوتا تھا۔“



محاصرہ بڑا ہی سرگرم ہو گیا تھا لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ چنانکہ مرو کا لشکر انتقام سے پاگل ہوا جا رہا تھا اس لئے سالاروں کو یہ مشکل پیش نہیں آتی

تھی کہ وہ انہیں آگے کس طرح دھکیلیں بلکہ مشکل یہ پیش آرہی تھی کہ یہ لشکر بار بار دیوار کے قریب یا دروازوں کی طرف اٹھ دوڑتا تھا اور اسے روکنا پڑتا تھا۔ وہاں شجاعت اور بے خوفی کی تو ضرورت یقیناً تھی لیکن عقل کے بغیر شجاعت بڑی ہی نقصان دہ تھی۔ یہاں تک دلیرانہ کارروائی کی گئی کہ ایک رات دیوار کے قریب جا کر کند اوپر پھینکی گئی۔ کند چھوٹی دو برجیوں کے درمیان اٹک گئی اور دو تین مجاہدین رسہ پکڑ کر اوپر جانے لگے۔ دیوار کے اوپر سے تیر آتے تھے اور ان تیر اندازوں کو دُور رکھنے کے لئے سلجوقی تیر اندازوں نے بے پناہ تیر پھینکنے شروع کر دیئے۔ مجاہدین رسہ چڑھتے گئے لیکن کچھ دُور سے دیوار والے تیر اندازوں نے رسہ چڑھتے مجاہدین پر تیر پھینکنے شروع کر دیئے اور برچھیاں بھی پھینکی گئیں اور ان پر جلتی ہوئی مشعلیں بھی پھینکیں۔ مجاہدین زخمی بھی ہوئے اور دو کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ اگر اس آگ کے باوجود اوپر ہی جاتے رہتے تو رستے کو بھی آگ لگ سکتی تھی۔ بہر حال اوپر جانا ممکن نہ رہا اور یوں کچھ مجاہدین شدید زخمی ہو کر رستے سے اتر آئے۔

شہر کے دو اطراف پہاڑی تھی۔ اس طرف بھی تیر اندازوں کو لے جایا گیا لیکن وہاں مشکل یہ تھی کہ پہاڑی کے دامن اور شہر کی دیوار کے درمیان فاصلہ بہت تھوڑا تھا۔ مجاہدین پہاڑی پر چڑھتے تھے تو شہرناہ کے تیر انداز ان پر تیروں کی بارش برسا دیتے تھے۔ دروازے توڑنے کی بھی کوشش کی گئی۔ مجاہدین کھانڈوں سے توڑنے کے لئے دروازوں تک پہنچ گئے لیکن آدھے ہی زندہ واپس آ سکے۔ دروازہ توڑنے کا ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا گیا۔ وہ یہ تھا کہ درختوں کے بہت وزنی ٹن کاٹے گئے، ان سے شاخیں وغیرہ اتار دی گئیں اور بے شمار مجاہدین نے ایک ٹن کو کندھوں پر اٹھایا اور دوڑتے ہوئے ایک دروازے تک گئے اور اس ٹن کا اگلا سرا دروازے پر مارا۔ دروازے اتنے مضبوط تھے کہ نہ ٹوٹ سکے۔ توڑے تو جاسکتے تھے لیکن اوپر سے برچھیاں اور تیر آتے تھے۔

آخر منہجیق استعمال کی گئیں۔ یہ سب چھوٹی منہجیق تھیں جن میں زیادہ وزنی پتھر نہیں ڈالے جاسکتے تھے۔ بہر حال ہر منہجیق ایک من وزنی پتھر پھینک سکتی تھی۔ شہرناہ کے ارد گرد گھوم پھر کر دیکھا گیا شاید کہیں سے ذرا سی دیوار کمزور ہو۔ ایسی دو تین جگہیں دیکھی گئیں اور منہجیقوں سے وہاں پتھر مارے گئے لیکن دیوار اس قدر چوڑی ا

تھی کہ اس میں شگاف ڈالنا ممکن نہیں تھا۔

ادھر قلعہ الموت میں حسن بن صباح بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ صبح و شام اس خبر کا منتظر رہتا تھا کہ اس کے ان دس فدائیوں نے جنہیں اس نے خود بھیجا تھا، محمد اور اس کے تمام سالاروں کو قتل کر دیا ہے اور خود کشتی کر لی ہے لیکن ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا اور اسے ایسی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ اُسے شاہ در کے اندر سے خبر نہیں جاسکتی تھی کیونکہ شہر محاصرے میں تھا۔ اسے باہر کے جاسوس خبریں پہنچاتے تھے۔ وہ یہ جواز تو قبول کرتا ہی نہیں تھا کہ قتل کا موقعہ نہیں ملا۔

اس نے آخر اپنے جاسوس بھیجے اور کہا کہ ان دس فدائیوں کا سراغ لگاؤ، وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ انہیں پتہ نہ چلے، در پردہ یہ معلوم کرو کہ انہوں ابھی تک اپنا کام کیوں نہیں کیا۔

اس کے جاسوس قلعہ الموت سے شاہ در کے مضافات میں پہنچ گئے۔ انہوں نے بہت تلاش کیا۔ مرنو بھی گئے اور رے بھی گئے لیکن وہ دس فدائی انہیں کہیں نظر نہ آئے۔ آخر کسی اور نے جنگل میں سے گزرتے بکھری ہوئی ہڈیاں دیکھیں اور سفید عمامے اور پھٹی ہوئی عبائیں بھی دیکھیں۔ کچھ اور نشانیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ کھوپڑیاں دیکھیں تو یہ پوری نہیں تھیں۔ یہ حسن بن صباح کے دس فدائی ہی ہو سکتے تھے جن کی لاشیں درندوں اور گدھوں نے کھالی تھیں۔ کچھ اور نشانیاں مل گئیں اور حسن بن صباح کو اطلاع دی گئی کہ فدائی اپنے ہدف تک پہنچ ہی نہیں سکے تھے۔ تاریخ میں شہادت ملتی ہے کہ ضعیف العمر عبد الملک بن عطاش کسی کسی وقت زیوار پر جا کھڑا ہوتا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بلند آواز سے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا رہتا اور سلجوقی لشکر کی طرف پھونکیں مارتا رہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس کا سہلی علم یا اس کا جو کوئی عمل اس کے ہاتھ میں تھا، ناکام ہو چکا تھا۔ وہ یہ فقرہ بار بار کہا کرتا تھا —
”و دشمن آنکھوں سے اندھا نہ ہو تو عقل سے اندھا ہو جائے گا۔“

محاصرے کو تین چار مہینے گزر گئے تو شاہ در والوں نے ایک بڑی دلیرانہ کارروائی شروع کر دی۔ رات کے وقت شہر کا کوئی ایک دروازہ کھلتا اور اس میں سے دو سو یا تین سو آدمی برہمیوں اور تمکواروں سے مسلح بڑی ہی تیزی سے باہر نکلتے اور بالکل سامنے سلجوقی لشکر پر ٹوٹ پڑتے۔ جس قدر نقصان کر سکتے کر کے اسی تیزی سے واپس چلے

جاتے تھے۔ ان کا اپنا جانی نقصان تو ہوتا تھا لیکن سلجوقی لشکر کا جانی نقصان کئی گنا زیادہ ہو جاتا تھا۔ بے شمار سلجوقی شدید زخمی بھی ہو جاتے تھے۔ تیسری چوتھی رات شاہ در کے اندر سے ایسا ہی حملہ اچانک آتا اور پھر واپس چلا جاتا تھا۔ ان کا انداز بگولے جیسا ہوتا تھا۔ یہ دلیرانہ کارروائی ڈیڑھ دو مہینے چلتی رہی۔ آخر محمد نے دیکھا کہ محاصرہ طول پکڑ رہا ہے اور ذرا سی بھی کامیابی نہیں ہو رہی تو اس نے حکم دیا کہ منجینیق شہر کے ارد گرد لگا کر کم وزنی پتھر شہر کے اندر پھینکے جائیں اور اس کے ساتھ ہی فلتے والے تیر آگ لگا کر مسلسل اندر پھینکے جاتے رہیں۔

دو تین مورخوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شہر سے جو آدمی حملہ کرنے کے لئے باہر آتے تھے، ان میں سے بعض اتنے زخمی ہوتے تھے کہ واپس نہیں جاسکتے تھے۔ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ شہری محاصرے سے تنگ آ چکے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ محاصرہ جلدی ٹوٹ جائے یا شہر محاصرہ کرنے والوں کے حوالے کر دیا جائے۔ شہری ضروریات زندگی سے محروم ہو گئے تھے اور زیادہ نقصان تاجروں اور دکانداروں کا ہو رہا تھا جنہیں باہر سے مال مل ہی نہیں رہا تھا۔ مورخوں نے لکھا ہے یہ تھی وجہ کہ محمد نے شہریوں کو اور زیادہ پریشان کرنے کے لئے شہر پر پتھر اور فلتے والے آتش تیر برسانے شروع کر دیئے تھے۔ محاصرے کو آٹھ نو مہینے ہو چلے تھے۔



ایک صبح شہر کا ایک دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر آیا جس کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔ باہر آتے ہی اس کے پیچھے دروازہ پھر بند ہو گیا۔ یہ آدمی سلجوقی لشکر کے قریب آگیا اور اس نے بلند آواز سے کہا کہ وہ سلجوقی سلطان کے لئے ایک پیغام لایا ہے۔ ایک سالار کو جو وہاں کہیں قریب ہی تھا، اطلاع دی گئی۔ سالار آیا اور وہ اس آدمی کو سلطان محمد کے پاس لے گیا۔ یہ پیغام قلعے کے حاکم احمد بن عبد الملک کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ ہم لوگ تمہارے ایک اللہ اور ایک رسول اور ایک قرآن کو مانتے ہیں اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول ہیں۔ اس کے بعد ہم شریعت کی پوری پابندی کرتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہمیں آزادی سے زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جا رہا۔ ہمارا اختلاف صرف امامت پر ہے۔ آپ ہمارے امام کو نہیں مانتے تو یہ اتنی بڑی بات نہیں کیونکہ امام نبی یا رسول نہیں ہوتا۔ پھر ہم اطاعت قبول

کرتے ہیں تو کیا شریعت میں جائز ہے کہ ایک ہی مذہب کا ایک فرقہ اطاعت قبول کر لے تو اسے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جائے اور اسے جینے کے حق سے محروم رکھا جائے؟ چونکہ اس پیغام میں اطاعت کا ذکر بھی تھا اس لئے محمد نے اپنا رویہ کچھ نرم اور صلح جو کر لیا لیکن اس میں چونکہ مذہب کا ذکر بھی تھا اس لئے محمد نے بہتر سمجھا کہ علماء سے فتویٰ لے لیا جائے۔ محمد نے پیغام کا جواب دیا کہ وہ اپنے علمائے سنت والجماعت سے فتویٰ لے کر فیصلہ کرے گا۔

اس موقع پر علمائے دین نے اپنا وہی کردار پیش کیا جو آج تک چلا آ رہا ہے۔ ابو القاسم رفیق دلاوری نے لکھا ہے کہ علماء اس مسئلے پر متحد اور متفق نہ ہوئے۔ بعض علماء نے تو یہ فتویٰ دے دیا کہ حسن بن صباح کا فرقہ اسلام کا ہی ایک فرقہ ہے اس لئے اس فرقے پر تشدد جائز نہیں۔ بعض علماء نے کوئی بھی فتویٰ دینے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ اُس وقت ایک بڑے ہی مشہور عالم دین تھے جن کا نام شیخ ابوالحسن علی بن عبدالرحمن سمبجانی تھا۔ انہوں نے فتویٰ دیا کہ باطنی اسلام کا فرقہ نہیں بلکہ ان کے عقائد خلاف اسلام ہیں اور ان کے اعمال ایسے ہیں کہ ان کا قتل واجب ہے اور حالات و واقعات گواہ ہیں کہ باطنی قتل و غارت گری میں یقین رکھتے ہیں اور ان میں ابلیسیت کا عنصر غالب ہے۔ انہوں نے فتوے میں یہ بھی لکھا کہ باطنی اپنے امام کا حکم مانتے ہیں اور شریعت کو الگ رکھتے ہیں۔ یہ فرقہ ان چیزوں کو بھی حلال قرار دیتا ہے جو شریعت اسلامی کی رو سے حرام قرار دی جا چکی ہیں۔ لہذا اس فرقے کو بخشنا اسلام کے حق میں نہیں۔

محمد نے یہ فتویٰ شاہ در احمد بن عبدالملک کی طرف بھیج دیا۔ شہر کے اندر سے ایک اور پیغام آیا جس میں لکھا تھا کہ حاکم قلعہ درخواست کرتا ہے کہ سلجوق سلطان اپنے علمائے دین کو شہر کے اندر بھیجے تاکہ باطنیوں کے علماء کے ساتھ بحث مباحث ہو سکے اور پھر یہ معاملہ کسی نتیجے پر پہنچایا جائے۔

اُس وقت اصفہان کے قاضی ایک عالم دین قاضی ابوالعلاء ساعد بن یحییٰ تھے جو شیخ الحنفیہ تھے، محمد نے انہیں شاہ در بلوایا۔ قاضی بن یحییٰ آئے تو محمد نے انہیں بتایا کہ انہیں شاہ در کے اندر حاکم شہر کے پاس بھیجا جا رہا ہے۔ متعدد مورخوں نے لکھا ہے کہ اصفہان کے اس قاضی کو شاہ در احمد بن عبدالملک کے اس مطالبے پر بھیجا گیا تھا کہ اس نے جو مسئلہ پیش کیا تھا اس مسئلے پر شاہ در کے علماء سے بحث کرنی تھی تاکہ کسی نتیجے پر یا کسی

فیصلے پر پہنچا جائے۔

قاضی صاعد بن یحییٰ چار محافظوں کے ساتھ شر کے اندر چلے گئے۔ توقع تو یہ تھی کہ ان کا سارا دن شہر میں ہی گزر جائے گا کیونکہ مسئلہ بڑا نازک اور پیچیدہ تھا جس پر بحث اتنی جلدی ختم نہیں ہو سکتی تھی لیکن قاضی موصوف جلدی واپس آگئے اور سلطان محمد سے ملے۔

”سلطان محترم!“ — قاضی بن یحییٰ نے کہا — ”اپنا وقت ضائع نہ کریں اور یہ شہر کسی نہ کسی طرح فتح کرنے کی کوشش کریں۔ یہ باطنی انتہائی عیار لوگ ہیں۔ حاکم شہر کے چہرے پر میں نے اہلسیست اور عیاری کا بڑا نمایاں تاثر دیکھا ہے۔ انہیں کسی بھی شرعی مسئلے پر بات نہیں کرنی تھی اور نہ یہ کوئی وضاحت چاہتے ہیں۔ مجھے ان کے علما نے بحث تو کی لیکن ساف پتہ چل رہا تھا کہ یہ لوگ کچھ اور چاہتے ہیں۔ میں نے یہ بھرا اپنے دماغ اور تجربے سے معلوم کر لیا۔ اس شہر کا حاکم اور حاکم کا بوڑھا باپ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ کسی طرح یہاں سے ٹل جائیں یا انہیں اتنا وقت مل جائے کہ یہ شر کے بچانے کی مزید تیاری کر لیں۔ یہ لوگ صرف وقت اور مہلت حاصل کرنے کی کوشش رہے ہیں۔“

محمد کے ساتھ اس کے سالار بھی تھے۔ سالاروں نے قاضی صاعد بن یحییٰ کی نائیدی اور کہا کہ ان باتوں کو مزید مہلت نہ دی جائے۔

”قابل احترام قاضی اصفہان!“ — محمد نے کہا — ”میں آپ کے سامنے طفل مکتب ہوں، میرے دل میں اسلام اور شریعت کا احترام ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ میرا کوئی قدم اور کوئی کارروائی شریعت کے خلاف نہ ہو جائے۔ آپ یہ بتائیں کہ انہوں نے یہ جو مسئلہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے کہ باطنی مسلمان ہیں وغیرہ یہ کہاں تک صحیح ہے اور کیا ہمیں شریعت اجازت دیتی ہے کہ انہیں ختم کیا جائے یا بخش دیا جائے؟“

”کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا“ — قاضی بن یحییٰ نے دو ٹوک لہجے میں کہا — ”یہ باطنی ابلیس کے بچاری ہیں۔ انہیں بخشنا غیر اسلامی فعل ہے۔ ان لوگوں کا دوسرا گناہ یہ ہے کہ یہ شریعت کے قائم کئے ہوئے اصولوں کو توڑ موڑ کر قرآن کی خلاف ورزی اور توہین کر رہے ہیں.... آپ ان کے خلاف جنگ جاری رکھیں۔“

”ایک اور بات بتائیں“ — محمد نے پوچھا — ”کیا آپ نے یہ دیکھنے کی کوشش

کی تھی کہ اندر شہر کا کیا حال ہے اور شہریوں کا ردِ عمل اور ان کی حالت کیا ہے؟“
 ”ہاں سلطان!“ — قاضی موصوف نے کہا — ”یہ تو مجھے صاف طور پر پتہ چل گیا ہے کہ شہر کی حالت بہت بُری ہے اور شہری شہر کے حاکم کے پیچھے بُری طرح پڑے ہوئے ہیں کہ محاصرہ کسی نہ کسی طرح ختم کروایا جائے۔ یہ بات حاکم شہر نے خود بھی کہی ہے۔ اُس نے انداز تو اپنا اختیار کیا تھا لیکن میں اصل بات سمجھ گیا۔ اُس نے کہا تھا کہ شہر میں گھوم پھر کر دیکھیں۔ آپ لوگوں نے اتنی سنگ باری کی ہے کہ کئی مکان ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں اور لوگوں نے گھروں میں بیٹھنا اور سونا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ آتش تیروں نے کئی مکان جلا ڈالے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ شہر کا امن و امان ختم ہو چکا ہے اور نوبت فاقہ کشی تک پہنچ رہی ہے.... میں نے شہر کی یہ حالت اپنی آنکھوں دیکھی ہے۔ حاکم شہر وقت اور مہلت چاہتا ہے کہ اس کے شہری ذرا سانس لے لیں اور ان کا تعاون حاصل کر لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی حاکم شہر آپ کو دھوکہ دے کر باہر سے رسد منگوانا چاہتا ہے۔ آپ محاصرے میں شدت پیدا کر دیں۔ فتح انشاء اللہ آپ کی ہو گی۔“



محمد نے قاضی اصفہان کو پورے احترام سے رخصت کیا اور اپنے کچھ گھوڑ سوار محافظ ساتھ بھیجے۔

محمد نے محاصرے میں یوں شدت پیدا کی کہ منجینقوں سے سنگ باری اور تیز کردی اور فلیتوں والے تیر اور زیادہ پھینکنے شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی تقریباً ”ہر رات دروازوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہریوں کے حوصلے بالکل ہی پست ہو گئے اور دیکھا گیا کہ شہرینہ پر تیر اندازوں کی تعداد آدمی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ ان میں کچھ تو مر گئے اور کچھ زخمی ہوئے تھے لیکن بہت سے اچھے بھلے تیر انداز بھی منہ موڑ گئے تھے۔ وہ اب اُس ذہنی کیفیت تک پہنچ گئے تھے جہاں جذبے ختم ہو جاتے ہیں اور ہتھیار ڈالنے کا ارادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مختصر بات یہ کہ لڑنے والے شہری اب یہ چاہتے تھے کہ وہ مزاحمت کم کر دیں اور سلجوقی لشکر شہر لے لے تاکہ یہ قیامت جو ان پر دن رات گرتی رہتی ہے، ختم ہو جائے۔

چند ہی دنوں بعد شہر کا ایک دروازہ کھلا اور ایک آدمی جو گھوڑے پر سوار تھا ہاتھ میں

سفید جھنڈا لئے باہر آیا اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔ یہ سوار کوئی پیغام لایا تھا۔ اسے سلطان محمد کے پاس لے گئے۔

حاکم شہر نے اس پیغام میں استدعا کی تھی کہ اسے اجازت دی جائے کہ وہ اس شہر سے اپنی آبادی کے ساتھ نکل جائے اور اسے دوسری اجازت یہ دی جائے کہ وہ قلعہ خاتجیان میں چلا جائے۔ آبادی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ شاہ در کی تمام تر آبادی وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی بلکہ مطلب یہ تھا کہ جو لوگ یہاں سے جانا چاہتے ہیں انہیں جانے دیا جائے۔

خاتجیان اصفہان سے تھوڑی ہی دور ایک قلعہ تھا۔ کسی وقت بانیوں نے اس قلعے پر قبضہ کر لیا تھا اور اسے اپنا ایک اور اڑھ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن سلطان ملک شاہ مرحوم نے اس قلعے پر اچانک ایسی یلغار کی کہ قلعے پر قبضہ کر لیا اور اسی باطنی کو زندہ رہنے کا موقع ملا جو بھاگ نکلا تھا۔ اب وہ قلعہ کسی کے بھی قبضے میں نہیں تھا۔

یہاں یقیناً ”عبد الملک بن عطاش یاد آتا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ سلجوقی سلطان اور سالار اگر آنکھوں سے اندھے نہ ہوئے تو عقل سے اندھے ہو جائیں گے۔ وہ مسلسل اپنا کوئی عمل کرتا رہا تھا اور شہر نہا پر کھڑے ہو کر اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کچھ بڑبڑاتا رہتا اور باہر والے لوگوں پر پھونکیں مارتا رہتا تھا۔ کچھ ایسی شہادت ملتی ہے کہ اس کے جاوے نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور دکھایا تھا۔

محمد دیکھ چکا تھا کہ حاکم شہر نے مذہب کے نام پر کس قسم کی عیاری اور مکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسے اصفہان کے قاضی نے بھی بتایا تھا کہ یہ باطنی صرف عیاری کر رہے ہیں کہ انہیں کچھ مہلت اور وقت مل جائے۔ پھر بھی محمد کا رویہ یہ تھا کہ شاہ در کے حاکم نے یہ نئی استدعا باہر بھیجی کہ اسے اس کی بجائے دوسرا قلعہ دے دیا جائے تو محمد نے یہ استدعا قبول کر لی اور شہر پر سنگ باری اور آتش تیر اندازی رکوا دی تھی اور پھر اس پیغام کا یہ جواب دیا کہ ایک مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس عرصے میں جس کسی نے اس شہر سے نکلنا ہے نکل جائے۔

شاہ در کے بانیوں نے اپنی ایلیمی ذہنیت کا ایک اور مظاہرہ کر دیا۔ وہ اس طرح کہ سلجوقی لشکر کے کچھ لوگ شہر میں بھیج دیئے گئے اور ان کے ساتھ ایک سالار کو بھی بھیج دیا گیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ جو لوگ شاہ در سے نکل رہے ہیں انہیں جلدی نکالا جائے اور کوئی

مزید گزرنے ہو لیکن سلجوقی لشکر کا ایک عہدیدار کسی گلی میں جا رہا تھا تو تین چار باغیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ یہ اس کی اپنی شجاعت اور قسمت تھی کہ وہ صرف زخمی ہوا، مرا نہیں لیکن باغیوں نے اپنی نیت ظاہر کر دی تھی۔

سلطان محمد کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے آدمیوں کو شہر سے باہر نکال کر پھر شہر پر سنگ باری شروع کر دی اور آگ والے تیر پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں چھوڑنے شروع کر دیئے۔ شہر میں چیخ و پکار بلند ہونے لگی اور نفسا نفسی کا عالم پیدا ہو گیا۔ اب حاکم شہر احمد بن عبد الملک خود اپنے چند ایک محافظوں کے ساتھ شہر کے ایک دروازے سے باہر آیا۔ ایک محافظ نے سفید جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔ وہ سلطان محمد سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے محمد تک پہنچا دیا گیا۔

اس نے محمد سے معافی مانگی اور کہا کہ یہ چند ایک اشخاص تھے جنہوں نے سلجوقی عہدیدار پر حملہ کیا تھا اور اس میں حاکم شہر کی رضا شامل نہیں تھی۔ محمد نے پہلے تو اس کی معافی قبول نہ کی اور کہا کہ اب وہ بزورِ شمشیر یہ شہر لے گا اور اس کے بعد شہریوں سے اور حاکم شہر اور اس کے خاندان سے پورا پورا انتقام لے گا لیکن حاکم شہر گزرا کر معافی مانگ رہا تھا۔ محمد نے صاف کہہ دیا کہ اسے قلعہ خالنجان نہیں دیا جائے گا۔

احمد بن عبد الملک روپڑا اور اس نے کہا کہ خالنجان اسے نہ دیا جائے، اس کی بجائے ایک اور چھوٹا سا قلعہ جس کا نام ناظرو طہس تھا، اسے دے دیا جائے اور اس کے بعد وہ امن و امان سے رہے گا۔

سلطان محمد کے دل میں رحم کی موج اٹھی اور اس نے باغیوں کی یہ شرط اور درخواست قبول کر لی اور انہیں اجازت دے دی کہ وہ اس قلعے میں منتقل ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی سلطان محمد نے حکم دیا کہ شاہ در کی شہر پناہ اسی طرح رہنے دی جائے لیکن قلعہ مسمار کر دیا جائے۔ سلجوقی لشکر نے اُسی وقت قلعے کو مسمار کرنا شروع کر دیا۔

شاہ در پر سلجوقی سلطان کا قبضہ تو ہو گیا تھا لیکن باطنی سانپ اور بچھو تھے جو ڈسنے سے باز نہیں آسکتے تھے۔ اس شہر کا قلعہ بہت ہی بڑا اور پیچ در پیچ تھا۔ اس میں چھوٹی بُرجیاں اور اس سے بڑے بُرج اور اس سے بڑے بُرج بھی تھے۔ کسی نے دیکھ لیا کہ ایک بڑے بُرج میں کوئی چھپا بیٹھا ہے۔ ایک سالار کچھ مجاہدین کو ساتھ لے کر دیکھنے گیا۔ دیکھا وہاں عبد الملک بن عطاش کا چھوٹا بھائی احمد بن عطاش چھپا بیٹھا تھا۔ اسے پکڑ لیا گیا۔

یہ بہت بڑا بُرج تھا جس کے کئی حصے تھے۔ اس کے کچھ کمرے بالائی منزل میں تھے۔ محمد کو اطلاع ملی تو اس نے کہا کہ صرف اس بُرج کی ہی نہیں بلکہ ایسے تمام بُرجوں کی تلاشی لی جائے۔ اس بُرج کی تلاشی لی گئی تو تاریخ کے مطابق 80 اور باطنی برآمد ہوئے۔ یہ سب خنجروں اور چھوٹی تلواریں سے مسلح تھے اور چند ایک کے پاس کمانیں اور تیروں سے بھری ہوئی ترکشیں بھی تھیں۔ ان سب کو سلیمان کے سامنے لے جایا گیا۔ تب معلوم ہوا کہ احمد بن عطاش کا ایک جواں سال بیٹا بھی اس کے ساتھ تھا۔

”ابن عطاش!“ — محمد نے احمد بن عطاش سے پوچھا — ”تو یہاں پنچپا کیا کر رہا تھا؟.... اگر سچ بولو گے تو شاید پہلے کی طرح اب بھی میرے دل میں رحم کی لہر اٹھ آئے اور اگر جھوٹ بولنے کا ارادہ ہے تو میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ تجھے کیسی کیسی اذیتیں دے دے کر ماروں گا۔“

”کیا سلطان اتنی سی بھی بات نہیں سمجھ سکتا؟“ — احمد بن عطاش نے بڑی دلیری سے جواب دیا — ”میں تمہاری پنچھ میں خنجر اتارنے کے لئے یہاں رک گیا تھا۔ ہم لوگ اتنی جلدی شکست تسلیم نہیں کیا کرتے۔“

”میں نے تیری ایک پیشین گوئی سنی تھی“ — محمد نے کہا — ”تو نے پیشین گوئی کی تھی کہ اصفہان میں تیری شوکت اور عظمت کے نقارے بجیں گے۔ اب بتا کہاں گئی تیری وہ عظمت؟“

”میری پیشین گوئی غلط نہیں نکلی“ — احمد بن عطاش نے کہا — ”سلطان اب بھی جا کر اصفہان میں دیکھ لے کہ لوگ میرا نام ایک پیرو فرشتہ کی طرح لیتے ہیں۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اصفہان پر میری حکومت ہوگی۔ میری پیشین گوئی کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں پر میری حکومت ہوگی اور میں اصفہان میں جدھر سے بھی گزروں گا، لوگ میرے آگے سجدے کریں گے۔“

تاریخ میں لکھا ہے کہ سلطان محمد کی ہنسی نکل گئی۔

”میں تجھے اصفہان کی گلیوں میں ہی پھرا رہا ہوں“ — محمد نے کہا اور اپنے پاس کھڑے دو سلاخوں کو حکم دیا — ”اس شخص کو اور اس کے بیٹے کو پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر اور ہاتھ باندھ کر اور ان دونوں کے منہ کالے کر کے اصفہان کی تمام گلیوں میں گھماؤ اور پھر سرعام ان دونوں کے سر کاٹ کر بغداد و خلیفہ کے حضور پیش کر آؤ۔“

اصفہان وہاں سے قریب ہی تھا۔ اُسی وقت احمد بن عطاش اور اس کے جواں سال بیٹے کے پاؤں میں اور ہاتھوں میں زنجیریں ڈال دی گئیں اور وہیں ان کے منہ کالے کر دیئے گئے۔

سلطان محمد کی یہ کچھری کسی کمرے میں نہیں بلکہ باہر ایک درخت کے نیچے لگی ہوئی تھی۔ ایک تو وہاں وہ 80 باطنی کھڑے تھے جنہیں بُرجوں میں سے پکڑا گیا تھا اور بہت سے شہری اور سلجوقی لشکر کے کچھ مجاہدین بھی وہاں موجود تھے۔ جب احمد بن عطاش اور اس کے بیٹے کو زنجیریں ڈال کر ان کے منہ کالے کر دیئے گئے تو تماشاویوں کے ہجوم میں سے ایک نوجوان لڑکی نکلی اور دوڑ کر احمد بن عطاش کے سامنے آن کھڑی ہوئی.... وہ اُس کی بیوی نور تھی جس کا پیچھے ذکر آچکا ہے۔

”اے سیاہ رو انسان!“ — نور نے بڑی بلند آواز میں کہا — ”تُو نے مجھے عبادت سے اٹھایا تھا اور میں نے تجھے کہا تھا کہ تُو ذلیل و خوار ہو کر مرے گا.... اب بتا اللہ تیرا ہے کہ میرا!“

جس وقت لوگ شہر در سے نکل رہے تھے اُس وقت احمد بن عطاش کا شاہی خاندان بھی شہر سے جا رہا تھا۔ نور کو موقع ملا تو وہ تیز دوڑ پڑی اور سلطان محمد تک آن پہنچی۔ اُس کے ساتھ اُس کا باپ بھی تھا جو عبد الملک بن عطاش کا قابلِ اعتماد ملازم بن گیا تھا۔ باپ نے محمد سے اپنا تعارف کرایا اور اپنی بیٹی کے متعلق بھی بتایا کہ اُسے قافلے سے اغوا کر کے احمد بن عطاش نے اپنی بیوی بنالیا تھا۔ اس باپ نے ہی عبد الملک بن عطاش کے متعلق ساری باتیں بتائی تھیں کہ کس طرح اُس نے الو کے ذریعے کالا جادو کیا تھا اور اس کے بعد اپنا جادو چلاتا ہی رہا تھا۔ نور کے باپ نے محمد کو بتایا کہ چمڑے پر لکھا ہوا پیغام تیرے ذریعے اُسی نے باہر پھینکا تھا۔ اس باپ نے اور بھی بہت سی باتیں بتائیں۔ محمد نے حکم دیا کہ نور اور اس کے باپ کو سلطان کے مہمان سمجھ کر رکھا جائے اور ابھی انہیں مُرُو بھیج دیا جائے۔

احمد بن عطاش اور اس کے بیٹے کو دو اونٹوں پر بٹھا کر اصفہان بھیج دیا گیا۔ ان کے ساتھ ایک عہدیدار تھا اور پچاس مجاہدین گھوڑوں پر سوار تھے۔ ابنِ اثیر نے لکھا ہے کہ ان دونوں کو اصفہان کی گلیوں اور بازاروں میں گھمایا پھرایا گیا اور ساتھ ساتھ یہ اعلان کیا جاتا رہا کہ ان کا جرم کیا ہے اور یہ لوگ کالے جادو کے ذریعے یا کسی سفلی عمل کے ذریعے

سلجوقی لشکر کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ پھر انہیں شہر کے وسط میں کھڑا کر کے سارے شہر کو اکٹھا کیا گیا اور ان کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے۔ سلطان محمد کے حکم کے مطابق دونوں کے سر بغداد لے جائے گئے جو دار الخلافہ تھا اور یہ سر خلیفہ کو پیش کئے گئے۔ خلیفہ نے ان سروں کی نمائش کی اور پھر دونوں سر آوارہ کتوں کے آگے پھینک دیئے۔

اُس وقت احمد بن عطاش کی پہلی بیوی قلعہ ناظرو طس میں پہنچ چکی تھی۔ اسے اطلاع دی گئی کہ اس کے خاوند کا اور اس کے جوان بیٹے کا سر کاٹ دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے دونوں کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے اصفہان کی گلیوں میں گھمایا گیا تھا۔ یہ عورت بیوی بھی تھی اور جوان بیٹے کی ماں بھی۔ وہ قلعے کی سب سے اونچی برجی پر چڑھ گئی اور اُس نے چھلانگ لگا دی اور یوں اس نے خود کشی کر لی۔

سلطان محمد شاہ در پر اپنے لشکر کا قبضہ مضبوط کر کے واپس مرو آ گیا۔ اس کا استقبال بڑی ہی شان و شوکت سے کیا گیا۔ یونکہ وہ بائیسوں کے بہت بڑے اڈے کو تباہ کر کے آیا تھا۔ مرو میں ہر کوئی فکر مند اور پریشان تھا کہ شاہ در کو فتح نہیں کیا جاسکے گا، اللہ محمد اور لشکر کو خیریت سے واپس لے آئے۔ محمد لشکر کے ساتھ صرف خیریت سے ہی واپس نہ آیا بلکہ وہ فاتح کی حیثیت سے اپنے دار الحکومت میں داخل ہوا۔



سلطین محمد نے اپنے چھوٹے بھائی سنجر کو شاہ در بھیج دیا اور اُس کے سپرد یہ کام کیا کہ وہاں کے سرکاری انتظامات کو اپنے سانچے میں ڈھال کر رواں کرے اور قلعہ جو مسمار کیا گیا ہے اسے از سر نو تعمیر کرے لیکن اس کی شکل قلعے جیسی نہ ہو۔

”.... اور میرے بھائی!“ — محمد نے اپنے بھائی سنجر سے کہا — ”اصل کام جو تمہیں وہاں کرنا ہے وہ غور سے سن لو۔ شاہ در کی تقریباً آدھی آبادی وہاں سے نہیں گئی۔ ان لوگوں نے وہیں رہنا پسند کیا ہے۔ خیال رکھنا کہ یہ سب باطنی ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ حسن بن صباح کے فدائی ہی ہوں اور یہ محض اس کے پیروکار ہوں لیکن محتاط ہونا پڑے گا کہ ان میں کچھ فدائی ہو سکتے ہیں، فدائی نہ ہوئے تو حسن بن صباح کے جاسوس تو ضرور ہوں گے۔ یہ انتظام میرا ہو گا کہ یہاں سے بڑے تجربہ کار جاسوس اور مخبر مستقل طور پر شاہ در بھیج دوں گا۔ وہ وہاں کے ہر گھر کے اندر بھی نظر رکھیں گے اور کوئی

ذرا سا بھی مشکوک شخص نظر آیا تو اسے تمہارے سامنے کھڑا کر دیں گے.... ہمارا مقصد یہ ہے کہ جس طرح حسن بن صباح نے اور اس کے پیر استاد عبد الملک بن عطاش نے شاہ در کو اپنا ایک مضبوط اڈہ بنا رکھا تھا اسی طرح ہم اس شہر کو اپنا دو سرام مرکز بنالیں گے جہاں سے تبلیغ بھی ہوگی اور دوسری کارروائیاں بھی کی جلیا کریں گی۔ میں یہاں کے پورے پورے خاندان شاہ در بھیج کر وہاں آباد کر دوں گا۔ ان خاندانوں کے افراد کو بتایا جائے گا کہ وہ کس طرح وہاں کے باطنیوں کو واپس اسلام میں لے آئیں.... تم کل صبح روانہ ہو جاؤ۔“

سجراگلی صبح روانہ ہو گیا۔

دو تین دنوں بعد محمد نے دربارِ عام منعقد کیا۔ اس میں وہ ان مجاہدین کو انعام و اکرام دینا چاہتا تھا جنہوں نے شاہ در کے محاصرے کو کامیاب کرنے کے لئے غیر معمولی شجاعت کے مظاہرے کئے تھے۔ اس نے نور اور اس کے باپ کو خصوصی انعام دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا کارنامہ پہلے سنایا جا چکا ہے۔ محمد نے نور اور اس کے باپ کو اپنے محل میں ایک کمرہ دے دیا تھا اور انہیں شاہی مہمان کی حیثیت دی تھی۔

اگلے روز دربار منعقد ہوا اور محمد نے پورے لشکر کو خراج تحسین پیش کیا۔ پھر چند ایک نام پکارے اور انہیں اس طرح انعام دیئے کہ ان کے کارنامے بھی بیان کئے۔ آخر میں نور اور اس کے باپ کو آگے بلایا گیا۔ محمد نے نور کے باپ کا کارنامہ سنایا اور کہا کہ وہ جو التیروں سے گرایا گیا تھا، وہ پورے لشکر کے لئے خطرناک ہو سکتا تھا لیکن نور کے باپ نے ایک تیر کے ساتھ پیغام باندھ کر باہر بھیج دیا اور اس طرح اس التو کو مار لیا گیا۔ پھر محمد نے اعلان کیا کہ نور کو اور اس کے باپ کو کیا انعام دیا جا رہا ہے۔

سلطان محمد کے وزیر اعظم کا نام سعد الملک تھا جو اس وقت دربار میں موجود تھا اور سلطان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ انعام و اکرام کی یہ تقریب ختم ہوئی تو دربار برخاست کر دیا گیا۔ نور کا باپ محمد کے پاس جا کھڑا ہوا اور سرگوشی میں کہا کہ وہ اس کے ساتھ ایک خفیہ بات کرنا چاہتا ہے لیکن اس طرح کہ کوئی اور موجود نہ ہو اور کسی اور کو پتہ بھی نہ چلے کہ وہ سلطان کو ملا ہے۔ سلطان نے اسے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں چلا جائے اور سلطان خود اس کے پاس آجائے گا۔

محمد سلطان تھا۔ اسے چاہئے تھا کہ اس شخص کو اپنے دربار میں بلاتا لیکن اس نے کہا

کہ وہ اس شخص کے کمرے میں جائے گا۔ یہ محمد کے کردار کی بلندی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نور کے باپ نے نہ صرف یہ کہ تبر کے ذریعے باہر ایک پیغام پہنچایا تھا پھر خود بھی وہاں سے اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر سلطان کے پاس آگیا تھا بلکہ اس نے سلطان محمد کو شہ در کے شہی خاندان کے اندر کی بہت سی باتیں بتائی تھیں اور یہ بھی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف کیا کیا کارروائیاں کرتے اور کس طرح کیا کرتے تھے۔ یہ ساری معلومات بڑی قیمتی تھیں۔

محمد نور اور اس کے باپ کے پاس چلا گیا۔

”سلطان علی مقام!“ — نور کے باپ نے کہا — ”دربار میں آپ کے بائیں طرف ایک معزز انسان بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ سلطنت کا وزیر اعظم ہے.... کیا یہ واقعی آپ کا وزیر اعظم ہے؟“

”ہاں!“ — محمد نے کہا — ”یہ میرا وزیر اعظم ہے اور اس کا نام سعد الملک ہے... کیوں کیا بات ہے؟“

”پھر تو مجھے سوچ اور سمجھ کر بت کرنی چاہئے“ — نور کے باپ نے قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا — ”ہو سکتا ہے میری نظروں نے دھوکا کھلیا ہو لیکن....“

”نظروں نے دھوکا کھلیا ہے یا نہیں“ — محمد نے اُس کی بات کاٹ کر کہا — ”تمہیں جو بات کہنی ہے کہہ ڈالو۔ مجھے تم پر اعتماد ہے۔ کہو کیا بات ہے!“

”اگر میں غلطی پر ہوں تو معاف کر دیجئے گا“ — نور کے باپ نے کہا — ”آپ کے اس وزیر اعظم کو میں نے تین بار شہ در میں عبد الملک بن عطاش کے پاس بیٹھے دیکھا ہے۔ وزیر اعظم ہر بار رات کو وہاں پہنچا اور پوری رات عبد الملک کے ساتھ رہا تھا۔“

”اے تو میں نے بھی وہاں دیکھا تھا“ — نور جو پاس ہی بیٹھی تھی بول پڑی — ”مہمانوں کو شراب پلانا میرا کام تھا۔ میں نے اس شخص کو عبد الملک بن عطاش کے کمرے میں اس کے ساتھ بیٹھے دیکھا اور شراب پیش کی تھی اور اس نے شراب پی تھی۔“

”کیا تم یہ تینوں دن بتا سکتے ہو؟“ — محمد نے کہا — ”اگر دن یا دن نہ ہوں تو یہ تو بتا سکو گے کہ یہ کتنے کتنے وقفے کے بعد وہاں گیا تھا؟“

نور کے باپ نے کچھ سوچ کر بتایا کہ اس کی یہ تین ملاقاتیں تین تین چار چار مہینوں

کے وقت سے ہوئی تھیں۔ نور نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ سلطان محمد گہری سوچ میں کھو گیا۔

”تمہاری اطلاع غلط نہیں ہو سکتی“ — محمد نے اس طرح کہا جیسے اپنے آپ سے بات کی ہو — ”تینوں بار اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ سلطنت کے دورے پر جا رہا ہے۔ تینوں بار اس نے مختلف جگہیں بتائی تھیں اور ہر بار چند دن مَرُو سے غیر حاضر رہا تھا۔“

”اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ یہی شخص تھا“ — نور کے باپ نے کہا — ”اگر آپ مجھے اور نور کو اس کے سامنے کھڑا کر دیں تو ہم یہی بات اس کے منہ پر کہہ دیں گے۔“

”نہیں!“ — محمد نے کچھ دیر سوچ کر کہا — ”تمہارا کہنا کافی نہیں۔ اگر میرے وزیر اعظم کا تعلق درپردہ حسن بن صباح کے استلو کے ساتھ ہے تو یقیناً یہ اتنا چالاک اور عیار ہو گا کہ ثابت کر دے گا کہ تم غلط کہہ رہے ہو۔ تم کوئی ثبوت تو پیش نہیں کر سکتے۔ میں اسے کسی اور طرح پکڑوں گا.... تم دونوں کسی کو یہ پتہ نہ چلنے دینا کہ تم نے یہ بات مجھے بتائی ہے۔“

محمد اور سنجر کے باپ سلطان ملک شاہ نے خواجہ حسن طوسی کو اپنا وزیر اعظم بنایا تھا اور اسے نظام الملک کا خطاب دیا تھا۔ نظام الملک عالم فاضل انسان تھا اور سپہ سالاری کے جوہر بھی جانتا تھا۔ وہ باطنی فدائیوں کے ہاتھوں قتل ہوا تو نظام الملک کے بڑے بیٹے ابوالنضر علی کو وزیر اعظم بنایا گیا اور اسے فخر الملک کا خطاب دیا گیا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح بڑا ہی قتل اور عالم انسان تھا۔ وہ بھی فدائیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو نظام الملک کا ایک بیٹا رہ گیا تھا جس کا نام ابوالنضر تھا۔ قابلیت کے لحاظ سے وہ بھی اپنے باپ اور بڑے بھائی جیسا تھا لیکن محمد کے ہاتھ میں سلطنت آئی تو اس نے سعد الملک کو وزیر اعظم بنا دیا۔ اس شخص سے سلطان محمد کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا تھا لیکن اب اس کے متعلق یہ رپورٹ ملی کہ وہ حسن بن صباح کے استلو عبد الملک بن عطاش کے ہاں جا رہا ہے۔

سلطان محمد نے اپنے بڑے بھائی برکیارق اور چھوٹے بھائی سنجر سے بات کی۔ تینوں بھائیوں نے اپنے ایک معتمد خاص کو بلا کر مشورہ کیا اور ان سب نے ایک طریقہ سوچ لیا۔ اسی شام وزیر اعظم سعد الملک نور اور اس کے باپ کے کمرے میں گیا۔ دونوں اسے دیکھ کر گھبرا س گئے۔ یہ شخص اپنا راز چھپائے رکھنے کے لئے ان دونوں کو غائب کرا سکتا

تھا لیکن اُس نے باتیں کچھ اور کی۔

”آج کا انعام تمہیں مبارک ہو۔“ — سعد الملک نے بڑے ہی خوشگوار لہجے میں کہا — ”میں یہ کہہ کر تم پر احسان نہیں دھر رہا کہ تمہیں میرے کہنے پر انعام دیا گیا ہے۔ شہ در کی فتح ویسے ہی حاصل نہیں ہو گئی۔ تم نے مجھے دو تین بار عبد الملک بن عطاش کے پاس دیکھا ہو گا۔ تم مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہوئے ہو گے کہ میں تو سلجوقی سلطان کا وزیر اعظم ہوں۔ میں تمہیں ایک تو مبارکباد کہنے آیا تھا دوسری یہ بات کہنی تھی کہ میں وہاں جاسوس بن کر گیا تھا اور عبد الملک پر یہ ظاہر کیا تھا کہ میں درپردہ باطنی ہوں اور شیخ الجبل کے لئے کام کر رہا ہوں۔ وہ بوڑھا اپنے آپ کو بڑا جلوہ گر اور استلو سمجھتا تھا لیکن میں اُس کے دل میں اُتر گیا اور ایسے راز حاصل کر لئے جو اس کی شکست کا باعث بنے۔“

”سلطان کو تو معلوم ہو گا کہ آپ وہاں جاسوس بن کر جاتے رہے ہیں“ — نور کے باپ نے کہا — ”آپ کو تو بے انداز انعام ملنا چاہئے۔“

”نہیں!“ — سعد الملک نے کہا — ”میں نے جو کیا وہ سلطان کے لئے نہیں بلکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا تھا۔ مجھے انعام و اکرام کی ضرورت نہیں.... میں تمہیں یہ کہنے آیا ہوں کہ کبھی سلطان کے ساتھ ذکر نہ کرو تا کہ تم نے مجھے وہاں دیکھا تھا۔ میں جس مقصد کے لئے وہاں جاتا رہا ہوں وہ میں نے پایا ہے لیکن اب اُسے پتہ چلا کہ میں وہاں جاتا رہا ہوں تو میرے خلاف بڑا ہی بے بنیاد اور خطرناک شک پیدا ہو جائے گا۔“

”نہیں محترم وزیر اعظم“ — نور کے باپ نے کہا — ”ہم ایسی اونچی حیثیت کے بندے تو نہیں ہیں کہ سلطان کے ساتھ اس کے وزیر اعظم کی باتیں کریں۔ میں نے اپنی اس بیٹی کو اس بوڑھے کے بچوں سے آزاد کرانا تھا وہ کر لایا ہوں۔ اب میرے جینے کا ایک ہی مقصد ہے کہ اُس بیٹی کو کسی جوان اور معزز آدمی کے ساتھ بیاہ دوں اور خود اللہ اللہ کرتے زندگی پوری کر جاؤں۔“

”میں یہ فرض ادا کروں گا“ — سعد الملک نے کہا — ”تمہاری بیٹی کی شادی ویسے ہی آدمی کے ساتھ کروں گا جیسا تم چاہتے ہو۔ یہ میری اپنی بیٹی ہے۔“

نور کے باپ نے ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اسے انعام و اکرام اور دولت کی ضرورت نہیں، اس کی بیٹی ٹھکانے لگ جائے۔

دو دن گزر گئے۔ رات گہری ہو چکی تھی اور سعد الملک کھانے سے فارغ ہو کر اپنے خاص کمرے میں جا بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ملازم نے اسے اطلاع دی کہ ایک گھوڑ سوار آیا ہے اور اس سے ملنا چاہتا ہے۔ ملازم نے یہ بھی بتایا کہ گھوڑ سوار کی حالت اور حلیہ بتاتا ہے کہ بڑا مہاجر کر کے آیا ہے.... سعد الملک نے اسے فوراً بلوایا۔

”بہت دور سے آئے معلوم ہوتے ہو“ — سعد الملک نے اس آدمی سے کہا اور پوچھا — ”کہاں سے آرہے ہو؟“

”قلعہ ناطرو طس سے!“ — اس آدمی نے جواب دیا اور ادھر ادھر دیکھا جیسے وہ کوئی راز کی بات کہنا چاہتا ہو — ”امام کے پیرو مُرشد عبد الملک بن عطاش نے بھیجا ہے... کیا میں یہاں کھل کر بات کر سکتا ہوں؟“

”ضرور کرو“ — سعد الملک نے کہا — ”اوپنی آواز میں نہ بولنا.... کیا پیرو مُرشد ابھی ناطرو طس میں ہی ہیں؟“

”ایک دو دنوں بعد وہاں سے اَلْمَوْتَ چلے جائیں گے“ — اس آدمی نے کہا — ”انہوں نے آپ کو یہ پیغام دیا ہے کہ اب آپ آسانی سے اور بے خطر شاہ در جا سکتے ہیں کیونکہ اب شاہ در آپ کی سلطنت میں آگیا ہے اور آپ اس سلطنت کے وزیر اعظم ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ اپنے کچھ آدمی پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ آپ وہاں جائیں گے تو یہ آدمی خود ہی آپ کو مل جائیں گے۔ پیرو مُرشد نے کہا ہے کہ محمد اور سخر کو جلدی ختم کرنا ہے لیکن یہ آپ نہیں کریں گے بلکہ یہ شاہ در کے آدمی کریں گے۔“

”ان آدمیوں کے نام جاننے ہو؟“ — سعد الملک نے پوچھا۔

”نہیں!“ — اس آدمی نے مسکرا کر کہا — ”کیا آپ جانتے نہیں کہ نام نہیں بتائے جاتے؟ میں یہاں زیادہ نہیں رکوں گا۔ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ یہاں اپنا کوئی آدمی ہے تو آپ اسے یقیناً جانتے ہوں گے۔ مجھے اس کے گھر کا راستہ بتادیں یا وہاں تک پہنچانے کا کوئی بندوبست کر دیں۔ میں کل علی الصبح واپس چلا جاؤں گا۔“

”ایک نہیں یہاں اپنے تین آدمی ہیں“ — سعد الملک نے کہا — ”میں تمہیں ان میں سے ایک کے گھر پہنچا دوں گا۔“

سعد الملک نے ایسی باتیں کیں جن سے صاف پتہ چل گیا کہ یہ شخص باطنی ہے اور باطنیوں کے لئے ہی کام کر رہا ہے۔ اُس نے اس آدمی کو ایک گھر کا پتہ اور راستہ سمجھا دیا

اور کہا کہ نہ وہ خود اس کے ساتھ جاسکتا ہے نہ کسی ملازم کو بھیج سکتا ہے کیونکہ اس سے اس کے خلاف شک پیدا ہو جائے گا۔

”اب میری بات غور سے سن لو“ — سعد الملک نے کہا — ”دروازے پر تین بار دستک دینا اندر سے آواز آئے گی کون ہے۔ تم نے کہنا ہے، ملک الملک۔ پھر دروازہ کھلے گا اور اندر جا کر بتانا کہ تم کہاں سے آئے ہو اور یہاں تک کس طرح پہنچے ہو۔“



صبح سعد الملک حسب معمول اپنے دفتر گیا۔ پہلے سلطان محمد سے ملا اور معمول کے مطابق کچھ باتیں کیں اور اپنے روزمرہ کام میں لگ گیا۔ اس نے سلطان محمد کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی سوائے اس کے کہ سلطان اس صبح پہلے سے کچھ زیادہ ہی مسکرا کر باتیں کرتا تھا۔

آدھا دن گزر گیا تو محمد نے سعد الملک کو بلوایا۔ سعد الملک سلطان کے دفتر والے کمرے میں داخل ہوا تو ٹھٹھک کر رک گیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ سلطان اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے پاس ایک تو نور بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ نور کا باپ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک طرف وہ آدمی کھڑا تھا جو رات اس کے پاس گیا تھا اور عبد الملک بن عطاش کا پیغام دیا تھا۔ اس کے ساتھ تین آدمی زنجیروں میں جکڑے کھڑے تھے۔

”آگے آؤ سعد الملک!“ — محمد نے اسے کہا — ”ڈرو مت۔ یہ سب تمہارے اپنے آدمی ہیں اور انہیں تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ سب تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ تین آدمی جو زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں، وہ آدمی ہیں جو اس مکان میں رہتے تھے جہاں تم نے اس آدمی کو بھیجا تھا۔ ہم نے رات کو ہی انہیں اُس مکان پر چھاپہ مار کر پکڑ لیا تھا۔“

سعد الملک پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کی زبان بالکل ہی بند ہو گئی تھی۔

”اور ان دونوں کو تو تم اور زیادہ اچھی طرح جانتے ہو“ — سلطان محمد نے نور اور اُس کے باپ کی طرف اشارہ کر کے کہا — ”اس لڑکی کے ہاتھوں تو تم نے کئی بار شراب بھی پی ہے۔ اسے تو تم کبھی بھی بھول نہیں سکو گے۔ یہ تمہارے پیر و مرشد کی بیوی تھی.... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”میں وہاں جاسوسی کے لئے جاتا رہا ہوں“ — سعد الملک نے لڑکھاتی ہوئی آواز

میں کہا۔ اس سے آگے وہ بول نہ سکا۔

”تم نے کبھی مجھے راز کی کوئی بات تو بتائی نہیں تھی“ — محمد نے کہا — ”تم وہ سانپ ہو جس نے اس سلطنت کی آستین میں پرورش پائی ہے اور اس سلطنت کو ڈنک مارا ہے۔ کیا تم نے دیکھ نہیں لیا کہ فتح حق کی ہوا کرتی ہے، باطل کی نہیں؟ میں تمہارا یہ جھوٹا من بھی لوں کہ تم وہاں جاسوسی کے لئے جاتے رہے ہو تو تمہارے پاس اس کا کیا جواز ہے کہ تم ان تین فداؤں کو جانتے تھے اور انہیں گرفتار نہیں کیا بلکہ میرے ایک جاسوس کو اپنا آدمی سمجھ کر ان کے پاس رات بسر کرنے کے لئے بھیجا.... اب سزا کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

اگلی صبح گھوڑوں کے میدان میں سلطنت کے تمام تر لشکر کو ایک ترتیب میں کھڑا کیا گیا۔ شہری بھی تماشہ دیکھنے آگئے۔ کچھ دیر بعد سعد الملک اور تین فداؤں کو جنہیں ان کے مکان سے گرفتار کیا گیا تھا، میدان میں لایا گیا اور لشکر کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد سلطان محمد، اس کا چھوٹا بھائی سخر اور ان کا بڑا بھائی برکیارق اپنے تین چار بڑے حاکموں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار وہاں آگئے۔ باقی سب نے گھوڑے پیچھے روک لئے۔ محمد آگے چلا گیا اور ان مجرموں کے قریب جا گھوڑا روکا۔

”تم سب اپنے وزیرِ اعظم کو بیڑیوں میں بندھا ہوا دیکھ کر حیران ہو رہے ہو گے“ — سلطان محمد نے اپنے لشکر سے خطاب کیا — ”یہ شخص جسے میں نے وزیرِ اعظم بنایا تھا، درپردہ حسن بن صباح کا کام کرتا رہا ہے اور شاہِ در کی فتح سے پہلے چوری چھپے وہاں حسن بن صباح کے استاد عبد الملک بن عطاش کے پاس جاتا رہا ہے۔ اس سے یہ اُگلوانا ممکن نہیں کہ اس کے حکم سے یا اس کے ہاتھوں ہمارے کتنے آدمی قتل ہو چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ اس نے ہمارے بہت سے آدمی قتل کروائے ہیں۔ یہ سانپ میری آستین میں پلتا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ باپ اپنے بیٹے پر بیٹا اپنے باپ پر، ماں اپنی بیٹی پر اور بیٹی اپنی ماں پر اعتماد نہ کرے لیکن میں یہ صورت پیدا نہیں ہونے دوں گا۔ میں ہر کسی کو صاف لفظوں میں بتا رہا ہوں کہ ہم نے شاہِ در فتح کر لیا ہے تو اب ہم قلعہ الموت بھی لے لیں گے اور اس باطل فرقے کا قلع قمع کر کے ہی رہیں گے۔ اپنا جرم اپنے ساتھیوں سے چھپایا جاسکتا ہے لیکن مت بھولو کہ اللہ کی ذات بھی موجود ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ گناہگاروں کو پکڑ لیا کرتا ہے۔ یہ گناہگار سعد الملک اپنے ان

تین قاتل فدائیوں کے ساتھ پکڑا گیا ہے اور آج اسے سزائے موت دی جا رہی ہے۔
 سلطان محمد نے جلادوں کو اشارہ کیا۔ جلاد آگے آئے اور ان چاروں کو ایک
 دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑا کر کے انہیں آگے کو جھکا دیا اور ایک ہی بار
 چاروں کی تلواریں حرکت میں آئیں اور چار سر جسموں سے کٹ کر مٹی میں جا پڑے۔
 تمام مَورخوں نے لکھا ہے کہ سعد الملک ایسا ڈھکا چھپا رہا تھا کہ کسی کو ذرا سا بھی
 شک نہ ہوا۔ اسے سزائے موت دی گئی اور وہیں سلطان محمد نے اعلان کیا کہ اب
 سلطنت کا وزیر اعظم نظام الملک خواجہ حسن طوسی کا چھوٹا بیٹا ابو نصر احمد ہو گا۔
 ابو نصر احمد اپنے باپ اور بڑے بھائی کی طرح عالم فاضل تھا اور سلطنت کے امور کو
 بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُس نے وہیں اعلان کر دیا کہ میں اب قلعہ الموت پر فوج کشی
 کروں گا اور اس کی قیادت بھی میں خود کروں گا۔ جس طرح ہم نے شہ در فتح کر لیا ہے
 اسی طرح ہم الموت کا قلعہ بھی لے لیں گے۔
 لشکر سے بکسیر کے نعرے بلند ہونے لگے اور ان نعروں سے زمین و آسمان ہل رہے
 تھے۔

محمد نے قلعہ شاہ در فتح کر کے احمد بن عطاءش کی یہ شرط مان لی تھی کہ وہ اس کا سلطان خاندان اور شہر کے جتنے لوگ شہر سے جانا چاہتے ہیں، انہیں قلعہ ناظروطس جانے کی اجازت دے دی جائے۔ یہ دراصل شرط نہیں بلکہ ایک درخواست تھی جو ایک بارے ہوئے حاکم قلعہ نے سلطان محمد کے آگے پیش کی تھی۔

سلطان محمد نے یہ درخواست قبول کر کے بڑی غلطی کی تھی۔ اگر وہ یہ درخواست قبول نہ کرتا تو تاریخ کا رخ بدل جاتا لیکن سلطان محمد پر فتح کی خوشی اس حد تک طاری ہو گئی تھی کہ اس نے بادشاہوں والی فیاضی کا مظاہرہ کیا اور ان سانپوں اور بچھوؤں کو اجازت دے دی کہ وہ زندہ رہیں اور جہاں جانا چاہتے ہیں وہاں چلے جائیں۔

اس درخواست میں یہ بھی تھا کہ شہر سے جانے والے آدھے لوگ ناظروطس جائیں گے اور باقی قلعہ الموت جائیں گے۔ ان دونوں گروہوں کو سلطان محمد مسلح حفاظت دے جو انہیں وہاں تک پہنچا دے۔ سلطان محمد نے یہ درخواست بھی قبول کر لی۔ شاہ در سے جو لوگ جا رہے تھے انہیں غیر مسلح کر دیا گیا تھا یعنی وہ نہتے تھے۔ انہوں نے اس خطرے کا اظہار کیا تھا کہ راستے میں ان پر قافلے لوٹنے والوں کا حملہ ہو سکتا ہے یا کوئی اور مصیبت ان پر نازل ہو سکتی ہے۔

پہلے سنایا جا چکا ہے کہ شاہ در کی فتح کوئی معمولی فتح نہیں تھی بلکہ اس فتح کی اہمیت ایسے تھی جیسے حسن بن صباح کی پیٹھ میں خنجر اتار دیا گیا ہو۔ قلعہ الموت کے بعد بالفنیوں کا دوسرا مضبوط اور خطرناک شاہ در تھا۔ اس فتح کی خبر دار الحکومت میں پہنچانے کے لئے تیز رفتار قاصد روانہ کر دیئے گئے تھے۔ یہ خبر قلعہ دسم کوہ میں سالار اور یزی تک

بھی پہنچ گئی۔ اُس وقت منزل آندری شدید زحمتی حالت میں پڑا تھا۔ پھر یہ خبر حسن بن صباح تک بھی پہنچی اور کچھ دنوں بعد شاہ در کے وہ لوگ جو قلعہ الموت جانا چاہتے تھے، وہ بھی اُس کے پاس پہنچ گئے۔

عبد الملک بن عطاش کو راستے میں اطلاع مل گئی تھی کہ اُس کے چھوٹے بھائی احمد بن عطاش اور اُس کے بیٹے اور اُس کے 80 باطنی فدائیوں کو مرو میں قتل کر دیا گیا ہے۔ عبد الملک کو یہ اطلاع اُن جاسوسوں نے پہنچائی تھی جو مرو میں موجود تھے۔

عبد الملک کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ یہ صدمہ اس کے لئے کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا۔ ویسے بھی عبد الملک بوڑھا آدمی تھا اور اس میں قوتِ برداشت کم ہو گئی تھی۔ پھر اُسے یہ اطلاع بھی ملی کہ احمد بن عطاش کی بیوی نے اپنے خاوند کی یہ خبر سن کر کہ اسے جلاؤ کے حوالے کر دیا گیا ہے، ایک بلند مکان سے چھلانگ لگا کر خود کشی کر لی ہے۔ عبد الملک کے لئے یہ دو سرا صدمہ تھا۔

عبد الملک بن عطاش قلعہ ناعروطس میں پہنچا۔ یہ قلعہ اصفہان کے قریب ہی تھا۔ عبد الملک نے دو ایلیچی اور کچھ اور آدمی اصفہان بھیجے۔ اصفہان میں باطنیوں کے جو جاسوس تھے، انہوں نے عبد الملک کو یہ خبر دے دی تھی کہ سلطان محمد اس وقت اصفہان میں ہے اور کچھ دنوں بعد اپنے دار الحکومت مرو چلا جائے گا۔ عبد الملک نے سلطان محمد کی طرف ایلیچی اس درخواست کے ساتھ بھیجے تھے کہ اس کے چھوٹے بھائی احمد اور احمد کے بیٹے اور احمد کی بیوی کی لاشیں دے دی جائیں۔

احمد اور اس کے بیٹے کی لاشیں ایک ہی گڑھے میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی گئی تھی۔ دونوں کے سر کاٹ کر بغداد خلیفہ کے پاس بھیج دیئے گئے تھے۔ احمد کی بیوی کوں آدمیوں نے جو اس کے ساتھ تھے، باقاعدہ دفن کیا تھا۔ عبد الملک کے ایلیچی سلطان محمد کے پاس پہنچے تو سلطان محمد نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ ان تینوں کی لاشیں نکال کر لے جائیں۔

ایک روز یہ تین لاشیں قلعہ ناعروطس پہنچ گئیں۔ عبد الملک نے جب دیکھا کہ اس کے بھائی اور بھائی کے بیٹے کی لاشیں بغیر سروں کے ہیں تو اُس پر غشی طاری ہونے لگی۔ وہ اپنا کلا جادو اور شعبہ بازی بھول ہی گیا۔ اُس کی تو کمر ہی دو ہری ہو گئی۔ ان تینوں لاشوں کو احرام کے ساتھ دفن کیا گیا۔

عبد الملک بن عطاش حسن بن صباح کا استلا اور پیرو مُرشد تھا۔ مختلف مؤرخوں نے مختلف رائے دی ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح سر تاپا اندر اور باہر سے ابلیس تھا۔ اُس نے اپنے اس پیرو مُرشد اور استلا کو بھی دھوکے دیئے تھے اور کوشش یہ کی تھی کہ اسے اتنی اہمیت اور مقبولیت نہ ملے جتنی اسے حاصل ہو گئی تھی، یہاں تک کہ بعض لوگ حسن بن صباح کو امام ہی نہیں نبی بھی کہنے لگے تھے۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے عبد الملک کے ساتھ پوری وفاداری کی تھی۔ ذہنی طور پر حسن بن صباح عبد الملک کو پیر استلا مانتا تھا اور جب اسے یہ اطلاع ملی کہ عبد الملک شاہ در سلجوقیوں کو دے کر قلعہ ناظروطیس میں آگیا ہے اور اس کے چھوٹے بھائی کو اور بھائی کے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے تو اس نے ضروری سمجھا کہ قلعہ ناظروطیس جا کر اپنے استلا کی دلجوئی کرے۔

حسن بن صباح جب قلعہ الموت سے ناظروطیس کے سفر کو روانہ ہوا تو یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا کا بادشاہ یہی اکیلا شخص ہو۔ اس کے لئے ایسی پاکلی تیار کی گئی تھی جسے بیس آدمی اٹھاتے تھے۔ دس آگے اور دس پیچھے۔ پاکلی کے پردے خالص ریشم کے تھے اور باقی پاکلی کنواب سے تیار کی گئی تھی۔ اس کے اندر بڑے ہی نرم گدے اور گاؤ تکتے رکھے گئے تھے۔ حسن بن صباح کے ساتھ اس پاکلی میں اس کی جنت کی دو حُوریں بھی تھیں جو اُس کی مٹھی چا پی کرتی جا رہی تھیں۔ اُس وقت حسن بن صباح بوڑھا ہو چکا تھا۔ تقریباً "بیس فدائی تلواروں اور برہمیوں سے مسلح اُس کے آگے جا رہے تھے۔ بیس پیچیس دائیں طرف اور اتنے ہی بائیں طرف اور اتنے ہی اس کے پیچھے تھے۔ یہ سب گھوڑوں پر سوار تھے اور ان کے لباس بڑے ہی دلکش اور دل فریب تھے۔ اس کے پیچھے اونٹوں پر سلمان تھا اور اس سلمان میں خورد و نوش کی وہ اشیاء تھیں جو جنت میں ہی کسی کو مل سکتی ہوں گی۔ ان اونٹوں کے ساتھ ساتھ اور کچھ پیچھے سوڈیڑھ سواروں کا گروہ تھا۔ وہ بھی سب کے سب مسلح تھے۔

حسن بن صباح کا یہ قافلہ جب پہلا پڑاؤ کرنے لگا تو فدائیوں نے اُس جگہ کو حصار میں لے لیا۔ اس کے لئے زمین پر نرم و گداز گدے بچھادیئے گئے اور ارد گرد ریشم کے پردے تن دیئے گئے۔ باہر کا کوئی آدمی اُس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس

فخص نے مسلمانوں کے خون کے دریا بہا دیئے تھے۔ اس نے نہایت اہم اور تاریخ ساز شخصیتوں کو قتل کروا دیا تھا۔ سینکڑوں قافلے اس کے اشارے پر ٹوٹے گئے تھے۔ قافلوں کے ساتھ جو کسمن اور جوان بچیاں تھیں وہ اغوا کی گئی تھیں اور انہیں جنت کی حوریں بنایا گیا تھا۔ اب اس فخص کو ہر لمحہ اپنی جلن کا غم لگا رہتا تھا۔ اسے کوئی ملنے کے لئے جاتا تو اس کے پاس جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی اور اگر کسی کو اجازت مل بھی جاتی تو اُس کی جگہ تلاشی بڑی سختی سے کی جاتی تھی۔

دو ہزاؤ کے بعد جب حسن بن صباح کا قافلہ ناعروطس کے قریب پہنچا تو قافلے کا ایک سوار گھوڑا دوڑاتا قلعے میں پہنچا اور عبد الملک کو اطلاع دی کہ شیخ الجبل امام حسن بن صباح کی سواری آرہی ہے۔ یہ خبر قلعے میں فوراً پھیل گئی۔ ان تمام باطنیوں کو جو وہاں موجود تھے خوشیاں منانی چاہئے تھیں کہ شیخ الجبل ان کے ہاں آرہا ہے لیکن سب پر موت کی مُردنی چھا گئی اور ان کے سر جھک گئے۔ وہ سب شکست خوردہ تھے۔ شاہ درجیسا قلعہ سلجوقیوں کو دے آئے تھے۔ عبد الملک کے تاثرات کچھ اور تھے۔ غموں نے اور بڑھاپے نے اُسے جھکا دیا تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ قلعے کے تمام لوگ قلعے سے باہر جا کر راستے میں دونوں طرف کھڑے ہو جائیں اور اپنے ہمام کا استقبال کریں۔

آخر حسن بن صباح کی سواری قلعے تک پہنچی اور قلعے کے لوگ دونوں طرف کھڑے بازولہرا لہرا کر نعرے لگا رہے تھے۔

”بند کرو یہ نعرے!“ — پالکی میں سے حسن بن صباح کی آواز گرجی — ”ان ہارے ہوئے بزدلوں کو کیا حق ہے کہ وہ زندہ باد اور مُردہ باد کے نعرے لگائیں.... انہیں کو خاموش رہیں۔“

اُس کا یہ حکم لوگوں تک پہنچا دیا گیا اور وہاں موت کا سکوت طاری ہو گیا۔ عبد الملک بن عطاش اُس کے استقبال کے لئے دروازے تک نہ آیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد حسن بن صباح اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ عبد الملک نے انھنے کی کوشش کی لیکن حسن بن صباح نے آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور اسے انھنے نہ دیا۔ عبد الملک کے آنسو جاری ہو گئے اور کچھ دیر بعد وہ رُسکنے لگا۔ حسن بن صباح اس کے پاس بیٹھ گیا اور اُسے تسلیاں دینے لگا۔

”ابن صباح!“ — عبد الملک نے کچھ دیر بعد کہا — ”تم لوگوں کو دھوکے میں قتل

کروانا جانتے ہو لیکن قلعوں کے دقلع کا تمہیں کوئی خیال نہیں۔ ہمیں ایک باقاعدہ فوج تیار کرنی چاہئے ورنہ تم دیکھ لینا ایک روز قلعہ الموت بھی ہم سے چھین جائے گا۔

”پیر و مرشد!“ — حسن بن صباح نے پُر اعتماد لہجے میں کہا — ”وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔ البتہ اُس وقت کا انتظار کریں جب سلجوقیوں کی سلطنت ہمارے قدموں کے نیچے ہوگی اور یہ سلطان اور ان کے خاندان ہمارے قیدی ہوں گے۔ میں جانتا ہوں آپ پر احمد اور اس کے بیٹے کا اور اس کی بیوی کا غم حاوی ہو گیا ہے۔ شاہ در ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو اس کا اتنا غم نہ کریں۔ ہمیں قلعوں کی نہیں لوگوں کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں۔“

”ہوش میں آہن صباح!“ — عبد الملک نے کہا — ”میں نے تجھے شیخ الجبل اور امام بنایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تو اپنی طاقت اور مقبولیت کا اندازہ بڑا غلط لگا رہا ہے۔ خوش فہمیوں سے نکل۔ اگر ہمارا یہی حل رہا تو ہمارا فرقہ سُکڑ سٹ کر صرف ہم تک رہ جائے گا۔ سلجوقیوں کو ہم پر یہ پہلی فتح حاصل ہوئی ہے، یہ کوئی معمولی فتح نہیں۔ ہم شاہ در کو ناقابلِ تسخیر سمجھتے تھے لیکن اہل سنت سلجوقیوں کے ہاتھ میں بھی کوئی طاقت آگئی ہے۔ میں نے اپنا وہ جادو چلایا جو کبھی ناکام نہیں ہوا تھا لیکن میں نے اُلُو چھوڑا تو سلجوقیوں کے تیر اندازوں نے اسے تیروں سے گرا لیا۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ سلطان محمد کو کسی طرح پہلے پتہ چل گیا تھا کہ قلعے کے اندر سے ایک اُلُو اڑے گا جو پورے لشکر پر اڑ کر واپس آجائے گا لیکن اُلُو اڑا اور تیر اندازوں نے اُسے گرا لیا.... بتاؤ، میں کیا سمجھوں!“

”نہیں پیر و مرشد!“ — حسن بن صباح نے کہا — ”میں اس شکست کو فتح میں بدل کر دکھا دوں گا۔ آپ اس صدمے کو اپنے اندر جذب کر لیں اور میری رہنمائی اسی طرح کرتے رہیں جس طرح کرتے رہے ہیں.... یہ بتائیں آپ وہاں کیا چھوڑ آئے ہیں؟“

”میں وہاں جانباز قسم کے فدائی چھوڑ آیا ہوں“ — عبد الملک نے کہا — ”وہ عقل اور ہوش والے ہیں۔ وہ کسی کو یوں قتل نہیں کریں گے کہ قتل کیا اور خود کشی کر لی۔ میں انہیں پوری ہدایات دے کر آیا ہوں۔ وہ مسجدوں میں امام بنیں گے۔ بچوں کو قرآن اور احادیث کی تعلیم دیں گے اور وہ زندگی کے ہر شعبے میں معزز افراد کی حیثیت سے رہیں گے۔ میں زیادہ کیا بتاؤں، وہ بڑے ہی زہریلے سانپ ہیں جو میں شاہ در میں

چھوڑ آیا ہوں۔ وہ ان سلجوقیوں کو ایسے ڈنک ماریں گے کہ وہ شاہ در سے بھاگ جائیں گے.... مجھے جگہ اور شکوہ تم سے ہے کہ ہم اتنا زیادہ عرصہ محاصرے میں رہے کہ نہ جانے کتنے چاند طلوع ہوئے اور ڈوب گئے لیکن تم سے اتنا بھی نہ ہوا کہ کچھ فدائی بھیج دیتے جو سلطان محمد اور اس کے سالاروں کو اسی طرح قتل کر دیتے جس طرح وہ پہلے قتل کرتے چلے آئے ہیں۔“

”مجھے محاصرے کی اطلاع مل گئی تھی“ — حسن بن صباح نے کہا — ”میں نے دس منتخب فدائی بھیج دیئے تھے جنہوں نے سلطان محمد اور اس کے سالاروں وغیرہ کو قتل کرنا تھا لیکن آپ سن کر حیران ہوں گے کہ ان دس فدائیوں کا کچھ پتہ ہی نہ چلا کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ آخر کچھ عرصے بعد یہ اطلاع ملی کہ ان دس کی لاشیں جنگل میں پڑی ہیں اور انہیں جنگل کے درندے کھا چکے ہیں۔“

”تم نے ابھی نقصان کا اندازہ نہیں کیا ابن صباح!“ — عبد الملک نے کہا — ”ہماری آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں جو دوست اور قیمتی اشیاء قاتلوں سے ملتی تھیں، وہ اب نہیں مل سکیں گی۔ شاہ در بڑی موزوں جگہ تھی۔ میں نے جو آخری قافلہ لٹوایا تھا، اس سے ہمیں بے شمار دولت ملی تھی۔ میں شاہ در میں بے انداز خزانہ چھوڑ کر آیا ہوں۔ میں سمجھ نہیں سکتا وہ خزانہ وہاں سے کس طرح نکلوا سکتا ہوں۔“

”وہ خزانہ کہاں ہے؟“

”وہ میں نے ایسی جگہ چھپالیا تھا جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا“ — عبد الملک نے جواب دیا — ”شاہ در میں اپنے جو آدمی چھوڑ آیا ہوں، اُن میں ایک یا دو آدمی اس جگہ سے واقف ہیں۔ میں ذرا سنبھل لوں تو یہاں سے آدمی بھیجوں گا جو وہ خزانہ نکالنے کی کوشش کریں گے.... یہ بعد کی باتیں ہیں ابن صباح! فوری طور پر کرنے والا کام یہ ہے کہ فوج تیار کرو۔ اگر نہیں کرو گے تو قلعہ الموت بھی خطرے میں رہے گا۔ مت بھولو کہ سلجوقیوں کے حوصلے اس فتح سے بلند ہو گئے ہیں اور ان کے لئے یہ معمولی فتح نہیں کہ انہوں نے احمد کو مزائے موت دی ہے۔“

یہ اُس دور کا واقعہ ہے جب حسن بن صباح کی ابلیسیّت ایک پُرکشش اور پُر اثر عقیدے کی شکل میں دُور دُور تک پھیل گئی تھی اور اس کے اثرات سلجوقی سلطنت میں

داخل ہو چکے تھے۔ یہ ایک ایسا سیلاب تھا جو زمین کے نیچے نیچے آیا تھا اور لوگ شیخ الجبل کو نبی تک ماننے پر اتر آئے تھے۔ سلجوقی سلاطین کے مومن تھے اور وہ اہل سنت والجماعت بھی تھے۔ وہ دل اور روح کی گہرائیوں سے اس فتنے کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے اور سرگرم عمل بھی تھے لیکن یہ فتنہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ایک بڑی پرانی کتاب — ”تاریخ آل سلجوقی اصفہانی“ — میں یہ سراغ ملتا ہے کہ سلجوقی سلاطین میں وہ کون سی کمزوری تھی جس نے باغیوں کو اپنے باطل عقیدے پھیلانے کا موقع مل گیا۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کا جاسوسی کا نظام بڑا ہی کارگر ہوا کرتا تھا۔ مسلمانوں کے جاسوس کفار کے درمیان موجود رہتے تھے اور پل پل کی خبر پیچھے بھیجتے تھے لیکن سلطان ملک شاہ کے باپ الپ ارسلان نے یہ محکمہ نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر توڑ دیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ مسلمانوں کے جاسوس واپس آ گئے۔

الپ ارسلان کو جاسوسوں کی ضرورت نہیں رہی تھی اور اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ابھی حسن بن صباح کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ حسن بن صباح سلطان ملک شاہ کے دور میں اٹھا تھا۔ سلطان ملک شاہ نے بھی جاسوسی کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسن بن صباح کے جاسوس ہی نہیں بلکہ اس کے تخریب کار بھی مسلمانوں میں آ گئے اور انہیں کوئی بھی پہچان نہ سکا۔ انہوں نے نفسیاتی تخریب کاری بھی کی اور نظریاتی بھی اور اس کے بعد انہوں نے اہم شخصیتوں کے قتل کا سلسلہ شروع کر دیا۔

یہ تھی مسلمانوں کی وہ کمزوری جس سے باطنی فرقے نے فائدہ اٹھایا۔ سلطان ملک شاہ کے وزیر اعظم نظام الملک خواجہ حسن طوسی نے شدت سے محسوس کیا کہ جاسوسوں کے بغیر دشمن پر کاری ضرب نہیں لگائی جاسکتی۔ سلطان ملک شاہ نظام الملک کا تو مرید تھا اور وہ اس کی رہنمائی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا کرتا تھا۔ نظام الملک نے جاسوسی کا نظام از سر نو قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور سلطان ملک شاہ نے اسے فوراً تسلیم کر لیا۔

ابتداء میں مسلمان جاسوسوں کو بہت ہی دشواریوں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑا۔ حسن بن صباح کے جاسوس انہیں فوراً پہچان لیتے تھے۔ مڑل آفندی کی مثل پہلے تفصیل سے سنائی جا چکی ہے۔ مڑل حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا لیکن واپس یہ ارادہ لے کر آ گیا کہ وہ سلطان ملک شاہ اور نظام الملک کو قتل کرے گا۔ یہ حسن بن صباح کے ایک

خاص نظام کا مکمل تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے جاسوس کامیابیاں حاصل کرنے لگے لیکن ابھی تک ان کا یہ نظام کمزور تھا۔ اب شاہ در کے محاصرے کے دوران نور کے باپ نے تیر کے ذریعے پیغام باہر بھیجا تو سلطان محمد نے سوچا کہ یہ تو اللہ کی خاص نوازش تھی کہ ایک آدمی کے دل میں باغیوں کے خلاف عتلا بھرا ہوا تھا اور اُس نے سلطان محمد کی مدد کی تو کیوں نہ ان باغیوں میں اپنے جاسوس چھوڑ دیئے جائیں جو ذرا اسی بھی باتیں آکر بتاتے رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنے چھوٹے بھائی سخر کو شاہ در بھیجا تھا اور اسے خاص طور پر کہا تھا کہ اس شہر میں جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں وہ بظاہر بے ضرر سے لگتے ہیں لیکن ان میں فدائی اور حسن بن صباح کے خاص جاسوس اور تخریب کار یقیناً ہوں گے۔ سلطان محمد نے سخر سے کہا تھا کہ وہ باغیوں کے بہروپ میں اپنے جاسوس شاہ در بھیج دے گا۔

یہ صحیح ہے کہ سلجوقیوں نے باغیوں کے ہاتھوں بہت ہی نقصان اٹھایا تھا۔ سلجوقیوں نے حوصلہ ہارنے اور مایوس ہونے کی بجائے اپنا جہاں اس باطل کے خلاف جاری رکھا۔ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ بدی کے خلاف لڑنے والوں کی مدد اللہ یقیناً کیا کرتا ہے۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ حسن بن صباح کے بھیجے ہوئے دس فدائی جنہوں نے سلطان محمد اور اس کے سلاہوں کو قتل کرنا تھا، خود قتل ہو گئے۔ یہ بھی تو ایک معجزہ تھا کہ عبد الملک کے کالے جالو کو اس کے اپنے ہی قاتل اعتمو ملازم نے ضائع کر دیا۔ وہ جو پیغام تیر کے ساتھ بندھا ہوا باہر آیا، وہ یوں تھا جیسے آسمانوں سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے پھینکا ہو۔ حسن بن صباح اپنے پیر و مرشد عبد الملک بن عطاش کو تسلیاں دے کر اور اس کا حوصلہ مضبوط کر کے واپس الموت چلا گیا۔



سخر شاہ در پہنچ گیا تھا۔ اُس نے پہلا کلام یہ کیا کہ شاہ در کی جو آبادی پیچھے رہ گئی تھی اسے ایک میدان میں اکٹھا کر لیا۔ زیادہ تر آبادی یہاں سے چلی گئی تھی۔ پیچھے جو لوگ رہ گئے تھے، ان کی تعداد پانچ چھ ہزار تھی۔ جانے والے سب باطنی تھے اور جو پیچھے رہ گئے تھے، وہ بھی باطنی تھے لیکن کچھ تعداد مسلمانوں کی بھی تھی۔ سخر نے اس آبادی کے صرف مردوں ہی کو باہر اکٹھا نہ کیا بلکہ عورتوں اور بچوں کو بھی ان کے ساتھ بلوایا۔

بانیوں کے چہروں پر خوف و ہراس نمایاں تھا۔ عورتوں پر تو خوف زدگی طاری تھی۔ ان کی آنکھیں ٹھہری ٹھہری تھیں اور چہروں پر گھبراہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ ان میں جواں سال اور بڑی اچھی شکل و صورت کی عورتیں بھی تھیں۔ ان میں کسن اور نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔ اصل خطرہ تو انہیں تھا۔ اُس زمانے میں فاتح فوج مفتوحہ شہروں کی عورتوں سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا کرتی تھی۔ ان لوگوں کے چہروں پر بھی یہی خوف نظر آ رہا تھا کہ نہ جانے اب انہیں کیا سزا ملے اور ان کی بیٹیوں کے ساتھ کیا سلوک ہو۔

سلجوقی فوج کی کچھ نفری اس ہجوم کے ارد گرد کھڑی کر دی گئی تھی اور فوج کی باقی نفری قلعہ مسمار کر رہی تھی۔

سخر گھوڑے پر سوار وہاں آیا اور اُس نے پہلے سارے مجمع کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھ لیا۔ لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔

”تم لوگ ڈرے ڈرے سے کیوں لگتے ہو؟“ — سخر نے کہا — ”کیا تم مجھے اور اس فوج کو اجنبی اور غیر سمجھتے ہو؟.... ہم نے نہ کوئی قلعہ فتح کیا ہے اور نہ ہی تم لوگوں کو فتح کیا ہے۔ میری ایک بات اچھی طرح سن لو۔ نہ میں فاتح ہوں نہ تم مفتوح ہو۔ ہم نے صرف یہ فتح حاصل کی ہے کہ اس شہر سے باطل کو نکل دیا ہے۔ کیا تم خوش نہیں ہو گے کہ جن لوگوں نے تمہیں اللہ کی راہ سے ہٹا کر کفر کی راہ پر ڈالا تھا وہ مارے گئے ہیں یا یہاں سے جا چکے ہیں؟.... تمہارے دوسرے خوف سے بھی میں واقف ہوں۔ تم ان لڑکیوں کے لئے یقیناً ”پریشان“ ہو رہے ہو۔ ہم یہاں ان کی عزت کے ساتھ کھینے نہیں بلکہ ان کی عزت کی حفاظت کرنے آئے ہیں۔ اپنی بیٹیوں سے کہو کہ یہ تمہارا اپنا شہر ہے، اس کی گلیوں میں بے خوف و خطر گھومو پھرو اور اگر تمہاری عزت پر فوج کا کوئی آدمی یا کوئی اور ہاتھ ڈالتا ہے تو میرے دروازے ہر کسی کے لئے کھلے ہیں۔ میں فریاد سنوں گا اور اس آدمی کو تمہارے سامنے جلاد کے حوالے کروں گا....“

”بڑے لمبے عرصے تک تم محاصرے میں رہے ہو۔ تم پر پتھر برستے رہے ہیں اور تم پر آگ بھی برستی رہی ہے۔ تم مجھے اور میری فوج کو دل ہی دل میں کوس رہے ہو گے اور بددعائیں دے رہے ہو گے کہ ہم نے تم پر پتھر برسائے اور آگ بھی برسائی اور تمہارے کئی گھر جلادئے ہیں لیکن سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس شہر پر یہ پتھر اور آتش تیر اللہ نے

برسائے۔ ہم تو اس کا ایک سبب بنے تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟.... صرف اس لئے کہ تمہیں اللہ کے راستے سے ہٹایا گیا اور تم نے اسی کو دین اور مذہب سمجھ لیا۔ یہاں شیطان کی حکمرانی رہی ہے۔ یہ تمہارا الم جیسے تم نبی بھی مانتے ہو، کہاں ہے؟.... یہ امام کا پیرو مُرشد جسے تم یوں مانتے تھے جیسے وہی تمہیں اگلے جہان جنت میں داخل کرے گا، وہ شکست کھا کر بھاگ گیا ہے۔“

سجّر نے انہیں سنایا کہ عبدالملک بن عطاش جسے وہ پیرو مُرشد سمجھتے رہے ہیں، کالے جادو میں یقین رکھتا تھا اور اس نے محاصرہ توڑنے کے لئے کالا جادو استعمال کیا تھا اور ایک اُلو کو اُڑایا تھا لیکن وہ اُلو تیروں سے مار کر گر لیا گیا۔ سجّر نے کہا کہ جہاں ایمان میں بچے ہوئے تیر چلتے ہیں وہاں جادو نہیں چل سکتا۔ سجّر نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ سنایا کہ انہوں نے کس طرح فرعون کے جادو گروں کو نچاد کھایا تھا اور کس طرح ان جادو گروں کے سانپوں کو حضرت موسیٰ کا عصا نکل گیا تھا اور پھر حضرت موسیٰ کو دریائے نیل نے راستہ دے دیا اور فرعون کو غرق کر دیا تھا۔

”یہ لوگ تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے“ — سجّر نے کہا — ”یہ سر تپا ابلیس ہیں اور یہ لوگ ابلیس کی پوجا کرتے ہیں اور انہوں نے تم سب کو بھی ابلیس کا پجاری بنا دیا ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ یہ شہر ہماری عملداری میں آگیا ہے اور وہ ابلیس یہاں سے نکل گئے ہیں۔ ہم یہاں تم پر حکومت کرنے نہیں آئے۔ ہم بادشاہ نہیں نہ تمہیں اپنی رعایا سمجھتے ہیں۔ ہم اللہ کا وہ پیغام اور حکم لے کر آئے ہیں جس کے مطابق تمام انسان برابر ہیں.... نہ کوئی بادشاہ نہ کوئی رعایا.... اب میں چاہوں گا کہ تم خود زبان سے بولو.... کیا یہ غلط ہے کہ یہاں قافلوں کے لٹیرے رہتے تھے اور یہاں قافلوں کا لوٹا ہوا مال آتا تھا؟“

سجّر نے تمام مجمعے پر اپنی نگاہیں گھمائیں اور خاموش رہا۔
 ”بولو!“ — کچھ دیر بعد اس نے کہا — ”دل میں کوئی بات نہ رکھو۔ کہو میں نے جھوٹ کہا ہے یا سچ؟“
 ”ہاں سلطان!“ — آخر ایک آدمی کی آواز آئی — ”یہاں قافلوں کا لوٹا ہوا مال آتا تھا۔“

”اور یہاں اغوا کی ہوئی بچیاں اور نوجوان لڑکیاں لائی جاتی تھیں۔“

”ہماری بچیوں کو یہاں سے اٹھایا گیا ہے“ — ایک اور آواز آئی — ”ہماری بچیوں کے ساتھ شادی کر کے انہیں غائب کیا گیا ہے۔“

”میں تمہیں بتاتا ہوں لوٹی ہوئی یہ دولت اور یہ بچیاں کہاں جاتی رہی ہیں“ — سخر نے کہا — ”یہ تمام دولت قلعہ الموت اس حسن بن صباح کے پاس اکٹھی ہوتی رہی ہے جسے تم امام اور نبی اور نہ جانے کیا کیا مانتے ہو۔ تمہاری بچیاں اور قافلوں سے اٹھائی ہوئی بچیاں وہاں حوریں بنائی گئی ہیں۔“

”ہمیں ایک بات بتاؤ سلطان!“ — ایک ضعیف العمر آدمی نے ہجوم سے آگے بڑھ کر کہا — ”قافلے ہم نے تو نہیں لوٹے اور بچیوں کو ہم نے تو اغوا نہیں کیا پھر ہمیں کس گناہ کی سزا دی گئی ہے؟ تمہاری فوج کے آتش تیروں نے میرا گھر کیوں جلا دیا ہے؟ شہر میں گھوم پھر کر دیکھو، بہت سے گھر جلے ہوئے نظر آئیں گے۔ تمہاری فوج کے برسائے ہوئے پتھروں سے ہمارے بچے ہلاک ہوئے ہیں۔“

”میں نے شہر میں گھوم پھر کر دیکھ لیا ہے“ — سخر نے کہا — ”جن لوگوں کے گھر جل گئے ہیں یا پتھروں سے تباہ ہوئے ہیں، انہیں وہ گھر دیئے جائیں گے جو بالکل ٹھیک کھڑے ہیں۔ اگر وہ پورے نہ ہوئے تو جلے ہوئے گھر سرکاری خزانے سے نئے کر دیئے جائیں گے۔ جب تک یہ مکان نہیں بنے، میرا تمام لوگوں کا مالیہ، لگان اور دیگر محصولات معاف کرتا ہوں۔“

سخر نے اسلامی فاتحین کی روایات کے عین مطابق شاہ در کے لوگوں کے دلوں سے خوف و ہراس نکال دیا اور انہیں یہ تاثر دیا کہ انسان واجب التکریم ہے اور اس شہر کے لوگوں کو پوری تکریم دی جائے گی اور ان کے حقوق پورے کئے جائیں گے۔ سخر ان لوگوں کے دلوں کو فتح کرنا چاہتا تھا لیکن ان لوگوں میں حسن بن صباح کے تخریب کار موجود تھے جنہیں عبد الملک بن عطاش اور احمد بن عطاش خاص طور پر پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ سخر جب اس مجمعے سے خطاب کر رہا تھا، اُس وقت دو آدمی ان لوگوں کے پیچھے کھڑے تھے اور سخر کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہے تھے۔

”یہ شخص ہمارے لئے مشکل پیدا کر رہا ہے“ — ایک نے دوسرے سے کہا — ”اگر یہاں کے لوگوں نے اس سلطان کی باتوں کو دل میں بٹھالیا اور انہیں دل و جان سے قبول کر لیا تو ہمارے لئے ایک مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔“

”کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا“ — دوسرے نے کہا — ”یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ ہمارا شکار یہ سلطان خنجر ہے، لوگ نہیں۔“

”اور اب میں ایک نہایت ضروری بات کہنا چاہتا ہوں“ — خنجر نے اپنے خطاب کے آخر میں کہا — ”مجھے معلوم ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے استاد عبدالملک بن عطاش کے تخریب کاریاں موجود ہیں۔ وہ مسجدوں میں بھی موجود ہوں گے اور وہ ہر جگہ تمہارے درمیان گھومتے پھرتے رہیں گے۔ انہیں پکڑنا یا ان کی نشاندہی کر کے پکڑوانا تمہارا فرض ہے۔ اگر تم اپنے فرض سے کوتاہی کرو گے تو ایک بار پھر تمہیں تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تم میں سے کوئی آدمی کسی ایسے شیطان کو پکڑ کر لائے گا یا نشاندہی کرے گا، اسے بے دریغ انعام دیا جائے گا۔“

سلطان محمد نے جب خنجر سے کہا تھا کہ وہ شاہ در چلا جائے اور وہاں کا انتظام سنبھالے تو اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے تربیت یافتہ آدمی شاہ در بھیجے گا جو جاسوسوں اور تخریب کاروں کو زمین کے نیچے سے بھی نکال لائیں گے۔ کچھ آدمی تو خنجر کے ساتھ ہی آگئے تھے اور کچھ بھیجے جا رہے تھے۔



داستان گو اس داستان کو پیچھے اُس مقام پر لے جا رہا ہے جہاں منزل آفندی بن یونس، شمونہ اور شافعیہ نے دس باطنی فدائیوں کو جنگل میں قتل کیا تھا۔ منزل شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے دائیں کندھے میں ایسا خنجر لگا تھا کہ ہنسی سے بھی نیچے چلا گیا تھا۔ وہاں سے خون اُٹ اُٹ کر باہر آ رہا تھا جسے نہ روکنے کی صورت میں موت کا خطرہ تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ آگے جانے کی بجائے پیچھے وسم کوہ چلے جائیں۔ وہ اُسی وقت واپس چل پڑے تھے۔

وسم کوہ ایک دن کی مسافت تھی۔ وہ آدھی رات کو چلے تو ان کا ارادہ تھا کہ بہت تیز چلیں گے تاکہ جلدی منزل پر پہنچ جائیں اور منزل کا خون روک دیا جائے لیکن منزل کا گھوڑا تیز دوڑتایا چلتا تھا تو جھکوں سے اس کا خون اور زیادہ نکلنے لگتا تھا۔ اس کے زخم میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا اور اوپر بھی کپڑا باندھ دیا گیا تھا لیکن خون پوری طرح رکا نہیں تھا۔ اس کے باوجود منزل نے گھوڑے کی رفتار تیز رکھی لیکن راستے میں ہی اُس پر غشی طاری ہو گئی اور گھوڑوں کی رفتار کم کر دی گئی۔

اگلے روز آدھا دن گزر چکا تھا جب یہ لوگ وسم کو پہنچ گئے۔ منزل کا چہرہ اور جسم پیلا پڑ گیا تھا جو اس امر کی نشانی تھی کہ جسم میں خون ذرا سا ہی باقی رہ گیا ہے۔ اسے فوراً سالار اور یزی کے پاس پہنچایا گیا۔ طبیب اور جراح دوڑے آئے اور انہوں نے منزل کا خون روکنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

سالار اور یزی کو بتایا گیا کہ وہ دس فداؤں کو قتل کر کے واپس آ گئے ہیں اور فداؤں سے ایسا اشارہ ملا تھا جیسے وہ شاہ دربار ہے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ سلطان محمد اور اس کے سالاروں کو اسی طرح قتل کر دیں جس طرح انہوں نے پہلے اہم شخصیتوں کو قتل کیا تھا۔

منزل آفندی دو دنوں بعد ہوش میں آیا اور اُس نے پہلی بات یہ پوچھی کہ وہ کہاں ہے اور اُس کے ساتھی کہاں ہیں۔ اسے بتایا گیا کہ وہ وسم کوہ میں ہے اور اللہ نے اُسے نئی زندگی عطا فرمائی ہے۔ اس کے بعد اس نے طبیب اور جراح سے کہا کہ اسے بہت جلدی ٹھیک کر دیں تاکہ وہ قلعہ الموت کے لئے روانہ ہو سکے۔ طبیب اور جراح اسے کہتے تھے کہ وہ جسم کو زیادہ ہلائے نہیں ورنہ زخم پھر کھل جائے گا۔ دراصل منزل جو شیلا آدمی تھا۔ وہ برداشت نہیں کر رہا تھا کہ چارپائی پر ہی لیٹا رہے۔

اُس کا زخم ملتے ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ اس دوران وسم کوہ میں یہ خبر پہنچی کہ شاہ دربار فتح کر لیا گیا ہے اور اس شہر کی زیادہ تر آبادی وہاں سے نکل گئی ہے۔ پھر یہ خبر بھی وہاں پہنچی کہ عبدالملک ناظروطس چلا گیا ہے۔ اس قلعے میں پہنچے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے۔ منزل آفندی آخر بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اسے ایسی غذائیں دی جاتی رہی تھیں کہ اس کے خون کی کمی پوری ہو گئی تھی۔ اسے جب یہ خبر ملی کہ عبدالملک قلعہ ناظروطس چلا گیا ہے اور اس کے ساتھ شاہ دربار کی کچھ آبادی بھی وہاں گئی ہے تو منزل فوراً سالار اور یزی کے پاس گیا۔ بن یونس کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔

”سالار محترم!“ منزل نے کہا۔ ”آپ قلعہ ناظروطس لے سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ سالار اور یزی نے پوچھا۔

”عبدالملک چند دن پہلے وہاں پہنچا ہے۔“ منزل نے کہا۔ ”اس کے ساتھ شاہ دربار کی کچھ آبادی ہے اور کوئی فوج اس کے پاس نہیں۔ اس قلعے میں پہلے سے کچھ لوگ آباد ہوں گے جو اتنی جلدی اس کی لڑائی نہیں لڑیں گے۔ ہم اس قلعے کو محاصرے میں

نہیں لیں گے۔ میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔“

اس نے اور بن یونس نے سالار اور یزی کو اپنا پلان بتایا۔ سالار اور یزی پہلے ہی پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ وہ ایک عرصے سے دسم کوہ میں بیٹھا ہے اور کچھ کر نہیں رہا۔ وہ تو بائیسوں کا ایسا دشمن تھا کہ کسی پر شک ہو تا کہ یہ حسن بن صباح کا پیروکار ہے تو اسے قتل کروا دیتا تھا۔ اس نے تجویز سنی تو منزل اور بن یونس کو اجازت دے دی کہ وہ اس پر عمل کریں۔

”ایک پہلو پر غور کر لیں“ — بن یونس نے کہا — ”سلطان محمد نے عبد الملک کو اجازت دی ہے کہ وہ قلعہ ناطروطس چلا جائے۔ سلطان نے اسے حفاظتی دستہ بھی دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سلطان نے اس شخص کی جان بخشی کر دی تھی۔ اگر آپ اس قلعے پر چڑھائی کر کے یہ قلعہ لے لیتے ہیں تو سلطان شاید اس کارروائی کو پسند نہ کرے اور وہ اسے حکم عدولی بھی سمجھ سکتا ہے۔“

”میں سلطان کے حکم کا نہیں اللہ کے حکم کا پابند ہوں“ — سالار اور یزی نے کہا — ”ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ حسن بن صباح کی اہلیست کو کچل اور مسل دیا جائے۔ میں وہ قلعہ اپنی ذات کے لئے سر نہیں کرنا چاہتا۔ تم اپنی تجویز پر عمل کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“



حسن بن صباح عبد الملک عطاش کو تسلی دے کر اور اس کا حوصلہ مضبوط کر کے قلعہ الموت جا چکا تھا۔ عبد الملک نے خود بھی بہت کوشش کی تھی کہ اس کا حوصلہ مضبوط ہو جائے لیکن یہ کام کوئی آسان نہیں تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی، اس کے بیٹے اور بھائی کی بیوی کے موت کے غم کو اپنی ذات میں جذب کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا، اور اس کوشش میں کامیاب بھی ہو رہا تھا لیکن اسے جو چیز کھائے جا رہی تھی وہ انتقام کا جذبہ تھا۔ یہ جذبہ آگ بن کے جلا رہا تھا۔ اسے حسن بن صباح پر غصہ بھی تھا کہ اس نے قاتل تو ہزار ہا پیدا کر لئے تھے لیکن لڑنے والا کوئی ایک آدمی بھی تیار نہیں کیا تھا۔ شاہ در سے اس کے ساتھ جو لوگ گئے تھے ان میں مردوں کی تعداد چھ سات ہزار تھی۔ باقی ان کی عورتیں، بوڑھے اور بچے تھے۔ عبد الملک نے سوچا کہ ان ہی کو فوج کی صورت میں منظم کر لے۔

سب سے پہلے ضرورت ہتھیاروں کی تھی۔ شاہ در سے انہیں منتہ کر کے نکالا گیا تھا۔ انہیں گھوڑے اور اونٹ بھی نہیں دیئے گئے تھے۔ وہ سب پیدل یہاں تک پہنچے تھے.... ایک روز اس نے ان تمام آدمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور انہیں بتایا کہ یہاں پہلا کام تو یہ ہے کہ از سر نو آباد ہونا ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ باقاعدہ لڑائی کی تیاری شروع کر دی جائے تاکہ سلجوقیوں سے اس شکست کا انتقام لیا جائے۔

اُس نے دیکھا کہ ان لوگوں پر کچھ خوف و ہراس سا طاری تھا جیسے وہ لڑنے کے لئے تیار ہونے سے گھبرار ہے ہوں۔ اگر عبد الملک کوئی سالار ہو تا یا عام ساحاکم ہو تا تو لوگ شاید اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیتے لیکن عبد الملک ان کا پیرو مُرشد اور ان کے امام شیخ الجبل کا استاد تھا۔ وہ جانتے تھے کہ امام حسن بن صباح بھی اسے اپنا پیرو استاد مانتا ہے۔ یہ ایسی وجہ تھی کہ کوئی بھی اس کے آگے بول نہیں سکتا تھا۔ کسی نے جرأت کر کے لوگوں کی نمائندگی یہ کہہ کر کی کہ ابھی تو ہمارے پاس ہتھیار بھی نہیں اور گھوڑے بھی نہیں۔

”سب کچھ آجائے گا“ — عبد الملک نے گرج کر کہا — ”ہتھیار اور گھوڑے الموت سے آجائیں گے۔ میں آج ہی قاصد کو الموت روانہ کر دوں گا اور پیغام بھیجوں گا کہ ہمیں گھوڑے اور ہتھیار فوراً بھیجے جائیں۔ تم لوگ اب ایک فوج کی صورت میں منظم ہو کر لڑو گے۔“

اس نے جو شبلی اور اشتعال انگیز تقریر بھی کر ڈالی جس میں اس نے ان لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ اللہ کی نگاہ میں برتری انہیں حاصل ہے سلجوقیوں کو نہیں۔ اُس نے کہا کہ جنت کے حقدار تم ہو، سلجوقی نہیں لیکن جنت حاصل کرنے کے لئے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اس طرح اس نے اپنے آدمیوں کو بنی نوع انسان سے برتر ثابت کیا اور سلجوقیوں کے خلاف وہ زہر اگلا کہ اس کے یہ آدمی لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ عبد الملک آخر استاد تھا اور استاد بھی ایسا جس نے حسن بن صباح کو تعلیم و تربیت دے کر امام اور شیخ ابنا ڈالا تھا۔

اس سے اگلے ہی روز کا ذکر ہے، سورج سر پر آگیا تھا جب دو مرد اور دو عورتیں قلعہ ناظروطس میں داخل ہوئیں۔ یہ چاروں گھوڑوں پر سوار تھے اور پانچویں گھوڑے پر کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ ایک گھوڑے پر مژمل آفندی سوار تھا، دوسرے پر بن یونس، تیسرے پر شمونہ اور چوتھے گھوڑے پر شافیعہ سوار تھی۔ انہوں نے تین دنوں کا سفر دو

دنوں میں طے کر لیا تھا۔ وہ جب قلعے میں داخل ہوئے تو لوگ ان کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ ہر کوئی ان سے یہی ایک سوال پوچھا رہا تھا کہ وہ کہاں سے آرہے ہیں۔

”لوگو! تیار ہو جاؤ“ — مژل نے آواز میں گھبراہٹ کا تاثر پیدا کر کے کہا — ”قلعہ وسم کوہ سے سلجوقیوں کی فوج آرہی ہے۔ یہ وہی فوج ہے جس نے قلعہ وسم کوہ فتح کیا تھا۔ اس فوج کو سلطان کا حکم ملا ہے کہ قلعہ ناظروطس میں جا کر کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑو۔۔۔۔۔ پیر استاد عبد الملک بن عطاش کہاں ہیں؟۔۔۔۔۔ ہم بڑی مشکل سے وہاں سے نکل کر آئے ہیں۔۔۔۔۔ ہمیں پیر استاد تک پہنچا دو، ہم انہیں خبر کر دیں۔“

لوگوں میں افراتفری پھا ہو گئی اور وہ اپنے اپنے گھروں کو دوڑ پڑے۔ اگر بات صرف لڑنے کی ہوتی تو وہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے مگر وہاں تو یہ عالم تھا کہ وہ نہتے تھے۔ اگر ان کے پاس ہتھیار ہوتے تو بھی ان کا خوف و ہراس بجاتا تھا۔ شاہ در میں ان پر جس طرح مہینقوں کے پتھر اور آتش تیر گرے تھے، اس کا خوف ابھی تک ان پر طاری تھا۔

مژل کا یہ چھوٹا سا قافلہ ابھی عبد الملک تک نہیں پہنچا تھا کہ عبد الملک کو پہلے ہی کسی نے اطلاع دے دی کہ باہر سے کوئی لوگ آئے ہیں اور انہوں نے لوگوں میں بھگدڑ پھا کر دی ہے اور لوگ گھبراہٹ کی حالت میں بھاگے دوڑے پھر رہے ہیں اور بعض لوگ بھاگ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ عبد الملک باہر نکل آیا تھا اور اپنی آنکھوں سے لوگوں کی خوفزدگی اور نفسا نفسی دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں مژل، بن یونس، شمونہ اور شافیعہ اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور گھوڑوں سے اترے۔

”کون ہو تم؟“ — عبد الملک نے پوچھا — ”کہاں سے آئے ہو؟“

مژل اور بن یونس گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ کر عبد الملک کی طرف بڑھے اور جھک کر اُس کے گھٹنے چھوئے اور پھر اُس کے ہاتھوں کو پکڑ کر چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ عبد الملک نے غصیلی آواز میں پوچھا کہ وہ ہیں کون اور آئے کہاں سے ہیں اور انہوں نے لوگوں سے کیا کہہ دیا ہے کہ یہاں بھگدڑ مچ گئی ہے۔

”ہم آپ کے مرید ہیں یا پیر و مرشد!“ — مژل نے ادب و احترام سے کہا —

”ہم امام حسن بن صباح پر جانیں قربان کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ میری بیوی ہے اور یہ لڑکی میری بہن ہے۔ یہ میرا بھائی ہے۔ اس کی بیوی اور دو بچے وسم کوہ میں ہی رہ گئے ہیں۔ سلجوقیوں نے وسم کوہ فتح کر لیا تو ہم کوشش کے باوجود وہاں سے نکل نہ سکے اور یہ

اتنا لبا عرصہ وہیں رہے۔ ہم یہ ظاہر کر کے وہاں وقت گزارتے رہے کہ آپ کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں اور ہم اہل سنت والجماعت ہیں۔ وسم کوہ کا حاکم سپہ سالار اور یزی میں نے اُس کی ملازمت حاصل کر لی تھی اور میں نے اُس پر اپنا اعتماد جمایا تھا۔

”میں نے تم سے کچھ اور پوچھا؟“ — عبد الملک نے بے صبر ہو کر کہا — ”یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ تم وسم کوہ سے آئے ہو، یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کو کیا کہہ دیا ہے کہ یہ بھاگے دوڑے پھر رہے ہیں؟“

”گستاخی معاف یا پیر استاد!“ — منزل نے جھک کر کہا — ”یہ لوگ خوش قسمت ہیں کہ ہم نے بروقت اطلاع دے دی ہے کہ ان کی طرف کیا قیامت بڑھی چلی آرہی ہے.... انہوں نے ہم سے پوچھا تو ہم نے انہیں بتایا کہ وسم کوہ سے فوج چل پڑی ہے اور اس فوج کو سلطان کا حکم ملا ہے کہ شاہ در سے عبد الملک بن عطاش اتنے ہزار لوگوں کے ساتھ ناظروطس کے قلعے میں چلا گیا ہے، اپنی فوج بھیجو اور ان سب کو قتل کر کے اس قلعے پر قبضہ کر لو.... ہم نے لوگوں کو بس یہ بات بتائی ہے۔“

عبد الملک انہیں اپنے گھر میں لے گیا۔ اجڑے تھے تو لوگ اجڑے تھے، عبد الملک کا رہن سہن یہاں بھی شاہانہ تھا۔ اُس نے جو مشروب منزل وغیرہ کو پیش کئے، وہ کوئی بادشاہ ہی اپنے ہاں رکھ سکتا تھا۔ گھر لے جا کر عبد الملک نے شمونہ اور شافیعہ کو اپنی عورتوں کے حوالے کر دیا اور منزل اور بن یونس کو اپنے پاس بٹھالیا۔

”سلطان نے تو ہمیں امان دے دی تھی“ — عبد الملک نے کہا — ”ہم نے اسے جس طرح کہا اس نے اسی طرح کر دیا۔ ہم نے کہا کہ شاہ در سے جانے والے آدھے لوگ ناظروطس چلے جائیں گے اور آدھے قلعہ الموت جائیں گے۔ ہم نے کہا کہ ہماری حفاظت کے لئے ایک ایک دستہ ساتھ بھیجا جائے۔ سلطان محمد نے یہ بھی قبول کر لیا اور دوستے ساتھ کر دیئے لیکن اب اُس نے ہم پر فوج کشی کا حکم دے دیا ہے۔“

”صرف فوج کشی کا نہیں، قتل کا بھی حکم دیا ہے“ — بن یونس نے کہا — ”ہم دونوں نے سالار اور یزی کی ملازمت حاصل کر لی تھی۔ میرا بھائی منزل تو اُس کا قابل اعتماد آدمی بن گیا تھا۔ اس کی موجودگی میں سلطان کا حکم آیا تھا کہ قلعہ ناظروطس میں فوج بھیج کر سب کو قتل کر دیا جائے اور عبد الملک کو بالکل نہ بخشا جائے۔“

”کیا یہ ہمارے ساتھ دھوکہ نہیں ہوا؟“ — عبد الملک نے کہا — ”میں نے اس

سلجوقی سلطان پر اعتبار کیا تھا اور میں خوش تھا کہ اس نے کشادہ ظرفی اور فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے کہ مجھے اور وہاں سے نکلنے والے ہر شخص کو اجازت دے دی تھی....“

”آپ اس کی یہ چال سمجھے نہیں یا پیر اُستاد!“ — منزل نے اُس کی بات کٹ کر کہا — ”اس نے آپ کے لوگوں کو دو حصوں میں کٹ کر بکھیر دیا۔ یہ غلطی آپ کی ہے کہ آپ نے خود ہی اس کا کام آسان کر دیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ آدھے آدمی الموت چلے جائیں گے اور آدھے اس قلعے میں آجائیں گے۔ اس نے آپ کی یہ شرطیں اس لئے مان لی تھیں کہ آپ قلعہ چھوڑ دیں اور وہ قلعے میں داخل ہو جائے۔“

”اب زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں“ — بن یونس نے کہا — ”فوج وسم کوہ سے چل پڑی ہے۔ اس وقت مسئلہ صرف یہ ہے کہ آپ کو اور آپ کے خاندان کے ہر فرد کو بچایا جائے۔“

”فوج کب تک یہاں پہنچے گی؟“ — عبد الملک نے پوچھا۔

”دو دنوں بعد!“ — منزل نے کہا — ”آپ یہاں سے نکلنے کی تیاری کریں۔ ہم آپ کے ساتھ الموت جائیں گے۔ یہاں پہلے جو لوگ آباد تھے، ان کے پاس گھوڑے بھی ہیں اور اونٹ بھی۔ ہم ان میں سے گھوڑے بھی لے لیں گے اور اونٹ بھی لیکن یہاں سے روانگی رات کے وقت ہوگی تاکہ لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ آپ جا رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے سامنے نکلے تو لوگ آپ کے خلاف ہو جائیں گے۔“



وہاں کے لوگوں میں افراتفری پھا رہی اور شام تک کچھ لوگ اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر قلعے سے نکل گئے۔ وہ قلعہ الموت کی طرف جا رہے تھے۔ عبد الملک نے منزل، بن یونس، شمونہ اور شافیعہ کو اپنے گھر میں ہی رکھا۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ آدھی رات کے وقت نکلیں گے اور قلعہ الموت کا رخ کر لیں گے۔ عبد الملک منزل اور بن یونس کو اس لئے بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا کہ ان کے پاس تلواریں اور خنجر تھے۔ شمونہ اور شافیعہ بھی تلواروں سے مسلح تھیں اور ان کے پاس بھی خنجر تھے۔

عبد الملک کہتا تھا کہ اُسے اپنی جان کا کوئی غم نہیں۔ وہ اپنے خاندان کی عورتوں کو محفوظ کرنا چاہتا تھا اور دوسرا اس کا الموت جانے کا مقصد یہ تھا کہ اس نے حسن بن صباح کو مجبور کرنا تھا کہ وہ فوج تیار کرے اور سلجوقیوں کے ساتھ باقاعدہ جنگ لڑ کر انہیں ختم

کرے۔ شہر کے لوگوں سے دو اونٹ اور کچھ گھوڑے لے لئے گئے تھے۔ یہ سارا انتظام خفیہ رکھا گیا تھا۔ رات کو جب قلعے کے اندر خاموشی طاری ہو گئی اور لوگ گہری نیند سو گئے تو دو اونٹ اور گھوڑے عبد الملک کے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ اس کا خاندان تیار تھا اور جو سامان ساتھ لے جانا تھا وہ بھی تیار کر لیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک قافلہ شہر سے نکلا۔ چونکہ اس شہر میں فوج تھی ہی نہیں اس لئے دروازوں پر کوئی پہرہ اور کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ اُس شام لوگوں نے خود ہی شہر کے دروازے بند کر لئے تھے۔ ایک دروازہ کھول لیا گیا اور یہ قافلہ نکل گیا۔

مزل اور بن یونس اس قافلے کے محافظ تھے۔ ناظروطس سے کوئی ایک میل دُور گئے ہوں گے کہ مزل نے گھوڑے کے ساتھ بندھی ہوئی مشعل کو آگ لگائی۔ عبد الملک نے پوچھا کہ مشعل کی کیا ضرورت ہے، چاند اوپر آ رہا ہے۔ مزل نے کوئی جواب نہ دیا اور مشعل بلند کر کے دائیں بائیں تین بار ہلائی اور پھر مشعل بجھادی۔

عبد الملک نے پوچھا کہ یہ اُس نے کیا کیا ہے۔ مزل نے اُسے ویسے ہی باتوں میں ٹال دیا.... ذرا ہی دیر بعد دُور سے گھوڑوں کے ہلکے ہلکے ٹاپ سنائی دینے لگے جو تیزی سے بڑھتے آ رہے تھے۔ عبد الملک نے چونک کر کہا کہ یہ گھوڑ سوار نہ جانے کون ہیں۔ مزل نے کہا کہ کوئی ایسا خطرہ نہیں ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی اپنے ہی آدمی ہوں اور وہ مشعل کی روشنی دیکھ کر ادھر آ رہے ہوں۔

وہ سوار جو آ رہے تھے، جنگل میں کہیں چھپے ہوئے تھے۔ وہ مزل اور بن یونس کے ساتھ وسم کوہ سے آئے تھے اور ناظروطس سے کچھ دور ان سے الگ ہو گئے تھے۔ اُن کی تعداد چالیس پچاس تھی۔ انہیں کچھ دُور جا کر چُپے رہنا تھا اور مزل کے اسی اشارے کا انتظار کرنا تھا۔ طے ہی کیا گیا تھا کہ مزل اور بن یونس عبد الملک کو آدھی رات کے وقت قلعے سے نکالیں گے۔ ان کی یہ سکیم کامیاب ہو گئی تھی اور مزل نے انہیں مشعل کا اشارہ دے دیا تھا۔

گھوڑ سواروں نے قریب آ کر اس قافلے کو گھیرے میں لے لیا اور مزل نے عبد الملک سے کہا کہ وہ گھوڑے سے اُتر آئے۔ وہ گھوڑے سے اُتر ہی تھا کہ ایک گھوڑ سوار نے تلوار نکالی اور عبد الملک کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اُس کے خاندان کی جو عورتیں تھیں، انہوں نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ مزل نے

عورتوں سے کہا کہ ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا جائے گا اور انہیں واپس قلعے میں بھیج دیا جائے گا۔ اس خاندان کے دو آدمی بھی ساتھ تھے۔ انہیں بھی قتل کر دیا گیا اور پھر عبد الملک کی لاش اور اس کا سر اٹھا کر یہ قافلہ واپس ناظرو طس چلا گیا۔

ایک گھوڑ سوار نے عبد الملک کا سر اپنی برچھی کی آئی سے اُڑس لیا اور اس کے خاندان کی عورتوں کو قلعے میں داخل کر کے سب وسم کوہ کی طرف چل پڑے۔ منزل کا خیال تھا کہ عبد الملک کا سر قلعہ الموت کے دروازے پر رکھ آتے ہیں لیکن سواروں کا کماندار نہ مانا اور اس نے کہا کہ اس کا فیصلہ سالار اور یزی کرے گا۔

تیسری صبح یہ سوار وسم کوہ پہنچ گئے۔ وہ برچھی جس میں عبد الملک کا سر اُڑسا ہوا تھا، سالار اور یزی کو پیش کی گئی۔ سالار اور یزی نے کہا کہ یہ سر کپڑوں میں لپیٹ کر سلطان محمد کے پاس بھیج دیا جائے۔ شاید یہ سر بھی وہ بغداد بھیجنا چاہتا ہو.... اس کے بعد تاریخ میں اس کا سراغ نہیں ملتا کہ اس کا سر بغداد میں بھیجا گیا تھا یا نہیں۔ یہ صاف شہادت ملتی ہے کہ سالار اور یزی نے سلطان کے حکم کے بغیر ہی اپنی آدمی فوج قلعہ ناظرو طس اس حکم کے ساتھ بھیج دی کہ اس قلعے پر قبضہ کر لیا جائے۔ فوج کو یہ حکم بھی دیا گیا کسی کے ساتھ ذرا سی بھی زیادتی نہ کی جائے بلکہ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور انہیں یقین دلایا جائے کہ ان کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی اور کسی عورت پر دست درازی نہیں ہوگی۔ فوج اس حکم کو بڑی اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ زمانہ چونکہ قتل و غارت کا زمانہ تھا، باطنی مسلمانوں کو قتل کرتے تھے اور مسلمانوں کی طرف سے باطنی جوابی قتل ہوتے تھے اور فوج تک کو یہ حکم دے دیا جاتا تھا کہ جہاں کہیں کوئی باطنی نظر آئے، اُسے قتل کر دیا جائے۔ ان حالات میں سالار اور یزی نے اپنی فوج کو خاص طور پر کہا کہ کسی ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔

فوج چلی گئی اور پانچویں چھٹے روز ناظرو طس سے قاصد آیا اور اُس نے بتایا کہ وہاں امن و امان ہے اور جو لوگ بھاگ رہے تھے انہیں روک لیا گیا ہے۔ اس پیغام کے ملنے کے بعد سالار اور یزی ناظرو طس چلا گیا۔ منزل اور بن یونس بھی اُس کے ساتھ گئے۔ شمونہ اور شافیعہ وسم کوہ میں ہی رہیں۔

سالار اور یزی نے اس قلعہ بند آبادی کے تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے ویسا ہی لپکھ دیا جیسا سانجر نے شاہ در میں دیا تھا۔ اُس نے خاص طور پر زور دے کر کہا کہ اللہ کے راستے پر

واپس آ جاؤ۔ تمہیں جنہوں نے پیرو مُرشد اور امام بن کر گمراہ کیا تھا، ان کا انجام دیکھ لو۔ تم نے اپنے شیخ الجبل اور امام حسن بن صباح کے استاد کی لاش دیکھ لی ہوگی۔ اُس کی لاش کے ساتھ سر نہیں تھا۔ اگر یہ اللہ کا اتنا ہی برگزیدہ شخص تھا تو وہ اس انجام کو کیوں پہنچا؟.. مختصر یہ کہ اوریزی نے ان لوگوں کو باطنی فرقے سے نکالنے کے لئے بہت کچھ کہا۔ وہ لوگ پہلے ہی خوفزدہ تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ سلجوقی فوج آئی اور اس نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ یہ موقع ہوتا ہے جب فاتح فوج شہریوں پر ٹوٹ پڑتی ہے اور پہلا ہلہ وہاں کی عورتوں پر بولتی ہے لیکن اس فوج نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ اس کی بجائے اس فوج کا کماندار شہر سے بھاگنے والوں کو روکتا تھا اور روک روک کر واپس ان کو گھروں میں بھیجتا تھا اور پھر لوگوں کو یقین دلاتا تھا کہ وہ ان کے محافظ بن کر آئے ہیں، لٹیرے بن کر نہیں۔

جب سالار اوریزی ان لوگوں کے سامنے گیا تو لوگ پہلے ہی مطمئن ہو چکے تھے۔ اوریزی کی ایک بات ان کے دلوں میں اُترتی جا رہی تھی۔ وہ تو اب عقیدوں، فرقوں اور مذہب کی بات ہی نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے شاہ در میں بہت بُرا وقت دیکھا تھا۔ اب تو وہ اپنے اہل و عیال کی سلامتی اور عزت و آبرو چاہتے تھے۔ وہ انہیں ملتی نظر آگئی تو وہ سالار اوریزی کی ہر آواز پر لبیک کہنے لگے۔

سالار اوریزی نے اپنا ایک خاص ایلمچی سلطان محمد کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اس نے اس طرح قلعہ ناظروطس اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ سالار اوریزی کو توقع یہ تھی کہ سلطان ناراض ہو گا کہ اس کے حکم کے بغیر ایسا کیوں کیا گیا لیکن جب ایلمچی واپس آیا تو پتہ چلا کہ سلطان اس اقدام پر بہت ہی خوش ہوا ہے اور سالار اوریزی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔



قلعہ ناظروطس کے لوگوں نے سالار اوریزی کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن ان میں کچھ کدرباطنی بھی تھے جن کے دلوں پر ذرا سا بھی اثر نہ ہوا۔ وہ حسن بن صباح کے پیرو مُرشد عبد الملک بن عطاش کا قتل برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی اَلْمَوْتُ جا پہنچا اور حسن بن صباح کو جا اطلاع دی کہ پیرو استاد عبد الملک بن عطاش قتل کر دیئے گئے ہیں۔

حسن بن صباح پر تو جیسے سکتے طاری ہو گیا ہو۔ اُس کے دل میں اپنے پیر استاد کا احترام تھا یا نہیں، یہ الگ بات ہے، اُس کے لئے اصل دچکہ یہ تھا کہ سلجوقیوں نے بھی اس کی طرح اہم شخصیتوں کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُس آدمی نے جو حسن بن صباح کو اطلاع دینے گیا تھا، تفصیل سے بتایا کہ کس طرح دو آدمی اور دو عورتیں وہاں آئی تھیں اور انہوں نے کیا افواہ پھیلائی اور وہ کس طرح عبدالملک کو لے گئے تھے اور اگلی صبح عبدالملک کی لاش شہر کے ایک دروازے میں پڑی ملی تھی۔

حسن بن صباح یکنخت چونکا اور وہی تباہی بکنے لگا۔ اُس کے مشیر اور دیگر درباری اٹھ کھڑے ہوئے اور تھر تھر کانپنے لگے۔ انہوں نے حسن بن صباح کو اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر صورت حال میں خندہ پیشانی سے بات کیا کرتا تھا اور تبسم اُس کے ہونٹوں پر رہتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جن ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی تھی، ان ہونٹوں سے جھاگ پھوٹنے لگی اور وہ جب غصے سے بولتا تھا تو یہ جھاگ اُڑاڑ کر سننے والوں پر پڑتی تھی۔ وہ اپنے پیر استاد کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا اس لئے اُس کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ اپنے فدائیوں کو سالار اور یزی یا سلطان محمد اور سب کو قتل کرنے کے لئے کہہ دیتا لیکن اس کے لئے وقت اور موقع درکار تھا۔

غصے سے وہ پاگل ہوا ہی جا رہا تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ عبدالملک کی دونوں بیویاں اور دو بیٹیاں اور ان بیٹیوں کے ایک ایک دو دو بچے آئے ہیں۔ حسن بن صباح باہر کو دوڑ پڑا۔ اپنے پیر استاد کے ان پس ماندگان کا استقبال وہ آگے جا کر کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے استقبال یوں کیا کہ عبدالملک کی بوڑھی بیوی کے قدموں میں گر پڑا اور اس کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ اس کی دوسری بیوی ابھی جوانی کی عمر میں تھی۔ حسن بن صباح انہیں اپنے کمرے میں لے آیا۔

”کیا سلجوقیوں نے آپ کو چھوڑ دیا ہے؟“ — حسن بن صباح نے پوچھا — ”یا آپ خود کسی طریقے سے وہاں سے نکل آئی ہیں؟“

”سلجوقی سالار اور یزی آیا تھا“ — بڑی بیوی نے جواب دیا — ”اُس نے ہمیں بڑے اچھے لہجے میں کہا کہ یہاں رہنا چاہتی ہو تو رہ سکتی ہو۔ تمہاری حفاظت کی ذمہ داری ہم پر ہوگی، اور اگر الموت جانا چاہتی ہو تو اپنے محافظوں کے ساتھ الموت تک پہنچا دوں گا.... میں نے کہا، ہمیں الموت پہنچا دیا جائے۔ مجھے زیادہ ڈر اس جوان بیٹی کا تھا لیکن یوں لگتا

تھا جیسے یہ جوان بیٹی کسی کو نظر آئی ہی نہیں ورنہ ایسی جوان لڑکی کو کون معاف کرتا ہے لیکن سالار اور یزی نے جیسا کہا تھا ویسا کر کے دکھا دیا۔ ہمیں محافظ دستہ دے کر رخصت کیا اور وہ دستہ ہمیں قلعہ الموت کے باہر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔“

حسن بن صباح نے حکم دیا کہ اسے ایک خاص قسم کے فدائی کی ضرورت ہے۔ اُس نے بتایا کہ سالار اور یزی کو قتل کرنا ہے۔ اس کے آدمی اچھی طرح جانتے تھے کہ کون سے آدمی کو قتل کرنے کے لئے کس قسم کے فدائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ حسن بن صباح کا مطلب سمجھ گئے پھر بھی حسن بن صباح نے انہیں مزید سمجھا دیا کہ سالار اور یزی بڑا ہی ہوشیار اور دانشمند آدمی ہے اور اس کی نظریں گہرائی تک چلی جاتی ہیں اس لئے اس کے مطابق کوئی فدائی بھیجا جائے اور اس کا جوان سال ہونا ضروری ہے۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ حسن بن صباح کو ہر بڑی شخصیت کی نفسیات تک سے بھی واقفیت تھی۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اُس کا جاسوسی کا نظام بڑا ہی کارگر تھا۔ اس میں عام قسم کے یا اوسط درجہ کے آدمی نہیں تھے بلکہ اونچی حیثیت کے لوگ بھی تھے اور خاص طور پر عقلمند آدمی بھی تھے۔

داستان گو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح کی جنت میں فدائی پرورش پاتے تھے۔ اُن کے دماغوں پر حشیش اور انتہائی خوبصورت لڑکیوں کا قبضہ ہوتا تھا۔ ان کی اپنی تو کوئی سوچ ہوتی ہی نہیں تھی۔ حسن بن صباح کی ایک جنت اور بھی تھی۔ اس کے متعلق تاریخوں میں کم ہی لکھا گیا ہے لیکن دو وقائع نگاروں نے اس کی بھی تفصیلات لکھی ہیں جو مختصراً ”یوں ہیں کہ کچھ نوجوانوں کو ایک خاص قسم کی بوٹی کا نشہ پلایا جاتا تھا اور انہیں ایسی جگہ رکھا جاتا تھا جہاں غالباً ”اسی بوٹی کا ہلکا ہلکا دھواں پھیلا رہتا تھا۔ اس نشہ کا اور اس دھوئیں کا اثر یہ ہوتا تھا کہ وہ آدمی اگر کنکریاں کھا رہا ہو تو یوں محسوس کرتا جیسے مرغن کھانے کھا رہا ہے۔ انہیں کھانے تو مرغن ہی دیئے جاتے تھے لیکن ان کے تصورات میں ایک جنت آباد کر دی جاتی تھی جس میں حوریں بھی ہوتی تھیں اور شراب بھی ہوتی تھی لیکن وہ حقیقت میں نہ حوریں ہوتی تھیں نہ شراب، وہ آدمی اس تصور کو حقیقت سمجھتے تھے۔ تاریخ سے ایسے اشارے ملتے ہیں کہ اس خیالی جنت میں بہت ہی تھوڑے نوجوانوں کو رکھا جاتا تھا کیونکہ باہر بھیجے جانے کی صورت میں ان کا نشہ اُتر بھی سکتا تھا۔ ان میں سے اگر کسی کو الموت سے باہر بھیجا جاتا تو ساتھ حشیش کا نشہ دیا جاتا تھا۔

حشیش ایسی چیز تھی جو دماغ کو حقیقی حالت میں آنے ہی نہیں دیتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد چھبیس ستائیس سال عمر کا ایک خوب رو آدمی حسن بن صباح کے سامنے لا کر کھڑا کیا گیا۔ اس آدمی نے حسن بن صباح کے آگے سجدہ کیا۔ حسن بن صباح نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ سجدے سے اٹھا۔

”ہمیشہ کے لئے جنت میں رہنا چاہتے ہو؟“ — حسن بن صباح نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں یا امام!“ — اس آدمی نے جواب دیا — ”آپ کا حکم ہو گا تو ہمیشہ جنت میں رہنا چاہوں گا اور آپ جہنم میں پھینکیں گے تو وہاں بھی میری زبان پر آپ ہی کا نام ہو گا۔“

”نہیں، جہنم میں نہیں پھینکوں گا“ — حسن بن صباح نے کہا — ”میں تمہیں اُس جنت میں بھیج رہا ہوں جس میں تم ہمیشہ رہو گے اور ہمیشہ جوان رہو گے۔“

اگر ہم آج کل اور جدید دور کی زبان میں بات کریں تو یہی کہیں گے کہ اس جوان آدمی اور اس جیسے دوسرے آدمیوں کی برین واشنگ ایسی خوبی سے کر دی گئی تھی کہ وہ حسن بن صباح کے اشارے پر جہنم میں جا-نے کے لئے بھی تیار ہو جاتے تھے۔ یورپ کے دو تین نفسیات دانوں نے حسن بن صباح کی جنت کا نفسیاتی تجزیہ بھی کیا ہے جو یہاں پیش نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ بڑا ہی خشک اور سائنسی موضوع ہے۔ حسن بن صباح کا اپنا ایک طریقہ اور انداز تھا جو وہ ایسے نوجوانوں پر استعمال کرتا تھا۔ اُس نے اس جوان سال آدمی کو بتایا کہ وہ دسم کوہ جائے گا اور وہاں اسے ایک پہ سالار دکھایا جائے گا جس کا نام اور یزی ہے۔ اسے قتل کرنا ہے اور خود بھی قتل ہو جانا ہے۔ اگر وہ اس شخص کو قتل کر کے زندہ نکل سکتا ہے تو یہ اُس کی اپنی قسمت ہے۔ وہ واپس یہاں آئے گا تو جنت میں رہے گا اور اگر اپنے آپ کو مار لے گا یا کسی کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا تو اس سے زیادہ خوبصورت جنت میں جائے گا۔

حسن بن صباح کے فدائی کوئی اور دلیل تو سمجھتے ہی نہیں تھے۔ ان کے دماغوں پر حشیش اور عورت اور لذت پرستی سوار ہوتی تھی۔ جان لینے اور جان دینے کو تو وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے.... اس جوان سال آدمی کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا کہ وہ یہ کام کس طرح کرے گا اور وہ اکیلا نہیں ہو گا۔ وہاں دو آدمی اسے ملیں گے جو اسے اپنی پناہ میں

رہیں گے اور اوریزی کے قتل میں اس کی راہنمائی اور مدد کریں گے۔
 حسن بن صباح نے ایسے انداز سے بات کی تھی جیسے اُس نے اس جواں سال شخص
 پر بہت بڑی نوازش کی ہو کہ اسے اپنے حکم کی تعمیل کا موقع دیا ہو۔

○

وہ سم کوہ ایک قلعہ بند شہر تھا جس کے متعلق پہلے تفصیل سے سنایا جا چکا ہے کہ یہ
 کس طرح اور کتنی مدت میں فتح کیا گیا تھا۔ اب اس کے اندر کے حالات بالکل نارمل
 تھے۔ عام خیال یہی تھا کہ اس قلعے میں اب کوئی باطنی نہیں رہا لیکن یہ سوچنے والے
 حقیقت سے بے خبر تھے۔ وہاں چند ایک باطنی موجود تھے جو صرف باطنی ہی نہیں تھے بلکہ
 حسن بن صباح کے جاسوس اور تخریب کار بھی تھے۔ وہ اس معاشرے میں اُس طرح گھل
 مل گئے تھے کہ ان پر ذرا سا بھی شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ سم کوہ کی خبریں الموت
 پہنچاتے رہتے تھے۔ ابھی تک انہوں نے کوئی تخریبی کارروائی نہیں کی تھی۔ شاید انہیں
 ایسا کوئی مشن دیا ہی نہیں گیا تھا۔ ان کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں تھی پانچ سات ہی ہوں
 گے۔

وہ سم کوہ میں دو ادھیڑ عمر آدمی رہتے تھے۔ ان کے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے
 تھے۔ دونوں بیوی بچوں والے تھے۔ ایک بڑھئی کا کام کرتا تھا اور دوسرا سبزیاں کاشت کر
 کے لوگوں کو بیچتا تھا۔ دونوں نے معاشرے میں اپنی باعزت جگہ بنا رکھی تھی اور لوگ
 انہیں عزت و احترام سے دیکھتے تھے۔ وہ بھی سب میں گھل مل کر رہتے تھے۔ وہ جو بڑھئی
 کا کام کرتا تھا اس کے گھر ایک جواں سال آدمی آیا جو اس کا مہمان سمجھا گیا لیکن وہ وہیں
 رہنے لگا۔ بڑھئی نے اور اس سبزی فروش نے لوگوں کو بتایا کہ یہ بڑھئی کا بھتیجا ہے۔
 رے میں رہتا تھا اور اس کا باپ مر گیا ہے۔ اب یہ اپنے بڑھئی چچا کے ساتھ رہنے کے
 لئے یہاں آیا ہے اور اپنے چچا کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس کا نام عبید عربی بتایا گیا۔

عبید عربی خاموش طبع انسان تھا۔ لوگوں سے کم ہی ملتا اور بولتا تو بہت ہی کم تھا۔ اس
 کے چہرے پر اداسی سی چھائی رہتی تھی۔ کوئی اسے سلام کرتا، ملتا تو اس کے ہونٹوں پر ہلکی
 سی مسکراہٹ آ جاتی تھی۔ پھر فوراً ہی مسکراہٹ غائب ہو جاتی اور چہرے پر اداسی غود
 کر آتی تھی۔ اُس کے انداز سے یوں لگتا تھا کہ وہ اس کوشش میں ہے کہ کسی کی طرف
 نہ دیکھے اور کوئی اس کے ساتھ سلام و دعا نہ لے..... یہ وہی خوبو جوان تھا جسے حسن بن

صلح نے ذاتی طور پر دسم کوہ سلار اور یزی کے قتل کے لئے بھیجا تھا۔

وہ اس بڑھئی کا بھتیجا تھا یا نہیں، اس کا باپ مر گیا تھا یا نہیں، بہر حال یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ بڑھئی اور سبزیوں اگانے اور بیچنے والا اس کا پڑوسی باطنی تھے۔ وہ صرف باطنی نہیں تھے بلکہ تجربہ کار جاسوس اور تخریب کار تھے۔ دسم کوہ سے قلعہ الموت تک خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ ان دونوں نے عبید عربی کو اپنی پناہ میں رکھا اور اس جواں سال اور خوب رو آدمی نے ان دونوں کی ہدایات اور رہنمائی سے سلار اور یزی کو قتل کرنا تھا۔

دسم کوہ میں ایک وسیع و عریض میدان تھا جسے گھوڑ دوڑ کا میدان کہا کرتے تھے۔ فوجی وہاں لڑائی کی مشق وغیرہ کیا کرتے تھے اور سوار گھوڑے دوڑاتے تھے۔ سلار اور یزی ہر روز کچھ دیر کے لئے وہاں جاتا اور گھوڑے پر سوار اس میدان میں گھوم پھر کر فوجیوں کو ٹریننگ کرتے دیکھا کرتا تھا اور پھر واپس آ جاتا تھا۔ ایک روز عبید عربی ان لوگوں میں کھڑا تھا جو فوج کا یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ سلار اور یزی ان لوگوں کے قریب سے گزرا تو عبید عربی اُس کی طرف چل پڑا۔ ایک فوجی نے دوڑ کر اُسے وہیں روک لیا اور پوچھا کہ وہ آگے کیوں آیا ہے۔

”میں فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں“ — عبید عربی نے کہا — ”میں اسی لئے سپہ سلار کے سامنے جانا چاہتا ہوں۔“

”نہیں بھائی!“ — فوجی نے کہا — ”میں تمہیں وہ جگہ دکھا دوں گا جہاں فوج میں آدمی بھرتی کئے جاتے ہیں۔ تم وہاں چلے جانا اور تمہیں بھرتی کر لیا جائے گا۔“

”میں صرف بھرتی کے لئے سپہ سلار سے نہیں ملنا چاہتا“ — عبید عربی نے کہا — ”یہ سپہ سلار مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں اس کا عقیدت مند ہوں۔ یہ بہادر سلار ہے اور پکا مسلمان ہے۔ میں اس کے ساتھ ہاتھ ملانا چاہتا ہوں اور اس کے ہاتھ چومنا بھی چاہتا ہوں۔“

”نہیں میرے بھائی!“ — فوجی نے کہا — ”بڑا سخت حکم ہے کہ کوئی باہر کا آدمی سپہ سلار کے قریب نہ جائے۔ تمہیں بھی سپہ سلار سے ملنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔“

”وہ کیوں؟“ — عبید عربی نے پوچھا۔

”یہ تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے“ — فوجی نے کہا — ”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ

حسن بن صباح کے فدائی یہاں کتے ہی حاکموں کو قتل کر چکے ہیں۔ ان کا طریقہ قتل یہی ہے کہ عقیدہ مند بن کر یا فریادی بن کر کسی حاکم کے قریب روتے دھوتے چلے جاتے ہیں اور خنجر نکال کر اس حاکم کو قتل کر دیتے ہیں پھر خود کشی کر لیتے ہیں۔“

دراصل عبید عربی یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سالار اور یزی کے قریب جایا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اسے پتہ چل گیا کہ وہ یا کوئی اور اس سالار کے قریب نہیں جاسکتا۔ اسے اب کوئی اور طریقہ سوچنا تھا۔



سورج غروب ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ شافیعہ قلعہ و سم کوہ کی دیوار پر اکیلی ہی ٹہل رہی تھی۔ وہ تو اس دنیا میں رہ ہی اکیلی گئی تھی۔ اسے ماں باپ یاد آرہے تھے اور پھر اسے اپنا چچا ابو جندل یاد آنے لگا۔ اس چچا کے مارے جانے کا اسے کوئی افسوس نہیں تھا لیکن اس کے دل پر بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پہلے سنایا جا چکا ہے کہ وہ اپنے چچا ابو جندل کے ساتھ دوردراز کے ایک پہاڑی علاقے میں خزانے کی تلاش میں گئی تھی۔ شافیعہ کو کسی خزانے کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں تھی لیکن ابو جندل شافیعہ اور اس کی بہن کو بھی ساتھ لے گیا تھا کہ پیچھے ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کرنے والا کوئی نہ تھا۔

ابو جندل جس طرح خزانے والے غار میں مارا گیا تھا اور جس طرح شافیعہ وہاں سے نکلی اور جن مصائب میں اُبھتی اور نکلتی واپس وسم کوہ پہنچی تھی، وہ داستان گو پہلے ہی تفصیل سے سنا چکا ہے۔

شافیعہ قلعے کی دیوار پر چلتے چلتے رک گئی اور اُس جنگل کی طرف دیکھنے لگی جس میں سے گزر کر وہ واپس آئی تھی۔ اس کے دل پر ہول سا طاری ہونے لگا۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرنے لگی کہ وہ یقینی موت کے پیٹ میں سے نکل آئی تھی۔ وسم کوہ میں اس کا اپنا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں رہا تھا لیکن وہ یہیں واپس آ گئی۔

وہ خوش قسمت تھی کہ اسے مزل اور شمونہ کی پناہ مل گئی تھی۔ ان دونوں نے اسے وہی پیار دیا جو اس کے ماں باپ اور پھر اس کا چچا ابو جندل اپنے ساتھ ہی لے کر اس دنیا سے اٹھ گئے تھے۔ پھر وہ اللہ کا شکر اس لئے بھی ادا کرنے لگی کہ ابو جندل نہ صرف باطنی تھا بلکہ حسن بن صباح کا جاسوس اور تخریب کار تھا لیکن شافیعہ اس کے راستے سے ہٹ کر اللہ کی راہ پر آ گئی۔ اس راہ پر مزل اور شمونہ نے اور سالار اور یزی نے بھی اس

کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

سورج اُفق تک پہنچ گیا تھا اور شفق بڑی ہی دلکش ہوتی جا رہی تھی۔ شافیہ اس شفق کے رنگ دیکھنے لگی.... اسے اپنے پیچھے قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ سناؤ دی۔ یہ چاپ بتا رہی تھی کہ کوئی خراشاں خراشاں چلا آ رہا ہے۔ شافیہ نے پیچھے دیکھا۔ ایک خوبرو جوان آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔

شافیہ نے اُسے دیکھا اور پھر شفق کی طرف نظریں پھیر لیں لیکن اچانک اُس نے پھر پیچھے دیکھا۔ اُسے اس جوان سال آدمی کا چہرہ کچھ مانوس سا اور کچھ شناسا لگا۔ اُس نے اس چہرے کو اور غور سے دیکھا اور ذہن پر زور دے کر یاد کرنے لگی کہ یہ چہرہ اسے کہاں نظر آیا تھا۔ اسے اتنا یاد آیا کہ یہ چند دنوں چند مہینوں یا چند سالوں پہلے کی بات نہیں بلکہ بڑی ہی پرانی بات ہے کہ یہ چہرہ اس سے ملتا چلتا چہرہ دیکھا تھا۔

اس نے اس شخص سے نظریں ہٹالیں اور وہ جوان سال شخص اسی رفتار سے چلتا آیا اور شافیہ کے قریب پہنچ گیا۔ شافیہ نے ایک بار پھر منہ اُس کی طرف کر کے دیکھا۔ وہ آدمی بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ چونک اٹھا ہے اور وہ شافیہ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے اور ان کے درمیان بمشکل ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ وہ جوان آدمی شافیہ کی ہی عمر کا تھا۔ اُس وقت شافیہ کی عمر پچیس چھبیس سال ہو گئی تھی۔

”کیا تم مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہو؟“ — شافیہ نے بلا جھجک پوچھا اور جواب نے بغیر کہا — ”کوشش کرو.... ضرور کوشش کرو.... مجھے بھی کچھ ایسے لگ رہا ہے کہ ہم پہلے بھی کبھی ملے ہیں۔ اگر ملے نہیں تو ایک دوسرے کو دیکھا ضرور ہے.... اور کچھ ایسے بھی لگتا ہے جیسے ہم نے صرف ایک دوسرے کو دیکھا ہی نہیں بلکہ کسی جگہ ہم اکٹھے رہے ہیں۔“

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے بُرا نہیں جانا“ — اس شخص نے کہا — ”جو تم محسوس کر رہی ہو وہ میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔“

”تم ناصر تو نہیں ہو؟“ — شافیہ نے پوچھا — ”خدا کی قسم، تم ناصر ہو.... اب یاد آیا.... میری یادیں مجھے دھوکہ نہیں دے سکتیں۔ تم میرے بچپن کے ساتھی ہو۔ مجھے وہ کشادہ گلی یاد آگئی ہے جہاں ہم کھیلا کرتے تھے اور تم مجھ سے اور میں صرف

تم سے کھیلا کرتی تھی.... کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”تم غلط نہیں کہہ رہیں“ — اس شخص نے کہا — ”تمہیں میرا نام یاد نہیں رہا۔ شاید بچپن میں میرا نام ناصر ہی ہو گا لیکن بعد میں میرا نام عبید عربی ہو گیا تھا.... ہاں، تم میرے بچپن کی ساتھی ہو۔ اس کے بعد تم وہاں سے چلی گئی تھیں اور پھر شاید تمہیں ایک دو مرتبہ دیکھا ہو اور اس کے بعد میں کہاں کہاں پھرا اور مجھ پر کیا گزری، یہ لمبی کہانی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بہت ہی خوشی ہوئی ہے۔“

”کیا تم نے شادی کر لی ہے؟“ — شافیہ نے پوچھا۔

”نہیں شافیہ!“ — عبید عربی نے کہا — ”لڑکیاں تو بہت ملیں لیکن پیار والی کوئی نہ ملی۔ میں تمہیں دل کی بات بتاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مجھے جسم نہیں چاہئے، وہ محبت چاہئے جو روح کے اندر سے پھوٹا کرتی ہے اور روح کے غنجوں کو بھی کھلا دیتی ہے۔“

اس خوب رو جاں سال آدمی نے شافیہ کی روح کے مرجھائے ہوئے غنچے کو تروتازہ کر کے کھلا دیا۔ اُس کا ذہن ایک ہی اُڑان میں ماضی کے اُس دور میں پہنچ گیا جب وہ عبید عربی کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ اسے گئی گزری باتیں یاد آنے لگیں۔ ان کا ساتھ بچپن تک ہی نہیں بلکہ بچپن سے نکل کر لڑکپن تک پہنچ گیا تھا۔ شافیہ کے ماں باپ ایک دوسرے کے بعد اسی عمر میں مر گئے تھے اور اسے اور اس کی چھوٹی بہن کو دن کے چچا ابو جندل نے سنبھال لیا اور بڑے پیار سے پالا پوسا تھا۔ جب ماں مر گئی اور دو چار مہینوں بعد اس کا باپ بھی مر گیا تو وہ عبید عربی کے ساتھ پہلے سے زیادہ کھیلنے لگی تھی اور اب وہ کھیلتی کم تھی اور عبید کو اپنے پاس بٹھا کر باتیں زیادہ کرتی تھی۔ عبید اس کچی عمر میں بھی شافیہ کو تسلیاں اور دلا سے دیا کرتا تھا۔

”نہیں.... نہیں!“ — شافیہ نے عبید عربی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا —

”تمہارا نام ناصر تھا، عبید عربی نہیں.... میں تمہیں ناصر ہی کہوں گی.... میرے دل میں وہ ناصر زندہ ہو گیا ہے۔“

شافیہ کے جذبات میں جو ہلچل پھا ہو گئی تھی ویسی ہی عبید عربی کے جذبات میں پیدا ہوئی۔ اُسے یاد آنے لگا کہ اس شافیہ کے ساتھ اسے کتنا پیار تھا۔ اس کے بغیر وہ خوش رہتا ہی نہیں تھا۔ اپنے ہجولیوں کے ساتھ تو کھیلتا ہی نہیں تھا۔ اُسے وہ وقت یاد آنے لگا جب ماں باپ کی موت کے بعد شافیہ اُس کے پاس بیٹھ کر رویا کرتی اور انہیں یاد کیا کرتی

تھی تو عبید کس پیار سے اسے بہلایا کرتا تھا۔

”شافیعہ!“ — عبید عربی نے کہا — ”تم اُس عمر میں خوبصورت تو تھیں لیکن اتنی نہیں جتنی آج ہو۔“

عبید عربی نے یہ بات کچھ ایسے جذباتی لہجے میں اور خوشگوار انداز میں کی تھی کہ شافیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس بے ساختہ ہنسی نے اُس کی ذات سے وہ سارا غبار اُڑا دیا جو اسے کچھ دیر پہلے پریشان کئے ہوئے تھا وہ محسوس کیا کرتی تھی جیسے اس کی ذات سے اور اس کے اندر سے دھواں اٹھتا رہتا ہے جس سے اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ عبید عربی کی شگفتگی نے اُس کی یہ ساری گھٹن ختم کر دی۔

سورج غروب ہو گیا تھا اور قلعے میں کئی جگہوں پر مشعلیں جل اٹھی تھیں۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ شافیہ کو یہ خیال آیا ہی نہیں کہ شمونہ اور منزل اس کے لئے پریشان ہوں گے۔

”تمہاری شادی تو ہو چکی ہو گی!“ — عبید عربی نے پوچھا۔

”نہیں!“ — شافیہ نے جواب دیا — ”شادی کی بات سامنے آتی ہے تو یوں لگتا ہے اپنے آپ کو کسی کے ہاتھ بیچ رہی ہوں۔ شاید گم گشتہ پیار کی تلاش میں ہوں جو ملنا محال نظر آتا ہے۔“

”وہ مل گیا ہے“ — عبید عربی نے کہا — ”ہم دونوں کو مل گیا ہے۔ کس کے پاس رہتی ہو؟“

”اپنا کوئی بھی نہیں رہا“ — شافیہ نے جواب دیا — ”اللہ کے دو ایسے بندے مل گئے ہیں جن کے دلوں میں وہی پیار ہے جو میرے ماں باپ کے دلوں میں ہوا کرتا تھا.... میں تمہیں ان سے ملواؤں گی۔“

”تمہیں یہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہئے“ — عبید عربی نے کہا — ”جن کے پاس رہ رہی ہو وہ تمہارے خون کے رشتہ دار نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تم پر کوئی شک کریں۔“

”تم اپنی بتاؤ“ — شافیہ نے پوچھا — ”تمہارا گھر کہاں ہے؟ پہلے تو تمہیں وسم کوہ میں کبھی نہیں دیکھا۔“

”میرے بھی ماں باپ مر گئے تھے“ — عبید عربی نے جواب دیا — ”تم اصفہان سے اپنے چچا کے ساتھ ہمیشہ کے لئے چلی گئی تھیں تو اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد

میرے ماں باپ بھی مر گئے تھے۔ میں کہیں اور رہتا تھا لیکن اب یہاں رہنے کے لئے آ گیا ہوں۔ یہاں ایک بڑھی ہے، وہ میرا چچا ہے۔ میں اب اسی کے ساتھ رہوں گا اور اس نے مجھے اپنا کام سکھانا شروع کر دیا ہے.... آؤ چلیں، کل کہاں اور کس وقت ملو گی؟“

”جہاں کہو گے“ — شافیہ نے بڑے ہی جذباتی لہجے میں جواب دیا — ”جس وقت کہو گے آ جاؤں گی۔“

”قلعے کے باہر آ سکو گی؟“ — عبید عربی نے پوچھا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر بولا — ”قلعے کے ساتھ ہی سبزیوں کا ایک باغ ہے۔ وہ بہت ہی خوبصورت جگہ ہے وہاں درخت بہت زیادہ ہیں اور ان پر بلیں چڑھی ہوئی ہیں اور وہاں پھولدار پودے بھی ہیں۔ وہ باغ یہاں ہمارے ایک پڑوسی کا ہے۔ وہ سبزیاں اگاتا ہے اور قلعے میں بیچتا ہے۔ فوج کو بھی سبزیاں وہی دیتا ہے۔ اگر کل کسی وقت وہاں آ سکو تو میں وہیں ملوں گا۔ اس باغ کے مالک سے ڈرنے اور جھجکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ہمارا پڑوسی ہے اور میرے چچا کا بھائی بنا ہوا ہے۔“

”ہاں وہ باغ!“ — شافیہ نے مسرت بھرے لہجے میں کہا — ”میں دو تین بار اس باغ میں گئی ہوں۔ بہت ہی خوبصورت جگہ ہے.... میں وہاں آ جاؤں گی۔“

انہوں نے اگلے روز کی ملاقات کا وقت مقرر کر لیا اور پھر قلعے کی دیوار سے اتر کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔



شافیہ تو عبید عربی کی ذات میں گم ہو گئی تھی۔ اُسے تو جیسے احساس ہی نہ رہا تھا کہ شام بہت گہری ہو گئی ہے اور اسے اپنے گھر پہنچنا ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ مڑل اور شمونہ اس سے پوچھیں گے کہ وہ کہاں رہی ہے تو وہ کیا جواب دے گی۔ اس نے کوئی جھوٹ گھڑنا چاہا تو ضمیر نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ وہ مڑل اور شمونہ کے آگے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ انہوں نے جو پیار اور جو احترام اسے دیا تھا، اس کی قدر وہ صرف اس طرح کر سکتی تھی کہ ان کے ساتھ مخلص رہے اور صداقت کا دامن نہ چھوڑے۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو شمونہ اس کے لئے خاصی پریشان ہو رہی تھی۔ مڑل نے اسے بتایا کہ وہ اس کی تلاش میں نکلنے ہی والا تھا۔ دونوں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں چلی گئی تھی۔ وہ کھانے کے لئے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”بچپن کا ایک ساتھی مل گیا تھا“ — شافیہ نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہا —
 ”اس کے ساتھ قلعے کی دیوار پر کھڑی بچپن کو یاد کرتی رہی ہوں۔“
 ”کون ہے وہ؟“ — شمونہ نے پوچھا۔

”کچھ دن ہوئے یہاں آیا ہے“ — شافیہ نے جواب دیا — ”ہم بچپن میں اکٹھے
 کھیلا کرتے تھے۔ آج اس عمر میں ملاقات ہوئی ہے اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو
 فوراً پہچان لیا تھا۔“

”اگر تم اسے اچھی طرح جانتی ہو پھر تو کوئی بات نہیں“ — مزمل نے کہا — ”اگر
 اسے اتنا ہی جانتی ہو کہ بچپن میں تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا تو پھر محتاط رہنا۔ آج کل
 کسی کا بھروسہ نہیں۔“
 ”نہ ملو تو بہتر ہے“ — شمونہ نے کہا۔

”یہ بات غلط ہے“ — مزمل نے کہا — ”اُسے ضرور ملو۔ اگر وہ شہر میں ابھی ابھی
 آیا ہے تو اُسے ضرور ملو لیکن یوں نہیں کہ تمہیں اس سے بچپن میں پیار تھا بلکہ اس لئے
 ملو کہ اسے غور سے دیکھو اور یہ جانچ پڑتال کرنے کی کوشش کرو کہ یہ کوئی غلط آدمی تو
 نہیں.... وہ حسن بن صباح کا بھیجا ہوا فدا بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے جس طرح قلعہ
 ناظر و طبرس لیا ہے اسے حسن بن صباح بخشنے کا نہیں۔ ہم نے اس کے پیرو مرشد کو قتل
 کیا ہے۔ حسن بن صباح انتقام لے گا اور ضرور لے گا۔ ہو سکتا ہے وہ سپہ سالار اور یزی
 کو بھی قتل کروادے.... ایسا کوئی اجنبی شہر میں نظر آئے تو اسے ہمیشہ شکلی نظروں سے
 دیکھو۔“

مزل آفندی نے یہ جو بات کہی تھی بالکل ٹھیک کہی تھی۔ سالار اور یزی نے جاسوسوں اور مخبروں کو بلا کر خاص ہدایات دی تھیں کہ قلعے میں کوئی اجنبی آئے تو اسے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھیں۔ شہر میں فدائیوں کی موجودگی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ سالار اور یزی نے ایک خاص ہدایت یہ دی تھی کہ تاجروں کا جب مال آتا ہے تو اسے ضرور دیکھیں۔ اگر مال اتارتے وقت اچھی طرح نہ دیکھ سکیں تو یہ دیکھیں کہ اس میں سے مختلف اشیاء کہاں کہاں جاتی ہیں، وہاں جا کر دیکھیں۔ اور یزی نے بڑی عقلمندی کی بات کہی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ جہاں فدائی ہوں گے وہاں حشیش ضرور ہو گی۔ حشیش باہر ہی سے آتی ہو گی۔ اس حشیش کے ذریعے فدائیوں کو پکڑا جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے کسی شہر میں اور کسی قلعے میں ایسی جانچ پڑتال اور دیکھ بھال کا کسی کو کبھی خیال نہ آیا تھا۔ اور یزی کو احساس تھا کہ عبدالملک بن عطاش کو مروا کر وہ خود بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس پر قاتلانہ حملہ ہونا ہی تھا۔

شافیعہ کی زبانی معلوم ہوا کہ اس خوب رو جواں سال آدمی کا اصل نام ناصر تھا اور وہ یہاں آکر عبید عربی بن گیا تھا لیکن شافیعہ نے نام کی طرف توجہ دی ہی نہیں تھی۔ نام پر توجہ دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ عبید عربی نے کہا تھا کہ کبھی وہ ناصر ہوا کرتا تھا اور پھر اس کا نام عبید عربی رکھ دیا گیا تھا۔ شافیعہ نے اس کی اس بات اور وضاحت کو سچ مان لیا تھا۔

”شافیعہ!“ — شمونہ نے کھانے کے بعد شافیعہ سے کہا — ”اب تم اپنے لئے کسی کو منتخب کر ہی لو“۔

شمونہ نے شافیعہ کو یہ مشورہ اس لئے دیا تھا کہ یہ لڑکی عالم شباب میں ہے اور غیر معمولی طور پر حسین بھی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پیار کے دھوکے میں آکر حسن بن صبح کی جنت میں ہی پہنچا دی جائے۔

”میں عبید کو کسی دن گھراؤں گی“ — شافیعہ نے کہا — ”آپ دونوں بھی اسے دیکھ لیں اور مجھے بتائیں کہ میرا انتخاب کیسا ہے۔“

”تمہارا انتخاب یقیناً اچھا ہو گا شافیعہ!“ — منزل نے کہا — ”لیکن ہم صرف یہ نہیں دیکھیں گے کہ عبید کتنا خوب رو ہے اور تمہیں کتنا چاہتا ہے، ہمیں تو اس کی اصلیت اور اس کا باطن دیکھنا ہے۔ ہم تمہیں کسی فریب کار کے چنگل میں نہیں جانے دیں گے۔“

شافیعہ نے وہ رات بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزار دی۔ آنکھ لگتی تھی تو اُسے خواب میں عبید عربی نظر آتا تھا۔ آنکھ کھل جاتی تو اسی کے تصور میں گم ہو جاتی۔ وہ محسوس کرنے لگی جیسے رات بڑی ہی لمبی ہو گئی ہو۔ آخر صبح طلوع ہوئی اور شافیعہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ملاقات کا وقت ابھی دور تھا۔ وقت گزارنے کے لئے وہ کالم کالج میں مصروف ہو گئی اور ملاقات کا وقت قریب آ گیا۔

”میں اُسے ملنے جا رہی ہوں“ — شافیعہ نے شمونہ سے کہا — ”میری اتنی فکر نہ کرنا“ میں بچی تو نہیں ہوں۔“

”پھر بھی محتاط رہنا“ — شمونہ نے کہا — ”اُسے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھو اور اُسے یہاں ضرور لانا۔“

شافیعہ گھر سے نکلی پھر قلعے سے نکل گئی اور سبزیوں والے باغ میں جا پہنچی۔ عبید عربی اس کے انتظار میں وہاں پہلے سے موجود تھا۔ شافیعہ کو دیکھ کر دوڑا آیا اور اُس کا بازو پکڑ کر باغ کے اندر ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں درختوں پر چڑھی ہوئی بیلوں نے چھاتہ سا بنا رکھا تھا۔ اس کے نیچے گھاس تھی اور تین اطراف بیلوں اور پودوں کی اوٹ تھی۔ تنہائی میں بیٹھنے کے لئے وہ جگہ موزوں تھی اور رومان پرور بھی تھی۔ دونوں وہاں جا بیٹھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دونوں دنیا سے بے خبر ہو گئے۔

”پہلے ایک فیصلہ کر لو“ — شافیعہ نے عبید عربی سے کہا — ”میں تمہیں ناصر کہا کروں یا عبید؟“

”عبید بہتر ہے“ — عبید عربی نے جواب دیا — ”نام کو اتنی اہمیت کیوں دیتی ہو؟۔۔۔ اگر محبت ہے تو نام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ محبت نہیں تو بڑے پیارے پیارے نام بھی بھدے اور بے معنی لگتے ہیں۔“

اُس روز انہوں نے بہت باتیں کیں۔ پیار کی باتیں، گزرے ہوئے وقت کی باتیں لیکن ایسی نہیں کہ دلوں پر اُداسی اور ملال آجاتا۔ شافیہ نے اسے کہا تھا کہ ایسی کوئی بات یاد نہ کرو نہ یاد دلاؤ جس میں تلخیاں ہوں۔ وہ کہتی تھی کہ ہم آپیں بھریں گے، فریادیں کریں گے اور روئیں گے تو بھی ہمیں مل باپ نہیں مل جائیں گے نہ ان کا پیار ملے گا۔ پیار تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دینا ہے۔

وہ ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ محبت کی وارفتگی اور خود سپردگی ایسی جیسے یہ دو جسم ایک ہو جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ شافیہ کہتی تھی کہ وجود ہو تو محبت کا ہو، ہمارے اپنے کوئی وجود نہیں۔ اگر ہیں تو انہیں اس طرح پاک اور صاف رکھنا ہے کہ خیال ہی نہ آئے کہ جسم کو تسکین کی ضرورت ہے۔

عبید عربی نے اُسے یقین دلایا کہ اُس کی نظر جسم پر ہے نہیں۔ وہ بار بار ایک تشنگی کا اظہار کرتا تھا۔ یہی وہ تشنگی تھی جس سے شافیہ مری جا رہی تھی۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے پیار و محبت کے چشمے بن گئے۔ وہ یوں محسوس کرنے لگے جیسے یہ چشمے سوکھ گئے تھے اور اچانک پھوٹ پڑے ہوں۔

دن آدھا گزر چلا تھا جب وہ کسی کی آواز پر اچانک بیدار ہو گئے اور گھروں کو جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں تمہیں کسی دن اپنے گھر لے چلوں گی“ — شافیہ نے کہا — ”میں تمہیں اُن لوگوں سے ملواؤں گی جن کے پاس میں رہتی ہوں۔۔۔۔ انہیں تم میرے ماں باپ ہی سمجھو۔“

”شافیہ!“ — عبید عربی نے کہا — ”ان کے پاس لے جانے سے پہلے مجھے خود سمجھ لو۔ میں کچھ نہیں چاہتا، میں پیار کا تشنہ ہوں۔“
وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔



محبت نے ان پر دیوانگی طاری کر دی تھی۔ اُسی شام وہ دونوں قلعے کی دیوار پر وہیں

کھڑے تھے جہاں گذشتہ شام ان کی ملاقات ہوئی تھی۔
اگلے روز وہ پھر سبزیوں کے باغ میں اُسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ شام کے وقت وہ پھر
قلعے کی دیوار پر کھڑے تھے۔

اس طرح وہ آٹھ دس روز ملتے رہے اور ایک روز شافیعہ عبید عربی کو اپنے گھر لے
گئی۔ شمونہ کو عبید خاص طور پر پسند آگیا تھا۔ منزل نے اس کے ساتھ کچھ ایسے ذاتی سوال
کئے جنہیں وہ ضروری سمجھتا تھا۔ عبید عربی نے اُسے مایوس نہ کیا۔

”میری ایک خواہش ہے“ — عبید عربی نے منزل سے کہا — ”میں سپہ سالار
اور یزی سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کے ہاتھ چومنے کو جی چاہتا ہے۔ اس نے جو کارنامے کر
دکھائے ہیں وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ عبد الملک بن عطاش کو کون قتل کر سکتا تھا!.... یہ
قلعہ و سم کوہ کوئی اور فتح نہیں کر سکتا تھا اور پھر جس طرح اس سالار نے قلعہ ناظروطیس
لیا ہے، یہ اسی کی دانشمندی اور عسکری فہم و فراست کا نتیجہ ہے۔ مجھے اس سے ملو!
دیں۔“

”میں ملوؤں گا“ — منزل نے کہا۔

”میں دراصل فوج میں جانا چاہتا ہوں“ — عبید عربی نے کہا — ”میں سپہ سالار
اور یزی کے ماتحت سلطنت کی اور اسلام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔“

شمونہ اور منزل کو ذرا سا بھی شک نہ ہوا کہ عبید عربی حسن بن صباح کا بھیجا ہوا فدا فی
ہے۔ منزل دلی طور پر تیار ہو گیا تھا کہ اسے سالار اور یزی سے ملوایا جائے گا۔ اُس نے
عبید عربی سے کہا کہ سالار اور یزی سے ملاقات تو کرا دی جائے گی لیکن تمہاری جامہ تلاشی
ہوگی اور تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوگا۔

”میں نے ان سے ملنا ہے“ — عبید عربی نے کہا — ”ان کے سامنے کسی ہتھیار
کی نمائش نہیں کرنی۔“

عبید عربی کو وسم کوہ میں آئے دو مہینے ہو گئے تھے اور قلعہ الموت میں حسن بن صباح
اس خبر کا انتظار بڑی بے تابی سے کر رہا تھا کہ سالار اور یزی کو عبید عربی نے قتل کر دیا
ہے۔ اس دوران بڑھی نے اپنے ایک جاسوس کو یہ پیغام دے کر قلعہ الموت بھیجا تھا کہ
امام سے کہنا سالار اور یزی کو اتنی جلدی قتل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کوئی آدمی اس کے
قریب نہیں جاسکتا۔ بڑھی نے حسن بن صباح کو یقین دلایا تھا کہ یہ کام ہو جائے گا اور

عبید عربی ہوموٹھنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ بڑھئی نے پیغام میں یہ بھی کہا تھا کہ عبید عربی نے اُس گھر تک رسائی حاصل کر لی ہے جس گھر کے افراد سالار اور یزی کے قابلِ اعتماد لوگ ہیں بلکہ یہ اُس حلقے کے لوگ ہیں جو سالار اور یزی کی دوستی کا ذاتی حلقہ ہے۔ امید ہے ان لوگوں کے ذریعے سالار اور یزی تک عبید عربی پہنچ جائے گا۔

ایک روز شافیہ نے صاف طور پر محسوس کیا کہ عبید کچھ پریشان ہے اور بولتا ہے تو اس کی زبان لڑکھڑاتی ہے۔ شافیہ نے پوچھا تو اُس نے پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شافیہ کو ٹال دیا لیکن باتیں کرتے کرتے عبید کی بے چینی بڑھتی گئی۔ ایک بار تو اُس نے یوں کیا کہ شافیہ کا ایک ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا اور اُس نے اپنی انگلیاں شافیہ کی انگلیوں میں الجھا رکھی تھیں۔ عبید عربی نے اپنے ہاتھ کو اتنی شدت سے مروڑا جیسے اس کے ہاتھ میں لڑکی کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ لکڑی کا ایک ٹکڑا تھا اور اسے وہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شافیہ درد سے بلبلا اٹھی۔ اس نے عبید کا چہرہ دیکھا تو چہرہ لال سرخ ہوا جا رہا تھا۔ شافیہ نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے نکالا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے۔

”کچھ نہیں شافیہ!.... کچھ نہیں ہوا“ — عبید عربی نے اکھڑی اکھڑی آواز میں کہا — ”کبھی کبھی ایسے ہو جاتا ہے.... میں جلدی ہی اپنے آپ میں آ جاؤں گا۔ یوں محسوس کرتا ہوں جیسے کوئی غیبی طاقت میرے وجود کے اندر آ کر مجھ پر غالب آنے کی کوشش کر رہی ہو.... تم گھبراؤ نہیں۔ چلو گھر چلیں.... میں شام تک ٹھیک ہو جاؤں گا اور ہر روز کی طرح دیوار پر ملیں گے۔“

عبید عربی کی یہ حالت دیکھ کر شافیہ کو بھی ویسی ہی بے چینی محسوس ہونے لگی تھی۔ عبید عربی نے اُسے بہت تسلی دی اور کہا کہ وہ شام کو اُسے بالکل ہشاش بشاش دیکھے گی۔ شافیہ اپنے گھر چلی گئی اور عبید عربی بڑھئی کے گھر چلا گیا۔ شافیہ اُس کی یہ کیفیت سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ عبید کو جسمانی اینٹھن ہو رہی تھی جو صاف علامت تھی کہ یہ شخص نشے سے ٹوٹا ہوا ہے۔

”تمہیں امام کی قسم ہے کوئی بندوبست کرو“ — عبید نے بڑھئی سے کہا — ”آج تو میری حالت بہت ہی بگڑ گئی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکی کو یا کسی اور کو کچھ شک ہو جائے۔ اگر آج مجھے حشیش نہ ملی تو میں پاگل ہو جاؤں گا اور ہو سکتا ہے اس پاگل پن میں

تمہاری گردن مروڑ دوں۔“

”آج شام تک امید ہے تمہارا نشہ پورا ہو جائے گا“ — بڑھئی نے کہا — ”میں نے تمہیں بتایا ہے کہ یہاں آنے والے مال کو کھول کر دیکھا جاتا ہے۔ سالار اور یزی نے بڑا سخت حکم جاری کر رکھا ہے کہ حشیش کا ایک ذرہ بھی اس قلعہ بند شہر میں نہ آئے اور اگر کسی کے پاس حشیش یا اس قسم کا کوئی اور نشہ پکڑا جائے، اسے فوراً قید خانے میں بند کر دیا جائے۔“

سالار اور یزی نے یہ حکم یہ سوچ کر جاری کیا تھا کہ حشیش صرف فدائی یا حسن بن صباح کے جاسوس اور تخریب کار پیتے ہیں۔ یہ نشہ ان باطنیوں کا ہی تھا۔ سالار اور یزی نے سوچا تھا کہ ان لوگوں کو یہاں نشہ نہ ملا تو یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ پھر بھی کسی نہ کسی طریقے سے حشیش وہاں پہنچ ہی جاتی تھی مگر اتنے زیادہ دن ہو گئے تھے، الموت سے حشیش نہیں آئی تھی۔ عبید عربی نشے سے ٹوٹا ہوا تھا۔

دن کے پچھلے پہر جب سورج مغرب کی طرف اتر رہا تھا، شافیعہ قلعے کی دیوار پر جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ ہر شام اُس کی عبید عربی کے ساتھ ملاقات ہوتی تھی۔ شافیعہ گھر سے نکلنے ہی لگی تھی کہ منزل آگیا۔ اس نے شافیعہ کو بازو سے پکڑا اور اندر شمونہ کے پاس لے گیا۔

”میں تمہیں بہت بُری خبر سننے لگا ہوں شافیعہ!“ — منزل نے کہا — ”وقتی طور پر تمہیں یہ خبر بُری لگے گی لیکن اچھا ہوا کہ ایک بہت بڑے خطرے کا پہلے ہی علم ہو گیا ہے۔“

شمونہ اور شافیعہ کے رنگ اتنی سی بات سے ہی اڑ گئے۔ دونوں خبر سننے کو بے تاب ہو گئیں۔

خبر یہ تھی کہ تاجروں کا مال اونٹوں سے قلعے سے باہر اُترا تھا۔ مال سے مال کے تبادلے وہیں ہوا کرتے تھے۔ جس روز تاجروں کا مال آتا تھا، اُس روز وہاں بہت ہی رونق اور لوگوں کا جھمکھٹا ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہاں منڈی لگتی تھی لیکن اتنے زیادہ لوگ ہر روز نہیں ہوتے تھے۔ سالار اور یزی کے حکم کے مطابق وہاں کچھ لوگ گھومتے رہتے اور دیکھتے پھرتے کہ کون کیا لایا ہے اور یہاں کون کیا خرید کر قلعے کے اندر لے جا رہا ہے۔

ایک مخبر نے ایک آدمی کو دیکھا جو الگ تھلگ کھڑا تھا اور اُس کے ہاتھ میں کپڑے کا

ایک تھیلا تھا۔ یہ تھیلا اتنا سا ہی تھا کہ چنے کے اندر چھپایا جاسکتا تھا۔ منجر نے دیکھا کہ بڑھئی اور عبید عربی اس کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے پھر بڑھئی نے وہ تھیلا اُس سے لے لیا اور اپنے چنے کے اندر کر کے اوپر بازو رکھ دیئے اور ایک طرف چل پڑا۔ عبید عربی بھی اس کے پیچھے گیا۔

منجر کو کچھ شک سا ہوا۔ اُس نے ان دو آدمیوں کو بتایا جو کسی بھی تاجر کا مال کھول کر دیکھ سکتے تھے۔ یہ دونوں آدمی دوڑتے ہوئے بڑھئی اور عبید عربی کے پیچھے گئے۔ انہیں دیکھ کر وہ دونوں بھی دوڑ پڑے اور ایک دروازے میں داخل ہو گئے۔ یہ قلعے کی ایک طرف کا دروازہ تھا۔

وہ بھاگ کر جا ہی کہاں سکتے تھے۔ انہیں قلعے کے اندر پکڑ لیا گیا۔ انہیں یہ تھیلا جس آدمی نے دیا تھا وہ پہلے ہی کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ اس تھیلے کو کھول کر دیکھا تو اس میں خشک حبش بھری ہوئی تھی۔ یہ خاصی لمبی مدت استعمال کے لئے کافی تھی۔ بڑھئی اور عبید عربی کو پکڑ کر کو تو ال کے پاس لے گئے۔ کو تو ال نے دونوں کو قید خانے میں بھیج دیا۔ شافیعہ نے جب سنا کہ عبید عربی قید خانے میں بند ہو گیا ہے تو اس کے آنسو بہنے لگے اور وہ منزل کے پیچھے پڑ گئی کہ وہ اسے قید خانے میں لے چلے، وہ عبید عربی سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ عبید عربی ایسا آدمی نہیں۔ شمونہ اور منزل اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگے کہ کسی انسان کا پتہ نہیں ہوتا وہ درپردہ کیا ہے لیکن شافیعہ عبید عربی کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔ وہ کہتی تھی عبید ایسا آدمی نہیں اور یہ ضرور کہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔

منزل نے شافیعہ کی یہ جذباتی حالت دیکھی تو وہ پریشان سا ہو گیا۔ اُس نے شافیعہ سے کہا کہ وہ جا کر معلوم کرتا ہے کہ عبید عربی حبش اپنے پاس رکھنے کا مجرم ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے اُسے معلوم ہی نہ ہو اور یہ حبش اُس کے چچا بڑھئی کے لئے آئی ہو۔



منزل آفندی اور بن یونس سالار اور یزی کے خاص آدمی تھے۔ اور یزی نے ان دونوں کو جاسوسی کے محکمے میں باقاعدہ طور پر رکھ لیا تھا لیکن اور یزی کے ساتھ ان کے تعلقات دوستانہ بھی ہو گئے تھے۔ قید خانے میں کوئی اور آدمی نہیں جاسکتا تھا لیکن منزل اور بن یونس کے لئے کہیں بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ منزل بن یونس کو ساتھ لے کر

قید خانے کے مہتمم سے ملا اور کہا کہ وہ ان دو قیدیوں سے ملنا چاہتا ہے جنہیں گزشتہ روز حشیش کے سلسلے میں گرفتار کر کے یہاں بھیجا گیا تھا۔

مہتمم نے اُسی وقت قید خانے کے داروغہ کو بلا کر کہا کہ ان دونوں کو ان دو قیدیوں کے پاس لے جائے جن کے قبضے سے حشیش برآمد ہوئی تھی۔ داروغہ ان دونوں کو لے گیا اور داروغہ نے ہی انہیں بتایا کہ بڑھئی کو ایذا رسانی والے کمرے میں لے جایا گیا ہے اور اُسے بہت ہی اذیتیں دی جا رہی ہیں لیکن وہ بتا نہیں رہا کہ یہ حشیش کہاں سے آئی تھی۔ اُس پر شک یہ ہے کہ وہ فدائی ہے اور المکوت کا جاسوس بھی ہے۔ عبید عربی کے متعلق داروغہ نے بتایا کہ وہ کوٹھڑی میں بند ہے اور وہ تو یوں سمجھو کہ پاگل ہو چکا ہے۔ داروغہ نے یہ رائے دی کہ وہ نشے سے ٹوٹا ہوا معلوم ہوتا ہے اور بھول ہی گیا ہے کہ وہ انسان ہے۔

بڑھئی کو تو دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، منزل اور بن یونس اُس کو ٹھڑی تک گئے جس میں عبید عربی بند تھا۔ اُس نے جب منزل کو دیکھا تو دوڑ کر سلاخوں تک آیا اور سلاخوں کو پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔

”خدا کے لئے مجھے تھوڑی سی حشیش دے دو“ — عبید عربی نے چلا چلا کر کہا —
 ”میں مرجاؤں گا.... مجھے اتنی زیادہ اذیت دے کر نہ مارو.... مجھے حشیش دو، نہیں دیتے تو مار ڈالو“۔

منزل نے اُسے بتایا کہ حشیش تو قلعے میں بھی نہیں داخل ہو سکتی، اُسے قید خانے میں حشیش کیسے دی جاسکتی ہے!.... عبید عربی نے یہ سنا تو اس نے سلاخوں کو پکڑ کر بڑی زور زور سے اپنا سر سلاخوں کے ساتھ مارا۔ اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ داروغہ ساتھ تھا۔ اُس نے جب اس قیدی کی یہ حالت دیکھی تو دو تین سنتریوں کو پکارا۔
 تین سنتری دوڑے آئے۔ داروغہ نے انہیں کہا کہ وہ رسیاں لے آئیں اور اس قیدی کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیں اور ٹانگیں بھی باندھ دیں۔

وہ طریقہ بڑا ہی ظالمانہ تھا جس سے عبید عربی کے ہاتھ اور پاؤں باندھے گئے۔ منزل اور بن یونس وہاں سے آگئے۔ عبید عربی کی چیخیں دور تک ان کا تعاقب کرتی رہیں۔
 ”اے تھوڑی سی حشیش دے دی جائے تو یہ بتا دے گا کہ حسن بن صباح کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہے“ — منزل نے داروغہ سے کہا — ”صاف پتہ چلتا ہے یہ

نشے سے ٹوٹا ہوا ہے۔“

”پھر بھی نہیں بتائے گا“ — داروغہ نے کہا — ”ہمیں ان لوگوں کا بہت تجربہ ہے۔ اسے تھوڑی سی بھی حشیش مل گئی تو یہ شیر ہو جائے گا۔ پھر تو یہ بولے گا ہی نہیں۔“

مزل اور بن یونس قید خانے سے مایوسی کے عالم میں نکل آئے۔ ان دونوں کو اگر کچھ دلچسپی تھی تو وہ شافیعہ کے ساتھ تھی۔ ان دونوں کو تو یقین ہو گیا تھا کہ عبید عربی حشیش کے نشے سے ٹوٹا ہوا ہے اور یہ مشکوک آدمی ہے۔ اب یہ معلوم کرنا تھا کہ اس کا تعلق حسن بن صباح کے ساتھ ہے یا نہیں لیکن شافیعہ نہیں مان رہی تھی۔ ان دونوں نے گھر جا کر شافیعہ کو یقین دلانے کی کوشش کی بھی لیکن وہ نہیں مانتی تھی۔ وہ روتی اور بُری طرح تڑپتی تھی۔ کہتی تھی مجھے سالار اور یزی تک لے چلو، میں عبید کو قید خانے سے نکلوا لوں گی.... سالار اور یزی قلعے کا امیر بھی تھا۔ وہ عبید عربی کو چھوڑ سکتا تھا لیکن مزل اور بن یونس ایسی سفارش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سالار اور یزی باطنیوں کے معاملے میں کس قدر حساس ہے اور انتقام سے بھرا ہوا ہے۔

اگلے روز شافیعہ کی جذباتی حالت بہت ہی بگڑ گئی اور اُس نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ اُس نے مزل کو مجبور کر دیا کہ وہ آج بھی قید خانے میں جائے اور عبید عربی کو دیکھ کر آئے اور اُسے بتائے کہ وہ کس حل میں ہے۔

مزل چلا گیا اور عبید کو دیکھ آیا۔ عبید کی حالت اب یہ تھی کہ اُس کے ہاتھ پاؤں تو بندھے ہوئے تھے، ماتھے سے خون رِس رہا تھا اور وہ ایسی بُری طرح چیخ اور چلا رہا تھا جیسے کسی کُتے کو باندھ کر مارا پیٹا جا رہا ہو۔

مزل نے شافیعہ اور شمونہ کو عبید عربی کی یہ حالت بالکل ایسے ہی بتائی جیسی وہ دیکھ کر آیا تھا۔ یہ سن کر شافیعہ کی حالت بھی ویسی ہی ہونے لگی۔ شمونہ عورت تھی، شافیعہ کی یہ حالت اُس سے برداشت نہ ہو سکی اور وہ رونے لگی۔ مزل نے شافیعہ سے کہا کہ چلو دونوں سالار اور یزی کے پاس چلتے ہیں۔

”کیا سالار اور یزی اُسے چھوڑ دے گا؟“ — شمونہ نے پوچھا۔

”چھوڑے گا تو نہیں!“ — مزل نے جواب دیا — ”میں سالار اور یزی سے

صرف یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ وہ طبیب کو قید خانے میں بھیجے کہ وہ عبید عربی کو

دیکھے اور کوشش کرے کہ اس کے ذہن سے نشے کا اثر اُتر جائے اور وہ صحیح حالت میں آ جائے پھر اس سے پوچھیں گے کہ حشیش اس کے پاس کہاں سے آئی تھی۔ بس یہ ایک صورت ہے کہ ہم عبید عربی کو بچا سکتے ہیں۔ اگر وہ نہیں بتائے گا تو ہم بھی اس کی کوئی مدد نہیں کریں گے۔ پھر تو ہم یہی سمجھیں گے کہ وہ حسن بن صباح کا آدمی ہے۔ اس صورت میں اگر شافیعہ مر بھی گئی تو ہم پرواہ نہیں کریں گے۔“

اُس زمانے میں قیدی کے ساتھ کسی کو ذرا سی بھی دلچسپی اور ہمدردی نہیں ہوا کرتی تھی۔ قید خانے میں قیدی مرتے ہی رہتے تھے۔ قید خانے میں ڈالے جانے کا مطلب ہی یہی ہوتا تھا کہ یہ شخص بڑا خطرناک مجرم ہے اور یہ ذرا سے بھی رحم کا حق دار نہیں۔



مزل اور شمونہ سالار اور یزی کے پاس جا پہنچے۔ انہوں نے ابھی بات شروع کی ہی تھی کہ شافیعہ بھی روتی چلاتی وہاں پہنچ گئی۔ دربان اُسے اندر جانے سے روکتا تھا لیکن شافیعہ اسے دھکیلتی اور اس کا منہ نوچتی تھی۔ آخر دربان نے اندر جا کر سالار اور یزی کو بتایا کہ ایک لڑکی باہریوں واویلا پیا کئے ہوئے ہے اور روکے رکتی نہیں۔ سالار اور یزی نے اُسے بھی اندر بلا لیا۔

سالار اور یزی کو بتایا جا چکا تھا کہ ایک بڑھئی اور اُس کا جواں سال بھتیجا حشیش کے ساتھ پکڑے گئے ہیں اور انہیں یہ حشیش باہر کا ایک آدمی دے کر غائب ہو گیا تھا۔ سالار اور یزی نے حکم دے دیا تھا کہ یہ مرتے ہیں تو مرجائیں، ان سے پوچھیں کہ یہ کون لوگ ہیں، ان کا تعلق بائنیوں کے ساتھ ضرور ہو گا۔ اب مزل اور شمونہ سالار اور یزی کو عبید عربی اور شافیعہ کی ملاقاتوں کا قصہ سنا رہے تھے۔ شافیعہ اندر گئی تو اس نے اپنا واویلا پیا کر دیا۔ وہ کہتی تھی عبید ایسا آدمی نہیں، ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

سالار اور یزی شافیعہ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اس لڑکی کے متعلق سب کچھ جانتا تھا اور اُسے معلوم تھا کہ یہ لڑکی کس طرح اس قلعے میں پہنچی تھی اور اس نے اور کیا کچھ کیا ہے لیکن اور یزی کسی مشکوک آدمی کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ شافیعہ کی جذباتی حالت یہ تھی کہ اُس نے عبید عربی کی رہائی کی خاطر آگے بڑھ کر اور یزی کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ کہتی تھی کہ اُسے قید خانے میں جانے دیا جائے، وہ عبید سے صحیح بات پوچھ لے گی اور وہ اُسے بتا بھی دے گا۔

سالار اور یزی نے حکم دیا کہ طبیب کو قید خانے میں بھیجا جائے کہ وہ عبید عربی کی مرہم پٹی کرے اور اگر کوئی دوائی کارگر ہو سکتی ہے تو وہ بھی دے، اور شافیہ کو بھی قید خانے میں جانے دیا جائے کہ یہ عبید کی حالت اپنی آنکھوں دیکھ لے۔

طبیب اور شافیہ قید خانے میں گئے۔ منزل اور شمونہ ان کے ساتھ تھے۔ قید خانے کے دو سپاہی بھی ان کے ساتھ ہو لئے تاکہ عبید عربی کو قابو میں رکھا جائے۔

عبید کی حالت پہلے سے زیادہ بُری اور قابلِ رحم ہو چکی تھی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور وہ فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور اُس کے حلق سے بڑی ڈراؤنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر سلاخوں والا دروازہ کھول دیا۔ شافیہ دوڑ کر اندر چلی گئی۔ کوٹھڑی میں ناقابلِ برداشت بدبو تھی۔ عبید نے شافیہ کو دیکھا تو رو کر اس کی فٹیں کرنے لگا کہ انہیں کھواسے کھول دیں۔ اُس نے چیخا چلاتا بند کر دیا۔ وہ اب شافیہ شافیہ ہی کہے جا رہا تھا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ بہہ کر اُس کے چہرے پر جم گیا تھا۔ شافیہ نے فرش پر بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اُسے اس طرح تسلی دلا سے دینے لگی جیسے ماں دودھ پیتے بچے کے ساتھ پیار کیا کرتی ہے۔

”شافیہ.... شافیہ!“ — عبید عربی ہانپتی آواز میں کہہ رہا تھا — ”مجھے پاگل ہونے سے بچالو.... ان لوگوں سے مجھے بچالو.... اپنی پناہ میں لے لو مجھے شافیہ!....“

طبیب عبید کی مرہم پٹی کرنا چاہتا تھا اور اُسے کوئی دوائی بھی دینی تھی لیکن شافیہ کی وارفتگی اور دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ اُس نے عبید کو اپنی گود میں اور زیادہ گھسیٹ لیا اور اپنا ایک گال اُس کے چہرے پر رکھ دیا۔ شافیہ تو شاید بھول ہی گئی تھی کہ وہاں اُس کے اور عبید کے سوا کوئی اور بھی موجود ہے۔

”تم میری پناہ میں ہو عبید!“ — شافیہ نے اُس کے ساتھ پیار کرتے ہوئے کہا — ”ہم دونوں اللہ کی پناہ میں ہیں۔ تم پاگل نہیں ہو گے، اور یہ لوگ جو یہاں موجود ہیں، تمہارے ہمدرد اور غمخوار ہیں.... زخم کی مرہم پٹی کروالو پھر میں تمہارے پاس بیٹھوں گی۔“

”نہیں!“ — عبید عربی نے شافیہ کا ایک بازو دونوں ہاتھوں میں بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا اور بولا — ”تم چلی جاؤ گی۔ مجھے ان لوگوں کے حوالے کر کے نہ جانا۔ یہ لوگ

مجھے بار ڈالیں گے.... پانی پلاؤ شافیعہ، پانی.... مجھے کچھ چاہئے، پتہ نہیں کیا چاہئے۔“
 شافیعہ نے اُسے بٹھا کر اپنے ہاتھوں پانی پلایا پھر اپنے ہاتھوں اُس کے چہرے سے
 خون دھو ڈالا اور پھر طبیب نے اُس کی مرہم پٹی کر دی۔ اگر شافیعہ اُسے مرہم پٹی کروانے
 کو نہ کہتی تو وہ طبیب کو اپنے قریب بھی نہ آنے دیتا.... عبید عربی کی ذہنی حالت بالکل بگڑ
 گئی تھی۔ وہ بے معنی سی باتیں بھی کر جاتا تھا اور اُس کی بعض باتیں تو پلے ہی نہیں پڑتی
 تھیں۔ اُس کی زبان جیسے اکڑی ہوئی تھی جو صحیح الفاظ بھی بولنے کے قابل نہیں رہی
 تھی۔

اُس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا — ”خدا نے آدم کو جنت سے نکل دیا تھا“ — اُس
 نے یہ الفاظ اس طرح کہے تھے جیسے خواب میں بول رہا ہو۔ شافیعہ کے سوا یہ الفاظ کوئی نہ
 سمجھ اور سن سکا۔

طبیب نے تھوڑے سے پانی میں ایک دوائی کے چند قطرے ڈال کر شافیعہ کو پیالہ
 دیا کہ اسے پلا دے۔ شافیعہ کے ہاتھ سے اُس نے یہ دوائی پی لی۔ کچھ دیر انتظار کیا گیا تو
 دیکھا کہ عبید عربی پر خاموشی طاری ہو گئی تھی اور نیند سے اُس کا سر ڈولنے لگا تھا۔ یہ دوائی
 کا اثر تھا۔

ذرا ہی دیر بعد عبید عربی کی آنکھیں بند ہو گئیں اور سر ڈھلک گیا۔ اُسے فرش پر لٹا
 دیا گیا۔ طبیب نے اشارہ کیا کہ سب لوگ یہاں سے نکل چلیں۔ شافیعہ وہاں سے اٹھتی
 نہیں تھی لیکن طبیب نے اُس کے کان میں کچھ کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سب باہر نکل
 آئے اور کوٹھڑی کا دروازہ پھر مقفل کر دیا گیا۔ شافیعہ سلاخوں کو پکڑ کر وہیں کھڑی سوئے
 ہوئے عبید عربی کو دیکھتی رہی۔ شمونہ نے اُسے پکڑا اور ساتھ لے آئی۔ یہ سب داروغہ
 کے ساتھ قید خانے کے دفتر میں جا بیٹھے۔

”میں حیران ہوں محترم طبیب!“ — داروغہ نے کہا — ”کل یہی شخص سلاخوں
 کے ساتھ اپنا سر پھوڑ رہا تھا۔ اگر ہم اسے باندھ نہ دیتے تو اب تک یہ زندہ نہ ہوتا۔ میں
 حیران ہوں آج اس لڑکی کو دیکھ کر یہ قیدی آگ سے پانی بن گیا ہے۔“

”میں نے اسے بڑی ہی غور سے دیکھا ہے“ — طبیب نے یوں بات کی جیسے
 قاضی فیصلہ بنا رہا ہو — ”مجھے اس کے کل کے رویے کے متعلق سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔
 میں نے خود دیکھا ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ لگ کر وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ میں نے

اسے جو دوائی دی ہے، یہ صرف نیند کے لئے ہے، میں اسے سلاتا چاہتا ہوں تاکہ اس کا تھکاؤ ٹوٹا ہو، اذہن ٹھکانے پر آجائے۔ اسے علاج نہ سمجھا جائے۔ میں نے اس کا علاج دیکھ لیا ہے۔ یہ علاج صرف شافیہ کے پاس ہے۔ شافیہ اس کے پاس آتی رہے تو یہ اپنی صحیح ذہنی حالت پر آجائے گا۔ یہ نشے سے ٹوٹا ہوا ہے اور خطرہ ہے کہ یہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے گا۔“

طیب نے تشخیص کر کے کچھ ہدایات دیں اور زور دے کر کہا کہ اس قیدی کو شافیہ کے ساتھ کچھ دن رکھا جائے۔ یہ اپنے دل کی ڈھکی چھپی باتیں بھی شافیہ کے آگے اگل دے گا۔

قید خانے سے نکل کر یہ سب لوگ سالار اوریزی کے پاس گئے۔ طیب نے سالار اوریزی کو عبید عربی کے متعلق ساری رپورٹ دی اور اسے بھی کہا کہ عبید کا علاج شافیہ ہے۔

”سالار محترم!“ — شافیہ نے کہا — ”اگر آپ مجھے عبید کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دیں تو کیا میں اس کے ساتھ قید خانے کی کوٹھڑی میں رہوں گی؟.... میں اس کے ساتھ وہاں بھی رہنے کو تیار ہوں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اسے کسی اچھی جگہ منتقل کر دیا جائے جہاں میں اس کے ساتھ دل جمعی کے ساتھ رہ سکوں؟.... میں پہلے جو بات نہیں مانتی تھی وہ اب مان لی ہے۔ عبید نشے سے ٹوٹا ہوا ہے۔ مجھے اس سے پہلے کبھی شک بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ کوئی نشہ کرتا ہے۔ اگر آپ اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتے ہیں تو وہ میں پوچھ لوں گی.... مجھے پورا یقین ہے کہ یہ باطنی نہیں۔“

”جذبات سے نکلو شافیہ!“ — سالار اوریزی نے کہا — ”مجھے اب یقین ہونے لگا ہے کہ عبید اور یہ بڑھئی حسن بن صباح کے بھیجے ہوئے آدمی ہیں۔ مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا ہے کہ عبید تمہیں محبت کا دھوکہ دے رہا ہے اور یہ لوگ تمہیں یہاں سے اڑالے جائیں گے اور قلعہ الموت میں حسن بن صباح کے حوالے کر دیں گے۔ یہ لوگ اتنے پکے ہوتے ہیں کہ بڑھئی نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا حالانکہ اُسے ایسی اذیتیں دی گئی ہیں جو ایک تندرست گھوڑا بھی شاید برداشت نہ کر سکے۔ عبید ابھی کچا معلوم ہوتا ہے۔“

شافیہ نے سالار اوریزی کو کہا تھا کہ عبید کو کسی اچھی جگہ منتقل کر دیا جائے تو وہ اس سے اُگلوا لے گی کہ وہ اصل میں کیا ہے، کہاں سے آیا ہے اور کس ارادے سے آیا ہے

اور اس بڑھئی کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔ سالار اور یزی کو تو اصل راز کی ضرورت تھی۔ کسی کو اذیت میں ڈالنا ضروری نہیں تھا۔ اُس نے حکم دے دیا کہ عبید عربی کو کسی اچھی جگہ منتقل کر دیا جائے۔ یہ جگہ قید خانے کے باہر بھی ہو سکتی ہے اور وہاں پہرہ کھڑا کر دیا جائے، یعنی عبید کو قیدی قرار دے کر رکھا جائے اور شافیعہ جس وقت چاہے اور جتنی دیر تک چاہے اس کے پاس رہ سکتی ہے۔



عبید عربی کو اُسی دن قلعے میں ایک کمرہ تیار کر کے بھیج دیا گیا اور باہر دو سپاہی پہرے پر کھڑے کر دیئے گئے۔ اس کمرے میں بڑا اچھا پلنگ اور نرم بستر تھا اور ضروریات کی دوسری چیزیں بھی وہاں موجود تھیں۔ ایک ملازم بھی وہاں بھیج دیا گیا۔

اُس رات شافیعہ عبید عربی کے کمرے میں گئی اور اُس نے دیکھا کہ بہت دیر سو کر وہ کچھ سکون میں آ گیا تھا۔ اُسے دراصل یہ تھوڑا سا سکون اس لئے ملا تھا کہ اُسے قید خانے سے نکل دیا گیا تھا اور شافیعہ اس کے پاس تھی۔ ویسے وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ شافیعہ اُس کے پاس پلنگ پر اُسی طرح بیٹھی جس طرح وہ سبزیوں کے باغ میں بیلوں اور پودوں کی اوٹ میں بیٹھا کرتے تھے۔ اب اس کمرے میں جس کا دروازہ بند تھا اور کسی کے آنے کا خطرہ نہیں تھا، شافیعہ نے اور زیادہ جذباتی مظاہرے کئے جن میں بناوٹ نہیں بلکہ اُس کی روح شامل تھی۔ عبید اس کے ساتھ اس طرح لگ کر بیٹھ گیا تھا جس طرح ڈر اسما ہوا بچہ ماں کی آغوش کی پناہ میں جاد بکتا ہے اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عبید عربی حشیش کے نشے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ جن فدا یوں کو باہر قتل یا کسی دوسری واردات کے لئے بھیجا جاتا تھا، انہیں حشیش ملتی رہتی تھی اور وہ جیسا نشہ بھی طلب کرتے، انہیں مل جاتا تھا لیکن وہ سم کوہ میں، جیسا کہ سنایا جا چکا ہے، سالار اور یزی نے حشیش اور دوسری منشی اشیاء کی بھی بندش لگا رکھی تھی۔ حشیش نہ ملنے کے اثرات تو دماغ پر بہت ہی بُرے ہوتے تھے لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا کہ ایسا آدمی جو نشے سے ٹوٹا ہوا ہوتا تھا، محض نشے کی خاطر راز اُگل دیتا تھا۔ عبید کو پاگل ہو جانا چاہئے تھا لیکن شافیعہ ایک ایسا نشہ تھا جس نے عبید کے دماغ سے حشیش نہ ملنے کے اثرات زائل کرنے شروع کر دیئے۔

اس کے ساتھ طبیب کی دوائی کے اثرات بھی تھے۔ طبیب اپنی دوائی کی خوراک کم کرتا جا رہا تھا۔ اس سے عبید کو نیند کم آنے لگی تھی۔ مختصر یہ کہ شافیعہ کے والمانہ پیار نے اور طبیب کی دوائی نے عبید کو نشے کی طلب کی اذیت سے نکال لیا۔ ایک روز شافیعہ پیار ہی پیار میں اُسے اس بات پر لے آئی کہ وہ اپنا آپ بے نقاب کر دے۔

عبید عربی تو جیسے اسی انتظار میں تھا کہ شافیعہ اس سے یہ بات پوچھے۔ اُس نے بڑی لمبی کہانی شروع کر دی۔ اُس نے شافیعہ کو سنایا کہ جب شافیعہ اصفہان سے اپنے چچا ابو جندل کے ساتھ ہمیشہ کے لئے چلی گئی تھی تو عبید عربی تھوڑا ہی عرصہ بعد اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک قافلے میں کہیں جا رہا تھا۔ اُس کا باپ تاجر تھا اور مال بیچنے اور خریدنے کے لئے جا رہا تھا۔ پہلی بار وہ اپنی بیوی اور عبید کو بھی ساتھ لے گیا۔ اُس وقت عبید کا نام ناصر تھا اور یہی وہ نام تھا جو اُس کے ماں باپ نے رکھا تھا۔

راستے میں قافلے پر لیروں کا حملہ ہو گیا۔ عبید عربی نے سنایا کہ لیروں نے جہاں سب کچھ لوٹ لیا وہاں یہ ظلم بھی کیا کہ خوبصورت بچیوں اور جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے اور ایک لیئرے نے اُسے بھی اٹھا لیا۔ اُسے ابھی تک یاد تھا کہ اُس لیئرے نے اپنے ساتھی سے کہا تھا کہ بڑا ہی خوبصورت بچہ ہے۔ اُس وقت اس کی عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ عبید نے سنایا کہ اُس کی ماں بھی اور اُس کا باپ بھی لیروں کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے۔ اُس نے اپنے ماں باپ کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ تو رو رو کے بے ہوش ہو گیا تھا۔

لیروں نے اُسے شاہ در پہنچا دیا۔ شاہ در میں اس کی تربیت ہونے لگی اور وہ بڑا ہونے لگا۔ جب اس کی عمر انیس بیس سال ہو گئی تو اسے قلعہ الموت بھیج دیا گیا۔ وہاں اُسے حسن بن صباح کو پیش کیا گیا جس نے اسے جنت میں داخل کر لیا۔ اسے دوسروں کی طرح حشیش پلائی جاتی تھی اور وہاں بڑی خوبصورت لڑکیاں تھیں جن کے ساتھ وہ رہتا اور عیش و تفریح کرتا تھا۔

اُسے وہاں ہر عیش اور موج حاصل تھی لیکن پیار نہیں بھی نہیں تھا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ شیخ الجبل ایک دن اُسے بلائے گا اور کہے گا کہ اپنا خنجر نکالو اور اپنے آپ کو قتل کر لو۔ یہ مظاہرہ اُس کے سامنے چند مرتبہ ہوا تھا اور ہر بار ایک فدائی اپنے ہی ہاتھوں ہلاک ہو جاتا تھا۔

عبید عربی کی شخصیت ہی بدل گئی اور وہ اُس ذہنی مقام تک پہنچ گیا جہاں وہ خود چاہنے

لگا کہ شیخ الجبل اسے حکم دے کہ اپنا پیٹ چاک کر دو تو وہ اُسے اپنا پیٹ چاک کر کے دکھا دے۔ پھر بھی پیار کی تشنگی پوری طرح ختم نہ ہوئی۔ حسن بن صباح کی جنت میں ایک سے ایک حسین اور نوجوان لڑکی تھی لیکن وہ سب خوبصورت اور پُرکشش جسم تھے۔ ان کے اندر جیسے دل تھا ہی نہیں اور روح بھی نہیں تھی۔

آخر ایک روز اُسے شیخ الجبل امام حسن بن صباح نے بلایا اور کہا کہ تم وسم کوہ جاؤ گے اور وہاں سپہ سالار اور یزی کو قتل کرنا ہے اور پھر بھاگنے کی کوشش نہ کرنا بلکہ وہیں اپنے آپ کو اسی خنجر سے ہلاک کر لینا۔

وہ یہاں آیا۔ یہ بڑھئی اُس کا چچا بالکل نہیں لگتا بلکہ یہ اسی کام کے لئے یہاں موجود ہے کہ کوئی فدائی آئے تو اُسے پناہ دی جائے اور یہاں کی خبریں اَلْمَوْتَ بھیجی جائیں۔ اس نے سبزیوں کے باغ کے مالک کا نام بھی لیا اور کہا کہ وہ بھی حسن بن صباح کا آدمی ہے۔ عبید نے بتایا کہ وہ ابھی دیکھ رہا تھا کہ سالار اور یزی کو کس طرح اور کہاں قتل کیا جاسکتا ہے کہ اتنے میں اسے شافیعہ مل گئی اور شافیعہ سے اُسے وہ پیار مل گیا جس کے لئے وہ مرا جا رہا تھا۔

بڑھئی اور سبزیوں والے کے پاس حشیش ختم ہو گئی۔ انہوں نے عبید کو دوسرے نشے پلائے لیکن وہ حشیش ہی طلب کرتا تھا۔ حشیش آئی اور پکڑی گئی۔ اس سے جو حالت اس کی ہوئی وہ پہلے سنائی جا چکی ہے۔ اُس نے حیرت کا اظہار کیا کہ حشیش کے نشے سے وہ اس حد تک ٹوٹ گیا تھا کہ اُس نے اپنا سر پھوڑ لیا تھا لیکن اُس نے قید خانے میں شافیعہ کو دیکھا تو نشے سے ٹوٹنے کے اثرات کم ہو گئے۔ دراصل پیار کی پیاس کے اثرات زیادہ زہریلے تھے۔ شافیعہ نے والمانہ محبت کا مظاہرہ یہ کیا کہ اُسے قید خانے سے نکلوا لیا اور اس کمرے میں لے آئی۔ مختصر یہ کہ حشیش پر شافیعہ کی والمانہ محبت غالب آ گئی اور عبید نے اپنا یہ راز اگل کریوں سکون محسوس کیا جیسے اُس کے وجود میں زہر بھرا ہوا تھا اور یہ زہر نکل گیا ہو۔

”میں اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں شافیعہ!“ — عبید عربی نے کہا — ”سپہ سالار اور یزی کو یہ ساری بات سنا دو اور اُسے کہو کہ مجھے جو سزا دینا چاہے وہ میں ہنسی خوشی قبول کر لوں گا۔“

سالار اور یزی نے اُسے کوئی سزا نہ دی۔ بڑھئی اور سبزیوں کے باغ کے مالک کو سِر

عام سزائے موت دی گئی۔ ان کی لاشیں اور سر شہر سے دور جنگل میں پھینک دیئے گئے۔



حق و باطل کا تصادم اُسی روز شروع ہو گیا تھا جس روز غارِ حرا سے نُورِ حق کی کرنیں پھوٹی تھیں۔ حق و باطل کے لشکروں نے میدانوں اور صحراؤں میں خونریز لڑائیاں لڑیں، دشت و جبل میں برسریکا ہوئے، پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں میں ان کے معرکے ہوئے اور ہوتے ہی چلے آ رہے تھے۔ دونوں فریقوں کی فوج کے خون سے صحراؤں کی ریت اور سمندروں کا پانی لال ہو گیا۔ مطلب یہ کہ حق و باطل جب بھی باہم تصادم ہوئے، دُوبدو معرکہ آرا ہوئے لیکن حسن بن صباح اٹھا تو اس نے حق کے خلاف ایک ایسی جنگ شروع کر دی جس کا حق پرستوں کے ہاں کوئی تصور ہی نہ تھا۔ یہ ایک زمین دوز جنگ تھی۔ یہ ساری داستان جو اب تک داستانِ گوسنا چکا ہے، ایسی ہی انوکھی جنگ کی داستان ہے۔ یہاں اسے دوہرانے کی ضرورت نہیں۔

اہل سنت حق پرستوں نے پہلے پہل اسی لئے بہت نقصان اٹھایا کہ وہ اس طریقہ جنگ سے واقف نہ تھے۔ وہ تو مردانِ حُر تھے جو میدان میں اُتر کر لڑا کرتے تھے۔ یہ سنایا جا چکا ہے کہ کتنی ہی اہم شخصیات باطنیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئیں لیکن اب مسلمان اس طریقہ جنگ کو سمجھ گئے اور اُنہوں نے باطنیوں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ شاہِ در کی فتح تاریخِ اسلام کا ایک سنگِ میل ثابت ہوئی۔ یہ بھی سنایا جا چکا ہے کہ حسن بن صباح کے پیرو مرشد عبد الملک بن عطاش کا قتل بھی ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ حسن بن صباح کو کہیں سے بھی اپنے فرقے کے نقصان کی کوئی خبر ملتی تھی تو وہ مسکرا دیا کرتا تھا جیسے اُسے اس کی کوئی پرواہ نہ ہو۔ اُس کے قلعے لے لئے گئے تو بھی اُس نے ہنس کر ٹال دیا مگر اب اس پر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔

حسن بن صباح کا پیرو مرشد تو مارا ہی گیا تھا اور حسن بن صباح نے یہ انتہائی کڑوا گھونٹ بھی نگل لیا تھا لیکن عبد الملک اس کے سامنے ایک اور مسئلہ رکھ گیا تھا۔ وہ یہ کہ اس نے قلعہ ناظرو طلس میں حسن بن صباح سے ملاقات کے دوران کہا تھا کہ اُس نے شاہِ در سے کچھ دُور اچھا خاصا خزانہ چھپا کر رکھا ہوا ہے جسے وہ بوقتِ ضرورت استعمال کرے گا۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے علاوہ صرف دو آدمی ہیں جو جانتے ہیں کہ یہ خزانہ کہاں ہے۔

عبدالملک نے یہ بات یوں کی تھی جیسے اُسے یقین تھا کہ اُس نے تو مرنا ہے ہی نہیں۔ وہ یہ خزانہ پیچھے چھوڑ کر دنیا سے اٹھ گیا یا اٹھا دیا گیا۔ اُس نے حسن بن صباح کو یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ خزانہ کہاں ہے۔ یہی بتایا تھا کہ دو آدمی جانتے ہیں لیکن اُس نے ان دو آدمیوں کے نام نہیں بتائے تھے نہ یہ بتایا کہ وہ کہاں ہیں۔ حسن بن صباح کو تو خزانے کی ضرورت ہر وقت رہتی تھی۔ ضرورت نہ بھی ہوتی تو بھی اُس کی فطرت خزانوں کی متلاشی رہتی تھی۔ وہ اب اس سوچ میں گم رہنے لگا کہ اپنے پیرو مرشد کا یہ خزانہ کس طرح ڈھونڈے اور وہ جانتا تھا کہ جب تک ان دو آدمیوں کا تاپہ نہ ملے، خزانہ نہیں مل سکے گا۔

عبدالملک حسن بن صباح کے آگے ایک اور مسئلہ رکھ گیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ ہم لوگ چوری چھپے قتل کرانا جانتے ہیں اور ہمارے پاس ایسے فدائی موجود ہیں جو قتل کر کے خودکشی کر لیتے ہیں لیکن ایسے قاتل فوجوں کی یلغار کو نہیں روک سکتے نہ ہی وہ محاصرے کو توڑ سکتے ہیں۔ اس کے لئے باقاعدہ فوج کی ضرورت ہے اور اس فوج کو محاصرہ توڑنے کی اور محاصرہ کرنے کی اور میدان میں لڑنے کی تربیت دی جائے۔ اُس نے حسن بن صباح سے یہ بھی کہا تھا کہ جن سلجوقیوں نے شاہ درلے لیا ہے وہ اب سیدھے الموت پر آئیں گے اور کوئی بعید نہیں کہ وہ الموت کو بھی فتح کر لیں.... حسن بن صباح نے اس تجویز پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اُس نے اپنے مشیروں کو بتا دیا تھا کہ وہ ایک لشکر تیار کر لیں اور پھر اس کی تربیت کا بندوبست کیا جائے گا۔



جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے کفار کو شکست دینے کے لئے ابابلیس بھیج دی تھیں جن کی چونچوں میں کنکریاں تھیں، اسی طرح حسن بن صباح کے فرقے کے خاتمے کے لئے خداوند تعالیٰ نے کنکریوں والی ابابیلوں کا ہی بندوبست کر دیا۔ یہ اللہ کی مدد تھی اور اللہ حق پرستوں کو کچھ عرصہ آزمائش میں ڈال کر ان کی مدد کا بندوبست کر ہی دیا کرتا ہے ورنہ شافیعہ جیسی حسین و جمیل اور مصیبت زدہ لڑکی ایسے بائیسوں کی ہلاکت کا باعث نہ بنتی جو سالار اور یزی کو قتل کرنے آئے تھے اور وہم کوہ میں رہ کر نہ جانے اور کتنی اور کیسی تباہی لاتے۔ ایسا دوسرا کردار جو تاریخ کے اس باب میں ابھرا وہ نور تھی اور اس کے ساتھ اس کا باپ تھا۔

شافیہ کی طرح نور بھی حسین و جمیل اور جواں سال لڑکی تھی۔ اُس کی داستان سنائی جا چکی ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ شاہ در کی فتح کا باعث اس کا باپ بنا تھا اور وہ خود بھی۔ اب وہ مَرُو میں سلطان کے محل میں تھی۔ سلطان محمد نے اُسے اور اُس کے باپ کو خاصا انعام و اکرام دیا تھا اور دونوں کو محل میں رہنے کے لئے جگہ دے دی تھی۔

نور اب آزاد تھی۔ حسین بھی تھی، جوان بھی تھی۔ اُسے اب زندگی سے لطف اٹھانا چاہئے تھا، اور یہ اُس کا حق بھی تھا۔ اُس پر جو گزری تھی، وہ بڑا ہی دردناک حادثہ تھا۔ اُسے ایک بوڑھے نے زبردستی اپنی بیوی بنالیا تھا لیکن اُس کی حیثیت ایک زر خرید لونڈی کی سی تھی۔ وہ تو جنم سے نکل کر جنت میں آئی تھی۔ اب اُس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ اپنی پسند کا کوئی آدمی دیکھ کر اس کے ساتھ شادی کر سکتی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک امیر زادہ اُس کی راہ میں آنکھیں بچھانے کو بے تاب تھا لیکن اس کی اپنی بے تابیاں کچھ اور ہی نوعیت کی تھیں۔ اُس کے اندر انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ بعض اوقات بیٹھے بیٹھے وہ کسی سوچ میں کھو جاتی اور اچانک پھٹ پڑتی اور باپ سے کہتی کہ وہ کچھ کرنا چاہتی ہے۔ وہ اس پر مطمئن نہیں تھی کہ اس کا خاوند سزائے موت پا گیا ہے اور عبد الملک بن عطاش بھی جنم واصل ہو چکا ہے اور ان کا انتہائی مضبوط اڈہ جسے شاہ در کہتے تھے، حق پرستوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ انتقام کا جذبہ اُسے بے حال کئے جا رہا تھا۔ باپ اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا اور کہتا تھا کہ اب اُس کی شادی کسی موزوں آدمی کے ساتھ ہو جائے اور وہ اپنے اس فرض سے سبکدوش ہو کر باقی عمر اللہ کرتے گزارے۔ نور کہتی تھی کہ شادی تو اسے کرنی ہی ہے لیکن وہ بالینیوں کے خلاف کچھ کئے بغیر کسی کی بیوی بننا پسند نہیں کرتی۔

ایسی ہی باتیں کرتے کرتے ایک روز نور نے باپ سے کہا کہ وہ شاہ در جا کر آیا ہو جائیں تو شاید اسے چھین آجائے۔ اُس کا یہ خیال اچھا تھا۔ جس شاہ در میں وہ زر خرید بیوی یا لونڈی تھی، اس شاہ در میں جا کر وہ آزادی سے گھومنا پھرنا چاہتی تھی۔ اس کے باپ نے اپنی کوئی رائے ضرور دی ہوگی لیکن نور فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ باپ کو ساتھ لے کر شاہ در چلی جائے گی اور باقی عمر وہیں گزارے گی۔ ایک روز اُس نے اپنے باپ کو مجبور کر دیا کہ وہ سلطان کے پاس جائے اور اُسے کہے کہ وہ انہیں شاہ در بھجوانے کا بندوبست کر دے اور وہاں ان کا کوئی ذریعہ معاش بھی ہو جائے تو وہ باقی عمر وہیں گذاریں

گئے۔

اُس کا باپ سلطان محمد کے پاس گیا اور عرض کی کہ وہ اسی طرح سلطان کے محل میں سرکاری مکڑوں پر زندہ نہیں رہنا چاہتے کیونکہ یہ ان کے وقار کے خلاف ہے۔ باپ نے کہا کہ وہ کوئی ایسا بوڑھا تو نہیں ہو گیا کہ اپنے ہاتھوں کچھ کمانہ سکے، وہ شاہ در کو ہی موزوں سمجھتا ہے جہاں وہ اپنی روزی خود کمائے گا۔

سلطان محمد نے اُسی وقت حکم دے دیا کہ نور اور اُس کے باپ کو شاہ در پہنچا دیا جائے اور سب کو یہ پیغام دیا جائے کہ اس باپ بیٹی کو اتنی زمین دے دی جائے جو انہیں باعزت روٹی بھی دے اور معاشرے میں پُر وقار مقام بھی بن جائے.... اس طرح کچھ دنوں بعد نور اور اُس کا باپ شاہ در پہنچ گئے۔ انہیں سرکاری انتظامات کے تحت گھوڑا گاڑی میں وہاں تک پہنچایا گیا تھا۔ سب کو سلطان کا حکم دیا گیا کہ انہیں زمین اور مکان فوراً دے دیا جائے۔ سب تو ان پر بہت ہی خوش تھا۔ نور کے باپ نے جو کارنامہ کر دکھایا تھا، اس کی قیمت تو دی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ سب نے انہیں ایک تو بڑا ہی اچھا مکان دے دیا اور قلعے کے باہر اچھی خاصی زرخیز زمین بھی دے دی۔ کچھ مالی امداد بھی دی تاکہ یہ اپنی زمین کی کاشت شروع کر سکیں۔

باپ بیٹی اس مکان میں آباد ہو گئے اور پھر باپ نے ایسے نوکروں کا انتظام کر لیا جن کا پیشہ کاشتکاری تھا۔



نور اُس محل میں گئی جہاں عبدالملک اور اُس کا بھائی احمد شہنشاہوں کی طرح رہتے تھے۔ وہ جب اس محل میں داخل ہوئی تو اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے اُس کا خاوند بیس ہے اور جوں ہی وہ اندر داخل ہوئی، خاوند اسے دبوچ لے گا لیکن جب وہ اس محل میں داخل ہوئی تو سب کی دونوں بیویوں نے اس کا استقبال بڑے ہی پیار اور خلوص کے ساتھ کیا۔ وہ جانتی تھیں کہ اس لڑکی اور اس کے باپ نے شہ در کی فتح میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ نور نے وہ کمرہ دیکھا جس میں وہ اپنے بوڑھے خاوند کے ساتھ راتیں بسر کرتی تھی۔ اب اس کمرے میں کوئی پلنگ نہیں تھا نہ اُس وقت کی کوئی چیز موجود تھی۔ وہاں سب کے تین بچے اہل حق سے دینی تعلیم لے رہے تھے.... نور کو روحانی تسکین ہوئی۔ اُس کی ذات میں انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی، وہ کچھ سرد ہو گئی۔

اُس کا باپ علی الصبح اپنی زمین پر چلا جاتا اور نوکروں سے کام کروایا کرتا تھا۔ انہیں کچھ کھیتیاں تو ایسی مل گئی تھیں جن میں فصل پک رہی تھی۔ نور اپنے لئے اور باپ کے لئے کھانا تیار کر کے وہیں کھیتوں میں لے جایا کرتی تھی۔ باپ اُسے کہتا تھا کہ کھانا نوکر لے آیا کرے گا لیکن نور آزاد گھومنا پھرنا چاہتی تھی اور اُسے یہ کھیت جو قلعے کے باہر تھے بڑے ہی اچھے لگتے تھے۔ یہ اُس کی نئی زندگی کا آغاز تھا۔

ایک روز دوپہر کے وقت باپ کے ساتھ کھانا کھا کر نور کھیتوں کی طرف نکل گئی۔ فصل کی ہریالی سمندر کی لہروں جیسی لگتی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے لہلہاتے کھیت اُس پر کچھ اور ہی کیفیت طاری کرنے لگے۔ وہ دو کھیتوں کے درمیان آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی کہ سامنے اسے ایک جواں سال آدمی آتا نظر آیا۔ اس شخص کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر لگتی تھی۔ بڑا ہی خوبصورت جوان تھا۔ دُور سے ہی نور کو اُس کا چہرہ شناسا اور مانوس لگا۔ وہ آدمی بھی نور کو دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سا گیا اور پھر اُس نے اپنے قدم تیز کر لئے۔ اُسے بھی نور کا چہرہ ایسا لگا جیسے یہ چہرہ اُس نے کئی بار دیکھا ہو۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور پھر دونوں کے قدم تیز ہو گئے اور دونوں ایک دوسرے کے سامنے رک گئے۔

”اللہ کرے وہ خبر غلط ہو جو میں نے سنی ہے“ — اس آدمی نے کہا — ”شناختا آپ بیوہ ہو گئی ہیں اور عبد الملک بن عطاش بھی قتل کر دیا گیا ہے اور....“

”تم نے جو سنا ہے وہ ٹھیک سنا ہے“ — نور نے مسکرا کر کہا — ”اب یہ نہ کہنا کہ تمہیں یہ خبر سن کر دلی رنج ہوا ہے۔ مجھے ذرا سا بھی رنج اور ملال نہیں ہوا اور میں اب آزاد اور خوش ہوں.... مجھے تمہارا نام یاد ہے۔ حازق ہے نا تمہارا نام؟.... اب مجھے آپ نہ کہنا۔ میں تم سے تین چار برس چھوٹی ہوں اور مجھے تم کو تو زیادہ اچھا لگے گا۔“

اس آدمی کا نام حازق ہی تھا۔ وہ شاہ در کاہی رہنے والا تھا۔ نور کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ شخص کیا کام کرتا ہے۔ وہ اتنا ہی جانتی تھی کہ شاہ در کے محاصرے سے پہلے اونچی حیثیت کا آدمی تھا۔ تیسرے چوتھے روز عبد الملک سے ملنے آیا کرتا تھا۔ نور کے خاوند احمد سے بھی بڑے پیار اور دوستانہ انداز سے ملا کرتا تھا اور خاصا وقت ان کے پاس اندرونی ایک کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اس محل میں حازق کو خصوصی احترام حاصل تھا۔ کبھی نور سے اس کا آتنا سامنا ہو جاتا تو نور کو وہ مسکرا کر اور بڑے ادب و احترام سے سلام کیا کرتا

تھا۔

نور کو یہ شخص دلی طور پر اچھا لگتا تھا لیکن اس کے ساتھ اُسے بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ صرف مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ اونچی حیثیت کا ہونے کے علاوہ یہ شخص خوب رو تھا۔ دراز قد تھا اور قد و کاٹھ میں اتنی جاذبیت تھی کہ عورتیں اُسے رک کر دیکھتی تھیں۔ تب نور کے دل میں ایک خواہش سر اٹھانے لگی کہ اس شخص کو کسی دن روک لے اور اپنے کمرے میں بٹھائے اور اس کے ساتھ باتیں کرے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ حازق اسے بہت ہی اچھا لگتا تھا۔ یہ دراصل اُس کا نفسیاتی اور جذباتی معاملہ تھا۔ وہ حازق کو اپنے بوڑھے خاوند کے مقابلے میں دیکھتی تھی۔ باہر کا کوئی آدمی تو اس محل میں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ واحد آدمی تھا جو وہاں جاتا تھا اور اسے محل میں خصوصی پوزیشن حاصل تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ نور کے دل میں اپنے خاوند کے خلاف انتقامی جذبہ بھی پرورش پا رہا تھا۔ نور حازق کو دیکھ کر مسکرا اٹھتی تھی۔ اس مسکراہٹ میں صحرا میں بھٹکتے ہوئے مسافر کی پیاس تھی اور اس مسکراہٹ میں پنجرے میں بند پنچھی کی تڑپ تھی۔ اُس کی اس بے ساختہ مسکراہٹ میں بیڑیوں میں جکڑی ہوئی لونڈی کی آہیں اور فریادیں تھیں۔ نور پر پابندیاں ایسی لگی ہوئی تھیں کہ وہ حازق کو روک نہیں سکتی تھی لیکن اُس کی مسکراہٹوں کو تو بیڑیاں نہیں ڈالی جاسکتی تھیں۔ حازق اس کی نظروں سے اوچھل ہو جاتا تو اُس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔



اب وہ حازق اس کے سامنے کھیتوں میں کھڑا تھا۔ نور نے پہلے تو کچھ یوں محسوس کیا جیسے وہ حازق کو خواب میں دیکھ رہی ہو یا یہ اُس کا تصور ہو لیکن جب باتیں ہوئیں تو حازق اُس کے سامنے حقیقی روپ میں آگیا۔۔۔۔۔ اب نور آزاد تھی۔ شاید اسی لئے وہ پہلے سے زیادہ حسین لگتی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی اور مظلومیت کے تاثرات نہیں تھے جو اس کے چہرے پر چپک کے رہ گئے تھے۔ اس کی بیڑیاں نوٹ چکی تھیں۔ شاہ در کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ عبدالملک کا محل تو وہیں تھا لیکن اب اس میں وہ نحوست اور اہلیسیست نہیں تھی۔ اب نور کے اور حازق کے درمیان کچھ بھی، کوئی بھی انسان عامل نہیں ہو سکتا تھا۔

”میرا خیال تھا تم یہاں نہیں ہو گے“ — نور نے حازق سے کہا اور بے اختیار اُس

کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”مجھے جانا ہی کہاں تھا!“ — حازق نے نور کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا — ”یہ لوگ حسن بن صباح کے فرقے کے تھے اور میں اہل سنت ہوں اور پکا مومن ہوں۔ میں نے تو اللہ کا شکر ادا کیا ہے کہ ان کا تختہ الٹ گیا ہے اور اسلام ایک بار پھر شاہ در میں داخل ہو گیا ہے۔“

”کیا تم شہر میں رہتے ہو؟“ — نور نے پوچھا۔

”نہیں!“ — حازق نے ایک گاؤں کی طرف اشارہ کر کے کہا — ”میں اُس گاؤں میں رہتا ہوں.... اکیلا ہی رہتا ہوں۔“

”اکیلا کیوں؟“ — نور نے پوچھا۔

”بیوی دھوکہ دے گئی ہے“ — حازق نے جواب دیا — ”اَلْمَوْتُ بھاگ گئی ہے۔ وہ باطنیوں کے جال میں آ گئی تھی۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا۔ مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ وہ ایک ایلیس کی مرید تھی، اچھا ہوا اُنسی کے پاس چلی گئی ہے اور میں دھوکے اور فریب سے محفوظ ہو گیا ہوں۔“

نور نے حازق کو بتایا کہ یہ اتنی زیادہ زمین اور کھیتیاں اُسے اور اُس کے باپ کو سلطان نے عطا کی ہیں اور شہر میں بڑا ہی اچھا اور کشادہ مکان بھی دیا ہے۔ حازق نے اسے بتایا کہ اس سے آگے گاؤں کے ارد گرد تمام کھیتیاں اس کی ہیں اور ان کھیتوں نے اُسے اچھی خاصی دولت دی ہے اور شہر میں عزت بھی دی ہے۔

”آؤ میں تمہیں اپنے باپ سے ملواؤں“ — نور نے کہا اور حازق کا بازو پکڑ کر اُس طرف چل پڑی جہاں اُس کا باپ کام کروا رہا تھا۔

نور کے باپ نے دیکھا کہ اُس کی بیٹی ایک آدمی کو اپنے ساتھ لا رہی ہے تو وہ اُس کی طرف چل پڑا۔ ذرا قریب گیا تو اس کے قدم رکنے لگے کیونکہ وہ حازق کو پہچانتا ہی نہیں بلکہ جانتا بھی تھا۔ نور کا باپ عبد الملک کا قابلِ اعتماد خادم بنا ہوا تھا۔ کئی بار حازق عبد الملک کے پاس نور کے باپ کی موجودگی میں آیا اور ان کی باتیں نور کے باپ نے بھی سنیں۔ اس کی نگاہ میں حازق باطنی تھا اور عبد الملک کا بڑا ہی پکا اور برخوردار مرید تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ حازق حسن بن صباح کے فرقے کا خاص آدمی تھا۔

حازق نے آگے بڑھ کر نور کے باپ سے مصافحہ کیا اور پھر اُس کے ساتھ بغلگیر ہو گیا

لیکن جس وارفتگی کا مظاہرہ اُس نے کیا تھا اتنی ہی سرد مہری کا مظاہرہ نور کے باپ نے کیا۔
 ”میں کس طرح یقین کر سکتا ہوں کہ تم باطنی نہیں ہو؟“ — نور کے باپ نے پوچھا۔

”کیا یہ بھی کوئی پیچیدہ مسئلہ ہے؟“ — حازق نے جاں فزا مسکراہٹ سے جواب دیا —
 ”میرا یہاں موجود ہونا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ میں پکا مسلمان ہوں اور ان باطنیوں کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں نور کو بتا چکا ہوں کہ میری بیوی باطنی تھی اور وہ مجھے دھوکہ دے کر الموت بھاگ گئی ہے۔ میں پہلے جان ہی نہ سکا کہ وہ ان شیطانوں کے چنگل میں آئی ہوئی ہے۔ آپ نے مجھ پر بجا طور پر شک کیا ہے۔ عبد الملک اور اس کے بھائی اور بیٹے کو میں نے اپنا دوست بنا رکھا تھا۔ یہ محض ایک فریب تھا۔ وہ دیکھیں میری کھیتیاں۔ کتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر میں ان لوگوں کے ساتھ بگاڑ کر رکھتا تو وہ مجھے قتل کر کے میری اتنی وسیع و عریض جائیداد پر قبضہ کر لیتے۔ میں اپنی اس جائیداد کو اور اپنی حیثیت کو بچانے کی خاطر ان کے سامنے باطنی بنا رہا اور گھر میں باقاعدہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ میں سراونچا کر کے اور سینہ تان کر اس شہر میں گھومتا پھرتا ہوں۔ اگر میں باطنی ہوتا تو میں پہلی صف کا باطنی ہوتا۔ میری کارروائیاں بڑی ہی تباہ کن ہوتیں لیکن یہاں مجھے جاننے والے جو لوگ ہیں ان سے پوچھو، وہ تمہیں بتائیں گے کہ میں نے کوئی ایسی حرکت یا کوئی ایسی بات کی ہو۔ عبد الملک بڑا استاد بنا پھرتا تھا لیکن میں اُسے بے وقوف بناتا رہا اور اُسے اپنی مٹھی میں بند رکھا۔ اس کے قتل کی خوشی جتنی مجھے ہوئی ہے وہ شاید کسی اور کو نہیں ہوگی۔ اللہ نے اس خاندان پر قہر نازل کیا اور پورا خاندان ہی ختم ہو گیا ہے۔“

حازق نے اور بھی بہت سی باتیں کہہ سن کر ثابت کر دیا کہ وہ حسن بن صباح کا پیروکار نہیں بلکہ مردِ مومن ہے اور اب اسلام کے فروغ اور اس عظیم دین کی بقا کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا ہے۔ وہ جب وہاں سے رخصت ہوا تو نور بڑی بے تابی سے کچھ دور تک اس کے ساتھ گئی اور چلتے چلتے اُس سے پوچھا کہ وہ اُسے کب اور کہاں ملے گا۔
 حازق نے اُسے بتایا کہ کل وہ شہر میں جو باغ ہے، اُسے وہاں ملے گا۔ اُس نے وقت بھی بتا دیا اور باغ کا ایک خاص ٹہ بھی۔ شہر کے اندر یہ بڑا ہی خوبصورت باغ تھا جہاں اچھی حیثیت کے لوگ سیر کرنے کے لئے جایا کرتے تھے۔

حازق چلا گیا اور نور نے یوں محسوس کیا جیسے اُس کا چین اور سکون حازق کے ساتھ ہی چلا گیا ہو۔ اُس نے اپنے آپ پر قابو پالیا ورنہ اُس کے قدم حازق کے پیچھے ہی اُٹھ چلے تھے۔ وہ وہیں کھڑی حازق کو جاتا دیکھتی رہی۔ اگر باپ اُسے آواز نہ دیتا تو وہ حازق کو دیکھتی ہی رہتی۔

نور اپنے باپ کے پاس پہنچی تو باپ سے یہ نہ پوچھا کہ اُس نے کیوں بلایا ہے بلکہ اس کے ساتھ حازق کی ہی بات چھیڑ دی۔ وہ باپ سے منوانا چاہتی تھی کہ حازق باطنی نہیں اور یہ پکا مسلمان ہے۔ نور کے باپ کو مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی نہ صرف یہ کہ قائل ہو چکا تھا بلکہ وہ حازق کا گرویدہ بن گیا تھا۔ یہ حازق کی زبان کا جادو تھا جو باپ بیٹی پر اثر کر گیا تھا۔ اُس کے بولنے کا انداز بڑا ہی پیارا اور اثر انگیز تھا۔

”اتنی بڑی حیثیت کا آدمی اکیلا رہتا ہے“ — نور نے کہا — ”اس کی زمینیں دیکھو کتنی دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔“

”میں تمہاری بات سمجھتا ہوں نور!“ — نور کے باپ نے کہا — ”میں جانتا ہوں تم نے کیا سوچ کر یہ بات کہی ہے لیکن کسی سے متاثر ہو کر فوراً ہی اپنی آئندہ زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کر لینا اچھا نہیں ہوتا۔ میں تمہارے متعلق ہی سوچتا رہتا ہوں۔ یہ اب مجھے سوچنے دو کہ تمہارے لئے حازق کا انتخاب کروں یا اور انتظار کر لوں۔“

نور تو اپنی زندگی کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن ابھی اس نے باپ کے ساتھ کھل کر بات نہ کی۔

وہ سم کوہ میں سالار اور یزی نے یہ جو تجربہ کیا تھا کہ حشیش کا داخلہ شہر میں بند کر دیا جائے اور تاجروں کا سامان کھول کر دیکھا جائے، پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ اس کی کامیابی کا ایک واقعہ سنایا جا چکا ہے۔ اُس نے دوسرا تجربہ یہ کیا تھا کہ کوئی شخص اُس کے قریب نہ آئے۔ اگر کسی کا اس کے قریب آنا بہت ہی ضروری ہوتا تو اس شخص کی پوری طرح جامہ تلاشی لی جاتی تھی۔ سالار اور یزی نے سب کو پیغام بھیجا کہ وہ بھی شاہ در میں یہی طریقے اختیار کرے۔ شاہ در ایک بڑا شہر تھا اور بڑی منڈی بھی تھی اور یہاں سے اناج دوسرے مقامات کو جاتا تھا۔ سالار اور یزی نے سب کو تفصیلی پیغام بھیجا کہ وہ تاجروں کا

سارا سلمان کھٹوا کر دیکھا کرے اور ایسا انتظام کرے کہ شہر کے اندر جو سلمان لایا جائے، خواہ وہ چھوٹی سی پوٹلی کیوں نہ ہو، کھول کر دیکھی جائے۔

سلار اور یزی نے دوسرا طریقہ یہ پیغام میں شامل کیا کہ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خواہ وہ غریب ہو یا امیر، اپنے قریب نہ آنے دے اور کسی کا آنا ضروری ہی ہو تو اُس کی جگہ تلاش لی جائے۔

جس وقت سلار اور یزی کا قاصد سب سے پہلے پیغام دے رہا تھا، اُس وقت نور شہر کے سب سے بڑے اور بڑے ہی خوبصورت بلغ میں حلق کے پاس ایک ایسے گوشے میں بیٹھی تھی جہاں انہیں ٹھنڈی ہواؤں کے سوا کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نور بالکل اُسی طرح حلق میں جذب ہو گئی تھی جس طرح شافیہ نے اپنے آپ کو عبید عربی کی ذات میں تحلیل کر لیا تھا۔ یہ صرف محبت نہیں بلکہ عشق کی دیوانگی تھی۔ نور پر تو اُس صحرا نور کی کیفیت طاری تھی جو بھٹک بھٹک کر پیاس سے مرنا کرتا اور اپنے آپ کو گھینٹا ایک نخلستان میں پہنچ گیا ہو اور اُس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ باقی عمر اسی نخلستان میں گزار دے گا۔ وہاں ٹھنڈا پانی تھا اور گھنے پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں تھی۔

اس کے بعد نور کی زندگی ایک بڑے ہی حسین خواب کی طرح گزرنے لگی۔ نور نے حلق کو بتا دیا تھا کہ اُس کا باپ علی الصبح نکل جاتا ہے اور وہ گھر میں دوپہر تک اکیلی ہوتی ہے۔ حلق نے نور کو اپنے ایک دوست کا گھر بتا دیا تھا جو اکیلا رہتا تھا۔ پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا کہ حلق کبھی نور کے گھر آ جاتا اور کبھی نور حلق کے دوست کے گھر میں چلی جاتی اور وہ بہت دیر اس طرح بیٹھے رہتے جیسے ان کے جسم ایک ہو گئے ہوں۔ حلق نے نور کو تو جیسے پتلا تازہ کر لیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ نور پتلا تازہ ہونا چاہتی تھی۔ اُس پر خود پردگی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔

اس کے ساتھ ہی حلق تقریباً "ہر روز نور کے باپ سے ملتا تھا اور اُس کی زمینوں میں عملی دلچسپی لیتا تھا۔ وہ اس طرح کہ اس نے نور کے باپ کے نوکروں کے ساتھ اپنے مزارعے بھی لگا دیئے۔ نور کا باپ کاشتکاری سے واقف نہیں تھا۔ حلق نے اس کا یہ کام آسان کر دیا۔ نور کے باپ نے دو تین مرتبہ حلق کو شام کے کھانے پر اپنے گھر مدعو کیا۔ یہ باپ اپنی بیٹی کی جذباتی حالت بھی دیکھ رہا تھا اور حلق کی نیت کو اور خلوص کو بھی دیکھ رہا تھا جس میں اسے کوئی شک و شبہ والی بات نظر نہیں آتی تھی۔

ایک روز حلق نے نور کے باپ سے نور کو مانگ ہی لیا۔ نور کا باپ تو اسی کا خضر تھا۔ حلق کے منہ سے بات نکلی ہی تھی کہ نور کے باپ نے بھد خوشی ہل کر دی۔

اب شادی کا دن مقرر کرنا تھا۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا، کسی دن بھی یہ بات طے ہو سکتی تھی.... شام گہری ہوئی ہی تھی کہ حلق کے گھر ایک گھوڑ سوار بڑے لمبے سفر سے آیا۔ حلق اٹھ کر اور بازو پھیلا کر اس سے بغلیہ ہو کر ملا۔ یہ سوار الموت سے آیا تھا اور حسن بن صباح کا ایک پیغام لایا تھا۔ حلق نے اپنے نوکر سے کہا کہ وہ ٹھنڈا مشروب لائے لیکن سوار نے کہا کہ پہلے وہ پیغام سن لے، کھانا پینا بعد کی بات ہے۔

”حلق بھائی!“ — سوار نے کہا — ”یہ تو تم جانتے ہو کہ شیخ الجبل کے پیر استاد عبد الملک بن عطاش قتل ہو چکے ہیں.... یہ جو انقلاب آیا ہے، اس سے تم واقف ہو۔ اس کے متعلق بات کرنا بیکار ہے۔ شیخ الجبل امام حسن بن صباح کو ایک اور غم کھا رہا ہے۔ اس کے پیر و مرشد نے اسے بتایا تھا کہ شہ در کے قریب انہوں نے ایک خزانہ چھپایا تھا۔ وہ جگہ کسی کو معلوم نہیں۔ امام نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ شہ در میں دو آدمی ہیں جو اس خزانے سے واقف ہیں۔ خزانہ ایسی چیز ہے کہ بھائی اپنے بھائی کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ وہ دو آدمی خزانے پر ہاتھ صاف کر جائیں گے۔ امام نے تمہارے لئے پیغام بھیجا ہے کہ پہلے ان دو آدمیوں کا سراغ لگاؤ۔ یہاں کے معاملات تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ اپنے تمام آدمیوں کو تم جانتے ہو۔ شیخ الجبل امام حسن بن صباح کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ جب ہمارے لوگ شہ در سے بھاگے تھے تو وہ دو آدمی بھی بھاگ گئے ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس خزانے کو ذہن سے اتار دینا چاہئے۔“

”عمار بھائی!“ — حلق نے حسن بن صباح کے اس قاصد سے کہا — ”تم شاید نہیں جانتے کہ میں امام حسن بن صباح کا کس قدر شیدائی اور گرویدہ ہوں۔ یہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں اس کی عظیم ذات کو دھوکہ دوں گا۔ خزانے سے جو دو آدمی واقف ہیں، ان میں ایک تو میں ہوں اور دوسرا شہ در کے اندر رہتا ہے۔ وہ بھی دھوکہ دینے والا آدمی نہیں۔ ہم دونوں یہاں اسی لئے ٹھہرے ہوئے ہیں کہ امام کا حکم آئے اور ہم یہ خزانہ نکال کر اس کے قدموں میں رکھ دیں۔ اگر کچھ دن اور امام کا حکم نہ آتا تو میں خود الموت پہنچ جاتا اور امام کو اس خزانے کے متعلق بتا دیتا۔“

”تو اب میں امام کو جا کر کیا جواب دوں؟“ — عمار نے پوچھا۔

”کنا کہ خزانہ کچھ دنوں تک الموت پہنچ جائے گا“ — حلق نے جواب دیا — ”تم کل صبح ہی واپسی سفر روانہ ہو جانا“۔

”شیخ الجبل امام نے مجھے ایک اور بات بھی کہی تھی“ — عمار نے کہا — ”اُس نے کہا تھا کہ تمہیں یا کسی در کو میری ضرورت ہو تو میں یہاں رہا رہوں“۔
 ”نہیں!“ — حلق نے کہا — ”تم چلے جاؤ۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ ہم دو آدمی کافی ہیں..... میں امام کے لئے ایک حور بھی لارہا ہوں“۔
 ”کون ہے وہ؟“ — عمار نے پوچھا — ”کہاں سے ملی ہے؟“

”شلہ در کے امیر احمد بن عطاش کی نوجوان بیوی تھی“ — حلق نے جواب دیا —
 ”ہمارے ہاتھوں سے شلہ در جو نکلا ہے، اس کے پیچھے اسی لڑکی اور اس کے باپ کا ہاتھ تھا..... لیکن عمار بھائی ایک مشورہ دو۔ مجھے پہلی بار کسی لڑکی کے ساتھ دلی بلکہ روحانی محبت ہوئی ہے۔ اپنی جنت کی حوروں کے ساتھ بھی وقت گزرا ہے اور زندگی میں چند اور لڑکیاں بھی آئی ہیں لیکن وہ سب جسمانی معاملہ تھا۔ یہ پہلی لڑکی ہے جو میرے دل میں اتر گئی ہے اور میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن امام کی اجازت کے بغیر میں شادی نہیں کروں گا“۔

”حلق بھائی!“ — عمار نے کہا — ”تم یہ خزانہ امام تک پہنچا دو اور ساتھ یہ کہہ دینا کہ یہ لڑکی تمہیں انعام کے طور پر دے دے تو مجھے یقین ہے امام انکار نہیں کرے گا۔ کیا تم لڑکی کو ساتھ لارہے ہو؟“

”لڑکی کو بھی اور لڑکی کے باپ کو بھی ساتھ لارہا ہوں“ — حلق نے جواب دیا —
 ”اگر میں لڑکی کو ساتھ نہ لایا تو یہ کسی سلجوقی کے قبضے میں چلی جائے گی“۔
 ”میں امام کو پہلے ہی بتا دوں گا“ — عمار نے کہا — ”اور تمہاری سفارش بھی کر دوں گا“۔



وہ دوسرا آدمی جو اس خزانے سے واقف تھا، حلق کا وہی دوست تھا جو شلہ در شہر میں اکیلا رہتا تھا اور نور حلق سے اس کے گھر میں کئی بار ملی تھی اور ہر بار اُس نے وہاں خلافت گزارا تھا۔ اگلے ہی روز حلق علی الصبح شہر کے دروازے کھلتے ہی آگیا اور نور کے گھر آ پہنچا۔ نور کا باپ ابھی روزِ مَرُو کے کام کاج کے لئے گھر سے نہیں نکلا تھا۔ نور

اسے دیکھ کر خوش بھی ہوئی اور حیران بھی کہ حاذق اتنی سویرے کیوں آگیا ہے۔ حاذق نے انہیں بتایا کہ وہ ایک ضروری بات کرنے آیا ہے۔

”تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ عبد الملک کے ساتھ میرے تعلقات کتنے گہرے تھے“ — حاذق نے کہا — ”تمہیں اندازہ نہیں کہ ہم کس حد تک ایک دوسرے کے ہمراز تھے۔ میں تمہارے ساتھ ایسی بات کرنے لگا ہوں جس کا کسی کے ساتھ ذکر نہ ہو ورنہ ہم تینوں قتل ہو جائیں گے۔ بات یہ ہے کہ عبد الملک نے شاہ در سے کچھ دور ایک جگہ بہت بڑا خزانہ چھپایا تھا۔ میں اُس کے ساتھ تھا اور ہمارے ساتھ ایک اور دوست تھا۔ عبد الملک مجھے باطنی سمجھتا تھا اور قابلِ اعتماد دوست بھی۔ میں اُس کی زندگی میں اُسے ایسا دھوکہ نہیں دینا چاہتا تھا کہ اپنے دوست کو ساتھ لے کر وہ خزانہ اُڑالے جاتا اور پھر کبھی ادھر کا رخ ہی نہ کرتا۔ اب وہ اس دنیا سے اٹھ گیا ہے اور اُس کے گھر کا کوئی مرد زندہ نہیں رہا تو میں نے سوچا کہ میں یہ خزانہ کیوں نہ نکال لوں!“

”یہ تمہارا جائز حق ہے“ — نور نے کہا — ”میرے دل سے پوچھو تو مجھے خزانے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں لیکن چونکہ یہ خزانہ ان بائنیوں کا تھا بلکہ بائنیوں کے پیرو مُرشد کا تھا اس لئے اسے اڑا لیتا یا نکال لیتا ایک نیکی کا کام ہے اور یہ تمہارا جائز حق ہے۔“

”مجھ سے پوچھو تو میں بھی یہی کہوں گا“ — نور کا باپ بولا — ”خزانہ نکالو اور اپنی ملکیت میں رکھو۔“

”لیکن میں اس خزانے کا اکیلا مالک نہیں بننا چاہتا“ — حاذق نے کہا — ”تم نے اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا ہے۔ خزانے پر میرا اتنا حق نہیں جتنا تم دونوں کا ہے۔ نور پر ان لوگوں نے جو ظلم ڈھائے ہیں، میں اس کی یہ قیمت دے سکتا ہوں کہ ان لوگوں کا خزانہ نور کے قدموں میں رکھ دوں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔“

”یہ بھی تو سوچو“ — نور کے باپ نے کہا — ”یہ سارا خزانہ لوٹ مار کا ہے۔ نہ جلنے یہ لوگ کب سے قافلوں کو لوٹ رہے ہیں اور یہ خزانہ اکٹھا کرتے رہے ہیں۔ اس خزانے کو نکال ہی لیتا چاہئے۔“

”تمہیں بھی تو لوٹنا گیا تھا“ — حاذق نے کہا — ”اللہ کا کرم دیکھو، تم سے جو لوٹا گیا تھا، اس سے کئی گنا زیادہ تمہیں اللہ نے دے دیا ہے.... خزانہ تو سمجھو نکل آیا۔ اب میں

وہ بات کہنے لگا ہوں جو بہت ہی ضروری ہے۔ ہم جب خزانہ نکالنے جائیں گے تو تم دونوں ہمارے ساتھ ہو گے۔ پھر ہم یہاں واپس نہیں آئیں گے ورنہ خزانہ چھپانا مشکل ہو جائے گا۔ ہم وہیں سے اصفہان چلے جائیں گے جہاں ہمیں جانے اور پہچاننے والا کوئی نہیں ہو گا۔ میں تمہیں خواب نہیں دکھا رہا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم تینوں وہاں شاہانہ زندگی بسر کریں گے۔“

حازق دراصل نور اور اس کے باپ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے تیار کر رہا تھا۔ وہ تیار ہو گئے تو اس نے انہیں بتانا شروع کیا کہ خزانہ کہاں ہے اور کس قسم کے خطروں میں سے گزر کر خزانے تک پہنچا جائے گا۔۔۔ شاہ در سے تقریباً ایک دن کی مسافت پر ایک بہت بڑی جھیل ہوا کرتی تھی۔ یہ جھیل نیم دائرے میں تھی۔ اس کے درمیان خشکی تھی اور اس خشکی پر بڑی اونچی اور کچھ نیچی چٹانیں تھیں۔ ان کے پیچھے خشکی ہی تھی لیکن کچھ آگے جا کر جھیل کا پانی پھر وہاں پھیل گیا تھا۔ اس جھیل کے کناروں پر دلدل تھی۔ یہ جگہ مگر مچھوں کے لئے بڑی موزوں تھی۔ اس جھیل میں مگر مچھ رہتے تھے جن کی تعداد بہت زیادہ تو نہیں تھی لیکن تھوڑی بھی تھی تو یہ تعداد بہت ہی خطرناک تھی۔ مگر مچھ بہت بڑے بڑے تھے اور ان میں مگر مچھوں کی وہ قسم بھی پائی جاتی تھی جن کی لمبائی تھوڑی سی ہوتی ہے۔

نور نے پوچھا کہ ان مگر مچھوں سے کس طرح بچا جائے گا تو حازق نے بتایا کہ اس کا انتظام وہ کرے گا اور یہ انتظام انہیں جھیل پر پہنچ کر دکھایا جائے گا۔ حازق نے یہ بھی کہا کہ انہیں جان کے خطرے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

خزانہ ایسی چیز ہے کہ انسان جان کا خطرہ بھی مول لے لیا کرتا ہے۔ باپ بیٹی ان خطروں میں کودنے کے لئے تیار ہو گئے اور حازق نے انہیں بتا دیا کہ کس روز روانہ ہوتا ہے۔ اس نے انہیں یہ بھی بتایا کہ روانگی کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ شاہ در کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ جائیں گے۔



دو دنوں بعد نور اور اس کا باپ گھر سے نکلے تو ان کے ساتھ گھر کا کچھ ضروری سامان تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے شاہ در سے نکل رہے تھے۔ کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی کہ یہ کیا اٹھا کر لے جا رہے ہیں اور کسی کو ذرا سا بھی شک نہ ہوا کہ یہ آج واپس نہ آنے کے

۱۔ جارہے ہیں۔ شہر سے نکل کر وہ اپنی کمیتوں میں گئے اور وہاں رکے نہیں۔ کام کرنے والے نوکروں نے کچھ دیر بعد آنا تھا۔ وہ چلتے چلے گئے اور حاذق کے گھر جا پہنچے۔ ایسے ہی طے کیا گیا تھا۔ حاذق ان کا منتظر تھا۔

کچھ دیر بعد حاذق کا دوست بھی آگیا۔ انہوں نے سارا دن وہیں گزارا۔ حاذق اور اس کا دوست باہر چلے گئے تھے کیونکہ انہوں نے بہت سے انتظامات کرنے تھے۔

شام گہری ہو گئی تو شاہ در کے تمام دروازے بند ہو گئے اور شہر باہر کی دنیا سے کٹ گیا۔ شہر سے تھوڑی ہی دور چھوٹے سے ایک گاؤں سے ایک گھوڑا گاڑی نکلی۔ یہ گھوڑا گاڑی حاذق کے گھر سے نکلی تھی۔ یہ کوئی شاہانہ بکھی نہیں تھی بلکہ بار برداری والی تھی۔ اس پر تازہ کٹی ہوئی ہری فصل کے چند ایک گٹھے لدے ہوئے تھے اور کچھ گھریلو سامان تھا جس میں دو تین چار پائیاں بھی تھیں۔ گھوڑوں کی باگیں حاذق کے ہاتھ میں تھیں اور اُس کے ساتھ اس کا دوست بیٹھا ہوا تھا۔ پیچھے سامان پر نور اور اس کا باپ سوار تھے۔

اس سامان کے ساتھ پانچ بھیڑیں بھی تھیں جو اس گاڑی میں جارہی تھیں۔ حاذق نے نور اور اس کے باپ کو بتایا تھا کہ یہ سامان نئی جگہ لے جانا بالکل ضروری نہیں، یہ اس لئے ساتھ لے جایا جا رہا ہے کہ خزانے کے بکس اس سامان کے نیچے چھپائے جائیں گے۔ خزانے والی جگہ۔ سے اصفہان تک کئی دنوں کی مسافت تھی اور لٹیروں کا خطرہ بھی تھا۔ بھیڑوں کے متعلق اس نے بتایا کہ یہ جھیل پر جا کر بتائے گا۔

جھیل تک کا سفر تقریباً ایک دن کا تھا لیکن حاذق نے کچھ دور جا کر گھوڑے دوڑا دیئے اور یہ سفر تیزی سے کم ہونے لگا۔ گھوڑے بڑے ہی تندرست اور اچھی نسل کے تھے۔ راستہ صاف تھا اس لئے ان کی رفتار تیز ہی تیز ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آدھے راستے میں حاذق نے گاڑی روک لی تاکہ گھوڑے ذرا دم لے لیں۔

آدھی رات کے بہت بعد وہ جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ حاذق نے گاڑی کو جھیل کے کنارے سے کچھ دور دور رکھا تاکہ مگر کچھ گھوڑوں پر لپک نہ سکیں۔ مگر کچھ پانی میں اپنا شکار پکڑا کرتا ہے، خشکی پر آکر وہ شکار نہیں کھیلا کرتا۔ حاذق نے ایسی جگہ جا گاڑی روکی جہاں چار پانچ کشتیاں کنارے پر رکھی ہوئی تھیں۔ یہ پانی میں نہیں بلکہ خشکی پر تھیں۔

سب گھوڑا گاڑی میں سے اترے۔ حاذق نے سامان میں سے چار بڑی مشطیں نکالیں اور چاروں کو جلا لیا۔ ان کے دستے ایک ایک گز سے زیادہ لمبے تھے اور ان کے

شعلے تو بہت ہی اوپر جا رہے تھے۔ حلق نے ایک ایک مشعل سب کو دے دی۔ اب چاروں کے ہاتھوں میں ایک ایک مشعل تھی۔

وہ جھیل کے کنارے پڑی ہوئی کشتیوں کے قریب گئے۔ دو کشتیاں تو بالکل ٹوٹ گئی تھیں۔ ان سب میں ایک کشتی بڑی بھی تھی اور صحیح سلامت بھی تھی اور اس میں دو چپو لگے ہوئے تھے۔ حلق اور اس کے دوست نے پانچوں بھیڑوں کو اٹھا کر کشتی میں ڈال لیا اور پھر حلق کے کہنے پر سب کشتی میں سوار ہو گئے۔ دونوں دوستوں نے چپو سنبھال لئے۔

کشتی کنارے سے ذرا ہی دور گئی ہو گی کہ مشعلوں کی روشنی میں دو تین مگر مچھوں کے منہ پانی سے ابھرے ہوئے نظر آئے۔ یہ مگر مچھ بڑی تیزی سے کشتی پر حملہ کرنے کے لئے آ رہے تھے۔ حلق کے دوست نے چپو چھوڑ کر ایک بھیڑ کو اٹھایا اور پانی میں پھینک دیا۔ سارے مگر مچھ اس بھیڑ کی طرف ہو گئے اور اُس پر ٹوٹ پڑے۔ بھیڑ نے ایسی خوفزدگی کے عالم میں آوازیں نکالیں کہ دل دہل جاتے تھے۔

یہ مگر مچھ اس بھیڑ کو چیرنے پھاڑنے لگے۔ یوں لگا جیسے پانی میں طوفان آگیا ہو، کشتی آگے نکل گئی۔ کچھ آگے گئے تو دو اور مگر مچھ کشتی کی طرف آتے نظر آئے۔ حلق کے دوست نے ایک اور بھیڑ کو اٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ یہ مگر مچھ بھی بھیڑ پر جھپٹ پڑے اور کشتی آگے نکل گئی۔

حلق نے نور اور اُس کے باپ کو بتایا کہ اب مگر مچھوں کا کوئی خطرہ نہیں رہا کیونکہ جھیل کے سارے مگر مچھوں کو پتہ چل گیا تھا کہ پانی میں کوئی نیا شکار آیا ہے۔ وہ سب بڑی تیزی سے میرتے اپنے اُن ساتھیوں تک جا پہنچے جو ان بھیڑوں کو چیر پھاڑ رہے تھے۔



آخر کشتی اُس خشکی تک جا پہنچی جو اس جھیل کے درمیان تھی۔ وہاں بھی ایک بھیڑ پھینکنی پڑی کیونکہ وہاں کنارے پر تین چار مگر مچھ موجود تھے۔ بھیڑ کے گرتے ہی وہ بڑی تیزی سے اس تک پہنچے اور حلق اور اس کا دوست کشتی کو کنارے تک لے گئے اور دونوں کو دگر خشکی پر گئے اور کشتی کا رسہ کھینچ کر ایک بڑے پتھر کے ساتھ باندھ دیا۔ نور اور اُس کے باپ کو بھی اُترنے کے لئے کہا گیا۔ دونوں بڑے آرام سے اُتر گئے۔

حلق آگے آگے جا رہا تھا۔ زمین بڑی ہی ناہموار تھی۔ چھوٹے بڑے پتھروں پر

پاؤں پڑتے اور پھسلتے تھے۔ ذرا آگے گئے تو چٹانوں کی گلیاں سی آگئیں۔ حیرت والی بات یہ تھی کہ یہ خشکی جھیل کے درمیان میں تھی لیکن وہاں گھاس کی ایک پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ ایسی چٹانیں بھی آئیں جن کے درمیان سے گزرنا ناممکن نظر آتا تھا لیکن یہ لوگ جسم کو سکیڑ سمیٹ کر گزر گئے۔ انہیں کئی موڑ کاٹنے پڑے اور چٹانیں اونچی ہی اونچی ہوتی چلی گئیں۔

قدرت نے ان چٹانوں کی شکل و صورت ایسی بنائی تھی کہ یہ انسانی معماروں کی بنی ہوئی لگتی تھیں۔ بعض جگہوں پر گلیاں اتنی تنگ تھیں اور چٹانیں اتنی اونچی کہ وہاں دم گھٹتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے یہ چٹانیں آگے بڑھ کر ان انسانوں کو کچل ڈالیں گی۔ آخر ایک گلی ایک غار کے دہانے پر جا ختم ہوئی۔

اس دہانے میں داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے وہ ایک کشادہ کمرے میں آگئے ہوں۔ ایک جگہ بہت سے پتھر ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ حاذق نے سب سے کہا کہ یہ پتھر ایک طرف پھینکنے شروع کر دو۔ نور کو بھی پتھر اٹھا اٹھا کر پھینکنے پڑے۔ کچھ پتھر تو زیادہ ہی وزنی تھے۔

پتھر آدھے ہی ہٹائے گئے ہوں گے کہ ان کے نیچے پڑے ہوئے چار بکس نظر آنے لگے۔ باقی پتھر بھی ہٹا دیئے گئے۔

حاذق اور اُس کے دوست نے چاروں بکسوں کے ڈھکنے اٹھا دیئے۔ بکس مقفل نہیں تھے۔ جب ڈھکنے اُٹھے تو نور اور اُس کے باپ کو تو جیسے غشی آنے لگی ہو۔ ان بکسوں میں سونے کے سکے اور زیورات تھے اور ہیرے اور جواہرات تھے اور ایک بکس میں بڑے قیمتی 'رنگ دار اور چمکدار چھوٹے چھوٹے پتھر تھے۔ یہ بادشاہوں کے کام کی چیزیں تھیں یا بڑے ہی امیر لوگ ان کے خریدار تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں سونا، ہیرے، جواہرات اور یہ پتھر چمکتے تھے اور ان میں سے رنگا رنگ کرنیں پھونتی تھیں۔ حاذق نے کہا کہ اب زیادہ وقت ضائع نہ کرو اور یہ بکس کشتی تک پہنچاؤ۔ اُس وقت حاذق اور اُس کے دوست کی جذباتی کیفیت ایسی ہو گئی تھی جیسے انہوں نے کوئی نشہ پی لیا ہو۔ یہ خوشی کی انتہا تھی اور یہ خزانے کا نشہ یا جادو تھا جو ان کے دماغوں کو چڑھ گیا تھا۔ وہ ہلکی ہلکی باتیں کرنے لگے جو خوشی کی انتہا کی علامت تھی۔

”یا شیخ الجبل!“ حاذق کے دوست نے بازو اوپر کر کے کہا — ”یہ سب تیری

دولت ہے۔ ہم یہ خزانہ تیرے قدموں میں رکھیں گے۔“

”ہمارے پیر اُستاد عبد الملک کی روح بھی خوش ہو جائے گی جب ہم اَلْمُوت....“
— حاذق بولتے بولتے چپ ہو گیا اور لہجہ بدل کر بولا — ”بکس جلدی اٹھاؤ، ہمیں
اصفہان پہنچنا ہے۔“

نُور کے باپ نے ان دونوں کی باتیں سن لی تھیں۔ حاذق نے اپنے دوست کی طرف
دیکھا اور نُور کے باپ نے منہ پھیر لیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اُسے یقین ہو گیا کہ
یہ دونوں باطنی ہیں اور یہ خزانہ اَلْمُوت لے جائیں گے۔ نُور کے باپ کو یہ معلوم نہیں تھا
کہ اُس کے اور اس کی بیٹی کے ساتھ یہ کیا سلوک کریں گے۔ اُس نے بڑی تیزی سے
سوچ لیا کہ کیا کرنا ہے۔

بکسوں کے دونوں طرف لوہے کے کُنڈے لگے ہوئے تھے جنہیں پکڑ کر بکس
اٹھائے جاتے تھے۔ ایک بکس حاذق اور اس کے دوست نے ادھر ادھر سے پکڑ کر اٹھالیا
اور دوسرا بکس نُور اور اُس کے باپ نے اٹھالیا۔ بکس وزنی تو تھے لیکن وہ اٹھا کر باہر لے
آئے۔ اب ان کے لئے چلنا خاصا دشوار ہو گیا تھا لیکن وہ بکسوں کو کہیں اٹھاتے اور کہیں
گھسیٹتے دھکیلتے جھیل تک لے آئے۔

انہوں نے یہ دونوں بکس کشتی میں رکھ دیئے۔ نُور کے باپ نے دیکھا کہ کشتی کا اگلا
حصہ خشکی پر تھا اور زیادہ تر حصہ پانی میں تھا۔ جب حاذق اور اس کا دوست بکس رکھ کر
واپس پھر غار کی طرف گئے تو نُور کے باپ نے کشتی کو دھکیل کر پانی میں کر دیا۔ کشتی رے
سے بندھی ہوئی تھی اس لئے اس کے بہہ جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ باپ بیٹی کشتی سے
کوڈ کر اترے اور خزانے کی طرف چلے گئے۔



جس طرح وہ چاروں پہلے دو بکس اٹھا کر لے آئے تھے اسی طرح باقی دو بکس بھی اٹھا
لائے۔ ایک ایک ہاتھ سے بکس اٹھاتے تھے اور دوسرے ہاتھوں میں ایک ایک مشعل
تھی۔

اب وہ کشتی کی طرف بکس اٹھا کر آرہے تھے تو پہلے کی طرح نُور اور اُس کا باپ پیچھے
نہیں تھے بلکہ آگے آئے آرہے تھے۔ وہ اتفاقاً آگے آگے نہیں آئے تھے بلکہ نُور کے
باپ نے کچھ سوچ کر یہ پھرتی دکھائی تھی کہ غار میں جا کر بکس اٹھالیا اور تیزی سے غار سے

نکل آیا تھا۔

نور اور اس کے باپ نے بکس کشتی میں رکھا اور دونوں کشتی میں آگئے۔ حاذق اور اُس کا دوست بکس اٹھائے ہوئے کشتی کے قریب آئے تو نور کے باپ نے لپک کر بکس پکڑا اور گھسیٹ کر کشتی میں کر لیا۔ اب اُن دونوں نے کشتی میں سوار ہونا تھا۔ نور کے باپ نے فوراً اپنی مشعل نور کے ہاتھ سے لی اور بڑی ہی تیزی سے مشعل پہلے حاذق کے جسم کے ساتھ لگائی اور پھر فوراً ہی اُس کے دوست کے جسم کے ساتھ لگادی۔

مشعل کا شعلہ بہت بڑا تھا۔ اس شعلے نے دونوں کے کپڑوں کو آگ لگادی اور آگ نے یکنخت اُن کے پورے لباس کو لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی نور کے باپ نے نور سے کہا کہ مشعل آگے کرو اور کشتی کا رسہ جلاؤ الو.... رسہ بندھا ہوا تھا جسے کھولنے کے لئے نور یا اُس کے باپ کو کشتی سے اُترنا تھا لیکن اتنا وقت نہیں تھا۔ نور نے مشعل آگے کر کے رستے کے درمیان لگادی۔ فوراً ہی رسہ جل گیا اور کشتی پانی میں آگئی بلکہ آہستہ آہستہ چل پڑی۔

حاذق اور اس کے دوست کے کپڑوں کو آگ لگی تو دونوں پانی میں کود گئے۔ آگ تو بجھ گئی لیکن ان کے جسم جل گئے تھے جن پر پانی پڑا تو تکلیف بڑھنے لگی۔ آخر وہ دونوں جوان اور دلیر آدمی تھے۔ پانی میں ہی دونوں نے اپنی تلواریں نکال لیں اور کشتی کی طرف لپکے۔ اتنی سی دیر میں نور اور اس کے باپ نے مشعلیں کشتی میں ٹھونک کر تیزی سے چپو مارے تو کشتی کنارے سے دُور آگئی لیکن وہ دونوں بھی کشتی کے قریب آگئے۔

نور کے باپ نے نور سے کہا کہ دونوں چپو سنبھالو اور کشتی کو رکنے نہ دینا۔ حاذق اور اس کا دوست بڑی تیزی سے تیرتے کشتی کے قریب آئے اور انہوں نے کشتی کو پکڑنے کی کوشش کی۔ نور کے باپ نے دونوں مشعلیں اٹھا کر ایک کا شعلہ حاذق کے چہرے پر اور دوسری کا شعلہ اس کے دوست کے چہرے پر رکھ دیا اور زور سے آگے کو دھکیلا۔ تصویر میں لایا جاسکتا ہے کہ اُن کی آنکھیں تو فوراً ہی بیکار ہو گئی ہوں گی اور چہرے تو بُری طرح جلے ہوں گے۔ دونوں کی اس طرح چیخیں سنائی دینے لگیں جیسے بھیڑیے غرا اور چلا رہے ہوں۔ اب ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آگے بڑھتے وہ تو ڈوب رہے تھے۔

نور کے باپ نے ایک چپو نور کے ہاتھ سے لے لیا اور دونوں تیزی سے چپو چلانے لگے۔ دونوں دائیں بائیں جھیل میں دیکھ رہے تھے کہ مگر مجھ نہ آجائیں۔ ابھی جاتے تو

ان کے پاس بندوبست موجود تھا۔ دو بھیڑیں ابھی کشتی میں موجود تھیں لیکن اب مگر مچھوں کو شکار مل گیا تھا۔ یہ تھا حلق اور اُس کا دوست۔ دُور سے ان دونوں کی بڑی ہولناک آوازیں سنائی دیں جو فوراً ہی ختم ہو گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں کو مگر مچھوں نے پکڑ لیا ہو۔ مشعلوں کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کشتی میں مشعلیں کھڑی رکھنے کا انتظام تھا۔ نور کے باپ نے دونوں مشعلیں ان جگہوں میں پھنسا دی تھیں۔



نور کے باپ نے یہ کوشش نہ کی کہ کشتی کو اُس جگہ تک لے جائے جہاں سے انہوں نے کشتی لی تھی اور جہاں گھوڑا گاڑی رکی کھڑی تھی۔ اُن دونوں نے کشتی کو قریبی کنارے پر لگا دیا اور اُتر آئے۔ دونوں نے پورا زور لگا کر کشتی کو اتنا کھینچا کہ آدمی کشتی خشکی پر آگئی۔

باپ نے نور سے کہا کہ وہ کشتی کے قریب کھڑی رہے اور اگر کشتی پانی میں جانے لگے تو اسے پکڑ کر کھینچ لے۔ وہ خود گھوڑا گاڑی لینے چلا گیا۔ اب وہ ہر خطرے سے نکل آئے تھے۔

نور کا باپ گھوڑا گاڑی وہیں لے آیا اور کشتی کے قریب روک کر باپ بیٹی کشتی سے بکس اتارنے لگے۔ وہ علاقہ ایسا تھا جہاں سے کسی انسان کا گزر نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ علاقہ کسی راستے میں نہیں آتا تھا اور خطرناک بھی اتنا تھا کہ ادھر سے کوئی گزرتا ہی نہیں تھا۔

دونوں نے زور لگا کر چاروں بکس گھوڑا گاڑی میں لاد لئے اور سوار ہو گئے۔ گھوڑوں کی باگیں باپ نے سنبھال لیں اور گاڑی شاہ در کی طرف موڑ کر چل پڑے۔ نور ابھی دیکھ رہی تھی کہ باپ یہ خزانہ کہاں لے جاتا ہے۔ نور کی توجہ دراصل خزانے پر تھی ہی نہیں۔ وہ بہت بڑے صدمے سے دوچار تھی۔ اُسے جس کے ساتھ روحانی محبت ہو گئی تھی، اسے وہ اپنے ہاتھوں جلا کر اور ڈبو کر جا رہی تھی۔ حاذق کے خیال سے اور اس کے انجام سے اُسے اتنا شدید صدمہ ہوا کہ اس کے آنسو بہہ نکلے اور پھر وہ بسک سک کر رونے لگی۔

”روتی کیوں ہو؟“ — باپ نے نور سے کہا — ”کیا ہمیں خوش نہیں ہونا چاہیے کہ ہم بہت بڑے دھوکے سے بچ گئے ہیں؟.... یہ باطنی تھے اور یہ سیدھے الموت جا

رہے تھے۔ مجھے تو یہ راستے میں ہی قتل کر دیتے اور تمہیں وہاں لے جا کر حسن بن صباح کے حوالے کر دیتے اور وہ ابلیس تمہیں اپنی جنت کی حُور بنا دیتا۔ آج تم ایک خاوند کی تلاش میں ہو، وہاں ہر روز تمہارا ایک نیا خاوند ہوتا.... اللہ کا شکر ادا کرو جس نے ہمیں اس ذلت سے بچا لیا ہے۔ خدا کی قسم مجھے اس خزانے کی خوشی نہیں، خوشی ہے تو یہ ہے کہ میں آخر تمہیں بچا لیا ہوں۔“

نور کو اصل غم تو یہ تھا کہ اُس کی قسمت میں یہی لکھا گیا تھا کہ ایک فریب کار کے چنگل سے نکلے تو ایک اور فریب کار کے جال میں آ جائے.... نور کے لئے یہ صدمہ برداشت کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بہر حال اس نے یہ انتہائی تلخ گھونٹ نگٹنے کی کوشش شروع کر دی اور باپ اسے سمجھاتا بھجھاتا گیا اور پھر اسے اُمید بھی دلاتا رہا کہ اُس کے لئے ایک مردِ حق یقیناً ”منتظر ہے۔ اللہ نے جہاں اتنا کرم کیا ہے وہاں وہ یہ کرم بھی ضرور کرے گا کہ نور کی شادی ہو جائے گی۔

نور کے باپ نے گھوڑے دوڑا دیئے۔ وہ بہت جلدی شاہ در پہنچنا چاہتا تھا۔ راستے میں وہ ایک جگہ رکے۔ گاڑی میں کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ گھوڑوں نے سستالیا اور باپ بیٹی نے کھاپی لیا اور پھر گاڑی میں سوار ہوئے اور باپ نے گھوڑے دوڑا دیئے۔



دن تقریباً ”آدھا گزر گیا تھا۔“ سب سے اپنے دفتر میں بیٹھا روزمرہ کے کام کاج میں مصروف تھا۔ اس کے ذمے بڑا ہی نازک اور پیچیدہ کام تھا۔ اُس نے اس شہر کو از سر نو آباد کرنا تھا اور اس شہر کو باغیوں سے صاف بھی کرنا تھا۔ دربان نے اسے اطلاع دی کہ باہر ایک آدمی آیا ہے جس کے ساتھ ایک بڑی خوبصورت اور جوان سال لڑکی ہے اور وہ گھوڑا گاڑی پر آئے ہیں۔ دربان نے بتایا کہ یہ وہی باپ بیٹی ہیں جنہیں کچھ عرصہ پہلے یہاں ایک مکان دیا گیا تھا اور زمین بھی دی گئی تھی۔

سب نے کسی حد تک بے دلی سے کہا کہ انہیں اندر بھیج دو۔ اُس نے غالباً ”یہ سوچا ہو گا کہ اپنی کسی ضرورت کی خاطر آئے ہوں گے۔ دربان نے باہر جا کر انہیں کہا کہ وہ اندر چلے جائیں لیکن نور کے باپ نے کہا کہ وہ اندر نہیں جانا چاہتے، سلطان خود باہر آئے۔“

سب کو جب یہ بتایا گیا کہ باپ بیٹی اُسے باہر بلا رہے ہیں تو سب جھنجھلاہٹ کے عالم

میں باہر آگیا۔ نور کے باپ نے اسے کہا کہ وہ گھوڑا گاڑی تک چلے۔ اُس وقت سب نے قدرے اکتاہٹ سے کہا کہ آخر بات کیا ہے؟ وہ کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ کوئی اسے جدھر لے جانا چاہے وہ اُس طرف چل پڑے۔ نور اور اُس کا باپ کچھ بھی نہ بولے اور اُسے گھوڑا گاڑی تک لے گئے۔

نور کے باپ نے گاڑی پر جا کر چاروں بکس کھول دیئے اور سلطان کو اشارہ کیا کہ وہ اوپر آجائے۔ سب پہلے ہی اکتایا ہوا تھا، وہ غصے کی حالت میں گھوڑا گاڑی پر چڑھا اور جب اُس نے کھلے ہوئے بکس دیکھے تو اُس پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہو گئی۔

”یہ مل کہاں سے آیا ہے؟“ — سب نے ہکلاتی ہوئی زبان سے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہا — ”یہ تو بے انداز اور بے حد قیمتی خزانہ ہے۔“

”یہ میں سلطان کو اندر بیٹھ کر بتاؤں گا کہ یہ مال کس طرح آیا ہے۔“ — نور کے باپ نے کہا — ”یہ سارا مال نہ آپ کا ہے نہ میرا ہے بلکہ یہ سلطنت سلجوقیہ کا مال ہے اور یہ وہ خزانہ ہے جو یہ باطنی ابلیس قافلوں سے لوٹتے رہے ہیں۔“

سب نے فوراً چاروں بکس اٹھوائے اور اپنے کمرے میں رکھوا دیئے پھر اُس نے باپ اور بیٹی کو اپنے پاس بٹھا کر پوچھا کہ یہ خزانہ کہاں سے آیا ہے۔ نور کے باپ نے اسے ساری داستان سنا ڈالی۔

”میں تمہیں اس میں سے دل کھول کر انعام دوں گا“ — سب نے کہا۔

”میں اس میں سے ایک ذرہ بھی نہیں لوں گا“ — نور کے باپ نے کہا — ”یہ سلطنت کی ملکیت ہے اور یہ اللہ کی امانت سمجھ کر استعمال کی جائے۔ میں اپنا انعام لے چکا ہوں۔ مجھے ممکن مل گیا ہے اور زمین بھی مل گئی ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔“

گو داستان کو واپس اُس مقام تک ملے جاتا ہے جہاں عبید عربی کی نشاندہی پر داستان بڑھی اور سبزیوں کے تاجر کو پکڑا گیا اور ایک روز کے بعد انہیں جلاد کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

سلار اور یزی نے عبید عربی کو بڑے پیار اور شفقت سے اپنے پاس بٹھایا اور اُس سے پوری بات سنی تھی اور عبید عربی نے اُسے اپنی وہی داستان سنائی تھی جو وہ شافیعہ کو سنا چکا تھا۔ اس کا یہ بیان پچھلے باب میں تفصیل سے پیش کیا جا چکا ہے۔

”اے سلجوقی سلار!“ — عبید عربی نے کہا تھا — ”میں اللہ کے وجود کا قائل ہو گیا ہوں۔ میں تو آپ کو قتل کرنے آیا تھا لیکن آج آپ سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اپنے ہاتھوں قتل کر دیں..... ہمارا خدا بھی حسن بن صباح تھا، رسول بھی حسن بن صباح اور حسن بن صباح کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو یوں قدر و احترام سے سنا کرتے تھے جیسے یہ بات آسمان سے اُترتی ہو۔ ہمارے لئے نیکی اور بدی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ہمارا امام کہا کرتا ہے کہ جو فعل تمہیں اچھا لگتا ہے وہ کرو اور اسے گناہ مت سمجھو۔ گناہ اس فعل کو کہتے ہیں جو تم نہ کرنا چاہو لیکن یہاں آکر میں نے اپنی اصلیت کو پالیا ہے۔“

”تمہیں اس کا اجر اللہ دے گا“ — سلار اور یزی نے کہا تھا — ”تم اُن کا انجام بھی دیکھ لو گے جن کی تم نے نشاندہی کی ہے اور تمہیں جو صد ملے گا وہ سب لوگ دیکھیں گے..... میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا ان دونوں کے علاوہ تم ایسے آدمی بتا سکتے ہو جو دسم کوہ میں موجود ہوں؟“

”نہیں قابل احترام سلار!“ — عبید عربی نے کہا تھا — ”ضرور ہوں گے لیکن یہ

ضروری نہیں ہوتا کہ کسی جگہ ہر باطنی دوسرے باطنیوں کو جانتا ہو۔ حسن بن صبح کے بعض فداؤں کو یوں چھپا کر رکھا جاتا ہے کہ کوئی دوسرا فدا لئی بھی اسے نہیں جانتا.... میں چونکہ آپ کو قتل کرنے کے لئے آیا تھا اس لئے میں ان ہی دو آدمیوں سے واقف ہو سکا جن کے ذمے مجھے پناہ میں رکھنا تھا۔ مجھے آپ کے قتل کے بعد خود کشتی کر لینی تھی یا موقع ملتا تو فرار ہونا تھا اور میرے پکڑے جانے کا بھی امکان تھا۔ اس صورت میں آپ نے تشدد اور ایذا رسانی کے ذریعے مجھ سے یہ راز اگلا لیتا تھا کہ یہاں کتنے باطنی ہیں اور وہ کہاں کہاں رہتے ہیں اور ان میں فدا لئی کون کون ہیں۔ میں نے اپنے اس راز پر اپنی جان دے دینی تھی لیکن ایذا رسانی سے بڑے مضبوط آدمی بھی ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور وہ راز اگل دیتے ہیں.... پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ ان کا سراغ لگا لوں۔ یہ بھی سن لیں کہ آپ کو تو ان لوگوں نے قتل کرنا ہی ہے، میری جان بھی خطرے میں آگئی ہے۔ میں نے حسن بن صبح کے دو بڑے ہی اہم اور تجربہ کار آدمی پکڑوا دیئے ہیں اور اب یہ لوگ موقع ملتے ہی مجھے قتل کر دیں گے لیکن میں جان کی بازی لگا کر باطنیوں کا سراغ لگاؤں گا۔“

سلار اور یزی نے کہا کہ وہ اُسے بچائے رکھنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ دوسرے باطنیوں اور فداؤں کا سراغ کہاں سے لگائے.... سلار اور یزی نے یہ بھی کہا کہ یہ دونوں آدمی جو عبید نے پکڑوائے ہیں کچھ بھی نہیں بتائیں گے۔

”یہ امید دل سے نکال دیں“ — عبید عربی نے کہا — ”انہیں آپ کوئی لالچ دے سکتے ہیں جو یہ کسی قیمت پر قبول نہیں کریں گے۔ دوسرا طریقہ ایذا رسانی کا ہے۔ یہ لوگ مرنا پسند کریں گے لیکن بتائیں گے کچھ بھی نہیں۔ میرا معاملہ کچھ اور ہے۔ آیا تو میں بھی مارنے اور مرنے کے لئے تھا لیکن میری جذباتی دنیا میں جو شدید زلزلہ آیا، یہ مجھے آپ کے سامنے اس صورت میں لایا جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ اسے میں اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ کہتا ہوں لیکن یہ دونوں آدمی اُس درجے کے باطنی ہیں جو فخر سے اپنی جانیں دے دیا کرتے ہیں۔ انہیں یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ آپ انہیں سزائے موت دیں گے۔“

”یہ تو میرا فیصلہ ہے“ — سلار اور یزی نے کہا — ”کل سارے شہر میں منلوں کرواؤں گا کہ دو باطنیوں کو قلعے کے باہر سزائے موت دی جائے گی اور تمام لوگ اس

وقت اکٹھے ہو جائیں۔ پھر میں انہیں....“

”گستاخی معاف قابل احترام سالار!“ — عبید عربی نے سالار اور یزی کی بات کاٹ کر کہا — ”آپ کی باقی بات بعد میں سنوں گا، ایک طریقہ میرے دماغ میں آگیا ہے جس سے باطنیوں کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ آپ ان دونوں کو سرعام سزائے موت دیں گے۔ یہ آپ بہت اچھا کریں گے کہ شر کے تمام لوگوں کو اکٹھا ہونے کو کہہ رہے ہیں۔ یہاں جتنے باطنی ہیں یا بڑھئی اور سبزیوں کے باغ کے مالک جیسے آدمی ہیں، وہ بھی لوگوں میں شامل ہوں گے۔ ان دونوں کے سر جلا د کاٹ چکے گا تو مجھے پورا پورا یقین ہے کہ ایک یا دو آدمی الموت کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ یہ ان کے فرائض میں شامل ہے کہ اس قسم کا سنگین واقعہ فوراً الموت جا کر حسن بن صباح کو سنائیں۔ آپ یہ بندوبست کریں کہ چند ایک آدمی شر کے ہجوم سے باہر باہر دیکھتے رہیں۔ وہ جب کسی ایک یا دو یا تین آدمیوں کو گھوڑوں پر سوار الموت کی طرف رخ کر کے جاتا دیکھیں تو انہیں گھیر کر پکڑ لیں۔ وہ یقیناً حسن بن صباح کے آدمی ہوں گے۔“

”وہ سب کے سب تو نہیں ہوں گے!“ — سالار اور یزی نے کہا — ”دوسرے پھر بھی شر میں ڈھکے چھپے رہیں گے، بہر حال مجھے تمہاری یہ تجویز بہت پسند آئی ہے۔ میں اس پر عمل درآمد کرواؤں گا۔“

”جو تجربہ اور دانشمندی آپ کو حاصل ہے وہ مجھے نہیں“ — عبید عربی نے کہا — ”لیکن میں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ منادی میں یہ بھی شامل کریں کہ تمام لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ گھروں میں سے نکل کر قلعے کے باہر اکٹھے ہوں اور ان دو آدمیوں کو جلا د کے ہاتھوں کشتا دیکھیں.... اس طرح یہ ہو گا کہ کوئی باطنی اپنے گھر میں بیٹھا نہیں رہے گا۔“

”تم اور شافعیہ بہت بڑے انعام کے حقدار ہو عبید!“ — سالار اور یزی نے خوش ہوتے ہوئے کہا — ”میں سمجھ نہیں سکتا کہ تم دونوں کو کیا انعام دوں۔“

”انعام کی حقدار تو شافعیہ ہے“ — عبید عربی نے کہا — ”اگر آپ ہم دونوں کو انعام دینا ہی چاہتے ہیں تو سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ مجھے شافعیہ کو اور شافعیہ مجھے دے دیں۔“

”یہ تو طے ہے“ — سالار اور یزی نے کہا — ”ان دونوں باطنیوں کو پرسوں جہنم

واصل کر کے میں تم دونوں کا نکاح پڑھا دوں گا۔“

سالار اور یزی نے اُسی وقت منزل آفندی اور بن یونس کو بلوایا اور عبید عربی کی تجویز انہیں سنائی۔ انہوں نے آپس کے صلاح مشورے سے طے کر لیا کہ یہ کارروائی کس طرح کی جائے۔



اگلی صبح سورج طلوع ہوا ہی تھا کہ دسم کوہ کا بچہ بچہ قلعے کے باہر گھوڑ دوڑ کے میدان کے ارد گرد اکٹھا ہو گیا تھا۔ منادی میں یہ حکم بھی شامل تھا کہ تمام لوگ حکماً باہر آئیں گے۔ عورتیں اُس طرف جو قلعے کی دیوار تھی، اُس پر اکٹھی ہو گئی تھیں۔ گھر بالکل خالی ہو گئے تھے۔ بڑھئی اور سبزیوں کے باغ والے کو قلعے سے نکالا گیا۔ ان کے ہاتھ اُن کی پیٹھوں کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ چار محافظ انہیں لے جا رہے تھے۔ ہجوم نے اس طرف سے انہیں راستہ دیا اور ان دونوں کو میدان کے وسط میں لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد سالار اور یزی اپنے چھ گھوڑ سوار محافظوں کے ساتھ قلعے سے باہر نکلا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔

محافظ ہجوم کے پیچھے رک گئے اور سالار اور یزی وہاں جا پہنچا جہاں دونوں باطنیوں کو کھڑا کیا گیا تھا۔ منزل آفندی اور بن یونس بھی وہیں تھے لیکن وہ تماشائیوں کے ہجوم کے پیچھے گھوڑوں پر سوار تھے اور ایک دوسرے سے دُور دُور تھے۔ ان کی نظریں ہجوم پر لگی ہوئی تھیں اور وہ دونوں ایک جگہ رکتے نہیں تھے بلکہ گھوڑوں کو آہستہ آہستہ ہجوم کے پیچھے پیچھے چلا رہے تھے۔ ان کے ساتھ سالار اور یزی کے محافظ دستے کے دو گھوڑ سوار بھی تھے۔ وہ بھی ہجوم کے پیچھے پیچھے ایک طرح کی گشت کر رہے تھے۔ محافظ دستے کے دو آدمی شہر کی دیوار پر اُس جگہ کھڑے تھے جہاں سے قلعہ الموت کی طرف جانے والا راستہ نظر آتا تھا۔ وہاں سے الموت تک دونوں کی مسافت تھی۔

”اے ایمان والو!“ — سالار اور یزی نے بڑی ہی بلند اور گونج دار آواز میں ہجوم سے خطاب کیا — ”یہ دو آدمی میرے یا سلطنت سلجوقیہ کے مجرم نہیں بلکہ یہ اللہ، رسول اور دین اسلام کے مجرم ہیں۔ یہ حسن بن صباح کے پیروکار ہیں جسے ابلیس نے زمین پر اتارا ہے۔ یہ دونوں باطنی یہاں فدائیوں کو پنہاں میں رکھتے تھے اور اب انہوں نے ایک ایسے فدائی کو پنہاں دی تھی جو مجھے قتل کرنے آیا تھا لیکن اللہ کی قدرت دیکھو کہ یہ

دونوں میرے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں۔ اگر حسن بن صباح اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہے یا اُس کے ہاتھوں میں کوئی خدائی طاقت ہے تو ان دونوں کو قتل ہونے سے بچالے لیکن اس کے پاس جو طاقت ہے وہ اعلیٰ سیست کی طاقت ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ان دونوں کو ذاتی انتقام کے طور پر قتل کر رہا ہوں۔ میں اللہ کی راہ میں ہر وقت قتل ہونے کے لئے تیار رہتا ہوں۔ تمام لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ باطنی ہونا بہت بڑا جرم ہے جس کی سزا موت ہے۔ اس شر میں ابھی اور باطنی موجود ہیں۔ یہ تم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ جس کسی پر شک ہو کہ وہ باطنی ہے، اس کے متعلق اطلاع دے۔ یہ بھی سُن لو کہ صرف شک پر بھی میں سزائے موت دوں گا۔ اگر حسن بن صباح یہ اعلان کر دے کہ اُس کا مذہب بالکل الگ تھلگ ایک مذہب ہے جس کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تو پھر کسی باطنی کو صرف اس لئے سزا نہیں دی جائے گی کہ وہ باطنی ہے۔ ہر کسی کو مذہبی آزادی حاصل ہے لیکن یہ لوگ اسلام کا چہرہ مسخ کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ یہ ایسا گناہ ہے جسے میں معاف نہیں کر سکتا کیونکہ معاف کرنے کو بھی میں گناہ سمجھتا ہوں۔ حسن بن صباح کے حکم سے ہمارے بہت سے علمائے دین، خطیب اور امام اور وزیر قتل کئے جا چکے ہیں۔ ان باطنیوں نے مرو میں خانہ جنگی بھی کروادی تھی۔ میں ان بے گناہوں کے خون کا انتقام لے رہا ہوں۔“

سالار اور یزی ایک طرف ہٹ گیا اور اُس کے اشارے پر جلاد جو سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھا اور ہاتھ میں چوڑے پھل والی تلوار تھی، تیزی سے آگے آیا اور اس نے ایک باطنی کو زمین پر دو زانو کر کے اُسے آگے کو جھکا دیا۔ اس کی تلوار بلند ہوئی اور دوسرے ہی لمحے اس باطنی کا سر اس کے جسم سے الگ ہو کر مٹی میں گر پڑا تھا۔ اس کے بعد دوسرے باطنی کو بھی اسی طرح جہنم واصل کر دیا گیا۔

سالار اور یزی نے حکم دیا کہ ان کی لاشیں دُور جنگل میں لے جا کر پھینک دی جائیں۔



اتنا بڑا ہجوم باطنیوں کی لاشوں کی طرف دوڑ پڑا۔ لوگ لاشوں کو ٹھڈ مارنے لگے اور ان پر انہوں نے تھو کا بھی۔ ہجوم میں سے مختلف آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ پیچھے والے لوگ کہہ رہے تھے کہ انہیں بھی لاشوں پر تھوکنے کا ثواب حاصل کر لینے دیا جائے۔ ایک

بڑی ہی بلند اور دہنگ آواز گرج رہی تھی۔۔۔ ”زندہ رہے گا تو صرف اسلام رہے گا“
 — معلوم نہیں یہ کون تھا۔ لوگ اسلام زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور آگے بڑھ
 کر باطنیوں کی لاشوں پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تھے۔ کچھ لوگ ان باطنیوں کی کھوپڑیوں کو
 ٹھڈ مار مار کر ہجوم سے باہر لے گئے اور اسی طرح ٹھڈ مارتے مارتے دُور جنگل تک لے
 گئے اور کہیں پھینک کر واپس آئے۔ تھوڑی سی دیر میں دونوں لاشوں کی کھال اتر چکی
 تھی اور اب لوگ انہیں پتھر مار رہے تھے۔

سالار اور یزی نے شہر کی دیوار پر دو آدمی کھڑے کر رکھے تھے۔ وہ اس ہجوم کو دیکھ
 رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ دو گھوڑ سوار ہجوم میں سے نکل کر اُس راستے پر ہو گئے
 تھے جو الموت کو جاتا تھا۔ مزل، بن یونس اور ان کے دو اور ساتھی ان سواروں کو نہیں
 دیکھ سکے تھے۔ دیوار پر جو آدمی کھڑے تھے وہ بڑی تیزی سے دوڑتے نیچے آئے اور
 انہیں مزل آفندی نظر آیا جو اس بے قابو اور بھڑے ہوئے ہجوم کے ارد گرد اپنے
 گھوڑے پر سوار گشت کر رہا تھا۔

دیوار سے اتر کر آنے والے آدمیوں نے مزل کو بتایا کہ وہ دیکھ نہیں سکا کہ دو سوار
 ہجوم میں سے نکل کر الموت کی سمت چلے گئے ہیں۔ مزل نے گھوڑا دوڑا کر اور کچھ آگے
 جا کر دیکھا۔ اُسے وہ دونوں سوار نظر آ گئے۔ اتنی دیر میں وہ خاصی دُور نکل گئے تھے۔

”بن یونس اور دوسرے دو آدمیوں کو ڈھونڈ کر جلدی لاؤ“ — مزل آفندی نے
 ان آدمیوں سے کہا۔ ”میں ان دونوں کے پیچھے جاتا ہوں اور تم دونوں بھی پیچھے پیچھے آ
 جانا۔“

مزل آفندی نے گھوڑا تیز نہ دوڑایا۔ رفتار اتنی ہی رکھی کہ وہ دونوں سوار اُس کی
 نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ آگے گھنا جنگل تھا اور ٹیکریاں اور چٹانیں بھی تھیں
 جن کی وجہ سے راستے میں کئی موڑ تھے اور ان موڑوں کی وجہ سے سوار نظروں سے
 اوجھل ہو جاتے تھے۔

مزل کم و بیش ایک میل دُور نکل گیا تھا جب بن یونس چار آدمیوں کے ساتھ
 گھوڑے دوڑاتا اُس تک پہنچ گیا۔ یہ چار آدمی سالار اور یزی کے محافظ دستے کے منتخب
 سوار تھے۔ وہ صرف شہسوار ہی نہیں تھے بلکہ بڑے ہی تجربہ کار چھاپہ مار بھی تھے....
 الموت کی طرف جانے والا یہ راستہ ٹیکریوں میں سے جاتا تھا اور آگے آگے جانے والے

دونوں سوار نظر نہیں آتے تھے۔ منزل آفندی نے اپنی اس سوار جماعت کے ساتھ گھوڑوں کو ایڑ لگادی اور فیکریوں کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ اگلے دونوں سوار اس راستے سے آگے نکل گئے تھے اور وہ منزل کو نظر آ گئے۔ اس جماعت نے اپنے گھوڑوں کی رفتار خاصی کم کر دی۔ شک تو یہ تھا کہ یہ دونوں آدمی باطنی ہیں اور الموت حسن بن صباح کو اطلاع دینے جا رہے ہیں کہ عبید عربی نے ان دو آدمیوں کو پکڑوا کر سزائے موت دلوا دی ہے جن کے ہاں اُس نے پناہ لی تھی لیکن یہ دونوں سوار کوئی عام سوار بھی ہو سکتے تھے۔ انہیں روک کر پوچھنا تو بے کار تھا کہ وہ کون ہیں۔ انہوں نے یہ تھوڑے ہی بتا دینا تھا کہ وہ باطنی ہیں اور الموت جا رہے ہیں۔ منزل آفندی اور بن یونس سوچ رہے تھے کہ یہ کس طرح معلوم کیا جائے کہ یہ دونوں مشکوک ہیں۔

اگلے دونوں سوار چلتے چلے گئے اور پیچھے والے چھ سوار اُن کی رفتار سے ذرا تیز چلتے گئے۔ آگے علاقہ کچھ ہموار آگیا تھا۔ ذرا اور آگے گئے تو آگے جانے والے دونوں سواروں میں سے ایک نے پیچھے دیکھا۔ اُس نے اپنے ساتھی کو اپنے سر سے کچھ اشارہ کیا تو اُس نے بھی پیچھے دیکھا۔ دونوں نے گھوڑوں کی رفتار خاصی تیز کر لی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے تعاقب میں آنے والے سواروں سے خاصا زیادہ آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔

”یہ ہمارے ملزم ہیں“ — منزل آفندی نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا — ”انہیں جلانے نہ دینا۔“

سب نے گھوڑوں کو ایڑ لگادی اور گھوڑے دوڑ پڑے۔ اگلے دو سوار اگر مشتبہ یا ملزم نہ ہوتے تو وہ پرواہ ہی نہ کرتے بلکہ رُک کر دیکھتے کہ ان لوگوں نے گھوڑے کیوں دوڑائے ہیں لیکن انہوں نے بھی گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور ان کے گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ تعاقب میں جانے والے سواروں کے جو گھوڑے تھے وہ فوجی گھوڑے تھے جنہیں بڑی اچھی خوراک ملتی تھی اور تھے بھی وہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے۔ تھوڑی ہی دُور جا کر ان گھوڑوں نے اگلے سواروں کے ساتھ فاصلہ بہت ہی کم کر دیا۔

اگلے دونوں سوار ایک دوسرے سے الگ الگ ہو گئے۔ ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف چلا گیا۔ ان کے تعاقب میں جانے والوں کی تعداد چھ تھی۔ انہوں نے بھی اپنے گھوڑوں کو پھیلادیا یعنی تین ایک طرف اور تین دوسری طرف ہو گئے اور گھیرا ڈالنے کے انداز سے ان کے پیچھے گئے۔ اُن دونوں سواروں نے بچ نکلنے کے لئے گھوڑوں

کو انتہائی تیز رفتار کر لیا لیکن فوجی گھوڑے اُن پر جا پہنچے۔

”زندہ پکڑنا ہے“ — منزل نے بڑی ہی بلند آواز سے اپنے ساتھیوں سے کہا —
”پکڑے نہ جائیں تو زخمی کر کے گرا لو، قتل نہیں کرنا۔“

ایک سوار گھیرے میں آ کر رُک گیا۔ اُس نے تلوار نکال لی اور تعاقب میں جانے والوں نے بھی تلواںیں نکال لیں لیکن اس آدمی نے مقابلہ نہ کیا بلکہ تلوار اپنے دل کے مقام پر رکھ کر ایسی دیباہی کہ آدمی تلوار اس کے جسم میں داخل ہوئی اور پیچھے سے اُس کی نوک باہر آ گئی۔ وہ گھوڑے سے گرا اور جب اسے جا کر دیکھا تو اُس نے اتنا ہی کہا کہ تم کسی فدائی کو زندہ نہیں پکڑ سکو گے اور پھر اس کے ساتھ ہی اُس نے آخری سانس لی اور مر گیا۔

اس کا ساتھی بھی گھیرے میں آ گیا تھا لیکن اُس نے تلوار تو نکالی، خود کشی نہ کی بلکہ مقابلے میں اُتر آیا۔ پہلے تو اس کا مقابلہ تین سواروں کے ساتھ تھا۔ اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر جس طرح گھوڑے کو گھما پھرا کر پینترے بدلے اور تلوار گھمائی اس سے پتہ چلا کہ یہ بڑا ہی ماہر تیغ زن ہے۔ اُس نے ایک آدمی کو زخمی بھی کر دیا لیکن زخم شدید نہ تھا۔
تین سواروں نے گھوم گھوم کر اس پر وار کئے لیکن وہ ہر وار بچا گیا حتیٰ کہ اُس کا گھوڑا ذرا سا زخمی ہو گیا۔ توقع تھی کہ گھوڑا زخمی ہو کر بھاگ اُٹھے گا اور سوار کے قابو سے نکل جائے گا لیکن سوار نے اسے قابو میں رکھا۔ وہ شخص دراصل جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ اُسے آخر مارے ہی جانا تھا لیکن وہ اس کوشش میں تھا کہ جاتے جاتے دو تین آدمیوں کو بھی لیتا جائے۔

پہلے تو اس کا مقابلہ تین آدمیوں کے ساتھ تھا۔ اُس کے ساتھی نے اپنے آپ کو خود ہی قتل کر لیا تھا اس لئے جو تین آدمی اس کی طرف گئے تھے وہ بھی ادھر آ گئے اور اب یہ اکیلا سوار چھ آدمیوں کے گھیرے میں آ گیا تھا اور منزل نے ایک بار پھر کہا کہ اسے زندہ پکڑو۔

اب یہ چھ کے چھ آدمی اس کوشش میں تھے کہ یہ سوار خود کشی کے لئے اپنی تلوار اپنے پیٹ پر رکھے تو فوراً ”جھپٹ کر تلوار چھین لی جائے لیکن وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر رہا تھا بلکہ جم کر اور پینترے بدل بدل کر چھ گھوڑوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اُسے زخم آچکے تھے اور یہ سب زخم اُس کی ٹانگوں پر تھے۔ یہ چھ تیغ زن سوار اس کوشش میں تھے

کہ اسے جان سے نہ مارا جائے اور اتنا ساز خنی کر دیا جائے کہ گر بھی پڑے اور زندہ بھی رہے۔

آخریوں ہوا کہ منزل کے ایک سوار نے پیچھے سے آکر اس کی تلوار والا ہاتھ زخمی کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اسے ایسا پکڑا کہ گھوڑے سے گرا دیا۔ تین چار سواروں نے اتر کر اس پر قابو پایا۔ انہوں نے دوسرا کلام یہ کیا کہ اسی کی چادر پھاڑ کر اس کے زخموں پر باندھ دی تاکہ دسم کوہ تک اس کا خون اتنا نہ نکل جائے کہ وہ زندہ ہی نہ رہ سکے۔ اسے اسی کے گھوڑے پر ڈال دیا گیا۔ اس پر غشی طاری ہو چکی تھی۔ اس کے دوسرے ساتھی کا گھوڑا بھی پکڑ لیا گیا اور اس کی لاش وہیں پڑی رہنے دی۔

جب یہ قافلہ واپس دسم کوہ کے قریب آیا تو بن یونس کو ایک احتیاط کا خیال آ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ دسم کوہ میں اور باطنی بھی ہوں گے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ ان کے دو ساتھی الموت روانہ ہو گئے ہیں۔ احتیاط یہ کرنی چاہئے کہ انہیں یہ معلوم نہ ہو سکے کہ الموت جانے والوں میں سے ایک مارا جا چکا ہے اور دوسرے کو زخمی کر کے پکڑ لائے ہیں۔

بن یونس نے بڑی اچھی بات سوچی تھی لیکن ان کے پاس کوئی ایسا کپڑا نہیں تھا جس سے اس باطنی کو چھپا لیتے۔ منزل نے اپنے ساتھیوں کو وہیں روک لیا اور ایک سے کہا کہ وہ دسم کوہ جائے اور وہاں سے تریاں یا کبل یا بڑے سائز کی دو بوریاں لے آئے۔ اس سوار نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

دسم کوہ کوئی دور نہیں تھا وہ سامنے نظر آ رہا تھا۔ سوار دو بڑی بوریاں لے کر واپس آ گیا۔ بے ہوش باطنی کو اس طرح دو بوریوں میں بند کر کے گھوڑے پر ڈال آیا گیا جیسے یہ کوئی سامان ہو۔ یہ قافلہ چل پڑا اور دسم کوہ میں داخل ہوا اور وہاں سے سالار اور یزی کے ہاں جا پہنچا۔ انہوں نے زخمی باطنی کو گھوڑے سے اتارا اور اندر ایک کمرے میں لے گئے۔ اس سے بوریاں اتار دیں اور جب سالار اور یزی نے دیکھا تو فوراً ”حکم دیا کہ جراح اور طبیب کو لایا جائے۔“



طیب اور جراح آئے تو سالار اور یزی نے انہیں بتایا کہ یہ بے ہوش زخمی باطنی ہے اور اس کے سینے کے راز نکالنے ہیں۔ جراح نے کہا کہ پہلے اس کے زخموں کا

بندوبست کریں گے ماکہ خون رک جائے ورنہ یہ خون نکل جانے سے ہی مر جائے گا۔
 ”خون نکل جانے دو“ — بوڑھے طبیب نے کہا — ”اس کے جسم میں اتنا ہی
 خون رکھا جائے گا جو اسے زندہ رکھے گا۔ اس کا زیادہ سے زیادہ خون نکل جانا چاہئے۔“
 جراح نے اور باقی سب نے حیرت زدگی کے عالم میں طبیب کی طرف دیکھا۔ وہ اتنا
 ہی جانتے تھے کہ خون نکل جانے سے انسان مر جاتا ہے لیکن طبیب کا تجربہ کچھ اور کہتا
 تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ یہ باطنی ہے اور اس کے سینے سے راز نکالنے ہیں۔ باطنی اپنی جان
 دے دیا کرتے تھے، راز نہیں دیتے تھے۔ طبیب جانتا تھا کہ باطنیوں کے خون میں حشیش
 کے علاوہ نہ جانے کیسی کیسی جزی بوٹیوں کے اثرات شامل ہوتے ہیں۔ اُس نے کچھ
 عرصہ گزر اُمرو میں دو باطنیوں کا یہی علاج کیا تھا کہ وہ اتفاق سے زخمی تھے اور طبیب نے
 ان کا خون بسہ جانے دیا تھا اور پھر انہیں ایسی غذا اور ایسی دوائیاں دیتا رہا تھا کہ نیا خون پیدا
 ہوا تو وہ باطنی راز دینے پر آگئے تھے۔ اس باطنی پر بھی طبیب وہی طریقہ آزما رہا تھا۔ اس
 طبیب نے کوئی جزی بوٹی دریافت بھی کر لی تھی جو ذہن کو نارمل حالت میں لے آتی
 تھی اور جسم پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے تھے۔

”کیا خون نکل جانے سے یہ مر نہیں جائے گا؟“ — سالار اور یزی نے پوچھا۔
 ”میں زندگی اور موت کی ضمانت نہیں دے سکتا“ — طبیب نے کہا — ”میں
 صرف یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ یہ زندہ رہ گیا تو آپ اسے بدلے ہوئے روپ میں دیکھیں
 گے اور اگر اس کے زخم فوراً ٹھیک کر دیئے گئے اور یہی خون اس کے جسم میں رہا تو پھر
 آپ ایذا رسانی کے ذریعے اس کی جان لے سکتے ہیں، راز نہیں۔“

سب خاموش ہو گئے اور طبیب نے زخمی کے منہ میں قطرہ قطرہ پانی پکانا شروع کر
 دیا۔ اس پانی میں اُس نے دوائی ملا دی تھی۔ کچھ دیر پانی پلا کر اُس نے زخمی کے منہ میں وہ
 دودھ پکانا شروع کر دیا جس میں شہد ملا ہوا تھا۔ زخمی کے زخموں سے خون اُلتا ہی چلا آ
 رہا تھا۔ وہ تنومند جوان تھا اور اس کے جسم میں سیروں کے حساب سے خون موجود تھا۔



سورج غروب ہو رہا تھا جب طبیب نے اپنی انگلیاں زخمی کی نبض پر رکھ دیں۔ زخمی
 کے چہرے کا رنگ ایسا پھیکا پڑ گیا تھا جیسے اس کی زندگی کا بھی سورج غروب ہو رہا ہو۔ اُس
 کے زخموں کے نیچے ایک خاصا بڑا برتن رکھا ہوا تھا، وہ بھر چکا تھا.... طبیب نے جراح سے

کہا کہ اب وہ اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر دے تاکہ مزید خون لکنا بند ہو جائے۔ زخمی بے ہوش تھا اور اب اس کی سانسوں کا تسلسل کمزور سا ہو گیا تھا۔ جراح نے زخموں کو صاف کر کے مرہم پٹی شروع کر دی۔

دوائیاں لگا کر پٹیاں باندھ دی گئیں تو طبیب نے ایک بار پھر زخمی کے منہ میں پانی پٹکانا شروع کر دیا جو اس کے حلق سے اترتا چلا جا رہا تھا۔ یہ ثبوت تھا کہ وہ زندہ ہے اور پانی قبول کر رہا ہے ورنہ پانی اس کے منہ سے واپس لکنا شروع ہو جاتا۔ اس طرح خلاصا پانی پٹکا کر طبیب نے پھر اسے شہد ملا دودھ قطرہ قطرہ دینا شروع کر دیا۔

”بہتر ہے آپ سب اپنے اپنے کام کاج میں لگ جائیں“ — طبیب نے کہا —
 ”اپنے اپنے ٹھکانے پر چلے جائیں اور آرام کریں۔ یہ کل دوپہر کے بعد شاید ہوش میں آئے گا اور اب میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ اللہ کی رضا سے زندہ رہے گا۔“

وہ رات گزر گئی، اگلا دن بھی گزر گیا اور پھر ایک رات اور آگئی۔ طبیب اس دوران زخمی کے منہ میں کچھ نہ کچھ پٹکا تا رہا۔ اس میں شہد ملا دودھ بھی تھا، دوائی ملا پانی بھی تھا اور کچھ اور دوائیاں بھی تھیں اور وہ زخمی کے زخموں کو بھی دیکھ رہا تھا کہ ان سے خون تو نہیں نکل رہا.... خون بند ہو چکا تھا اور اب زخمی کے منہ میں طبیب کچھ پٹکا تا تھا تو زخمی اپنا منہ خود ہی کھول دیتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہوش میں آ رہا ہے لیکن اس قدر کمزوری محسوس کر رہا ہے کہ اس سے بولا بھی نہیں جاتا۔

وہ رات گزری اور اس رات کے بطن سے جس صبح نے جنم لیا، وہ صبح امید افزا ثابت ہوئی۔ زخمی نے بڑی ہی نحیف آواز میں پوچھا، ”میں کہاں ہوں؟“
 ”اپنے عزیزوں کے پاس!“ — طبیب نے کہا — ”دل پر کوئی غم اور بوجھ نہ رکھو۔ تم وہاں ہو جہاں تمہارے لئے پیار ہی پیار ہے۔“



زخمی ابھی اتنا کمزور تھا کہ وہ اٹھ بیٹھ نہیں سکتا تھا لیکن وہ ہوش و حواس میں آ گیا تھا۔ طبیب اس کی ہر حرکت بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں دائیں بائیں گھومتی تھیں اور آنکھوں کی ان حرکات کو بھی طبیب بڑی اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ طبیب کے انداز میں ایسی شفقت تھی جس کا اظہار زخمی زبان سے تو نہیں کرتا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے معلوم ہوتا تھا جیسے متاثر تو ہو رہا ہے لیکن یہ سمجھ نہیں پا

رہا کہ وہ ہے کمال!

ایک دن اور ایک اور رات گزر گئی جب سے زخمی یہاں آیا تھا، تین مرتبہ اُس کے زخموں کی پٹی بدلی گئی تھی اور اب خون نہیں نکلتا تھا۔ وہ بیٹھنے لگا اور اُسے مقوی غذائیں دی جانے لگیں جو وہ اپنے ہاتھ سے کھاتا تھا۔

طیب نے منزل آئندی، بن یونس اور باقی ان افراد کو جن کا زخمی کے کمرے میں جانے کا امکان تھا، خصوصی ہدایات دے دی تھیں کہ زخمی کے ساتھ اُن کا رویہ اور باتیں کس قسم کی ہوں گی۔ جب طیب نے دیکھا کہ اب زخمی کے ہوش و حواس بحال ہو گئے ہیں اور صرف جسمانی کمزوری ہے تو اُس نے سالار اور یزی اور دو تین اور افراد کو کمرے میں آنے کی اجازت دے دی۔ زخمی کا ردِ عمل یہ تھا کہ وہ حیرت سے ہر فرد کو دیکھتا اور اس کے ماتھے پر شکن آجاتے جیسے وہ اپنے آپ سے پوچھ رہا ہو کہ یہ کون لوگ ہیں اور اسے اس سوال کا جواب نہ مل رہا ہو۔ زخمی سالار اور یزی کو اچھی طرح جانتا تھا اور تقریباً ہر روز اُسے دیکھتا تھا۔ منزل آئندی اور بن یونس سے بھی وہ واقف تھا اور جب عبید علی اُس کے سامنے آیا تو بھی وہ سوچ میں گم ہو گیا کہ اس جواں سال خوبرو آدمی کو کہاں دیکھا تھا۔

”میں شاید ایک بڑے ہی حسین خواب سے بیدار ہوا ہوں“ — زخمی نے کہا —
”میں خواب میں ایک بہت ہی خوبصورت اور بڑی ہی خوشنما جگہ دیکھ رہا تھا جس میں حسین اور نوجوان لڑکیاں بھی تھیں اور کہتے تھے یہ جنت ہے اور یہ خوریں ہیں معلوم نہیں وہ خواب تھا یا یہ خواب ہے جو میں دیکھ رہا ہوں“ — اُس نے کچھ دیر سوچ کر جھنجھلاہٹ کے لہجے میں کہا — ”میں خواب اور حقیقت میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔“

طیب نے اُسے ایک دوائی دی جس کے اثر سے وہ سو گیا۔ طیب نے الگ جا کر سالار اور یزی وغیرہ سے کہا کہ اب یہ جواں سال باطنی ہمارے قبضے میں آگیا ہے۔ اگر میں کامیاب نہ ہوتا تو یہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوتا اور مقابلے پر اُتر آتا۔ اس کے ذہن سے زخمی ہونے سے پہلے کی زندگی کی ہر بات نکل گئی ہے۔ اب اس سے پوچھنا ہے کہ وہاں کیا ہوتا تھا اور وہ یہاں کیا کرتا تھا۔

یہ تبدیلی اُسی رات سامنے آگئی۔ زخمی کو بدستور مقوی غذا کھلائی جا رہی تھی۔ طیب نے اسے دوائیاں بھی دیں اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ زخمی پچھلی زندگی کی باتیں

یوں ذہن پر زور دے دے کر یاد کرتا تھا جیسے اُس نے واقعی خواب دیکھا تھا۔ زخمی چُپ ہو گیا اور خلاؤں میں گھوڑنے لگا جیسے اُسے کوئی خاص بات یاد آگئی ہو یا وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”وہ میری بہن تھی“ — زخمی نے کہا اور اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا جو غصے کی علامت تھی۔ اس نے غضبناک آواز میں کہا — ”وہ میری بہن تھی اور میں اُس کے ساتھ نہیں میں اس شیطان کو قتل کر دوں گا“۔

وہ بے قابو ہو چلا تھا، طیب اور سالار اور یزنی نے پیار اور محبت اور شفقت سے اُسے ٹھنڈا کر لیا اور پوچھا کہ وہ اصل بات بتائے اور حسن بن صباح کو قتل کرنے کا انتظام وہ خود کریں گے۔

اُسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ اس کی ایک بہن تھی جو اُسے یاد آئی تو اس کا ذہن بیدار ہو گیا اور زخمی ہونے سے پہلے کی ساری زندگی اُس کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ اُس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ قلعہ الموت حسن بن صباح کو یہ اطلاع دینے جا رہا تھا کہ ہمارے دو آدمی اس شخص نے پکڑا کر مروا دیئے ہیں جسے الموت سے سالار اور یزنی کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وہ جس انداز اور جس لہجے میں بات کر رہا تھا اس میں رنج و ملال تھا، تاسف بھی تھا اور کچھ عتاب بھی تھا۔ اس نے بتایا کہ اُس کا باپ حسن بن صباح کا ایسا مرید تھا کہ اسے خدا کا بھیجا ہوا نبی سمجھتا تھا۔ اس کی عمر پندرہ سولہ سال تھی اور اس کی ایک چھوٹی بہن تھی جس کی عمر تیرہ سال تھی۔ ان کی ماں فوت ہو گئی۔

وہ اور اس کی بہن اپنے باپ کے لئے مسئلہ بن گئی۔ باپ نے دو سری شادی نہ کی اور ایک روز وہ اسے اور اس کی بہن کو ساتھ لے کر الموت چلا گیا۔ یہ لوگ بغداد کے رہنے والے تھے۔

باپ نے الموت جا کر اُسے اور اس کی بہن کو حسن بن صباح کے سامنے پیش کر دیا اور التجا کی کہ امام اس کے بچوں کو قبول کر لے اور یہ اس کے لئے بڑی سعادت ہوگی۔ اس کی بہن بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ باپ ان دونوں کو حسن بن صباح کے حوالے کر کے وہاں سے آگیا۔

بہن بھائی کو پہلے اپنی ماں یاد آیا کرتی تھی، اب باپ بھی یاد آنے لگا اور پھر گھر کی یاد

بھی ستانے لگی لیکن یہ کیفیت صرف دو تین دن رہی۔ وہاں حسن بن صباح کے استادوں نے ان دونوں کی ایسی برین واشنگ کی کہ وہ اپنی ماں باپ اور گھر کو بھول گئے۔ انہیں الگ الگ کر دیا گیا تھا۔ یہ تو انہیں معلوم ہی نہ ہو سکا کہ انہیں جو شاہی کھانے کھلائے جا رہے ہیں ان کھانوں میں حشیش کے علاوہ اور بھی اشیاء ملی ہوئی ہوتی ہیں جو انسان کی سوچ اور فکر اور شخصیت کو ہی بدل دیتی ہیں۔ اس شخص کو اپنی بہن کے ساتھ بہت ہی پیار تھا لیکن بہن کو اس سے الگ کر دیا گیا تو اس نے ذرا سا بھی محسوس نہ کیا کہ اس کی بہن اب اس کے ساتھ نہیں اور نہ جانے اُسے کہاں لے گئے ہیں۔ وہ نہ سمجھ سکا کہ حسن بن صباح انسانی فطرت سے بڑی اچھی طرح واقف ہے۔ وہ جانتا تھا کہ فدائی اُس وقت بننے شروع ہوتے ہیں جب عقل اور روح ابھی کچی ہوتی ہے اور پھر فدائی اس وقت بنتے ہیں جب ان تمام اعمال کی نہ صرف اجازت دے دی جاتی ہے بلکہ ان کا ارتکاب لازمی قرار دے دیا جاتا ہے جن میں لذت اور لطف ہوتا ہے۔ وہ دراصل یہ بیان کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اَلْمَوْتُ میں انسانوں کے ضمیر مار دیئے جاتے ہیں۔ ضمیر کے احتجاج اور ردِ عمل کو دبانے کے لئے ہی وہاں حشیش پلائی جاتی تھی اور گناہوں کا نشہ بھی خاری کر دیا جاتا تھا۔ اصل نشہ تو ان حسین اور نوجوان لڑکیوں کا ہوتا تھا جنہیں اس جنت کی حُوریں کہا جاتا تھا اور انہیں خاص تربیت دی جاتی تھی۔ ان لڑکیوں کی بھی برین واشنگ کی ہوئی ہوتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو سچ سج جنت کی حُوریں سمجھتی تھیں۔ حسن بن صباح کے عقیدے کی بنیاد یہ تھی کہ جو بات یا جو عمل اور فعل دل کو اچھا لگے کر گزر دے۔

اُس نے بتایا کہ تھوڑے ہی عرصے بعد اُس کے دل سے خون کے رشتوں کا تقدس صاف ہو گیا۔ کسی فدائی کو کہا جاتا کہ اپنی ماں کا گلا کاٹ دو یا اپنے باپ کو قتل کر دو تو وہ یوں اپنی ماں اور اپنے باپ کو قتل کر دیتا تھا جیسے وہ اس کے بدترین دشمن تھے اور وہ ان دونوں کو قتل کرنے کے لئے ہی پیدا ہوا تھا۔ حسن بن صباح نے بعض بیٹوں کے ہاتھوں اپنے باپوں کو قتل کروایا، بعض باپوں نے حسن بن صباح کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے بیٹوں کو قتل کر دیا تھا۔

اس باطنی نے جس نے اپنا نام ابن مسعود بتایا تھا ایک بڑی ہی تکلیف دہ بات سنائی۔ اُس نے کہا کہ ساڑھے چار پانچ سال بعد جب وہ پکا فدائی بن چکا تھا، اسے جو حُور دی گئی وہ اس کی سگی چھوٹی بہن تھی۔ ان دونوں کی ذات میں یہ احساس بیدار ہوا ہی نہیں کہ یہ

بہن بھائی ہیں۔ ابن مسعود کا یہ احساس و سم کوہ میں آٹھ نو سال بعد بیدار ہوا تھا جب طیب نے اس کے ذہن کو بیدار کر دیا تھا۔ اُس کا خون ایک بار پھر جوش میں آگیا اور وہ مٹھیاں بھیج کر اور دانت پیس کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں حسن بن صباح کو قتل کروں گا“ — اُس نے کہا — ”پھر میں اُسی مخبر سے اپنے آپ کو مار لوں گا“۔

”بیٹھ جاؤ ابن مسعود!“ — طیب نے کہا — ”تمہاری یہ خواہش اور یہ ارادہ بھی پورا ہو جائے گا لیکن ابھی اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔ تمہارے زخم ابھی کچے ہیں۔ اگر تم نے خون کو یوں گرمایا اور اتنا لابل دیا تو زخم کھل سکتے ہیں پھر تم کچھ نہیں کر سکو گے۔“

سلار اور یزی نے بھی اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے تسلیاں دیں کہ وہ بھی یہی کام کرنا چاہتے ہیں اور وہ صرف حسن بن صباح کو ہی قتل نہیں کریں گے بلکہ الموت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ اس طرح دوسروں نے بھی کچھ نہ کچھ کہہ کر اسے ٹھنڈا کر لیا۔

وہ بار بار یہی کہتا تھا کہ حسن بن صباح کو اپنے ہاتھوں قتل کرے گا اور اپنی بہن کو وہاں سے واپس لے آئے گا۔ ایک بار تو اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی بہن کا سامنا بھی نہیں کر سکے گا اور وہ بہن کو بھی قتل کر دے گا۔

اس سے پوچھا گیا کہ فدائی بن کر وہ کیا کام کیا کرتا تھا.... اُس نے اپنے اُن کاموں کی تفصیل سنائی جو اس سے گزرے ہوئے چھ سات برسوں کے عرصے میں کروائے گئے تھے۔ یہ پُر اسرار غارت گری اور عیش و عشرت کی روئیداد تھی۔ اُس نے کہا کہ قتل کرنا اور پھر قتل ہو جانا اور سینے میں خنجر اتار لینا ایسے ہی تھا جیسے کوئی آدمی سو گیا اور جاگ اٹھا اور پھر سو گیا۔ اس نے بتایا کہ الموت میں انسان کو اُس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں وہ خود کشی میں بھی لذت محسوس کرتا ہے۔

”اس کے بعد مجھے قافلے لوٹنے کا کام دے دیا گیا تھا“ — ابن مسعود نے کہا —

”میں آج پہلی بار محسوس کر رہا ہوں اور اپنے آپ پر لعنت بھیجتا ہوں کہ میں درندوں سے بڑھ کر ظالم تھا اور میں نے معصوم بچوں اور بے گناہ مردوں اور عورتوں کا خون بہایا ہے۔ ہم قافلوں پر اس طرح جھپٹ پڑتے تھے جس طرح بھیڑیے بھیڑوں کے ریوڑ پر نوٹ پڑتے ہیں۔ ہم بھیڑیوں سے کم نہ تھے۔ کوئی آدمی ذرا سی بھی مزاحمت کرتا یا یہ شک ہوتا کہ یہ مزاحمت کرے گا ہم اس کے سینے میں خنجر اتار دیا کرتے تھے۔ میں نے

ماؤں کی گودیوں سے بچے اور بچیاں نوچی ہیں۔ ہمارے لئے حکم تھا کہ کوئی خوبصورت بچہ اور کوئی خوبصورت بچی نظر آئے تو اسے اٹھا لو۔ ہم قافلے کو لوٹ کر واپس آتے تو پیچھے خون کی ندی چھوڑ آتے تھے۔ کچھ دُور تک ہمیں چیختی چلاتی ماؤں اور دھاڑیں مار مار کر روتے آدمیوں کی جگر پاش آوازیں سنائی دیتی تھیں جو ہمارے گھوڑوں کے ٹاپوں میں دب جاتی تھیں۔ ہمیں اس کامیابی پر اس قدر خوشی ہوتی تھی کہ ہم چیختے اور چلاتے تھے۔ ہمارے ساتھ قافلے سے اٹھائی ہوئی چند ایک نوجوان لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ ہم ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور عیش موج کر کے جشن مناتے تھے.... مجھے آج یہ بھی یاد نہیں کہ کتنے انسان میرے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔ کیا وہ سینکڑوں میں تھے یا ہزاروں میں، مجھے کچھ یاد نہیں.... میں نے یہ قتل و غارت نشے کی حالت میں کی تھی اور کبھی یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک خواب تھا اور اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی اور اب میں بیدار ہوں لیکن وہ حقیقت تھی۔ مجھے درندہ بنادیا گیا تھا اور میں اس میں روحانی لذت محسوس کرتا تھا.... اب میں انتقام لوں گا۔ مجھے جنہوں نے قاتل بنایا تھا اب میں انہیں قتل کروں گا۔

”تم اکیلے یہ کام نہیں کر سکو گے“ — سالار اور یزی نے کہا — ”قتل کرنے جاؤ گے اور جاتے ہی خود قتل ہو جاؤ گے۔ ہم تمہیں بار بار کہتے ہیں کہ یہ ہمارا کام ہے۔ ہم اس اڈے کو ہی اکھاڑ پھینکیں گے جہاں قاتل تیار کئے جاتے ہیں اور معصوم بچوں کو گناہوں کی وادیوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور جہاں بہن بھائی کا مقدس رشتہ بھی دم توڑ جاتا ہے.... انتقام لینے کے لئے کوئی خاص طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ تم صرف یہ بتا دو کہ یہاں وسم کوہ میں کون کون باطنی ہے اور فدائی کون کون ہے۔ ان کی نشاندہی کرو اور ہم پہلے انہیں پکڑتے ہیں اور نکوار تمہارے ہاتھ میں دیں گے کہ یہ لو ان کی گردنیں اڑا دو۔“

ابن مسعود نے تین مکان بتائے اور کچھ لوگوں کے نام بھی لئے۔ سالار اور یزی نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اپنے محافظ دستے کے کماندار کو بلایا اور ان مکانوں پر چھاپہ مارنے کے لئے کچھ ضروری ہدایات دیں۔ اُس نے کہا کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہو۔ چھاپہ مار دستہ فوراً ”گھوڑوں پر سوار ہوا اور ان تینوں مکانوں پر بیک وقت چھاپہ مارا گیا۔ ان تینوں مکانوں میں سے جو افراد پکڑے گئے ان میں تین جواں سال اور بڑی خوبصورت عورتیں تھیں، سلت آدمی تھے اور بچہ ایک بھی نہ تھا۔ ان کو پکڑنے کے لئے

بڑھے تو ان میں سے چار نے مخنجر نکال لئے لیکن وہ مقابلے پر نہ آئے بلکہ مخنجر اپنے دلوں میں اتار لئے اور گرفتاری سے بچ کر دنیا سے ہی اٹھ گئے۔ دو آدمیوں نے بڑے آرام سے اپنے کپڑوں کے اندر سے کچھ نکالا اور منہ میں ڈال لیا۔ وہ وہیں کھڑے رہے۔ چھاپہ مارنے والے انہیں پکڑنے کو آگے بڑھے تو وہ بڑے اطمینان سے خود ہی آگے آگئے اور چھاپہ ماروں نے انہیں گرفتار کر لیا لیکن چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ وہ گر پڑے اور مر گئے۔ انہوں نے زہر کھا کر خود کشی کر لی تھی۔

تین عورتیں جو پکڑی گئی تھیں، ان کے چہروں پر ذرا سا بھی کوئی خوف یا ملال نہ تھا بلکہ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سی مسکراہٹیں تھیں۔ تینوں مکانوں میں سے کچھ مقدار حشیش کی اور کچھ جڑی بوٹیاں برآمد ہوئیں اور سونے کی شکل میں خاصا مال ملا۔ اس کے علاوہ مخنجر کھواریں اور تیرو کمان ملے۔

صرف ایک آدمی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ چھاپہ مار اس گھر میں داخل ہوئے تو وہ جواں سال آدمی بالائی منزل کے ایک کمرے میں سے نکلا۔ اُس نے نیچے دیکھا اور پھست سے اس طرح کوڈا کہ منڈیر سے لٹکا اور گلی میں کود گیا۔ ایک چھاپہ مار اُسے پکڑنے کے لئے باہر کو دوڑا لیکن وہ جواں سال باطنی چھاپہ ماروں کے کھڑے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے پر کود کر سوار ہوا اور ایڑ لگا دی۔ جتنی دیر میں اُسے پکڑنے والا چھاپہ مار اپنے گھوڑے پر سوار ہوتا تھا اتنی دیر میں وہ باطنی دُور نکل گیا تھا۔ چھاپہ مار کچھ دُور تک اس کے تعاقب میں گیا لیکن وہ بہت ہی فاصلہ طے کر گیا تھا اور اب اُس کے پیچھے جانا بے کار تھا۔

سات ہی آدمی ہاتھ آئے تھے جن میں سے چھ نے خود کشی کر لی اور ساتواں بھاگ نکلا۔ پیچھے تین عورتیں رہ گئیں جنہیں سالار اور یزی کے حوالے کر دیا گیا۔ سالار اور یزی نے ان سے پوچھا کہ وہ ان کی بیویاں تھیں اور وہ یہاں کیا کرتی تھیں۔

”ہم میں سے کوئی بھی کسی کی بھی بیوی نہیں تھی“ — ان تینوں میں سے ایک نے پُر اعتماد لہجے میں کہا — ”ہم ان سب کی داشتائیں تھیں اور ان کی تفریح کا ذریعہ، ہمارا کوئی اور کام نہیں تھا۔ ہم صرف یہ بتا سکتی ہیں کہ قتل کی باتیں ہوتی رہتی تھیں اور پھر یہ پتہ چلا کہ عبید عربی نام کے ایک آدمی نے بھانڈہ ہی پھوڑ دیا ہے۔“

ان عورتوں سے راز لینے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ کچھ بھی نہ بتا سکیں اور

آخر اسی کوچ مان لیا گیا کہ یہ کچھ بھی نہیں جانتیں۔



یہ سارا واقعہ بہت بڑا کارنامہ تھا جو خواہ کسی نے ہی سرا انجام دیا تھا، یہ سالار اور یزی کے کام آیا۔ اتنی بڑی کامیابی کو وہ اپنے تک ہی محدود نہیں رکھ سکتا تھا۔ اُس نے سلطان محمد کو اطلاع دینے کے لئے ایک قاصد مَرُو بھیج دیا۔ دوسرا قاصد سخر کی طرف شاہ در بھیجا۔ سخر بھی سلطان ہی تھا۔

سالار اور یزی کا قاصد سلطان محمد کے پاس پہنچا اور پیغام سنایا تو سلطان محمد کچھ دیر قاصد کو دیکھتا رہا جیسے اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو یا جیسے وہ قاصد کی بات نہ سمجھ سکا ہو۔ اسے توقع نہیں تھی کہ کہیں سے اس قسم کی خبر بھی آئے گی کہ حسن بن صباح کے ایسے آدمی بھی پکڑے جائیں گے اور راز فاش کر دیں گے جو پھر دل تھے۔ سلطان محمد کی حیرت زدگی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک دو روز پہلے اُسے سخر نے پیغام بھیجا تھا کہ بہت بڑا خزانہ ہاتھ آیا ہے۔ اس خزانے کے ساتھ دوسری اچھی خبر یہ تھی کہ حسن بن صباح کے دو بڑے ہی تجربہ کار تخریب کار پکڑے گئے اور انہیں مگر مچھوں نے کھالیا تھا۔

اُس وقت حسن بن صباح کی سلطنت دُور دُور تک پھیل گئی تھی اور وہ اس سلطنت کا بے تاج بادشاہ تھا۔ کم و بیش ایک سو چھوٹے اور بڑے قلعے باطنیوں کے قبضے میں تھے۔ یہ کوئی باقاعدہ سلطنت نہیں تھی، یہ حسن بن صباح کے اثرات تھے جو لوگوں نے اس انداز سے قبول کر رکھے تھے کہ حسن بن صباح دلوں پر راج کرتا تھا۔ تاریخ نویسوں نے بھی اس کے زیر اثر علاقوں کو اُس کی سلطنت ہی لکھا ہے..... اتنی بڑی سلطنت میں حسن بن صباح کے دو چار تخریب کاروں اور فدائیوں کا مارے جانا کوئی ایسا نقصان نہیں تھا کہ حسن بن صباح کے بازو اور اس کے اثرات کمزور ہو جاتے۔ اُس کے پاس پچاس ہزار سے زائد فدائی تھے لیکن نور کے باپ نے جس طرح خزانہ حاصل کر لیا تھا اور اس کے تخریب کاروں کو مگر مچھوں کے حوالے کر دیا تھا اور پھر عبید عربی نے جو پردے اٹھائے اور اور دو باطنیوں کو سزائے موت دلوائی تھی اور پھر ابن مسعود کا واقعہ تھا، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ سلطان محمد، سلطان سخر اور سالار اور یزی اور ان کے دیگر سالاروں کے حوصلوں میں جان آگئی اور ان سب نے ان واقعات کو خدائی اشارہ سمجھا کہ فتح حق پرستوں کی ہو گی۔

اُدھر الموت میں دسم کوہ سے بھاگا ہوا باطنی حسن بن صباح کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ دسم کوہ میں کیا انقلاب آگیا ہے۔ اس نے تفصیل سے سنایا کہ عبید عربی جو سالار اور یزی کو قتل کرنے گیا تھا، اُس نے اپنے ہی دو آدمی سالار اور یزی سے قتل کروادیئے ہیں اور پھر ایک اور پرانے فدائی ابن مسعود نے دسم کوہ کے تمام باطنیوں کو پکڑوا دیا ہے لیکن وہ پکڑے نہیں گئے بلکہ انہوں نے خودکشی کر لی ہے۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ حسن بن صباح اس قسم کی خبروں سے کبھی پریشان نہیں ہوا تھا لیکن اب اسے ایسی کوئی خبر ملتی تھی تو وہ گہری سوچ میں کھو جاتا اور اُس کے چہرے پر رنج و الم کا تاثر آ جاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو عمر تھی۔ وہ خاصا بوڑھا ہو چکا تھا۔ دوسری وجہ اُس کے پریشان ہونے کی یہ تھی کہ اُس نے ابھی تک اپنی فوج نہیں بنائی تھی۔ فوج سے مراد تربیت یافتہ لشکر تھا جسے وہ میدان جنگ میں لڑا سکتا۔ اُس کے پاس فدائیوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور اس کے فدائی اُس کے اشارے پر اپنی جانیں قربان کر دیا کرتے تھے لیکن وہ صرف چھری چاقو چلانا جانتے تھے اور لوگوں کو دھمکے میں لا کر قتل کرنے کے فن کے ماہر تھے۔ اُس نے تھوڑے عرصے سے اپنے مشیروں اور مصاحبوں سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ باقاعدہ فوج تیار کی جائے جو باقاعدہ جنگ کی تربیت یافتہ ہو۔ وہ مشیروں سے کہتا تھا کہ سلجوقی ایک نہ ایک دن الموت پر حملہ ضرور کریں گے۔ بے شک الموت کا قلعہ ناقابلِ تسخیر تھا۔ ایک تو وہ وسیع و عریض چٹان پر بنایا گیا تھا اور اُس کے تین طرف دریا تھا لیکن وہ بے خبر نہیں تھا کہ مسلمان قربانی دینے پر آگئے تو وہ اس قلعے میں داخل ہو جائیں گے۔

اُس نے اسی وقت اپنے مشیروں وغیرہ کو بلایا اور بتایا کہ دسم کوہ میں کیا ہوا ہے اور ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ کوئی پیروکار اس طرح غداری نہ کرے۔ کچھ دیر صلاح مشورے اور بحث مباحثے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہر شہر اور قصبے میں دو دو فدائی بھیج دیئے جائیں جو وہاں اپنے آدمیوں پر نظر رکھیں اور اُن سے ملتے ملائے رہیں اور جہاں کہیں شک ہو کہ فلاں شخص غداری کرے گا کسی ثبوت کے بغیر اس شخص کو قتل کر دیا جائے۔

جب سے حسن بن صباح کا پیر استاد عبد الملک بن عطاش قتل ہوا تھا، حسن بن صباح کچھ مغموم سا رہنے لگا تھا۔ شاید وہ تنہائی محسوس کر رہا تھا.... دسم کوہ سے بھاگ کر آنے والا آدمی حسن بن صباح کو ساری بات سنا چکا تو حسن بن صباح کو اپنا پیر و مرشد بہت یاد

آیا۔ اس پر کبھی کوئی مشکل آپڑتی تو وہ اپنے مرشد کی طرف قاصد بھیج کر مشورہ لے لیتا یا اسے اپنے ہاں بلا لیتا تھا۔ اب وسم کوہ کی یہ خبر سن کر اسے اپنا پیر و مرشد عبد الملک بن عطاش یاد آیا لیکن اب اسے اپنے مرشد سے زیادہ وہ خزانہ یاد آیا جسے نکلوانے کے لئے اس نے قاصد کو حلق کے پاس بھیجا تھا اور حلق نے قاصد کو یقین دلایا تھا کہ وہ کچھ دنوں بعد وہ خزانہ شیخ الجبل امام حسن بن صباح کے قدموں میں لا رکھے گا۔ بہت دن گزر گئے تھے شاہ در سے حلق نے کوئی اطلاع نہیں بھیجی تھی کہ اس نے خزانہ نکل لیا ہے یا نہیں۔ اسے یہ خیال آ رہا تھا کہ حلق خزانہ نکل چکا ہو تا تو اب تک وہ الموت پہنچ گیا ہو تا۔ حلق نے خزانہ شاہ در تو نہیں لے جانا تھا۔

حسن بن صباح کو شک ہونے لگا کہ حلق دھوکہ نہ دے گیا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ خزانہ ایسی چیز ہے جو پاپ بیٹے کو اور سکے بھائیوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتا ہے.... وسم کوہ سے بھاگا ہوا آدمی ابھی اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ حسن بن صباح کے دو تین مصاحبین بھی وہاں موجود تھے۔ اس نے ان کے ساتھ شاہ در کے خزانے کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ خزانہ پیر و مرشد عبد الملک بن عطاش چھپا گیا تھا اور دو آدمی اس خزانے کی اصل جگہ سے واقف تھے اور اس جگہ تک پہنچنے کا راستہ صرف ان دو کو معلوم تھا لیکن ابھی تک وہ دونوں نہیں پہنچے۔

”یا امام!“ — ایک مصاحب نے کہا — ”زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ خزانے کا معاملہ ہے۔ اس آدمی کو ایک بار پھر شاہ در بھیجیں اور وہ حلق سے مل کر واپس آئے اور بتائے کہ وہ کیا کر رہا ہے.... ہو سکتا ہے حلق وہاں موجود ہی نہ ہو۔ اگر وہ شاہ در سے جا چکا ہے تو اس کا ایک مطلب تو یہ ہو گا کہ وہ خزانہ نکل کر کہیں غائب ہو گیا ہے یا وہ زندہ ہی نہیں۔“

”ہمارا آدمی شاہ در تک ہی جاسکتا ہے“ — حسن بن صباح نے کہا — ”یہ تو ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ خزانہ ہے کہاں!“

”مجھے معلوم ہے یا شیخ الجبل!“ — وسم کوہ سے بھاگ کر جانے والے آدمی نے کہا — ”آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں نے ایک لمبا عرصہ شاہ در میں گزارا ہے اور میں حلق کے ساتھ رہا ہوں اور ہمارے پیر استاد عبد الملک بن عطاش مجھ پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ میں شاہ در چلا جاؤں؟“

حسن بن صباح تو خوشی سے اُچھل پڑا۔ اُسے تو توقع ہی نہیں تھی کہ کوئی اور بھی اس خزانے سے واقف ہو گا جو اس کا پیر و مرشد نہ جانے کتنے عرصے سے کہیں رکھ رہا تھا۔ اس نے اس آدمی سے کہا وہ فوراً ”شاہ در کو روانہ ہو جائے۔“

”یا شیخ الجبل!“ — ایک معمر مصاحب نے کہا — ”اگر یہ شخص خزانے والی جگہ سے واقف ہے تو اس کے ساتھ دو تین آدمی بھیج دیئے جائیں۔ اگر حاذق شاہ در میں نہ ملے تو یہ شخص خزانے والی جگہ چلا جائے اور دیکھے کہ وہاں کچھ ہے بھی یا نہیں۔ اگر حاذق بھی نہیں اور خزانہ بھی نہیں تو صاف ظاہر ہے کہ یہ مال و دولت حاذق لے اڑا ہے۔“

حسن بن صباح نے اُسی وقت یہ انتظام کرنے کا حکم دے دیا۔ اُس نے دو سرا حکم یہ دیا کہ خزانہ اگر حاذق نے نکال لیا ہے تو وہ جہاں کہیں نظر آئے اسے قتل کر دیا جائے.... باطنیوں اور خصوصاً ”فدائیوں“ کے لئے اپنے دشمن کو ڈھونڈ نکالنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وسم کوہ سے بھاگ کر آنے والا یہ جوان سال آدمی جس کا نام حیدر بصری تھا، دو روز بعد دو آدمیوں کو ساتھ لے کر شاہ در کے لئے روانہ ہو گیا۔



سلطنت سلجوقیہ کے دارالسلطنت مرو میں فوجی سرگرمیاں عروج کو پہنچی ہوئی تھیں۔ حسن بن صباح کی طاعت کو کچلنے کے لئے ایک فوج تیار ہو رہی تھی۔ لوگ اس فوج میں شامل ہو رہے تھے اور انہیں جنگ کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اب اس فوج کا ہدف قلعہ الموت تھا۔ سب جانتے تھے کہ الموت کو فتح کرنا اگر ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور ہے۔ فوج کو ذہن نشین کرایا جا رہا تھا کہ قلعہ الموت کی ساخت کیسی ہے اور شکل و صورت کیسی ہے اور وہ کس طرح ایک چٹان پر بنایا گیا ہے اور اس کے دروازے تک پہنچنے میں کیسی کیسی دشواریاں اور خطرے حائل ہیں۔

یہ حکم تو سلطان محمد کا تھا کہ ایسی فوج تیار کی جائے جس کی نفری کم نہ ہو اور اگر کم ہو بھی تو اس میں ایسا جذبہ اور ایسی اہلیت اور صلاحیت ہو کہ اگلی جنگ کو فیصلہ کن بنا سکے اور اس کے بعد باطنی فرقے کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو لیکن سلطان محمد ضرورت سے زیادہ محتاط تھا۔ وہ ابھی اس فوج کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھا۔ سلطان محمد کا وزیر ابو نصر احمد تھا۔ ابو نصر احمد سلطان محمد کے باپ سلطان ملک شاہ کے وزیر خواجہ حسن طوسی

نظام الملک مرحوم کا چھوٹا بیٹا تھا۔ ابو نصر احمد اپنی نگرانی میں یہ فوج تیار کروا رہا تھا اور وہ اس کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔ اس معاملے میں وہ سلطان محمد سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ اُس کا ارادہ یہ تھا کہ اَلْمَوْتَ پر فوراً حملہ کر دیا جائے تاکہ حسن بن صباح کو مزید تیاری کا موقع نہ ملے۔

سلطان محمد اسے ابھی حملے کی اجازت نہیں دے رہا تھا لیکن ابو نصر احمد کا باطنی دُشمن کے خلاف جذبہ بُرا ہی شدید تھا اور کبھی کبھی تو وہ جذباتی بھی ہو جایا کرتا تھا۔ ایک تو مسلمان کی حیثیت سے وہ حسن بن صباح کو اہلس کفر اور اس سے شدید نفرت کرتا تھا اور اس کے ساتھ ابو نصر احمد حسن بن صباح کو اپنا ذاتی دشمن بھی سمجھتا تھا۔ پہلے اس داستان میں سنایا جا چکا ہے کہ ابو نصر احمد کے باپ نظام الملک مرحوم کو حسن بن صباح کے ایک فدائی نے قتل کیا تھا۔ پھر ابو نصر احمد کا بڑا بھائی ابو المظفر علی وزیر بنا تو اُسے بھی ایک فدائی نے قتل کر دیا تھا۔ ابو نصر احمد اپنے باپ اور اپنے بھائی کے خون کا انتقام لینے کو بے تاب تھا۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ابو نصر احمد کی یہ ایک خالی تھی کہ وہ جذبے میں جذبات کو شامل کر لیتا تھا اور پھر بھول جاتا تھا کہ جنگ میں کچھ احتیاط بھی لازمی ہوتی ہے۔

اب ابو نصر احمد کو خبر ملی کہ وسم کوہ میں دو باطنی بلکہ حسن بن صباح کے دو فدائی صراطِ مستقیم پر آکر حسن بن صباح سے متنفر ہو گئے ہیں تو وہ اپنے کسی خیال کے پیش نظر وسم کوہ جانے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ اس نے سلطان محمد سے اجازت چاہی اور ساتھ یہ وجہ بتائی کہ وہ ان دونوں فدائیوں سے قلعہ اَلْمَوْتَ کے اندر کی باتیں معلوم کرے گا جو حملے میں ہمارے کام آئیں گی۔ سلطان محمد نے اُسے اجازت دے دی۔



ایک روز ابو نصر احمد محافظ دستے کے آٹھ گھوڑ سواروں کے ساتھ وسم کوہ روانہ ہو گیا۔ اس کے سامنے دو اڑھائی دنوں کی مسافت تھی۔ اس مسافت کو کم کرنے کے لئے اُس نے گھوڑوں کی رفتار تیز رکھی اور اپنے محافظوں سے کہا کہ شام سے پہلے کہیں پڑاؤ نہیں کیا جائے گا.... گھوڑے دن بھر چلتے رہے اور شام کو پہلا پڑاؤ کیا۔ گھوڑوں کو کھلایا پلایا گیا اور خود بھی کھاپی کر تھوڑا سا آرام کیا اور آدھی رات سے کچھ بعد ابو نصر احمد نے روانگی کا حکم دے دیا۔ اس طرح اگلے روز کے پچھلے پہر یہ قافلہ وسم کوہ پہنچ گیا۔

سلاطین اور یزیدی ابو نصر احمد کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا۔ وہ بھی ابو نصر احمد کا ہم خیال

تھا اور چاہتا تھا کہ الموت پر فوراً حملہ کیا جائے لیکن دونوں مجبور تھے کیونکہ سلطان اجازت نہیں دے رہا تھا۔ رات کھانے سے فارغ ہوتے ہی ابو نصر احمد کے کہنے پر سالار اور یزی نے ابن مسعود کو بلا لیا اور اس کا تعارف ابو نصر احمد سے کروایا۔

سالار اور یزی نے ابن مسعود کے جذبات اور باقی ہماری باتیں ابو نصر احمد کو سنائیں۔ ابو نصر احمد نے بے تحاشا خراج تحسین پیش کیا اور اس سے کہا کہ وہ اسے اپنی فوج میں بڑا عمدہ دے گا۔

”مجھے کسی چھوٹے بڑے عمدے کی خواہش نہیں“ — ابن مسعود نے کہا —
 ”قابل احترام سالار اور یزی نے آپ کو بتا دیا ہے کہ میرا عزم کیا ہے اور میرے سینے میں کیسی آگ بھڑک رہی ہے۔ میں حسن بن صباح کو اپنے ہاتھوں قتل کروں گا اور اپنی بہن کو واپس لاؤں گا۔“

”کیا تمہاری بہن تمہارے کہنے پر تمہارے ساتھ آجائے گی؟“ — ابو نصر احمد نے پوچھا۔

”نہیں!“ — ابن مسعود نے جواب دیا — ”میں تو نشے کی کیفیت سے نکل کر ہوش و حواس میں آ گیا ہوں لیکن میری بہن اُسی کیفیت میں ہوگی جس میں اُسے رکھا جاتا ہے۔ وہ تو مجھے پہچانے گی ہی نہیں۔ اگر پہچان بھی لے گی تو مجھے اپنا بھائی تسلیم نہیں کرے گی۔ اُسے اٹھا کر لانا پڑے گا۔“

”یہ کام اکیلے نہیں کر سکو گے“ — ابو نصر احمد نے کہا — ”یہ ایک فوج کا کام ہے اور فوج بھی ایسی جو بہت ہی طاقتور ہو.... میں نے ایسی فوج تیار کر لی ہے۔ میں تمہیں اس فوج کے ساتھ لے جاؤں گا اور تم میری راہنمائی کرو گے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ قلعے کا محاصرہ کر کے ہم قلعے میں کس طرح داخل ہو سکتے ہیں اور جب داخل ہو جائیں گے تو اندر ہمارا کیسا مقابلہ ہو گا۔“

”اصل مقابلہ تو اندر ہو گا“ — ابن مسعود نے کہا — ”اگر میں یہ کہوں کہ الموت میں داخل ہونا ناممکن ہے تو آپ شاید تسلیم نہ کریں۔ الموت ایک قلعہ بند شہر ہے جو ایک چٹان پر کھڑا ہے۔ اگر آپ نے یہ باہر سے دیکھا ہے تو آپ نے ضرور محسوس کیا ہو گا کہ محاصرہ کیسے کریں گے۔ محاصرہ چٹان کے نیچے ہو گا جس سے اندر والوں کو یہ تکلیف پہنچا سکیں گے کہ باہر سے رسد اندر نہیں جاسکے گی اور اندر سے کوئی باہر نہیں آ

سکے گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ چٹان کے دامن میں کھڑے ہو کر تیر پھینکیں اور وہ قلعے کی دیواروں تک پہنچ جائیں۔“

”دروازے کیسے ہیں؟“ — ابو نصر احمد نے پوچھا۔

”بہت مضبوط!“ — ابن مسعود نے جواب دیا — ”چٹانوں جیسے مضبوط۔ بڑی موٹی لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور ان پر لوہے کے خول چڑھے ہوئے ہیں.... قابلِ صد احترام وزیر! قلعہ الموت قدرت کا ایک شاہکار ہے یا اسے ایک عجوبہ سمجھیں۔ یقیناً نہیں آتا کہ یہ انسانی ہاتھوں سے تعمیر ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ چٹان کا ایک حصہ ہے اور اسے قدرت نے اپنے ہاتھوں بنایا ہے۔ آپ حسن بن صباح کی دانش اور عقل تک نہیں پہنچ سکتے۔ محاصرے میں نقصان آپ کا ہو گا۔ وہ اس طرح کہ اوپر سے جو تیر نیچے آئیں گے وہ خطا نہیں جائیں گے۔“

”قلعے میں داخل ہونے کی ایک ہی صورت ہے“ — سالار اور یزی نے کہا — ”اندر کچھ آدمی ہوں جو حسن بن صباح کے مخالف اور ہمارے حامی ہوں۔ وہ اندر سے دروازے کھول دیں یا ایک ہی دروازہ کھول دیں۔“

”الموت کے اندر آپ کو کوئی ایک بھی انسان حسن بن صباح کا مخالف نہیں ملے گا“ — ابن مسعود نے کہا — ”وہ تو آپ کے مقابلے میں جانوں کی بازی لگا دیں گے۔ آپ کو کوئی غدار نہیں ملے گا، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ابھی سے کچھ آدمی باطنیوں کے ہروپ میں الموت میں داخل کر دیں۔ یہ آدمی یہ ظاہر کرتے رہیں کہ وہ حسن بن صباح کے مرید یا پیروکار ہی نہیں بلکہ اس کے شیدائی ہیں لیکن محترم سالار! آپ کسی پتھر دل آدمی کو بھی اندر بھیج دیں تو وہ چند دنوں کے اندر اندر ہی آپ کا آدمی نہیں رہے گا۔ الموت میں ایسے آدمی موجود ہیں جو کسی مشکوک کو دیکھیں تو یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے اس شخص کا ضمیر اور اس کی روح بھی دیکھ لی ہو۔ اسے وہ قتل نہیں کرتے بلکہ جنت میں داخل کر دیتے ہیں۔ پھر وہ خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور جب وہ باہر نکلے گا تو اس عزم کے ساتھ نکلے گا کہ آپ کو قتل کر دے۔“

”تم نے الموت میں تیس سال گزارے ہیں“ — ابو نصر احمد نے کہا — ”کیا تم کوئی طریقہ نہیں سوچ سکتے؟ ہمارے پاس ایسے جانباز موجود ہیں جو اپنی جانیں قربان کر دیں گے لیکن صرف جان قربان کر دینے سے ہی کچھ حاصل نہیں ہوا کرتا۔ اپنا مقصد پورا

ہو جائے اور جان چلی جائے تو ہم لوگ کہتے ہیں کہ شہیدوں کا لورنگ لایا کرتا ہے۔“

”میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ اندر کیا ہے اور یہ قلعہ کس قسم کا ہے۔“ — ابن مسعود نے کہا — ”آپ کی فوج قلعے میں داخل ہو بھی گئی تو اصل لڑائی قلعے کے اندر ہو گی۔ عموماً یوں ہوتا ہے کہ فاتح فوج قلعے میں داخل ہوتی ہے تو قلعے کی فوج ہتھیار ڈال دیتی ہے یا شہر کی آبادی اپنی فوج کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ ہتھیار ڈال دے ورنہ فاتح فوج شہر کو تباہ کر دے گی لیکن الموت میں معاملہ الٹ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی فوج کو اندر کھینچنے کے لئے خود ہی دروازے کھول دیئے جائیں اور آپ اس خوش فہمی میں اندر چلے جائیں کہ آپ نے قلعہ سر کر لیا۔ تو یہ ایک بڑا ہی خطرناک پھندہ ہو گا جس میں آپ کی فوج پھنسا کر تباہ و برباد کر دی جائے گی۔ قلعے کے اندر آپ کو بھول بھلیاں ملیں گی۔ ان میں سے وہی گزر سکتا ہے جو ان سے واقف ہو۔ اجنبی ان بھول بھلیوں میں بھٹک جاتے ہیں۔ قلعے اور شہر کے نیچے چٹان کاٹ کاٹ کرو سبج تہہ خانے بنے ہوئے ہیں اور ان میں بھی جو راستے ہیں وہ بھول بھلیوں جیسے ہیں۔ اندر جا کر آپ کی فوج بکھر جائے گی یا فرد فرد بکھیر دی جائے گی پھر فدائی اور دوسرے باطنی آپ کی فوج کو کاٹ دیں گے۔“

ابن مسعود اچھا خاصا تجربہ کار اور ہوش مند معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہر بات جنگی نقطہ نگاہ سے کر رہا تھا۔ ابو نصر احمد اور سالار اور یزی اس سے جو تفصیلات معلوم کر رہے تھے وہ سب جنگی نوعیت کی تھیں۔ وہ سالاروں کی نگاہ سے الموت کے اندرونی ماحول کو دیکھ رہے تھے۔

”مگر مجھ بڑا ہی خوفناک جانور ہوتا ہے“ — ابن مسعود نے کہا — ”جانور نہیں میں تو اسے درندہ کہوں گا۔ اس پر نہ تیرا اثر کرتا ہے نہ برچھی نہ تلوار لیکن اس کا بھی ایک نازک حصہ ہوتا ہے اور وہ ہے اس کا پیٹ۔ وہاں ذرا سا چاقو مارو تو مگر مجھ بے بس ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قلعہ الموت ایک پہاڑ نظر آتا ہے جسے زلزلے کے شدید جھٹکے بھی راستے سے نہیں ہٹا سکتے لیکن اس میں بھی ایک دو کمزوریاں ہیں۔ ایک کمزوری اس شہر کی آبادی ہے۔ یہ لوگ آپ کی فوج کے خلاف لڑیں گے لیکن جلدی حوصلہ ہار جائیں گے۔ اصل لڑنے والے فدائی ہیں جن کی تعداد ہزار ہا ہے اور وہ پورا ایک لشکر ہے لیکن یہ لشکر پُر اسرار قتل اور خود کشی میں مہارت رکھتا ہے یا چھری چاقو چلا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو امام نے حکم دے رکھا ہے کہ ہتھیار ڈالنے یا پکڑے جانے سے بہتر یہ ہے کہ

خود کشی کر لو۔ یہ لوگ جانوں کی بازی لڑا کر آپ کا مقابلہ کریں گے لیکن جوں ہی دیکھیں گے کہ مقابلہ آسان نہیں تو اپنی تلواریں اور خنجر اپنے ہی جسموں میں اتار لیں گے لیکن یہ مرحلہ اُس وقت آئے گا جب آپ کی فوج بھی اسی طرح جانوں کی بازی لڑا کر یا یوں کہیں کہ دیوانگی کے عالم میں لڑے گی اور ان لوگوں پر غالب آجائے گی....

”اب میں آپ کو الموت کا وہ پیٹ دکھاتا ہوں جو مجھ کی طرح بہت ہی نازک ہے۔ وہاں آپ چاقو کی نوک سے کھل چیر کر اسے بے بس بھی کر سکتے ہیں اور اس میں داخل بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ الموت کی تین اطراف دریا بہتا ہے۔ قلعے کے پچھلے حصے میں جو چٹان ہے اس کے نیچے دامن میں ایک دروازہ چٹان کاٹ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ وہاں سے دریا چٹان کے ساتھ ٹکرا کر گزرتا ہے۔ یہ دروازہ جو ایک غار کے دہانے جیسا ہے، تقریباً آدھا دریا میں ڈوبا رہتا ہے۔ اندر کی طرف بڑا ہی مضبوط دروازہ لگایا گیا ہے جو اندر سے مقفل رہتا ہے۔ دریا کا پانی اس دروازے تک آ جاتا ہے اور اگر دروازہ کھولا جائے تو پانی اور اندر آ جاتا ہے لیکن آگے راستہ دریا کی سطح سے اونچا بنایا گیا ہے اس لئے پانی آگے تک نہیں آ سکتا۔ اس دروازے تک پہرہ بھی ہوتا ہے لیکن بہت اندر کی طرف سنتری گشت کرتا ہے۔ یہ قلعے کا تہ خانہ ہے جس میں اترو تو آگے بھول بھلیاں آ جاتی ہیں۔ ان میں سے وہی اس دروازے پر پہنچ سکتا ہے جو ان بھول بھلیوں سے واقف ہو۔“

”یہ دروازہ کس مقصد کے لئے بنایا گیا ہے؟“ — ابو نصر احمد نے کہا۔

”نکل بھاگنے کے لئے!“ — ابن مسعود نے کہا — ”میں فدائیوں کے اُس

درجے تک پہنچ گیا تھا جس درجے کے ہر فدائی کو قلعے کے بہت سے راز بتادیئے جاتے ہیں۔ میں نے یہ ساری بھول بھلیاں اور یہ راستے دیکھے ہوئے ہیں۔ دریا کی طرف یہ چور دروازہ اس لئے بنایا گیا تھا کہ ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ قلعہ کوئی طاقتور فوج فتح کر لے تو حسن بن صباح اور اس کے قریبی مصاحب اور مشیر وغیرہ اس دروازے سے بھاگ نکلیں۔ دروازے سے کچھ دور کشتیاں ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ کوئی ماں ہی نہیں سکتا کہ دریا میں دروازہ بھی ہو گا۔ اندر سے اس دروازے تک جو راستہ جاتا ہے وہ ایسی بھول بھلیوں میں سے گزر کر جاتا ہے کہ کوئی بھولے بھٹکے بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں پہنچ سکتا ہوں۔“

”بس اتنا ہی کافی ہے“ — ابو نصر احمد نے کہا — ”میں جو معلوم کرنا چاہتا تھا وہ تم نے زیادہ ہی تفصیل سے بیان کر دیا ہے جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ مجھے ایسے ہی ایک آدمی کی ضرورت تھی جو الموت کے اندر چلا جائے اور دروازہ کھول دے۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہاں کوئی چور دروازہ بھی ہے۔ وہ تم نے بتا دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ صرف تم اس دروازے تک پہنچ سکتے ہو.... اب تم بتاؤ کہ الموت کو محاصرے میں لیں تو کیا تم اندر جا کر وہ دروازہ کھول سکتے ہو؟“

”ایک بات آپ بھول گئے محترم وزیر!“ — سالار اور یزی نے کہا — ”پہلا کام تو یہ ہے کہ یہ یا کوئی اور قلعے میں داخل ہو۔ سوال یہ ہے کہ وہ داخل کس طرح ہو گا؟“

”وہ میں ہوں گا“ — ابن مسعود نے کہا — ”یہ خبر حسن بن صباح تک پہنچ چکی ہوگی کہ میں نے وسم کوہ میں تمام باغیوں کی نشاندہی کر کے سب کو مروا دیا ہے۔ ان میں سے ایک بھاگ گیا تھا۔ وہ یقیناً حیدر بصری تھا۔ میں الموت چلا جاؤں گا اور حسن بن صباح سے کہوں گا کہ ان باغیوں کو پکڑوانے اور مروانے والا یہی حیدر بصری تھا اور میں تو سب جویوں کا قیدی بن گیا تھا اور انہوں نے مجھ پر اتنا تشدد کیا ہے کہ میرے تو ہوش بھی ٹھکانے نہیں رہے اور اب میں فرار ہو کر آیا ہوں۔“

”ہم تمہیں ایسے خطرے میں بھی نہیں ڈالنا چاہتے“ — ابو نصر احمد نے کہا —

”حسن بن صباح استادوں کا استاد ہے۔ وہ تمہاری بات کو سچ مانے گا ہی نہیں۔“

”یہ آپ مجھ پر چھوڑیں“ — ابن مسعود نے کہا — ”جس طرح لوہے کو لوہا کا تیار ہے اسی طرح فریب کار ہی فریب کار کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں کیا ڈھونگ رچاؤں گا، یہ تو ابھی سوچنا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں حسن بن صباح کو دھوکہ دے سکوں گا۔“

سب دیکھ رہے تھے کہ ابن مسعود حسن بن صباح اور اس کے فرقے کے خلاف اس قدر بھرا اور بھڑکا ہوا تھا کہ وہ نتائج کی پرواہ کئے بغیر اس قسم کے خطرے مول لینے کو بھی تیار ہو گیا تھا کہ وہ الموت جا کر حسن بن صباح جیسے ابلیس کو دھوکہ دے گا اور پھر اس کے بعد چور دروازہ بھی کھول دے گا۔ بہر حال سالار اور یزی اور ابو نصر احمد کو یہ کاوش نہ کرنی پڑی کہ وہ ابن مسعود کو دلائل دے کر یا کسی اور طریقے سے الموت جانے کے لئے تیار کرتے۔ وہ خود ہی تیار ہو گیا تھا۔ اب سوال یہ سامنے آیا کہ ابن مسعود کب جائے اور

اسے کس طرح بھیجا جائے اور اسے کس طرح اندر اطلاع بھیجی جائے کہ اب وہ دریا والا دروازہ کھول دے۔

اس سوال پر جب بات شروع ہوئی تو مشکل یہ سامنے آئی کہ سلطان محمد کو کس طرح راضی کیا جائے کہ وہ الموت پر حملے کی اجازت دے دے۔ ابو نصر احمد کہتا تھا کہ فوج بالکل تیار ہے۔ سالار اور یزی ابو نصر احمد کا ہم خیال تھا.... آخر طے یہ پایا کہ جب فوج مرو سے کوچ کرے گی تو پانچ سات روز پہلے وسم کوہ ابن مسعود کو اطلاع بجھوا دی جائے گی کہ اب وہ الموت چلا جائے۔ الموت کو محاصرے میں لیا جائے گا تو ابن مسعود اگر حسن بن صباح کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا تو وہ کسی رات شہر کی دیوار سے مشعل ہلانے گا جو یہ اشارہ ہو گا کہ اس نے پچھلا دروازہ کھول دیا ہے اور پھر ابو نصر احمد کچھ جانبازوں کو دریا کی طرف سے قلعے میں داخل کر دے گا اور وہ کام کر لیں گے۔

”نہیں قاتل احترام وزیر“ — ابن مسعود نے کہا — ”مجھے اتنا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ بہتر یہ ہے کہ میں کل صبح روانہ ہو جاؤں گا اور اپنا کھیل کھیلوں گا۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو مجھے خاصا وقت چاہئے کہ میں ان راستوں سے اور زیادہ واقف ہو جاؤں اور ان راستوں کے سنتریوں کے ساتھ بھی علیک سلیک ہو جائے اور انہیں یہ تاثر ملے کہ میں اس طرف امام کی اجازت یا حکم سے آتا جاتا رہتا ہوں.... آپ جب کبھی الموت کو محاصرے میں لیں گے تو میں دریائی دروازہ کھول کر مشعل سے آپ کو اشارہ دے دوں گا۔“

وزیر ابو نصر احمد اور سالار اور یزی ابن مسعود کی اس تجویز سے متفق ہو گئے اور اسے کہہ دیا کہ وہ اگلی صبح جس جلیے اور جس حالت میں جانا چاہتا ہے، روانہ ہو جائے۔



اگلے روز ابو نصر احمد مرو کو واپسی سفر پر روانہ ہوا تو سالار اور یزی بھی اس کے ساتھ تھا۔ ابو نصر احمد نے ہی سالار اور یزی سے کہا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے اور دونوں مل کر سلطان محمد کو قائل کریں گے کہ وہ فوری طور پر حملے کی اجازت دے دے۔ تقریباً تین دنوں کی مسافت کے بعد دونوں مرو پہنچے اور اگلے روز دونوں سلطان محمد کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے سلطان محمد کو تفصیل سے بتایا کہ کس طرح انہوں نے الموت کی اندرونی ساخت اور دیگر احوال و کوائف کے متعلق کتنی قیمتی

معلومات حاصل کر لی ہیں اور جس شخص نے یہ معلومات دی ہیں وہ محاصرے سے پہلے الموت میں داخل ہو چکا ہو گا۔ دونوں نے سلطان محمد کو ابن مسعود کی ساری باتیں سنائیں اور کہا کہ انہیں حملے کی اجازت دی جائے۔

بہت دیر تبادلہ خیالات اور بحث مباحثہ ہوتا رہا اور آخر سلطان محمد نے ابو نصر احمد کو الموت پر حملے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ کوچ ایک مہینے بعد ہو گا اور اس ایک مہینے میں فوج کو دن رات تیاری کروائی جائے گی۔ سلطان محمد نے دوسری بات یہ کہی کہ اس حملے میں سالار اور یزی شامل نہیں ہو گا بلکہ وہ واپس وسم کوہ جا کر اپنی فوج تیار کر لے گا اور ابو نصر احمد کو جتنی بھی کمک کی ضرورت ہو گی وہ سالار اور یزی وسم کوہ سے بھیجتا رہے گا۔

اُس وقت جب ابو نصر احمد اور سالار اور یزی مرو میں سلطان محمد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، الموت میں حسن بن صباح کو اطلاع دی گئی کہ وسم کوہ سے ایک فدائی جو اپنا نام ابن مسعود بتاتا ہے، بڑی بُری حالت میں آیا ہے اور شرفِ ملاقات کا متمنی ہے.... حسن بن صباح کسی فدائی کو نہیں ملا کرتا تھا، اس نے ابن مسعود کو بلا لیا۔

ابن مسعود جب حسن بن صباح کے سامنے گیا تو رُک گیا۔ اس کی حالت بہت ہی بُری تھی۔ کپڑے انتہائی میلے اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ اُس کے ایک پاؤں سے تھوڑا تھوڑا خون نکل رہا تھا۔ اُس کے سر کے بال مٹی سے اُلٹے ہوئے اور الجھے ہوئے تھے۔ اُس کے جسم سے بدبو آتی تھی۔

وہ حسن بن صباح کے کمرے میں داخل ہوا تو صاف نظر آتا تھا کہ اُس کی ٹانگیں اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہیں۔ وہ پاؤں گھسیٹ رہا تھا۔ وہ رُکا، اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوئیں پھر اس کا سر ڈولا اور وہ اس طرح گرا کہ پہلے اُس کے گھٹنے فرش پر لگے پھر پہلو کو لڑھک گیا۔

حسن بن صباح نے کہا کہ اسے طبیب کے پاس لے جایا جائے اور وہ اس کا علاج معالجہ کرے اور اسے کچھ کھلایا پلایا بھی جائے۔

”یہ کون ہے؟“ — حسن بن صباح نے پوچھا — ”مجھے اس کا نام ابن مسعود بتایا گیا ہے اور یہ وسم کوہ سے آیا ہے۔ کیا یہ وہی ابن مسعود نہیں جس کے متعلق حیدر بصری نے یہاں آکر بتایا تھا کہ ابن مسعود نے وہاں تمام فدائیوں کو پکڑوا دیا تھا اور ان

سب نے اپنی جانیں اپنے ہاتھوں لے لی ہیں؟“

حسن بن صباح کو بتایا گیا کہ یہ وہی ابن مسعود ہے۔ حسن بن صباح کچھ حیران ہوا کہ اس نے اگر وسم کوہ میں اپنے ساتھیوں کو پکڑوا دیا تھا تو اسے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا اور سلجوقی ایسے تو بے مروت نہیں کہ اسے انعام و اکرام نہ دیتے اور اس حالت میں اسے چھوڑ دیتے۔ حسن بن صباح کے مشیروں نے کہا کہ ان سوالوں کے جواب یہی شخص دے سکتا ہے۔ اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا چاہئے۔

حیدر بصری کو حسن بن صباح نے اس کام کے لئے شاہ در کے لئے روانہ کر دیا تھا کہ وہ حاذق سے ملے اور اس سے پوچھے کہ اس نے ابھی تک خزانہ الموت کیوں نہیں پہنچایا۔ حیدر بصری کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ حاذق اگر شاہ در سے غیر حاضر ہے تو حیدر بصری اسے ڈھونڈے اور اگر وہ نہ ملے تو حیدر بصری اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اس جگہ چلا جائے جہاں خزانہ رکھا ہے اور وہاں سے اٹھا کر الموت پہنچا دے.... حیدر بصری نے حسن بن صباح کو بتایا تھا کہ اسے معلوم ہے وہ خزانہ کہاں ہے اور وہاں سے کس طرح نکالا جاسکتا ہے۔

ابن مسعود رات بہت دیر بعد ہوش میں آیا۔ اسے نملایا گیا، صاف ستھرے کپڑے پہنائے گئے اور پھر اسے کچھ کھلایا پلایا گیا۔ طبیب نے اسے سلا دیا تاکہ اس کی کمزوری کم ہو جائے اور پھر یہ غشی میں نہ چلا جائے۔

اگلی صبح اسے حسن بن صباح کے پاس لے گئے۔ حسن بن صباح اُس کا بے تاب سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وسم کوہ میں یہ انقلاب کس طرح آیا ہے۔ حیدر بصری نے اسے بتایا تو تھا لیکن ابن مسعود کو دیکھ کر اسے کچھ شک ہونے لگا اور اب وہ ابن مسعود سے وسم کوہ کی واردات سننے کو بے تاب تھا۔

ابن مسعود کو جب حسن بن صباح کے کمرے میں داخل کیا گیا تو اس سے اچھی طرح چلا نہیں جاتا تھا۔ حسن بن صباح نے اسے اپنے سامنے بٹھایا اور پوچھا کہ وہ اس حالت میں کہاں سے آیا ہے اور اس پر کیا گزری ہے اور وسم کوہ میں کیا ہوا تھا۔

”میں سلجوقیوں کی قید سے فرار ہو کر آیا ہوں یا شیخ الجبل!“ — ابن مسعود نے لرزتی کانپتی اور قدرے نحیف آواز میں کہا — ”وہ ظالم سلجوقی مجھ سے الموت کی باتیں پوچھتے تھے اور یہ بھی پوچھتے تھے کہ یہاں اور کون کون تمہارے فرقے کا آدمی ہے۔ میں

انہیں کوئی جواب نہیں دیتا تھا تو وہ مجھے ایسی ایسی اذیتیں دیتے تھے جو شاید ہی کوئی انسان برداشت کر کے زندہ رہ سکتا ہو لیکن میں اپنے شیخ الجبل اور امام کو ذہن میں رکھ لیتا تھا اور میرا جسم ہر اذیت برداشت کر لیتا تھا۔ میں نے انہیں کچھ بھی نہیں بتایا۔

”پھر تمہارے ساتھیوں کی نشاندہی کس نے کی تھی؟“ — حسن بن صباح نے پوچھا — ”تم شاید نہیں جانتے کہ تمہارا ایک ساتھی حیدر بصری یہاں پہنچ گیا ہے اور وہ پوری بات سنا چکا ہے۔“

”حیدر بصری!“ — ابن مسعود نے کہا — ”اس نے تو یہاں پہنچ کر اپنے مطلب کی کہانی سنائی ہی تھی۔ میں نہیں جانتا نہ جاننا چاہوں گا کہ حیدر بصری نے آپ کو کیا بات سنائی ہے، میں یہ بتانے آیا ہوں کہ ہم سب کو حیدر بصری نے مروایا ہے۔ اس سے پہلے ہمارا ایک فدائی عبید عربی وہاں سالار اور یزی کو قتل کرنے گیا تھا لیکن ایک بڑی خوبصورت اور جوان لڑکی کے جال میں آگیا اور اس نے ان دو آدمیوں کو مروادیا جنہوں نے اسے آپ کے حکم کے مطابق پناہ میں رکھا تھا۔ سالار اور یزی نے ان دونوں کو گرفتار کر کے سرعام ان کے سر قلم کر دیئے ہیں۔“

ابن مسعود نے عبید عربی کا نام اس لئے نہیں لیا تھا کہ وہ اسے کسی مصیبت میں ڈالنا چاہتا تھا بلکہ اس لئے کہ اسے یہ یقین تھا کہ اب یہ باطنی اسے پکڑ کر اُلموت نہیں لاسکیں گے۔

”یا شیخ الجبل!“ — ابن مسعود نے کہا — ”عبید عربی کی نشاندہی پر حیدر بصری پکڑا گیا۔ حیدر بصری نے یقیناً“ سلجوقیوں سے منہ مانگا انعام لیا اور ہم سب کو پکڑوا دیا۔ سلجوقیوں نے سب سے پہلے مجھے پکڑا اور پوچھا کہ یہاں باطنی کون کون ہیں۔ میں نے انہیں صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میرے جسم کی بوٹیاں نوچنی شروع کر دو، میں اپنے کسی ساتھی کا سراغ نہیں دوں گا۔ تب سالار اور یزی نے خود آکر مجھے بتایا کہ تمہارے ایک ساتھی حیدر بصری نے سب کچھ بتا دیا ہے اور اسے اتنا زیادہ انعام دیا گیا ہے جو تم لوگ تصور میں بھی نہیں لاسکتے۔ میں نے کہا کہ تم لوگوں کو ہر باطنی کا پتہ چل گیا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ یا شیخ الجبل، انہوں نے مجھے تو مار ہی ڈالا تھا اور شاید وہ یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ میں اب یہاں سے نکل ہی نہیں سکتا۔ جسمانی طور پر میں بہت ہی کمزور ہو گیا تھا۔ آخر ایک روز مجھے فرار کا موقع مل گیا اور میں وہاں سے نکل آیا۔ یا امام! آپ کے عظیم

نام پر میں نے اس جسمانی حالت میں، بھوکے پیاسے یہ سفر طے کیا ہے۔“
ابن مسعود کی آواز یوں ڈوبتی چلی جا رہی تھی جیسے وہ ابھی بے ہوش ہو جائے گا۔ وہ
ذرا خاموش ہوا اور لمبے لمبے سانس لئے اور پھر کمزور سی آواز میں بولنے لگا۔

”یہاں میں اتنی مسافت پیدل طے کر کے جھوٹ بولنے نہیں آیا یا الہم!“ — ابن
مسعود نے کہا — ”میں وہیں دسم کوہ میں رہتا تو اپنی جنت کی حوروں جیسی ایک نوجوان
لڑکی کا خاوند ہوتا۔ مجھے ایسی دو لڑکیاں یوں دکھائی گئی تھیں کہ انہیں باری باری میرے
حوالے کر دیا گیا تھا۔ میرے لئے وہاں شہزادوں جیسی زندگی تھی لیکن میں شیخ الجبل کو جان
دے سکتا ہوں، دھوکہ نہیں دے سکتا۔“

”اگر حیدر بصری کو تمہارے سامنے بٹھا دیا جائے“ — حسن بن صباح نے کہا —
”اور وہ وہی بیان دے جو وہ دے چکا ہے تو تم اسے کس طرح جھٹلاؤ گے؟“

”یا شیخ الجبل!“ — ابن مسعود نے کہا — ”اس وقت تک حیدر بصری کو میرے
سامنے بیٹھا ہوا ہونا چاہئے تھا۔ آپ اسے بلاتے کیوں نہیں؟ میں تو اس امید پر آیا تھا کہ
حیدر بصری کی موجودگی میں یہ سارا بیان دوں گا۔“

”وہ شاہ در چلا گیا ہے“ — حسن بن صباح نے کہا — ”اُسے آ لینے دو۔ تمہیں
ایک بار پھر حیدر بصری کی موجودگی میں یہ بیان دینا پڑے گا۔“

”میری ایک التجا ہے یا شیخ الجبل!“ — ابن مسعود نے کہا — ”آپ اسے یہاں
فورا“ بلوالیں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میرے جسم پر آپ کو کوئی زخم یا کوئی
چوٹ نظر نہیں آئے گی لیکن آپ کی آنکھ میرے جسم کے اندر دیکھ سکتی ہے تو آپ کو
حیرت ہوگی کہ میں زندہ کس طرح ہوں۔ میرے جسم کے اندر اتنی چوٹیں ہیں کہ میں
شاید جانبر نہیں ہو سکوں گا۔ میں مرنے سے پہلے چاہتا ہوں کہ آپ کو یقین ہو جائے کہ
میں سچا اور حیدر بصری جھوٹا اور دھوکہ باز ہے۔“

حسن بن صباح کو جیسے یقین ہونے لگا تھا کہ ابن مسعود جھوٹ نہیں بول رہا لیکن
حیدر بصری کو اس نے شاہ در بھیج دیا تھا۔ حسن بن صباح نے اپنے دو مشیروں سے بات کی
کہ حیدر بصری کب تک واپس آ سکتا ہے۔ مشیروں نے کچھ باتیں کیں، کچھ مشورے
دیئے اور حسن بن صباح کچھ دیر ان کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور اُس کے منہ سے یہ الفاظ
نکل گئے کہ وہ تو خزانہ لانے گیا ہے، اُسے ابھی واپس نہ بلوایا جائے تو ٹھیک ہے۔

”کیسا خزانہ؟“ — ابن مسعود نے بیدار ہوتے ہوئے بلکہ چونک کر پوچھا —
 ”کون سا خزانہ؟.... اگر آپ نے اسے کہیں سے خزانہ یا کوئی قیمتی مال لانے کے لئے بھیج
 دیا ہے تو پھر یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ واپس آجائے گا۔ آپ ایک بڑے زہریلے سانپ کو
 اعتماد میں لے رہے ہیں۔ اس کے پیچھے کچھ آدمی بھیجیں جو اسے پکڑ کر لے آئیں۔
 کوشش کریں کہ وہ خزانے تک نہ پہنچ سکے۔“

ابن مسعود کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ خزانے کا معاملہ کیا ہے۔ شاہ در سے دُور
 جھیل میں سے جو خزانہ حاذق نکلنے گیا تھا اس کے متعلق ابن مسعود کو کچھ بھی معلوم نہ
 تھا پھر بھی وہ دماغ لڑا لڑا کر بات کر رہا تھا اور اس کی ہر بات اب قیاس آرائیوں سے تعلق
 رکھتی تھی۔ وہ اسی حسن بن صباح کا تربیت یافتہ تھا۔ اسی شیخ الجبل اور امام نے اسے بدی
 اور ابلت کے راستے پر ڈالا تھا۔ اس نے بہت حد تک حسن بن صباح کو متاثر کر لیا
 تھا۔ اس کے بولنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابن مسعود کو سچا سمجھنے لگا ہے۔ اس
 نے یہ فیصلہ سنایا کہ ابن مسعود کو حیدر بصری کی واپسی تک قید میں نہ ڈالا جائے بلکہ اپنی
 نگرانی میں رکھا جائے اور یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ یہ قلعے سے باہر نہ جائے۔



اُس وقت حیدر بصری اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ شاہ در میں اپنے باطنی ساتھیوں
 کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حسن بن صباح سے یہ تو کہہ دیا تھا کہ وہ عبد الملک بن
 عطاش کے خزانے والی جگہ سے واقف ہے لیکن شاہ در پہنچ کر اسے خیال آیا کہ اس جگہ
 تک پہنچنے کا طریقہ اور راستہ تو اسے معلوم ہی نہیں نہ یہ معلوم ہے کہ خزانہ چٹانوں میں
 کس جگہ رکھا گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پریشانی کے عالم میں بیٹھا باتیں کر رہا
 تھا۔

وہ عبد الملک بن عطاش کے عروج کے زمانے میں شاہ در رہ چکا تھا۔ حاذق بھی یہیں
 تھا۔ حیدر بصری بھی حاذق کے درجے کا فدائی تھا اس لئے وہ عبد الملک بن عطاش کی
 محفل میں جایا کرتا تھا اور کبھی کوئی راز کی بات ہوتی تو اس میں بھی حیدر بصری کو شامل کیا
 جاتا تھا لیکن جہاں تک خزانے کا تعلق تھا، عبد الملک بن عطاش نے حیدر بصری کو اس
 سے ناواقف رکھا تھا۔ اسے اس خزانے کا جو پتہ چلا تھا وہ حاذق نے اسے بتایا تھا۔ حاذق
 کے ساتھ حیدر بصری کی بڑی گہری دوستی تھی۔ جب حاذق نے اسے خزانے کے متعلق

بتایا تو اس نے پوری طرح غور نہیں کیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایسے شاہی خزانوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اب حسن بن صبح نے اس کا براہ راست تعلق پیدا کر دیا اور اسے شاہ در بھیج دیا کہ وہ خزانہ نکال کر لے آئے اور حیدر بصری نے پورے اعتماد کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ لے آئے گا مگر جب تفصیلات جاننے کی ضرورت پڑی تو حیدر بصری کو خیال آیا کہ وہ تو صرف ایک جھیل اور جھیل کے درمیان تھوڑے سے چٹانی علاقے سے آگاہ ہے اور اس سے زیادہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں۔

ایک روز نور کا باپ اکیلا اپنے کھیتوں میں گھوم پھر رہا تھا۔ نور اپنے گھر میں تھی۔ اچانک دو آدمیوں نے پیچھے سے نور کے باپ کو پکڑ لیا۔ وہ پیچھے مڑا تو دیکھا کہ ان میں ایک حیدر بصری تھا جسے وہ بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ پہلے سنایا جا چکا ہے کہ نور کا باپ عبد الملک کا خاص معتمد ملازم تھا اس لئے عبد الملک کے پاس جو لوگ آتے جاتے رہتے تھے انہیں نور کا باپ بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔

”اوہ حیدر بصری ہو!“ — نور کے باپ نے مسرت کے لہجے میں کہا — ”تم پھر آ گئے ہو؟.... تمہیں مل کر میرا دل خوش ہو گیا ہے لیکن میرے دوست! بہت احتیاط سے رہنا۔ سلجوقی سلطان خجریہاں موجود ہے اور سلجوقی ذرا سے شک پر بھی بائنیوں کو پکڑ لیتے ہیں۔“

”ہمیں دھوکہ نہ دے بُڑھے!“ — حیدر بصری نے کچھ طنز اور غصے کے لہجے میں کہا — ”مجھے الموت میں معلوم ہو گیا تھا کہ تو نے اور تیری بیٹی نور نے پیرو مُرشد عبد الملک بن عطاش کو دھوکہ دیا تھا اور اس کی شکست کا باعث بنے تھے۔“

”اور اب یہ سلجوقیوں کا وفادار بن گیا ہو گا“ — حیدر بصری کے ساتھی نے طنز یہ کہا — ”اس کے پاس اتنی خوبصورت لڑکی جو ہے۔“

نور کے باپ نے پُر اعتماد اور پُر اثر لہجے میں انہیں بتانا شروع کر دیا کہ اس نے کسی کو دھوکہ نہیں دیا بلکہ عبد الملک بن عطاش نے یہاں سے جاتے وقت ان کی پرواہ ہی نہ کی اور باپ بیٹی کو سلجوقی فوج کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے گئے۔ اس نے انہیں یہ یقین دلانے کی بھی کوشش کی کہ وہ ابھی تک حسن بن صبح کا پیرو کار ہے اور اس نے اپنی بیٹی کسی کے حوالے نہیں کی نہ ہی وہ اسے یہاں کسی سے بیابے گا۔

”تم نہیں جانتے حیدر بصری!“ — نور کے باپ نے کہا — ”کہ تمہیں دیکھ کر

مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ میں تم جیسے کسی ساتھی کے انتظار میں تھا کہ وہ مجھے اور میری بیٹی کو الموت پہنچا دے۔ حاذق تھا۔ اس سے میں چوری چھپے مل لیا کرتا تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے اور میری بیٹی کو الموت لے جائے گا لیکن وہ ایسا گیا کہ واپس ہی نہیں آیا۔“

”یہاں نہیں!“ — حیدر بصری نے کہا — ”ہمارے ساتھ چلو اور وہاں باتیں ہوں گی۔ ہم تمہیں پہلے ہی بتا دیتے ہیں کہ تمہیں ہم نے زندہ چھوڑنا ہی نہیں۔ چونکہ تم ہمارے ساتھی رہے ہو اس لئے تمہیں یہ موقع دیں گے کہ جو کہنا چاہتے ہو کہہ لو۔“

”تمہاری جگہ نہیں تم میرے گھر چلو“ — نور کے باپ نے کہا — ”وہاں تمہیں میری بیٹی بھی ملے گی اور پھر میں تمہیں یقین دلا دوں گا کہ میں تمہارا ہی ساتھی ہوں اور یہاں کچھ مجبوری اور زیادہ تر اپنے مقصد کے لئے رکا ہوا ہوں۔“

حیدر بصری اور اس کا ساتھی اس کے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔ حیدر بصری نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ وہ انہیں پکڑا دے گا۔

”تم مجھے یہ غمال بنائے رکھو“ — نور کے باپ نے کہا — ”تم دونوں کے پاس خنجر تو ضرور ہوں گے۔ اگر نہیں تو پھر تم فدائی ہو ہی نہیں سکتے۔ تمہیں جہاں شک ہوا کہ میں نے تمہیں دھوکہ دیا ہے اور اب تم پکڑے جاؤ گے تو خنجر میرے سینے میں اتار دینا اور نکل بھاگنا اور نکل نہ سکے تو اپنے آپ کو ختم کرنا تو جانتے ہی ہو..... میں کہتا ہوں میرے ساتھ چلو۔“

حیدر بصری اور اس کا ساتھی کوئی جاہل اور گنوار تو نہ تھے کہ اس کی باتوں میں آ جاتے۔ وہ بھی تجربہ کار آدمی تھا اور اتنی زیادہ عمر میں اس نے عملی زندگی کا بہت تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ بہت سی بحث اور جھک جھک کے بعد حیدر بصری اور اس کے ساتھی کو اپنے گھر میں لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

نور نے حیدر بصری کو دیکھا تو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی۔ نور نے حیدر بصری کو اپنے سابق خاوند عبدالملک بن عطاش کے ساتھ کئی بار دیکھا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی نور کے باپ نے نور کو آنکھوں سے ایسا اشارہ دے دیا جو نور سمجھ گئی اور بڑے تپاک سے حیدر بصری سے ملی۔ نور نے بھی ایسی باتیں کیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک باطنی ہے اور حسن بن صباح کو اپنا امام سمجھتی ہے۔ اُس نے حیدر

بھری اور اس کے ساتھی کی خوب خاطر تواضع کی۔

اس دوران حیدر بھری اور اس کا ساتھی نور کے باپ کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ انہیں نور کے باپ پر ابھی اعتبار نہیں آیا اور اسے شاہ در کی شکست کا مجرم سمجھ رہے ہیں۔ نور کے باپ نے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے کوئی زیادہ باتیں نہ کیں اور یہ کہا کہ حلقہ میں ہوتا تو وہ ثبوت پیش کرتا کہ وہ ابھی تک حسن بن صباح کا مرید ہے یا نہیں..... یہاں سے حلقہ کی بات چلی تو نور کے باپ نے کہا کہ وہ اتنا ہی جانتا ہے کہ حلقہ کسی جگہ کی بات کر رہا تھا کہ وہاں پیر و مرشد عبد الملک بن عطاش نے خزانہ رکھا تھا۔

خزانے کی بات شروع ہوئی تو حیدر بھری کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ وہ اسی خزانے کے لئے آیا ہے اور وہ خزانے والی جگہ سے بھی واقف ہے لیکن یہ بھول گیا ہے کہ اس جگہ تک کس طرح پہنچا جاسکتا ہے۔

نور کے باپ نے حیدر بھری کی یہ بات سنی تو اس کے دماغ میں روشنی چمکی اور اس کے چہرے پر رونق آگئی۔

”اب میں تمہیں یقین دلا سکوں گا کہ میں کس کا وفادار ہوں“ — نور کے باپ نے حیدر بھری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — ”میں تمہیں وہاں تک لے جاؤں گا اور سیدھا خزانے تک پہنچا دوں گا۔ ظاہر ہے تم لوگ خزانہ نکال کر واپس شاہ در نہیں آؤ گے بلکہ وہیں سے الموت چلے جاؤ گے۔ میں نور کو بھی ساتھ لے چلوں گا اور تم لوگ خزانے کے ساتھ ہم دونوں کو بھی الموت لے چلنا۔ اس طرح میں اور میری بیٹی سلجوقیوں کی قید سے اور اس پابند زندگی سے آزاد ہو جائیں گے۔“

نور کے باپ نے حیدر بھری اور اس کے ساتھی کو بتایا کہ حلقہ کے ساتھ اس کا یارانہ بڑا ہی گہرا اور رازدارانہ تھا۔ حلقہ نے اسے خزانے والے راز میں بھی شریک کر رکھا تھا۔

حیدر بھری نے جب یہ بات سنی تو وہ بھول ہی گیا کہ نور کا باپ مشتبہ اور مشکوک آدمی ہے۔ اس کے ذہن پر تو اس کا شیخ الجبل امام حسن بن صباح سوار تھا۔ اس نے نور کے باپ سے کہا کہ وہ اس خزانے کو نکالنے میں اس کی مدد کرے اور وہ اسے اور اس کی بیٹی کو الموت پہنچا دے گا۔

ظاہر ہے یہ تفصیلات اور یہ منصوبے کوئی اتنی جلدی طے نہیں ہوئے ہوں گے۔
 ہوا یہ کہ نور کے باپ نے کہا کہ وہ ایک اپنے قاتل اعتماد آدمی کو بھی ساتھ لے جائے گا
 اور تمام انتظامات مکمل کر لے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اسے باہر نکلنا پڑے گا تاکہ وہ
 آدمی کو بھی تیار کر لے۔ حیدر بصری اور اس کے ساتھی کو یہ سن کر شک ہوا کہ یہ شخص
 انہیں پکڑوا دے گا۔ حیدر بصری نے یہ شک صاف الفاظ میں ظاہر کر دیا۔

”پھر اس کا مطلب یہ ہو گا“ — نور کے باپ نے کہا — ”کہ تم صرف مجھے اور
 میری بیٹی کو اپنے ساتھ قیدی بنا کر لے جاؤ گے اور خزانہ تمہارے ساتھ نہیں ہو گا۔ اگر
 خزانہ چاہئے تو مجھے باہر نکلنے دو۔ یہ ہے میری بیٹی۔ اسے یہ غمال بنا کر جہاں جی چاہے لے
 جاؤ۔ میں دلی طور پر یہ چاہتا ہوں کہ ہم سب الموت اکٹھے جائیں اور خزانہ ہمارے ساتھ
 ہو۔ اس طرح مجھے یہ فائدہ حاصل ہو گا کہ شیخ الجبل میری نیت پر شک نہیں کرے گا اور
 اس کے دل سے یہ الزام نکل جائے گا کہ شاہ در کی شکست کا ذمہ دار میں ہوں۔“

نور کے باپ نے اس مسئلے میں بھی حیدر بصری کو اپنا ہم خیال بنالیا اور اسے کہا کہ
 وہ ایک بڑی گھوڑا گاڑی اور تین زندہ بھیڑوں کا انتظام کر لے۔ حیدر بصری نے پوچھا کہ
 بھیڑوں کو کیا کرنا ہے تو نور کے باپ نے کہا کہ یہ وہاں چل کر بتاؤں گا۔ وہ جب حلق کے
 ساتھ خزانے والی جھیل تک جا رہا تھا تو حلق پانچ بھیڑیں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ نور کے
 باپ نے اس سے پوچھا تھا کہ بھیڑوں کا کیا استعمال ہو گا تو حلق نے یہی جواب دیا تھا کہ
 وہاں چل کر بتاؤں گا۔

مختصراً یہ واقعہ یوں ہوا کہ حیدر بصری اور اس کا ساتھی گھوڑا گاڑی کا انتظام کرنے
 چلے گئے اور نور کا باپ یہ بتا کر کہ وہ اپنے آدمی کے پاس جا رہا ہے، سلطان خنجر کے وزیر
 کے پاس چلا گیا اور اسے بتایا کہ دو فدائی اس کے جال میں آ گئے ہیں لیکن وہ انہیں پکڑوانا
 نہیں چاہتا بلکہ بہت بُرے انجام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس نے وزیر کو یہ بھی بتایا کہ انہیں
 حسن بن صباح نے اسی خزانے کے لئے بھیجا ہے جو سلطنت کے سرکاری خزانے میں جمع
 ہو چکا ہے۔

وزیر نے اسے اجازت دے دی اور کہا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی بیٹی کو بھی پوری
 طرح محفوظ رکھے اور کوئی خطرہ مول نہ لے اور اسے جو کچھ بھی چاہئے وہ یہاں سے لے
 لے۔

رات کا پہلا پرگزرا گیا تھا۔ شہ در شہ پر نیند کا غلبہ طاری ہو چکا تھا۔ شہر کے مضافات کی ایک چھوٹی سی بستی میں ایک گھوڑا گاڑی نکلی جس کا رخ اس جھیل کی طرف تھا جس کے وسط میں عبدالملک بن عطاش کا خزانہ تھا اور جو اب وہاں نہیں تھا۔ گاڑی کے آگے دو گھوڑے جتے ہوئے تھے اور ان کی باگیں نور کے باپ کے ہاتھ میں تھیں۔ گاڑی میں نور بھی تھی، حیدر بھری اور اس کے دو ساتھی تھے اور ایک آدمی وہ تھا جسے نور کا باپ اپنے ساتھ لایا تھا۔ گاڑی میں تین بھیڑیں بھی تھیں۔ نور کا باپ راستے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس راستے پر وہ جا بھی چکا تھا اور واپس بھی آچکا تھا۔

شہر سے کچھ دور جا کر نور کے باپ نے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ صبح طلوع ہونے تک وہ آبادیوں سے دور جنگل بیابان میں جا پہنچے۔ اس نے سب کو بتا دیا تھا کہ پوری رات گاڑی چلتی رہے گی اور صبح کے وقت کہیں رکیں گے۔ صبح طلوع ہوئی تو وہ ایک ایسے جنگل بیابان میں پہنچ چکے تھے جس کے پیر پودوں کے لئے انسان ایسا جانور تھا جو انہوں نے پہلے کبھی دیکھا نہ ہو۔ دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہ تھا اور پتہ چلتا تھا کہ ادھر سے کبھی کسی انسان کا گزر نہیں ہوا۔ نور کا باپ اس بیابان میں سے پہلے حلق کے ساتھ گزرا تھا۔ انہوں نے کچھ دیر گھوڑوں کو آرام دیا اور خود بھی کچھ کھلایا پیا اور پھر چل پڑے۔

نور اور اس کا باپ حلق کے ساتھ اس طرف آئے تھے تو حلق بڑی جلدی میں تھا۔ اس نے گھوڑوں کو اتنا زیادہ دوڑایا تھا کہ گھوڑے پسینے سے نمائے اور ہانپ کانپ رہے تھے۔ اب گھوڑوں کی باگیں نور کے باپ کے ہاتھ میں تھیں اور اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کیا کرنا ہے اور اس نے اپنے ساتھی کو بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا اور نور کو بھی۔ اب وہ بڑے آرام سے گھوڑوں کو چلا رہا تھا اور ایک اور رات آگئی۔

وہ گھوڑوں کو کھلانے پلانے کے لئے اور خود آرام کرنے کے لئے رک گئے۔ وہ گزشتہ رات جاگتے رہے تھے اس لئے جوں ہی لیٹے سب سو گئے۔ نور کا باپ اور اس کا ساتھی حیدر بھری اور اس کے ساتھیوں کو سوتے میں بڑے آرام سے قتل کر سکتے تھے لیکن نور کا باپ اس قدر جلا بھنا ہوا تھا کہ وہ انہیں بڑے ہی خوفناک انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ نور کا باپ قافلے کے ساتھ جا رہا تھا کہ ان باطنی لیروں نے اس قافلے کو لوٹ لیا اور

اس کی بیٹی کو اٹھا کر لے آئے تھے اور اس کے باقی بچوں کو انہوں نے قتل کر دیا تھا اور اس کی بیوی کو بھی قتل کر دیا تھا۔ اس کے سینے میں ان بانیوں کے خلاف انتقام کے شعلے بھڑکتے رہتے تھے۔

رات گزر گئی اور یہ قافلہ گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر چل پڑا۔ نور کا باپ حلق کے ساتھ آیا تھا تو رات کو جھیل پر پہنچے تھے لیکن اب نور کا باپ دن کے وقت وہاں پہنچ رہا تھا۔ فاصلہ بہت ہی تھوڑا رہ گیا تھا۔ نور کے باپ نے دانستہ رات وہاں گزاری تھی۔

کچھ دیر بعد وہ جھیل پر پہنچ گئے۔ نور کے باپ نے دو چیزیں دور سے ہی دیکھ لیں۔ ایک تو چار پانچ مگرچھ تھے جو جھیل سے نکل کر خشکی پر سوئے ہوئے تھے۔ دوسری چیز وہ کشتی تھی جس میں وہ خزانہ نکال کر لایا تھا۔ وہ کشتی اسی جگہ جھیل کے کنارے موجود تھی جہاں اس نے اور نور نے اسے گھسیٹ کر آدھا خشکی پر کر دیا تھا۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی کشتیاں بھی پڑی تھیں لیکن اصل کشتی ان سے کچھ دور تھی۔ نور کے باپ نے گھوڑا گاڑی وہاں جا کر روکی اور سب کو اترنے کے لئے کہا۔

سب اترے اور بھینروں کو بھی اتار لیا گیا پھر بھینروں کو کشتی میں پھینک کر سب سوار ہو گئے اور چوہو نور کے باپ نے اور اس کے ساتھی نے سنبھل لئے۔ کشتی جوں ہی جھیل میں ذرا آگے گئی تو تین چار مگرچھ بڑی تیزی سے کشتی کی طرف آئے۔ نور کے باپ نے کہا کہ ایک بھینر جھیل میں پھینک دو۔

ایک بھینر حیدر بھری نے اٹھائی اور جھیل میں پھینک دی۔ سارے مگرچھ اس بھینر پر ٹوٹ پڑے۔ کچھ اور آگے گئے تو دو اور مگرچھ آگئے۔ نور کے باپ نے حیدر بھری سے کہا کہ ایک اور بھینر جھیل میں پھینک دے جو اس نے پھینک دی۔ نور کا باپ اور اس کا ساتھی بڑی تیزی سے چوہو مار رہے تھے۔ جھیل کا پانی پُر سکون تھا اس لئے کشتی کی رفتار خاصی تیز تھی۔

چھوٹے مگرچھ بھی جھیل میں نظر آرہے تھے لیکن وہ سب اُدھر کو ہی چلے گئے جدھر مگرچھوں نے دو بھینروں کو پکڑ لیا اور اسے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

آخر کشتی اس خشکی پر جا لگی جس پر چٹائیں تھیں اور اس ذرا سے اس چٹائی علاقے کے وسط میں خزانے والے غار تھے۔ نور کے باپ نے حیدر بھری اور اس کے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اتر جائیں اور وہ کشتی باندھ کر آتا ہے۔ نور کے باپ کا ساتھی اور نور بھی

اس طرح اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے کشتی میں سے اتریں گے۔ حیدر بصری اور اس کے دونوں ساتھی کود کر خشکی پر چلے گئے۔ نور کے باپ نے انہیں کہا کہ وہ آگے چلیں۔

جونہی ان تینوں نے پیٹھ پھیری، نور کے باپ نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور دونوں نے چپو مارنے شروع کر دیئے اور کشتی خشکی سے ہٹ آئی اور تیز ہی تیز ہوتی چلی گئی۔ حیدر بصری اور اس کے ساتھیوں نے گھوم کر دیکھا تو وہ حیران رہ گئے کہ یہ لوگ کشتی کہاں لے جا رہے ہیں۔ آخر حیدر بصری نے بلند آواز سے پوچھا کہ تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔

”ان چٹانوں کے اندر چلے جاؤ“ — نور کے باپ نے کہا — ”تمہیں خزانہ مل جائے گا۔ ہمیں خزانے کی ضرورت نہیں۔“

نور کے باپ اور اس کے ساتھی نے بڑے بلند قمتے لگائے۔ تب حیدر بصری سمجھا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ تینوں نے جھیل میں چھلانگیں لگا دیں اور کشتی کی طرف تیرنے لگے۔ انہیں غالباً یہ توقع تھی کہ وہ تیر کر اس ساحل پر پہنچ جائیں گے جہاں سے وہ کشتی میں سوار ہوئے تھے لیکن مگر مچھوں نے انہیں دیکھ لیا اور بڑی تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔ نور کے باپ نے کشتی کی رفتار اور تیز کر دی اور کنارے جا گئے۔ انہوں نے ایک بھیڑ بچالی تھی جسے اٹھا کر وہ کشتی سے نکل آئے اور ان تین باطنیوں کے انجام کا تماشا دیکھنے لگے۔

ان تینوں کی آخری چیخیں آسمان کا سینہ چاک کر رہی تھیں لیکن یہ چیخیں الموت تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ کچھ دیر تک ان کی چیخیں اور آہ و بکا سنائی دیتی رہی اور وہ تینوں دکھائی دیتے رہے اور پھر مگر مجھ انہیں پانی کے نیچے لے گئے۔

نور کے باپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے بازو پھیلائے اور لمبی آہ بھری اور پھر نور اور اپنے ساتھی کو سر کا اشارہ کیا کہ آؤ چلیں۔

یکے بعد دیگرے ایسے واقعات ہو گئے تھے اور ہوتے چلے جا رہے تھے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سلسلہ جاری رہا تو حسن بن صباح زوال پذیر ہو جائے گا۔

کچھ عرصہ پہلے تک یوں نظر آتا تھا جیسے فتح اور ہر ابلیسی کام میں کامیابی حسن بن صباح کے مقدّر میں لکھ دی گئی ہے۔ اس کے جانباز فدائی سلطنت سلجوقیہ کی جڑوں میں اتر گئے تھے۔ اُس نے مسلمانوں میں خانہ جنگی تک کرا دی تھی۔ انہوں نے انہوں کا اس قدر خون بہا دیا تھا کہ تاریخ کے اوراق آج بھی اس خون سے لال ہیں۔ حسن بن صباح نے جس سیاسی، معاشرتی اور مذہبی شخصیت کو اور جس حاکم کو قتل کرنا چاہا وہ اپنے فدائیوں سے کرا دیا.... حکمرانی تو سلجوقیوں کی تھی لیکن لوگوں کے دلوں پر حسن بن صباح راج کرتا تھا۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو اس کے مُرید ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اسے نبی مانتے تھے اور زیادہ تر لوگ آسمان سے اتر ا ہوا امام سمجھتے تھے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جن پر حسن بن صباح اور اس کے فدائی دہشت بن کر آسیب کی طرح سوار ہو گئے تھے۔

لوگ یقین سے کہتے تھے کہ حسن بن صباح کے پاس کوئی جادو ہے ورنہ ایسا کبھی نہ ہوتا کہ ایک آدمی ایک طاقتور سلطنت کے لئے اتنا خطرناک اور دہشتناک مسئلہ بن جاتا۔ مورخوں نے بھی یہی لکھا ہے۔ تاریخ ایسی شہادت پیش کرتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے ہاتھ میں جادو ضرور تھا لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ دن کو رات یا رات کو دن بناتا۔



سلطنت سلجوقیہ کی فوج میں اور لوگوں میں بھی بددلی سی پائی جاتی تھی جیسے وہ حسن بن صباح کو شکست نہیں دے سکیں گے۔ اس فوج نے بامنیوں کے قبضے میں آئے ہوئے جس قلعے کا بھی محاصرہ کیا وہاں سے فوج ناقابلِ برداشت جانی نقصان اٹھا کر پسپا ہو آئی تھی۔

پھر لوگوں کے کانوں میں یہی ایک خبر پڑتی تھی کہ آج حسن بن صباح نے وزیرِ اعظم کو یا کسی حاکم کو یا کسی عالمِ دین کو قتل کروا دیا ہے۔ لوگ فدائیوں کو جن بھوت سمجھنے لگے تھے لیکن سالار اور یزی نے دسم کوہ کا قلعہ فتح کر لیا، پھر شاہ در پر بھی قبضہ ہو گیا اور پھر حسن بن صباح کے پیر استاد عبد الملک بن عطاش کو بھی قتل کر دیا گیا اور اس کے علاوہ لوگوں کو یہ خبریں ملنے لگیں کہ باطنی فدائی پکڑے جانے لگے ہیں اور وہ اپنے ساتھیوں کو بھی پکڑوا رہے ہیں اور یہ بھی کہ وہ حسن بن صباح کے غدار اور مسلمانوں کے وفادار ہو گئے ہیں تو لوگوں کی نگاہوں میں حسن بن صباح ایک انسان کے روپ میں سامنے آنے لگا۔

سلطان محمد کا وزیرِ اعظم ابو نصر احمد مرو میں الموت پر حملے کے لئے بہت بڑی فوج تیار کر رہا تھا اور زیادہ تر وقت اس کی ٹریننگ پر صرف کرتا تھا۔ وہ وزیرِ اعظم تھا لیکن ہمہ وقت سپہ سالار بن گیا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ فوج میں حسن بن صباح کو پُر اسرار اور ایسی شخصیت سمجھا جا رہا ہے جس کے ہاتھ میں کوئی غیبی طاقت ہے۔ فوج کا جذبہ اور لڑنے کا حوصلہ مضبوط کرنے کے لئے ابو نصر احمد ساری فوج کو اکٹھا کر کے سناٹا رہتا تھا کہ بامنیوں پر کس طرح کامیابیاں حاصل کی جا رہی ہیں۔

وہ فوج کو قرآن کی وہ آیات سنا رہتا تھا جن کا تعلق جہاد کے ساتھ ہے۔ یہ آیت تو وہ اکثر سنایا کرتا تھا — ”وہ لوگ جو ایمان والے ہیں اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر طاغوت کے لئے لڑتے ہیں۔ شیطان کے ساتھیوں کے خلاف جہاد کرو۔ یقیناً شیطان کی چالیں کمزور ہیں۔“

پہلے سنایا جا چکا ہے کہ وہ سالاروں اور ان سے کم درجہ کمانداروں کو پوری طرح آرام بھی نہیں کرنے دیتا تھا۔ ہمیں اکٹھا کر کے الموت کے محاصرے اور تسخیر کے طریقے بتاتا اور ان کے مشورے اور تجاویز غور سے سنتا تھا۔ اس کے جوش و خروش اور سرگرمیوں میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے ابن مسعود نے الموت کے اندر کی

معلومات دے دی تھیں۔ وہ اب اپنے سالاروں کو الموت کے اندر کے نقشے بتا بنا کر دکھاتا اور انہیں یقین دلاتا تھا کہ الموت کو فتح کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

عبید عربی اور ابن مسعود جیسے پھر دل فدائی جو کسی دوسرے کی اور اپنی جان لے لینے کو ایک پُر لطف کام سمجھتے تھے، اپنے امام حسن بن صباح کی جان بکے دشمن ہو گئے تھے۔ ان کے ایمان پر اہلبیت کے جو پردے پڑ گئے تھے، وہ انہوں نے اتار پھینکے تھے۔

یہ تمام واقعات لوگوں کو سنائے جاتے رہے تو ان میں جو بددلی پیدا ہو گئی تھی وہ نکل گئی۔ لوگ تسلیم کرنے لگے کہ اللہ ان کی مدد کر رہا ہے۔ لوگوں کو مسجدوں میں خطبوں میں بتایا گیا کہ اللہ ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ یہ آیت فوج میں شامل ہونے والے لوگوں کو ذہن نشین کرادی گئی تھی کہ لڑو اُس وقت تک جب تک کفر کا فتنہ موجود ہے اور جب تک روئے زمین پر اللہ کی حکمرانی قائم نہیں ہو جاتی۔

ان حالات سے یہی پتہ چلتا تھا کہ حسن بن صباح کا زوال شروع ہو گیا ہے۔



داستان گونا چکا ہے کہ ابن مسعود الموت چلا گیا تھا اور اُس نے غداری کا سارا الزام حیدر بصری کے سر تھوپ دیا اور خود مظلوم اور مسلمانوں کی قید سے فرار کا ہیرو بن گیا تھا۔ اس وقت اسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ حیدر بصری کو امام شیخ الجبل نے شاہ در خزانہ نکالنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ ابن مسعود کو جب پتہ چلا تو اُس نے کہا کہ اسے خزانہ مل گیا تو وہ واپس ہی نہیں آئے گا۔

اس نے یہ الفاظ منہ سے نکال تو دیئے تھے لیکن وہ شیخ الجبل کے آگے جھوٹ بولنے کی سزا سے بے خبر نہیں تھا.... سزائے موت.... اگر حیدر بصری خزانہ لے کر یا خزانے کے بغیر ہی آ جاتا تو ابن مسعود کو گھٹنوں تک زمین میں گاڑ کر اُس پر خونخوار کئے چھوڑ دیئے جاتے لیکن یہ بھی اللہ کی مدد تھی کہ حیدر بصری اور اس کے ساتھیوں کو خزانے والی جھیل کے مگر مجھ ہضم کر چکے تھے اور حیدر بصری نے اب کبھی واپس نہیں آتا تھا۔

نور کے باپ نے بڑا ہی خوفناک انتقام لیا تھا۔ یہ پچھلے باب میں سنایا جا چکا ہے۔ نور کے باپ نے اپنی انتقامی کارروائی کو یہیں پر ختم نہیں کر دیا تھا۔ حیدر بصری اور اس کے ساتھیوں کو مگر مچھوں کے حوالے کر کے وہ اپنے ساتھی اور نور کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں سوار ہوا اور واپس چل پڑا۔ اب اُس نے کچھ سوچ کر گھوڑوں کو دوڑایا نہیں، رفتار

آہستہ رکھی۔ اُس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ وہ دو یا تین راتیں راستے میں ہی گزارے گا۔

چوتھے روز وہ شام کے بعد اُس وقت شاہ در میں داخل ہوا جب رات تاریک ہو گئی تھی۔ وہ دانستہ ایسے ہی وقت شہر میں داخل ہونا چاہتا تھا جب اسے وہ باطنی نہ دیکھ سکیں جنہیں معلوم تھا کہ وہ حیدر بھری کے ساتھ خزانے والی جھیل کو گیا تھا۔ ان باتوں کے صرف ایک گھر سے وہ واقف تھا۔ وہ لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ وہ شہر کے ساتھ ہی ایک گاؤں میں رہتے تھے۔

وہ سیدھا سلطان خنجر کے وزیر کے گھر کے سامنے جا رکھا اور وزیر کو پتہ چلا تو اُس نے اسے اندر بلا لیا۔۔۔۔۔ نور کے باپ نے وزیر کو بتایا کہ وہ کیا کر آیا ہے اور اب وہ کیا کرے گا۔ وزیر اُس کی بات سن کر خوش تو بہت ہوا لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے، محتاط ہو کر کرے اور اپنی اور اپنی بیٹی کی حفاظت سے بھی کوتاہی نہ کرے۔

اُس نے گھوڑا گاڑی وہیں چھوڑی اور وزیر سے درخواست کی کہ اس گاڑی کو چھپا کر رکھ دیا جائے اور یہ کسی کے سامنے نہ آئے.... وزیر نے گھوڑا گاڑی اور گھوڑے کو چھپا کر رکھنے کا حکم دے دیا۔ نور کا باپ نور اور اپنے ساتھی کو ساتھ لے کر وہاں سے اپنے گھر گیا اور انہیں یہ کہا کہ دو دن وہ باہر نہ نکلیں اور کسی کو پتہ نہ چلے کہ وہ واپس آ گئے۔



دو روز بعد نور کا باپ شہر سے نکلا اور گاؤں میں اُس باطنی کے گھر گیا جہاں باطنی اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ وہاں تین چار باطنی موجود تھے جن میں ایک فدائی تھا۔
 ”آگئے تم لوگ؟“ — ایک دو نے بیک زبان کہا — ”گھوڑا گاڑی کی آواز نہیں آئی.... حیدر اور دو سرے کہاں ہیں؟“

نور کا باپ کوئی جواب دیئے بغیر یوں چار پائی پر بیٹھا جیسے نڈھال ہو کر گر پڑا ہو۔ اُس نے سر جھکا کر دونوں ہاتھ سر پر رکھ لئے جو کوئی اچھی نشانی نہیں تھی۔ یا مٹیوں نے گھبرائی ہوئی سی آواز میں پوچھا ہوا کیا ہے؟

”کیا بتاؤں دوستو!“ — نور کے باپ نے بڑی ہی کمزور اور شکست خوردہ آواز میں کہا — ”شیخ الجبل کے طفیل میری اور میری بیٹی اور میرے ساتھی کی جان بچ گئی ہے اور

میری جوان بیٹی کی عزت بھی بچ گئی ہے.... حیدر بصری اور اس کے ساتھی خزانہ لے کر کہیں اور نکل گئے ہیں۔ وہ آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اتنا ہی سنا کہ وہ اسی گھوڑا گاڑی پر مصر چلے جائیں گے۔ بہر حال وہ الموت نہیں گئے۔ غداری کر گئے ہیں۔“

باطنی اُس سے پوچھنے لگے کہ یہ سب ہوا کیسے؟.... نور کے باپ نے کہا کہ وہ خیریت سے خزانے کے غار تک پہنچ گئے تھے اور بکس اٹھا کر لائے، کشتی میں بھی رکھ لئے مگر مچھوں نے حملہ کیا تو ان کے آگے بھڑس پھینک کر کنارے سے آگے اور پھر بکس گاڑی میں ڈال لئے۔

نور کے باپ نے رنج و الم سے دبی ہوئی آواز میں بتایا کہ وہاں سے چلنے لگے تو وہ آگے بیٹھا اور گھوڑوں کی باگیں ہاتھوں میں لے لیں لیکن حیدر نے اس کے ہاتھوں سے باگیں لے کر اسے پیچھے بٹھا دیا اور گاڑی چلا دی۔ کچھ دیر کے سفر کے بعد ایسی جگہ پہنچے جہاں سے دو راستے نکلتے ہیں۔ ایک شاہ در کی طرف آتا ہے اور دوسری پگڈنڈی کسی اور طرف چلی جاتی ہے۔

اُس نے الم ناک آواز میں آہستہ آہستہ سنایا کہ حیدر نے گھوڑا گاڑی دوسری پگڈنڈی کی طرف موڑ دی اور نور کے باپ نے اسے بتایا کہ شاہ در کو وہ دوسرا راستہ جاتا ہے۔ حیدر نے نہ جانے کس زبان میں کچھ کہا تو حیدر کے ساتھیوں نے نور کے باپ کو اور اس کے ساتھی اور نور کو بھی اٹھا کر دوڑتی گھوڑا گاڑی سے باہر پھینک دیا اور گھوڑے دوڑا دیئے۔ جتنی دیر میں وہ اٹھتے اور سنبھلتے تھے، گھوڑا گاڑی دور آگے جا کر ایک موڑ مُڑ چکی تھی اور چٹانوں کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

پھر نور کے باپ نے سنایا کہ وہ بیابان، سنان اور خطرناک جنگل تھا اور نور کا باپ صرف اپنی جوان اور خوبصورت بیٹی کے متعلق پریشان تھا۔ ان کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا جو کوئی راہزن یا ڈاکو لوٹ لیتا، سب سے زیادہ قیمتی چیز نور تھی۔ اسے چھپائے رکھنا بہت ہی مشکل نظر آ رہا تھا۔ وہ شاہ در کی طرف آنے والی پگڈنڈی پر ہو گئے اور شیخ الجبل کو یاد کرتے چل پڑے۔

”ہمیں زندہ واپس آنے کی کوئی امید نہیں تھی“ — نور کے باپ نے سنایا —
”جنگل میں ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تھی تو میں ڈر جاتا کہ یہ راہزن ہی ہوں گے۔ ہم خاصی

دور نکل آئے تو پیچھے سے سات اونٹ آتے نظر آئے۔ اب تو ہم اور زیادہ ڈرے۔ ہماری تلواریں گھوڑا گاڑی میں چلی گئی تھیں۔ بھاگنا بھی بے کار تھا۔ شترسواروں نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور وہ اونٹوں پر سوار ہو کر اونٹ ہمارے پیچھے دوڑا دیتے اور ہمیں پکڑ سکتے تھے....

”ہم نے اپنے آپ کو قسمت اور تقدیر کے حوالے کر دیا۔ اونٹ قریب آ گئے تو میں نے دیکھا کہ سات میں سے چار اونٹوں پر سلمان لدا ہوا تھا اور تین خالی تھے۔ ان کے ساتھ پانچ آدمی تھے۔ وہ ہمارے قریب آئے تو ان کا انداز ایسا تھا جس سے یہ شک نہیں ہوتا تھا کہ یہ راہزن یا ڈاکو ہیں۔ انہوں نے ہمیں مسکرا کر دیکھا اور ایک نے پوچھا کہ تم لوگ کون ہو اور کہاں جا رہے ہو.... میں نے انہیں یہ جھوٹا بیان دیا کہ ہم اونٹوں پر آ رہے تھے اور شاہ در جا رہے ہیں، راستے میں دو راہزنوں نے سلمان بھی لوٹ لیا ہے اور اونٹ بھی لے گئے ہیں....

”میری یہ بات سن کر ایک نے کہا کہ وہ اگر ڈاکو تھے تو اتنی خوبصورت لڑکی کو کیوں چھوڑ گئے ہیں؟ میں نے دوسرا جھوٹ بولا کہ اُس وقت یہ لڑکی جنگل کے اندر ایک اونٹ میں چلی گئی تھی۔ اس نے وہاں سے دیکھ لیا تھا اور چھپی رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ میری بیٹی ہے پھر میں نے اُن شتریانوں کی منت سماجت کی کہ ہمیں اونٹوں پر شاہ در پہنچا دیں اور وہ جتنی اُجرت مانگیں گے، وہاں انہیں دے دی جائے گی۔ وہ کوئی بھلے لوگ تھے جو ہمیں اونٹوں پر سوار کر کے یہاں لے آئے اور میں نے انہیں کچھ اُجرت دے دی لیکن راستے میں انہوں نے تین دن لگا دیئے۔ ہم تینوں تو گھر میں نڈھال ہو کر پڑے رہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ ہمارے ساتھ جو ہوا وہ کن الفاظ میں سنائیں گے کہ وہ سننے والے مان لیں۔“

”وہ تو ہم نے مان لیا ہے“ — ایک باطنی نے کہا — ”یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ تم جیسے بوڑھے نے حیدر بصری اور اس کے ساتھیوں کو اپنے صرف ایک ساتھی کے ساتھ قتل کر دیا ہو اور خزانہ ہضم کر لیا ہو، اب یہ سوچو کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔“

”تم سب ان کے تعاقب میں نکل جاؤ تو بھی ان تک نہیں پہنچ سکتے“ — نور کے باپ نے کہا — ”یہ تو دیکھو کہ دن کتنے گزر گئے ہیں۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی الموت چلا جائے اور شیخ الجبل کو بتا دے کہ خزانہ حیدر بصری لے اُڑا ہے۔ وہ الموت گیا

ہو تا تو ہمیں اس کے ساتھی راستے میں پھینک کیوں جاتے!“
 اُن میں سے ایک آدمی اُسی وقت اَلْمُوت جانے کے لئے تیار ہوا اور گھوڑے پر
 سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ نور کا باپ اٹھا اور دکھ زدہ آدمی کی طرح سر جھکائے ہوئے اس گھر
 سے نکل آیا۔



اَلْمُوت میں ابن مسعود باقاعدہ قید میں تو نہیں تھا لیکن اس کی باقاعدہ نگرانی ہو رہی
 تھی۔ حسن بن صباح نے کہا تھا کہ یہ خیال رکھا جائے کہ یہ شخص کہیں یہاں سے نکل نہ
 جائے۔

ابن مسعود ایک کشمکش میں مبتلا رہتا تھا۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے، اُس کی
 پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اسے ہر لمحہ یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ حیدر بصری خزانہ
 لے کر آجائے گا اور اس کا پل کھل جائے گا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ حیدر بصری کو
 جھٹلانے کی پوری کوشش کرے گا لیکن آنے کی صورت میں خطرہ یہ تھا کہ حسن بن
 صباح نے اُسی کو سچا اور دیانتدار سمجھنا تھا۔ اس صورت میں حسن بن صباح کے منہ سے
 یہی الفاظ نکلنے تھے کہ اس شخص ابن مسعود کو لے جاؤ اور عبرت ناک موت مار ڈالو۔

آخر ایک روز بلاوا آ گیا۔ ابن مسعود اندر سے کانپتا ہوا امام کے کمرے تک پہنچا۔
 اس نے نیفے میں خنجر اڑس لیا تھا اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ امام جب اسے سزائے موت
 سنائے گا تو وہ خنجر نکال کر امام کے دل میں اتار دے گا۔

”آؤ ابن مسعود!“ — حسن بن صباح نے کہا — ”مجھے یہ تو خوشی ہے کہ تم سچے
 نکلے اور اب میں تمہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ تم سلجوقیوں کی قید سے فرار ہو
 آئے ہو لیکن اس اطلاع نے مجھے بہت دکھ دیا ہے کہ حیدر بصری اپنے ساتھیوں کے
 ساتھ سارا خزانہ لے اڑا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ مصر جا رہا ہے۔ دن اتنے گزر گئے ہیں
 کہ اب اس کا تعاقب محض بے کار ہے۔“

”یا شیخ الجبل!“ — ابن مسعود نے کہا — ”کیا مصر میں ہمارا کوئی آدمی نہیں؟“
 ”وہ انتظام تو میں کر ہی دوں گا“ — حسن بن صباح نے کہا — ”لیکن یہ تو بہت
 دریا کی تہ میں سے سوئی ڈھونڈنے والی بات ہوگی۔ مصر بہت بڑا ملک ہے جس کے کئی
 شہر اور قصبے ہیں، معلوم نہیں یہ بد بخت کہاں جا آباد ہو گا۔“

”یا شیخ الجبل!“ — ابن مسعود نے بڑی جاندار اور پُر اعتماد آواز میں کہا — ”اب میں وہ باتیں بھی کر سکتا ہوں جو پہلے آپ تک نہیں پہنچائی تھیں۔ حیدر نے سلجوقیوں کو یہ بھی بتادیا ہے کہ دریا کی طرف اَلْمَوْتُ کا ایک چور دروازہ ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس دروازے تک کس طرح پہنچا جاسکتا ہے۔ اَلْمَوْتُ کا محاصرہ ضرور ہی ہو گا اور سلجوقیوں کی کوشش یہ ہوگی کہ وہ دریا والے دروازے سے اندر آئیں گے۔“

”اندر سے دروازہ کون کھولے گا؟“ — حسن بن صباح نے پوچھا۔

”ان کے ایک دو آدمی آپ کے پیروکاروں کے بہروپ میں قلعے میں پہلے ہی آ جائیں گے“ — ابن مسعود نے کہا — ”انہیں اس دروازے تک اندر سے پہنچنے کا راستہ معلوم ہو گا۔ حیدر بصری نے انہیں بڑی اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔“

”وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے“ — حسن بن صباح نے کہا — ”میں اس کا بندوبست کر لوں گا۔“

”ایک عرض ہے یا شیخ الجبل!“ — ابن مسعود نے کہا — ”آپ کا بندوبست یقیناً بے مثل ہو گا لیکن وہ دروازہ میری ذمہ داری میں دے دیں پھر اس تک کسی کے پہنچنے کا امکان بالکل ہی ختم ہو جائے گا۔ میں دسم کوہ میں بہت عرصے بعد پکڑا گیا اور قید ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں وہاں اتنا زیادہ عرصہ رہا ہوں کہ فوج کے بے شمار چیدہ چیدہ آدمیوں کو پہچانتا ہوں۔ وہ کسی بھی بہروپ میں آئے، میں انہیں پہچان لوں گا۔ اس سے پہلے مجھے مَرُو جانے دیں۔“

”وہاں جا کر کیا کرو گے؟“ — حسن بن صباح نے پوچھا — ”کیا پکڑے نہیں جاؤ گے؟“

”نہیں یا شیخ الجبل!“ — ابن مسعود نے جواب دیا — ”دسم کوہ میں مجھے بہت سے لوگ پہچانتے ہیں، مَرُو میں نہیں۔ میں مَرُو سے واقف ہوں اور کچھ عرصہ وہاں رہا ہوں لیکن لوگوں میں زیادہ اٹھا بیٹھا نہیں.... سلطان محمد کا وزیر اعظم ابو نصر احمد اَلْمَوْتُ پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ اُسے قتل کیا جاسکتا ہے لیکن میں کہتا ہوں اسے قتل نہیں کریں گے۔ اسے قتل کر دیا تو اس کی جگہ کوئی اور وزیر اعظم بن جائے گا اور وہ حملے کی تیاری جاری رکھے گا بلکہ سلطان کو خوش کرنے کے لئے فوراً حملہ کر دے گا۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ ابو نصر احمد کو زندہ رہنے دیا جائے اور اسے اپنے اثر میں لے لیا جائے۔ مجھے یہ بھی

معلوم ہے کہ سلطان محمد پر اس وزیر اعظم کا اثر غالب ہے۔ ہم اس وزیر اعظم کو اپنے جلال میں لا کر سلطان محمد کو اپنے رنگ میں رنگ سکتے ہیں۔“

”یہ کام کون کرے گا؟“

”میں کروں گا یا شیخ الجبل!“ — ابن مسعود نے جواب دیا — ”آپ مجھے مروّ جانے دیں اور میں زریں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”زریں کون ہے؟“

”وہ میری سگی بہن ہے“ — ابن مسعود نے جواب دیا — ”آپ کو یاد نہیں رہا“ میرا باپ ہم دونوں کو آپ کی خدمت میں پیش کر گیا تھا۔ زریں جنت میں ہے اور میں اس کے ذریعے ابو نصر احمد کو اپنے ہاتھ میں لے لوں گا۔ بڑی ہی خوبصورت اور تیز طرار لڑکی ہے۔ وہاں میں اپنے آپ کو چھپا کر رکھوں گا۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ابو نصر احمد جذباتی اور حُسن پرست ہے۔ اسے ہم شیشے میں اتار لیں گے۔“

حسن بن صباح گہری سوچ میں کھو گیا۔

”آپ کو یاد ہو گا یا شیخ الجبل!“ — ابن مسعود نے کہا — ”ہم نے ان کے ایک وزیر اعظم سعید الملک کو اپنے اثر میں لے ہی لیا تھا۔ وہ بہت عرصہ ہمارے زیر اثر رہا تھا پھر نہ جانے کس غدار نے یہ راز فاش کر دیا اور سلطان نے اس وزیر اعظم کو جلاد کے حوالے کر دیا تھا۔ ابو نصر احمد کو بھی اپنے ساتھ ملانا کوئی مشکل کام نہیں۔ آپ مجھے مروّ جانے دیں اور یہ اجازت بھی دیں کہ میں زریں کو اپنے ساتھ لے جاؤں.... ہاں یہ بھی یاد آیا یا شیخ الجبل! آپ نے سلطان برکیارق کو بھی تو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا.... اگر آپ میرا مشورہ قبول کریں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ ابو نصر احمد کو بھی اسی طرح آپ کی مٹھی میں دے دیں گے۔“

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح بوڑھا ہو گیا تھا۔ اُس میں پہلے والی بات نہیں رہی تھی۔ وہ مشورے کم ہی سنا کرتا تھا۔ اُس پر پے در پے چوٹیں ہی ایسی پڑی تھیں کہ اس کا دماغ کچھ کمزور ہو گیا تھا۔ سب سے بڑی چوٹ تو یہ تھی کہ اس کا پیر و مُرشد عبد الملک بن عطاش مرا نہیں بلکہ مار دیا گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اس نے جو جادو حسن بن صباح کو سکھایا تھا وہ اس کے ساتھ ہی قبر میں چلا گیا تھا۔

یہ چوٹ بھی کچھ کم نہ تھی کہ اس کے اپنے فدائی جن پر اسے مکمل بھروسہ تھا اتنا

زیادہ خزانہ لے کر غائب ہو گئے تھے۔ یہ تو اسے ابھی معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا ایک اور قابلِ اعتماد فدائی جس کا نام ابن مسعود تھا اور جو اس کے سامنے بیٹھا اسے مشورے دے رہا تھا، اسے بہت بڑا فریب دے رہا تھا۔ اس فدائی کو یہ فریب کاری حسن بن صباح نے خود ہی سکھائی تھی اور وہ اس کا اور اس کے استادوں کا ہی شاگرد تھا۔ یہ طلسم سامری تھا جو ابن مسعود سامری کے ہی خلاف استعمال کر رہا تھا اور حسن بن صباح جیسا ابلیس اس کا پورا پورا اثر لے رہا تھا۔

حسن بن صباح نے اُسی وقت اپنے دو تین مشیروں کو بلایا اور ابن مسعود نے جو مشورے دیئے تھے، وہ ان کے آگے رکھے اور پوچھا کہ ان مشوروں پر عمل کیا جائے یا نہیں۔

کچھ دیر تک بحث مباحثہ چلا۔ ابن مسعود نے مشیروں کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا اور یہ فیصلہ لے لیا کہ ابن مسعود اپنی بہن زرتیں کو ساتھ لے کر مروّ چلا جائے اور اس کے ساتھ دو آدمی بھیجے جائیں جو راستے میں ان کی حفاظت کریں کیونکہ اتنی حسین اور نوجوان لڑکی اس کے ساتھ جا رہی ہے.... ابن مسعود نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اپنے ان آدمیوں کو جانتا ہے جو مروّ میں رہتے ہیں۔



ابن مسعود یہ فیصلہ لے کر وہاں سے نکلا اور اپنی بہن زرتیں کی تلاش میں جنت کی طرف چلا گیا۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ جنت کا وہ علاقہ اس قدر حسین، سرسبز اور شاداب تھا جو الفاظ کے احاطے میں آ ہی نہیں سکتا۔ وہاں کے پیز پودے اور پھول ایسے تھے جو عام طور پر دیکھنے میں نہیں آیا کرتے تھے۔ وہاں کے پرندے بھی کچھ ایسے تھے جن کا تعلق اس علاقے کے ساتھ نہیں تھا، وہ دُور دُور سے لائے گئے تھے۔ یہ رنگارنگ پرندے تھے۔ وہاں سے ایک ندی گزرتی تھی جو بڑی ہی شفاف تھی۔ عجوبہ یہ تھا کہ اَلْمَوْتُ بلند اور بڑی ہی چوڑی چٹان پر آباد تھا لیکن اس بلندی پر بھی یہ مصنوعی ندی بنائی گئی تھی۔ دریا سے مصنوعی طریقوں سے پانی اوپر چڑھایا جاتا تھا اور یہ ندی جنت کے درمیان سے بل کھاتی گزرتی تھی۔

اُس جنت میں جو حوریں گھومتی پھرتی، شوخیاں کرتی اور ہنستی کھیلتی نظر آتی تھیں، وہ اس زمین کی لڑکیاں لگتی ہی نہیں تھیں۔ اصل بات جو مؤرخوں نے لکھی ہے وہ یہ

تھی کہ جسے اس جنت میں داخل کیا جاتا تھا اسے پہلے تھوڑی سی حشیش پلا دی جاتی تھی، اور بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ حشیش کے علاوہ ایک خاص قسم کی جڑی بوٹی تھی جو حسن بن صباح کی دریافت تھی۔ اسے کسی کیمیادوی عمل سے گزار کر نشہ آور بنا دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ جنت میں کئی جگہوں پر اُس جڑی بوٹی کو کاشت کر دیا گیا تھا جس کا اثر یہ تھا کہ اس کی خوشبو بھی نشہ طاری کر دیتی تھی۔ حشیش کے علاوہ اس جڑی بوٹی کا نشہ بھی پلا دیا جاتا تھا۔

اس کا اثر کچھ ایسا تھا کہ انتہائی بھدی اور بدنما چیزیں بھی بڑی ہی دلکش اور خوشنما لگتی تھیں۔

اپنی جانیں ہنستے کھیلتے ہوئے قربان کرنے والے فدائی اسی جنت کے نکالے ہوئے آدم تھے۔ انہیں جب یہاں سے نکالا جاتا تھا تو وہ تڑپتے، بے حال ہوتے، چیختے اور چلاتے تھے کہ انہیں یہاں سے نہ نکالا جائے لیکن ان کی بریں واشنگ اس حد تک ہو چکی ہوتی تھی کہ انہیں کہا جاتا تھا کہ وہ فلاں جگہ جائیں، فلاں کو قتل کریں پھر اسی خنجر سے اپنے آپ کو بھی قتل کر دیں اور پھر وہ ہمیشہ اس جنت میں رہیں گے۔

ابن مسعود بھی اس جنت میں رہ چکا تھا اور وہ یہاں سے نکل کر حشیش پیتا رہا تھا لیکن اس پر جنت کی حقیقت جس طرح بے نقاب ہوئی، وہ بیان ہو چکی ہے.... اب ایک عرصے بعد اور ایک بدلے ہوئے نارمل انسان کی طرح وہ اس جنت میں اپنی بہن کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا تو اسے اپنے دل میں غلٹ سی محسوس ہو رہی تھی اور ضمیر میں ایک کانٹا سا اتر گیا جس کی چبھن اسے بے چین کئے ہوئے تھی۔ اُسے کئی لڑکیاں نظر آئیں اور وہ سب ایک ایک نوجوان کو ساتھ لئے عشق و محبت کا کھیل کھیل رہی تھیں اور بعض بے حیائی کے مظاہرے کر رہی تھیں۔ ان کی ہنسی جلتزنگ جیسی مترنم تھی۔ ابن مسعود اپنے خون میں حرارت محسوس کرنے لگا تھا۔ حرارت تو وہ پہلے بھی محسوس کیا کرتا تھا لیکن اب اس حرارت میں ایمان کی تپش تھی۔

”عمر!“ — اسے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

اُس نے رُک کر ادھر دیکھا۔ اُس کا نام عمر بن مسعود تھا۔ اسے ابن مسعود کہتے تھے اور صرف اس کی بہن تھی جو اسے عمر کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ اُس نے ادھر دیکھا بدھڑے آواز آئی تھی تو اسے اپنی بہن نظر آئی جو اُس کی طرف دوڑتی آرہی تھی۔ وہ

اُس کی طرف چل پڑا۔

• بہن قریب آکر اس کے گلے لگ گئی اور اُس نے بہن کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا لیکن بہن کا انداز اور ملنے کا طریقہ بہنوں والا نہیں تھا۔ بہن کو یہ تو احساس تھا کہ یہ اس کا بھائی ہے لیکن اس رشتے کے تقدس کو وہ بھول چکی تھی۔ یہ تو ابن مسعود بھی بھول گیا تھا لیکن اب وہ آیا تو یہ احساس اس پر غالب تھا کہ یہ اُس کی چھوٹی بہن ہے اور وہ اس کا بڑا بھائی ہے اور بڑے بھائی اپنی بہنوں کی عزت اور آن کے محافظ ہوا کرتے ہیں اور ضرورت پڑے تو جان بھی قربان کر دیا کرتے ہیں۔

وہ بہن کو ان حرکتوں سے روک نہیں رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ کچھ نہیں سمجھے گی اور یہ ایسے نئے میں ہے جس پر خطبے، وعظ اور آیات قرآنی ذرا سا بھی اثر نہیں کر سکتیں۔ بہن اُس سے گلے شکوے کے انداز سے کہہ رہی تھی کہ وہ اسے بتائے بغیر کہاں چلا گیا تھا اور وہ اسے ڈھونڈتی رہی ہے۔ بہن اسے ندی کے کنارے ایک خاص جگہ چلنے کو کہہ رہی تھی اور اس کا بازو پکڑ کے تھینے کی بھی کوشش کر رہی تھی لیکن ابن مسعود کے قدم اٹھ نہیں رہے تھے جیسے اُس کے پاؤں زمین نے جکڑ لئے ہوں۔ وہ جانتا تھا کہ زریں اسے اُس جگہ کیوں لے جا رہی ہے۔

”میری بات سن لو زریں!“ — ابن مسعود نے بڑے پیار سے کہا — ”میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ ہم دونوں کل صبح مروءہ جا رہے ہیں.... تم جانتی ہو گی کہ مروءہ بڑا خوبصورت شہر ہے اور ہم دونوں کچھ عرصہ وہاں رہیں گے۔“

زریں نے اس سے پوچھا کہ ہم مروءہ کیوں جا رہے ہیں؟.... ابن مسعود نے اسے بتایا کہ سلجوقی وزیر اعظم کو اپنے قبضے میں لینا ہے اور یہ کام زریں کرے گی۔ اس نے زریں کے ساتھ وہی بات کی جو وہ حسن بن صباح کے ساتھ کر چکا تھا۔

”یہ تمہاری ذہانت اور عقل کا امتحان ہو گا“ — ابن مسعود نے کہا — ”تم اس میں کامیاب ہو جاؤ گی تو شیخ الجبل تمہیں بہت اونچا درجہ دے دے گا۔ بہت سی باتیں تمہیں پہلے بتادی جائیں گی اور کچھ میں تمہیں مروءہ چل کر بتاتا رہوں گا۔“

ابن مسعود نے بہن کو ذہنی طور پر بھی تیار کر لیا اور بہن خوش ہو گئی کہ وہ اُس آدمی کے ساتھ جا رہی ہے جس کی محبت اس کے دل میں موجزن ہے۔ اس جنت میں کوئی لڑکی جو حور کمالاتی تھی، کسی آدمی کے ساتھ دلی محبت نہیں کرتی تھی لیکن زریں ابن

مسعود کو دلی طور پر ہی نہیں بلکہ روحانی طور پر چاہتی تھی۔ یہ خون کا رشتہ تھا، یہ الگ بات ہے کہ زریں اس خون کی کشش کو ہوس کا رنگ دے رہی تھی اور اس کے تقدس کو ذہن سے صاف کر چکی تھی بلکہ اس کے ذہن سے یہ رشتے دھو دیے گئے تھے۔



ایک قافلہ مرو کی طرف جا رہا تھا۔ پانچ گھوڑے تھے۔ ایک پر ابن مسعود دوسرے پر اس کی بہن زریں، تیسرے اور چوتھے گھوڑے پر دو باطنی سوار تھے اور پانچویں گھوڑے پر کچھ سامان اور زادِ راہ تھا۔ زریں نقاب میں تھی۔ جو دو آدمی ابن مسعود کے ساتھ جا رہے تھے وہ مرو سے بڑی اچھی طرح واقف تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس شہر میں باطنی کہاں کہاں رہتے ہیں اور وہ کون لوگ ہیں۔ زادِ راہ میں حبشیش اور دوسری جڑی بوٹی کا نکالا ہوا پانی خاصی تعداد میں ساتھ تھا۔

یہ دونوں باطنی بہت خوش تھے کہ ان کے ساتھ ایک حور جا رہی تھی۔ انہوں نے راستے میں ہنستے ہوئے دو تین بار ابن مسعود سے کہا تھا کہ ہم تین ہیں اور حور ایک ہے، ایک اور حور ہونی چاہئے تھی۔ راستے میں دو یا تین راتیں آئیں گی۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ابن مسعود اب فدائی نہیں بلکہ اس لڑکی کا بڑا بھائی ہے جسے اس کے ساتھی حور کہہ رہے تھے اور اسے راستے میں آنے والی راتوں کی تفریح کا سامان سمجھ رہے تھے۔ ابن مسعود بڑی مشکل سے ان کی یہ باتیں برداشت کر رہا تھا۔ وہ ذرا سا بھی اشارہ نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اب فدائی نہیں، کچھ اور ہے۔ اس نے اپنی بہن کو دیکھا، وہ ان دونوں کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

پہلے دن کا سورج غروب ہو گیا۔ مختصر سایہ قافلہ کچھ دیر چلتا رہا۔ آخر ایک خوشنما جگہ رات گزارنے کے لئے رک گیا۔ انہوں نے کھانے پینے کا سامان کھولا اور اس کے ساتھ نشہ بھی پیالوں میں ڈالا اور کھانے پینے لگے۔ پھر وہ سونے کی جگہیں دیکھنے لگے۔

ابن مسعود نے دونوں ساتھیوں کو الگ لے جا کر کہا کہ آج رات اس لڑکی کو آرام کرنے دیں، اس نے آج پہلی بار اتنی لمبی اور تھکا دینے والی گھوڑ سواری کی ہے اس لئے اس کی تھکن کو ہم سمجھ سکتے ہیں جو مرد ہو کر بھی اتنے تھک گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ لڑکی ہماری اپنی ملکیت ہے، کہیں بھاگ تو نہیں جائے گی.... اس نے اس طرح کی باتیں کر کے اپنے ساتھیوں کو راضی کر لیا کہ وہ آج رات خود بھی آرام کریں گے اور لڑکی کو

بھی پورا آرام کرنے دیں گے۔

ابن مسعود نے زریں کو ایک ہموار جگہ پر بستر بچھا کر سلا دیا اور اپنا بستر اس کے قریب ہی بچھایا۔ کسی ایک کو تو لڑکی کے قریب ہونا چاہئے تھا۔ دوسرے دونوں آدمیوں نے اپنے بستر خاصی دور بچھائے اور ایک نے ازراہ مذاق کہا کہ اپنی حور سے آج رات دور ہی رہیں تو اچھا ہے۔ انہیں دراصل ابن مسعود نے مشورہ دیا تھا کہ وہ اس جگہ سوئیں جہاں انہوں نے بستر بچھائے تھے۔

وہ لیٹے اور دن بھر کی تھکن نے انہیں بڑی جلدی گہری نیند میں مدہوش کر دیا لیکن ابن مسعود جاگ رہا تھا۔ نیند نے اُس پر نہیں بلکہ اُس نے نیند پر غلبہ پالیا تھا۔ اس رات اسے ایک ضروری کام کر کے سونا تھا اور وہ اس انتظار میں تھا کہ رات آدھی گزر جائے۔ چاند اوپر اٹھتا آ رہا تھا اور چاندنی میں اسے اپنی بہن سوئی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ زریں گناہوں کا ایک بڑا ہی خوبصورت پُتلا تھی۔ پھر بھی ابن مسعود کو اس کے خفتہ چہرے پر معصومیت نظر آ رہی تھی۔ اُس کے آنسو نکل آئے۔ اُسے اپنی ماں یاد آئی جو مر گئی تھی۔ پھر اسے اپنا باپ یاد آیا جو ان دونوں بچوں سے بڑا ہی پیار کرتا تھا لیکن بچوں کی قسمت یوں پھوٹی کہ باپ حسن بن صباح کو نبی مانتا تھا۔ ابن مسعود کو وہ وقت یاد آیا جب اس کی یہ بہن پیدا ہوئی تھی اور وہ اسے ایک زندہ کھلونا سمجھا کرتا تھا۔ پھر بہن بڑی ہوتی گئی اور دونوں بڑے پیار سے ہنستے کھیلتے جو ان ہوئے تھے مگر قسمت انہیں کہاں اور کس روپ میں لے آئی۔

ماضی کی جھلکیاں ذہن میں آئیں تو ابن مسعود کا خون کھولنے لگا۔ ابن مسعود کا ہاتھ اپنی تلوار کے دستے پر چلا گیا جو اس کے بستر پر پڑی تھی۔ وہ وقت ہو گیا تھا جس وقت کے انتظار میں وہ سویا نہیں تھا۔ اس نے تلوار اٹھالی اور بڑے آرام سے نیام سے نکالی۔ نیام بستر پر رکھی اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ننگے پاؤں اس طرح اپنے ساتھیوں کی طرف چلا جس طرح بلی یا شیرنی اپنے شکار کی طرف بڑھتی ہے کہ ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہو۔

اس طرح دبے پاؤں اور پھونک پھونک کر پاؤں رکھتے ابن مسعود اپنے ساتھیوں کے سر پر جا پہنچا۔ ساٹھی بڑی ہی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ دونوں کے درمیان ڈیڑھ دو گز کا فاصلہ تھا۔ ابن مسعود ایک ساتھی کے قریب صحیح زاویے پر کھڑا ہو گیا۔

وہ اس ساتھی پر جھکا، تلوار کی دھار اُس کی شہ رگ پر رکھی اور اس جوانی میں اُس کے جسم میں جتنی طاقت تھی، وہ طاقت لگا کر تلوار دہلائی اور آگے پیچھے کھینچی اور ایک دو سینکڑ میں باطنی کی گردن کاٹ دی۔ باطنی ترپنے لگا۔

اُس نے انتظار نہ کیا اور ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر زوردار وار کر کے دوسرے باطنی کی گردن بھی کاٹ دی۔ اس نے پہلے ساتھی کو اس لئے بکرے کی طرح ذبح کیا تھا کہ تلوار زور سے مارتا تو اس کی آواز سے دوسرا ساتھی جاگ اٹھتا۔

اس نے تلوار زمین پر رگڑی پھر درختوں کے پتے توڑ کر تلوار پر پھیرے کہ اس پر خون کا داغ وجہ نہ رہے۔ وہ عجیب سا سکون اور اطمینان محسوس کرنے لگا اور اپنے بستر پر آکر تلوار نیام میں ڈالی اور سو گیا۔

صبح طلوع ہوئی تو ابن مسعود جاگ اٹھا۔ زریں ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ ابن مسعود اُسے جگانے لگا۔ آگے کو سفر کرنا تھا لیکن اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس نے سوچا یہ اور سولے۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ اپنی بہن کو گناہوں کی دنیا سے نکالنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اپنی سوئی ہوئی بہن کو دیکھتا رہا۔ قتل کر دینا اور قتل ہو جانا، اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ وہ مطمئن اور مسرور تھا کہ اس نے دو گناہگاروں سے اپنی بہن کی عزت بچالی تھی۔

آخر زریں جاگ اٹھی اور اُٹھ بیٹھی۔ ابن مسعود کھانے پینے کا سامان لے آیا۔ زریں اٹھ کر ایک طرف چلی تو اس نے اپنے دو ساتھیوں کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہیں، کیا وہ ابھی تک جاگے نہیں؟

”وہ کبھی نہیں اٹھیں گے“ — ابن مسعود نے اٹھتے ہوئے کہا — ”میرے ساتھ آؤ۔ میں نے انہیں ہمیشہ کی غیند سلا دیا ہے۔“

ابن مسعود زریں کو اپنے ساتھ اُس جگہ لے گیا جہاں ان کے دونوں ساتھیوں کی سر کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ زریں لاشوں کو دیکھ کر ڈری نہیں، گھبرائی نہیں بلکہ خاموشی سے ابن مسعود کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ زریں نے ایسی کئی لاشیں دیکھی تھیں۔ الموت میں اس نے کئی بار جلاد کو سب کے سامنے لوگوں کے سر قلم کرتے دیکھا تھا۔

”انہیں میں نے شیخ الجبل کے حکم سے قتل کیا ہے“ — ابن مسعود نے کہا —

”شیخ الجبل نے مجھے کہا تھا کہ تمہارے ساتھ ایک لڑکی جا رہی ہے۔ نہ تم نے اسے کسی اور نیت سے ہاتھ لگانا ہے نہ یہ دو آدمی لڑکی کو راستے میں تفریح کا ذریعہ بنائیں۔ تمہیں ہم کسی اور مقصد کے لئے لے جا رہے ہیں۔ شیخ الجبل نے کہا تھا کہ راستے میں تم میں سے کوئی بھی اس لڑکی کو تفریح کے لئے استعمال کرے تو اسے دوسرے وہیں قتل کر دیں۔... یہ دونوں تمہارے جسم کے ساتھ کھیلنا چاہتے تھے اور دن کو راستے میں تم نے سنا تھا کہ یہ کیسی باتیں کرتے آرہے تھے۔ میں نے انہیں رات سوتے میں قتل کر دیا ہے۔“

ابن مسعود نے زریں سے یہ نہ کہا کہ اُس نے انہیں اس لئے قتل کیا ہے کہ تم میری بہن ہو اور کوئی بھائی اپنی بہن کی عزت کے ساتھ کسی کو کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور کوئی آدمی اس طرح کی بات بھی منہ سے نکالے گا تو بھائی اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ جانتا تھا کہ زریں یہ بات نہیں سمجھ سکے گی کیونکہ وہ نشے کی حالت میں تھی اور اس کا دماغ اس کے اپنے کنٹرول میں نہیں تھا۔ ابن مسعود کو جھوٹ بولنا پڑا۔

زریں نے کچھ بھی نہ کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں تھی کہ دو آدمی مارے گئے ہیں۔ وہ ابن مسعود کے ساتھ واپس اپنے بستر پر آئی، کچھ کھایا پیا اور دونوں نے بستر سمیٹے، اپنے مقتول ساتھیوں کی تمواریں اور خنجر لئے اور یہ سارا سامان گھوڑے پر لاد کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور وہاں سے چل پڑے۔ لاشیں وہیں پڑی رہنے دیں جنہیں اب جنگل کے درندوں اور گوشت خور پرندوں نے کھانا تھا۔

وہ دونوں پانچوں گھوڑے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ ابن مسعود نے زریں سے کہا کہ اب رفتار تیز کریں گے تاکہ جلدی منزل پر پہنچ جائیں۔ زریں اتنی لمبی اور تیز رفتار گھوڑے کی سواری کی عادی نہیں تھی لیکن اس نے اپنے بھائی کا کہنا مان لیا اور رفتار تیز کر دی۔

ایک اور رات آئی اور وہ رات گزارنے کے لئے رُکے، بستر بچھائے اور کھانا کھایا۔ زریں نے حشیش پی اور اُس وقت اس نے ابن مسعود سے پوچھا کہ وہ حشیش کیوں نہیں پی رہا؟ ابن مسعود نے کوئی بہانہ پیش کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زریں بھی حشیش پیئے لیکن ابھی اسے اس نشے سے محروم رکھنا خطرہ مول لینے والی بات تھی۔ وہ جانتا تھا کہ نشے سے ٹوٹے ہوئے انسان کی حالت کیا ہو جاتی ہے لیکن زریں کو حشیش پلائی تو اس نے اُس کے لئے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اس کے دل میں ابن مسعود کی محبت موجزن

تھی۔ وہ محبت کا اظہار جسمانی طور پر کرنے کی عادی تھی اور یہی ایک طریقہ جانتی اور اسی کو جائز سمجھتی تھی۔ اس نے ابن مسعود کے ساتھ ایسا ہی اظہار کیا۔ ابن مسعود نے بڑی ہی دشواری سے اُسے اپنے جسم سے دور رکھا اور آخر یہ کہا کہ وہ شیخ الجبل کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرے گا اور اس خلاف ورزی پر اس نے اپنے دو ساتھی قتل کر دیئے ہیں۔

یہ ایک ایسی دلیل تھی جو زریں نے قبول کر لی۔ یہ تو پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس کے دل سے خون کے رشتوں کا تقدس دھل چکا تھا۔
یہ رات بھی گزر گئی۔ یہ دن ان کے سفر کا آخری دن تھا۔ اُس روز تو ابن مسعود نے گھوڑے دوڑا بھی دیئے تھے تاکہ سفر میں ایک اور رات نہ آئے۔



سلطان محمد کا وزیر اعظم ابو نصر احمد مغرب کی نماز مسجد میں پڑھ کر واپس گھر آ رہا تھا جب اُس نے اپنے گھر کے احاطے کے باہر والے دروازے کے سامنے ابن مسعود اور زریں کو گھوڑوں سے اترتے دیکھا اور دربان ان کی طرف چلا کہ وہ ان سے پوچھے کہ وہ کون ہیں اور کیوں آئے ہیں۔ ابو نصر احمد تو ابن مسعود کو دیکھ کر دوڑ ہی پڑا اور دوسرے لمحے دونوں بڑے ہی جذباتی اور پُر تپاک انداز سے بغلیں ہو گئے۔

”اپنی بہن کو لے آیا ہوں“ — ابن مسعود نے وزیر اعظم سے الگ ہوتے ہوئے زریں کی طرف اشارہ کیا اور کہا — ”آپ شاید حیران ہوتے ہوں گے کہ میں بہن کو اَلْمَوْتَ سے نکال کر کس طرح لایا ہوں۔ یہ بیٹھ کر سناؤں گا۔“

ابو نصر دونوں کو اندر لے گیا اور دربان سے کہا کہ گھوڑوں کو اصطبل میں رکھا جائے۔ مکان کے اندر جا کر زریں کو ابو نصر احمد نے زنانہ حصے میں بھیج دیا اور گھر میں کہا کہ یہ اس کے خاص مہمان ہیں۔

ان مہمانوں کو غسل کرایا گیا اور زریں نے عورتوں کے ساتھ اور ابن مسعود نے ابو نصر احمد کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر الگ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ابو نصر تو ابن مسعود کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوا تھا کہ وہ بار بار خوشی کا اظہار کرتا تھا۔

”محترم وزیر اعظم!“ — ابن مسعود نے کہا — ”اللہ کے فضل و کرم سے آپ المَوْتَ لے لیں گے۔ میں آپ کی پوری پوری مدد کروں گا۔ اس کے عوض آپ مجھے

میری بہن دے دیں۔“

”بہن دے دیں؟“ — ابو نصر احمد نے حیرت زدہ لہجے میں کہا — ”تم اپنی بہن کو لے تو آئے ہو!“

”ہاں محترم وزیر اعظم!“ — ابن مسعود نے کہا — ”میں بہن کو لے تو آیا ہوں لیکن یہ ایسے نشے سے سرشار ہے کہ بہن بھائی کے رشتے کے تقدس کو بھول بیٹھی ہے... جس طرح دسم کوہ میں مجھے طبیب نے ابلتیت سے نکال کر انسانیت کے درجے میں کھڑا کر دیا تھا، اسی طرح میری بہن کو انسانیت کی عظمت عطا ہو جائے تو میں اسے اپنے اوپر بہت بڑا احسان سمجھوں گا۔“

ابن مسعود نے تفصیلاً بتایا کہ اس کی بہن ابھی کس ذہنی کیفیت میں ہے اور جب یہ دونوں بہن بھائی حسن بن صباح کی جنت میں تھے تو ان کا آپس میں کیا تعلق تھا.... ابو نصر احمد دانشمند وزیر تھا۔ وہ ساری بات سمجھ گیا اور اس نے کہا کہ وہ کل صبح ہی زریں کو طبیب کے حوالے کر دے گا اور کچھ دنوں بعد ابن مسعود اپنی بہن کو اُس روپ میں دیکھے گا جس میں وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے۔

ابن مسعود نے ابو نصر احمد کو پوری تفصیل سے سنایا کہ وہ کس طرح حسن بن صباح کے پاس پہنچا تھا، کیا جھوٹ بولے تھے اور اسے کیا فریب دیئے تھے اور پھر اسے حیدر بصری اور خزانے کا قصہ سنایا لیکن ابن مسعود کو خزانے کی حقیقت معلوم نہیں تھی۔ اس نے ابو نصر احمد کو یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی بہن کو وہاں سے کیا کہہ کر ساتھ لایا ہے۔ راستے میں اس نے اپنے دو ساتھیوں کو جس طرح قتل کیا تھا، وہ بھی سنایا۔

”میں اب ایک ہی بات سننا چاہتا ہوں“ — ابو نصر احمد نے کہا — ”میں کب الموت پر حملہ کروں؟ حملے اور محاصرے کے وقت تمہیں الموت میں ہونا چاہئے۔“

”محترم وزیر اعظم!“ — ابن مسعود نے کہا — ”میں کل صبح دسم کوہ کو روانہ ہو جاؤں گا۔ منزل آفندی اور بن یونس میرے ساتھ الموت جائیں گے۔ خطرہ صرف منزل آفندی کے متعلق ہے کہ حسن بن صباح اسے پہچان لے گا لیکن ایسا نہیں ہو گا۔ وہ تو پندرہ سولہ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ منزل آفندی حسن بن صباح کے پاس کچھ دن رہا تھا۔ اس اتنے لمبے عرصے میں سینکڑوں منزل آفندی اس کی نظروں سے گزر چکے ہیں۔ حسن بن صباح میں اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی.... بہر حال میں نے کل صبح روانہ ہو جانا

ہے۔ دنوں کا حساب کر لیں۔ وہاں جاتے ہی ان دونوں کو ساتھ لے کر الموت روانہ ہو جاؤں گا اور کچھ دنوں بعد آپ یہاں سے کوچ کریں اور الموت کو محاصرے میں لیں۔ ہم دریا والا دروازہ کھول دیں گے اور آپ کو مشعل کا اشارہ بھی دے دیں گے۔ اندر ہمیں موقع ملا تو حسن بن صباح کو قتل بھی کر دیں گے لیکن یہ ممکن نظر نہیں آتا کیونکہ وہ اکیلا باہر نکلتا ہی نہیں۔“

انہوں نے ضروری تفصیلات طے کر لیں اور وہ سو گئے.... صبح اُس وقت ابن مسعود جاگ اٹھا جب صبح ابھی تاریک تھی۔ وہ جانے کے لئے تیار ہوا اور اپنی بہن سے ملے بغیر وسم کوہ کو روانہ ہو گیا۔



ابن مسعود وسم کوہ پہنچا تو سالار اور یزی، منزل آفندی اور بن یونس نے اس کا ویسا ہی پُرپٹاک اور پُر جوش خیر مقدم کیا جیسا ابو نصر احمد نے کیا تھا۔ وہ سب حیران تھے کہ یہ سابق فدائی زندہ اور سلامت حسن بن صباح کے ہاتھوں سے نکل آیا ہے۔ اس نے جب سنایا کہ وہ حسن بن صباح کے ہاتھوں سے نہ صرف نکل آیا ہے بلکہ اسے ایسا دھوکہ دیا ہے کہ وہ حسن بن صباح کا قابلِ اعتماد آدمی بن گیا ہے اور اب وہ واپس جائے گا تو حسن بن صباح دریا والا دروازہ اس کی ذمہ داری میں دے دے گا۔

وہ جب یہ تفصیلات سنا رہا تھا تو یہ تینوں اسے اس طرح حیران و پریشان ہو کر دیکھ رہے تھے کہ کوئی انسان اس قدر دانشمند بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی فریب کاریاں کر لے کہ اُس فریب کار کو بھی انگلیوں پر نچا دے جو نبی بھی بن گیا تھا اور امام بھی اور لوگوں نے اس کے آگے سجدے کرنے شروع کر دیئے تھے۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو بہت بڑی قوت عطا فرمائی ہے۔ اس قوت پر اختیار بھی انسان کو دے دیا ہے۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اس قوت سے عرش بریں کا فرشتہ بن جائے یا روئے زمین کا ابلیس ہو جائے۔

ابن مسعود نے اصل بات چھیڑی اور کہا کہ منزل آفندی اور بن یونس اس کے ساتھ الموت چلیں۔ وہ تو پہلے ہی تیار بیٹھے تھے اور انہوں نے اسی کو زندگی کا مقصد بنا رکھا تھا کہ الموت کو فتح کر کے وہاں سے ابلیسیست کا نام و نشان مٹانا ہے اور حسن بن صباح کو قتل کرنا ہے۔ بات اس خطرے کی ہوئی کہ حسن بن صباح منزل آفندی کو پہچان لے گا

لیکن ابن مسعود کہتا تھا کہ حسن بن صباح اتنی لمبی مدت بعد منزل کو نہیں پہچان سکے گا۔ ابن مسعود نے یہ بھی کہا کہ وہ کوشش کرے گا کہ منزل اور بن یونس حسن بن صباح کے سامنے جائیں ہی نہیں۔ اس طرح کچھ ضروری تفصیلات طے کر کے منزل اور بن یونس اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

اگلی صبح تینوں روانہ ہو گئے۔ منزل آفندی اور بن یونس نے کوئی بھیس نہ بدلا نہ وہ کسی بہروپ میں گئے، وہ جیسے تھے ویسے ہی چل پڑے۔ ابن مسعود کو اپنی عقل اور اپنی خدا داد صلاحیتوں پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ یقین کے ساتھ کہتا تھا کہ وہ ان دونوں کو محفوظ رکھے گا اور اتنا آزاد کہ الموت کے اندر یہ جو بھی کارروائی ضروری سمجھیں گے، کر سکیں گے۔ ابن مسعود کا ایمان بیدار ہو چکا تھا اور اس کی یہ کامیابی ایمان کی قوتوں کا حاصل تھی۔

بڑی لمبی مسافت طے کر کے وہ الموت پہنچے۔ منزل اور بن یونس کو ابن مسعود نے حسن بن صباح کے مہمان خانے میں بھیج دیا اور خود حسن بن صباح کے پاس پہلا گیا۔ حسن بن صباح نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کر آیا ہے۔

”یا شیخ الجبل!“ — ابن مسعود نے کہا — ”میں بات مختصر کروں گا اور وہی بات کروں گا جو شیخ الجبل کے لئے اہم ہے.... الموت پر حملہ نہیں روکا جاسکے گا۔ میں وہاں پہنچا تو فوج کو تیاری کا حکم مل چکا تھا۔ حملے کی قیادت وزیر اعظم ابو نصر احمد خود کرے گا۔ میں اپنی بہن کو ایوان سلطنت میں قابل اعتماد ساتھیوں کے حوالے کر آیا ہوں جہاں وہ نہ صرف یہ کہ محفوظ رہے گی بلکہ اپنی کارروائی آزادی سے اور آسانی سے کرتی رہے گی۔ میں نے بہن کو جس آدمی کے حوالے کیا ہے، وہ اسی انتظار میں تھا کہ اسے زہریں جیسی ہی ایک لڑکی مل جائے تو وہ ان سلطانوں کا تختہ الٹ سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ ابو نصر احمد کو شیشے میں اتارنا کوئی مشکل نہیں لیکن ابھی اسے حملے سے نہیں روکا جاسکتا کیونکہ سلطان محمد کوچ کا حکم دے چکا ہے۔“

”سلجوقی فوج کی نفری کتنی ہوگی؟“ — حسن بن صباح نے پوچھا۔

”چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان ہوگی“ — ابن مسعود نے جواب دیا — ”اس فوج کے پاس منجھتیس بھی ہوں گی لیکن انہیں میں نے مرو میں دیکھ کر حساب کیا ہے کہ ان کے پھینکے ہوئے پتھر شہر کے اندر نہیں پہنچ سکیں گے کیونکہ الموت چٹان کے اوپر ہے اور پتھر اتنی بلندی تک نہیں آسکیں گے۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں یا شیخ

الجل! یہ فوج الموت کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گی۔ آنے دیں۔ محاصرہ بڑی طرح ناکام ہو گا۔“

”سلطان محمد احمق آدمی ہے“ — حسن بن صباح نے کہا — ”اور اس کا یہ وزیر اعظم ابو نصر احمد اس سے بھی زیادہ احمق معلوم ہوتا ہے۔ وہ موسم کے تیز و کدکھ ہی نہیں رہے۔ تم باہر نکل کر دیکھنا، پہاڑوں پر برف پڑنی شروع ہو گئی ہے۔ ایک دو چاند اور طلوع اور غروب ہوں گے تو بر فباری یہاں تک بھی پہنچ جائے گی۔ ہم یہاں اندر آرام سے بیٹھیں رہیں گے اور سلجوقیوں کے محاصرے کو بر فباری ہی توڑ پھوڑ کر منجمد کر دے گی۔“

ابن مسعود نے یہ سنا تو پریشان ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ ابو نصر احمد بڑے ہی جوش و خروش سے حملے کی باتیں کر رہا تھا اور اس نے نہایت اچھی چالیں بھی سوچ رکھی تھیں لیکن اس نے موسم کی طرف دھیان دیا ہی نہیں تھا۔ یہ تو تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ابو نصر احمد جذباتی وزیر اعظم تھا۔ بے شک وہ مرد مومن تھا اور الموت پر قبضے کا مقصد یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اپنی سلطنت کو وسعت دینی ہے بلکہ وہ اہلسیست کا خاتمہ چاہتا تھا لیکن جذبات سے مغلوب ہو کر سوچنے والوں کے مقاصد اکثر پورے نہیں ہوا کرتے۔

ابن مسعود کے پاس اب کوئی ذریعہ اور طریقہ نہ تھا کہ وہ مرو پیغام بھیجتا کہ کوچ ملتوی کر دو کیونکہ تین چار مہینوں تک بر فباری شروع ہو جائے گی۔ اسے ایسی امید تھی ہی نہیں کہ تین چار مہینوں کے اندر اندر قلعہ سر ہو جائے گا۔ ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مرو سے فوج کب کوچ کرے گی۔

”یا شیخ اجل!“ — ابن مسعود نے حسن بن صباح کو مزید چکر دینے کے لئے کہا — ”میں نے ایک بڑی خطرناک بات دیکھی ہے۔ ہمارے جو آدمی مرو میں ہیں، ان میں کچھ بددلی پیدا ہو گئی ہے اور مجھے شک ہونے لگا ہے کہ ہمارے کچھ آدمی غداری پر اتر آئے ہیں اور ان کی وفاداریاں مشکوک ہو گئی ہیں۔ ایوان سلطنت میں جس کے حوالے میں اپنی بہن کر آیا ہوں، وہ بالکل صحیح آدمی ہے۔ وہ بھی کہتا تھا کہ اب اپنے آدمیوں پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔“

یہ ابن مسعود کا ایک نفسیاتی وار تھا جو اس نے حسن بن صباح کو کمزور کرنے کے لئے کیا تھا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ حسن بن صباح اپنے ان فدائیوں پر اعتماد کرنا چھوڑ دے

جنہیں اس نے سلطنت سلجوقیہ کے بڑے بڑے شہروں میں پھیلا رکھا تھا۔ حسن بن صباح کو اپنی اسی طاقت پر ناز تھا۔ حسن بن صباح نے یہ بات سنی اور کہا کہ وہ حملے اور محاصرے سے نمٹ لے تو باہر کے مسئلوں پر توجہ دے گا۔

”اب ایک بہت ہی ضروری بات کرتا ہوں یا شیخ الجبل!“ — ابن مسعود نے کہا — ”میں نے مرو میں بھی اڑتی اڑتی یہ بات سنی تھی کہ الموت کے اندر ایک دو آدمی ایسے آگئے ہیں جو محاصرے کے دوران اندر سے دریا والا دروازہ کھول دیں گے۔ اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ دو آدمی کون ہیں اور کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ میں اس کام کو بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن سمجھتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ وہ خفیہ دروازہ میری ذمہ داری میں دے دیں اور وہاں جو آدمی موجود ہیں انہیں وہاں سے ہٹا دیں۔ میں مرو سے دو فدائی ساتھ لایا ہوں۔ وہ بڑے ہی دانشمند اور جرات والے ہیں۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں ان دونوں کو ساتھ لے کر اس دروازے کا ذمہ دار بن جاؤں۔“

ابن مسعود نے ایسی ہی کچھ باتیں گھر کر حسن بن صباح کو پریشانی میں ڈال دیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حسن بن صباح اتنا ہی کچا تھا کہ یہ پریشانی اس کے پاؤں اکھاڑ دیتی۔ اس نے یہ حکم تو دے دیا کہ دریا والے خفیہ دروازے پر جو آدمی مقرر ہیں انہیں وہاں سے ہٹا کر ابن مسعود کو مقرر کر دیا جائے لیکن ابن مسعود کو شاید یہ معلوم نہ تھا کہ وہاں جاسوسوں پر بھی جاسوس لگے ہوئے تھے۔ حسن بن صباح نے ابن مسعود سے فارغ ہو کر جب یہ حکم دیا کہ وہ دروازہ ابن مسعود کے حوالے کر دیا جائے، اس نے یہ حکم بھی دیا کہ ابن مسعود اور اس کے ساتھیوں پر کڑی نظر رکھی جائے اور پھر کڑی نظر رکھنے والوں پر بھی نظر رکھنے کا انتظام موجود تھا۔ یہ تھے وہ طریقے اور اصول جنہوں نے حسن بن صباح کو نبی بھی بنایا، شیخ الجبل اور امام بھی اور اسے ایک دہشت بھی بنا دیا تھا۔



اب وہ واقعہ رونما ہوا جو تاریخ کے دامن میں آج بھی محفوظ ہے۔ یہ 503 ہجری کا واقعہ ہے جو ہر مؤرخ نے تفصیل سے لکھا ہے۔

سلطان محمد اور ابو نصر احمد موسم کو خاطر میں لائے ہی نہیں تھے۔ موسم سرما شروع ہو گیا تھا اور الموت اس علاقے میں تھا جہاں بر فباری ہوا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ جو

پھاڑ تھے وہ برف سے سفید ہو جایا کرتے تھے۔ بعض موڑخوں نے لکھا ہے کہ الموت میں یا اس علاقے میں برفباری تو ہوتی تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ فوجوں کے آگے رکاوٹ بن جاتی۔ بہر حال سلجوقی سالاروں کو پیش نظر رکھنا چاہئے تھا جو انہوں نے نہ رکھا۔ فوج کے کوچ میں بھی انہوں نے خاصی تاخیر کردی اور اس دوران سردی بڑھ گئی اور الموت برفباری کی زد میں آنے لگا لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ اسے برداشت ہی نہ کیا جاسکتا۔

آخر ایک روز الموت کے اندر ہڑبونگ مچ گئی کہ سلجوقی فوج شہر کا محاصرہ کر رہی ہے۔ حسن بن صباح کی کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی لیکن ہر شہری جو تلوار اٹھا سکتا تھا وہ الموت کا محافظ تھا اور ان میں فدائیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ اس تعداد پر موڑخوں کا اختلاف ہے۔ بعض نے بیس پچیس ہزار تعداد لکھی ہے اور ایک دو بنے پچاس ہزار لکھی ہے لیکن تعداد جتنی بھی تھی وہ جانباز ہی تھی لیکن یہ فدائی تربیت یافتہ فوج کی طرح نہیں لڑ سکتے تھے۔ وہ تو دن دہاڑے اپنے شکار کو خنجر سے ہلاک کرتے اور اسی خنجر سے اپنے آپ کو مار لیتے تھے۔

حسن بن صباح شہر کی دیوار پر گیا اور اس نے باہر کی صورت حال دیکھی۔ اس نے اپنے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ اس فوج پر آسمانی آفت گرے گی اور یہ بھاگ جائے گی۔ وہ اپنے لوگوں کی حوصلہ افزائی اسی طرح بڑبھانک کر کیا کرتا تھا۔ اس نے دیوار پر تیر انداز کھڑے کر دیئے۔

سلجوقی فوج نے ایسے جانباز تیار کر رکھے تھے جو معجزے بھی کر کے دکھایا کرتے تھے۔ وہ دو دو چار چار اور کچھ اس سے زیادہ ٹولیوں میں اس چٹان پر چڑھے جس پر الموت کا شہر آباد تھا۔ وہ دروازے توڑنے کے لئے اوپر جا رہے تھے لیکن تیر اندازوں کے لئے وہ بڑا ہی آسان شکار ثابت ہوئے۔ تیروں کی بوچھاڑیں ان پر پڑیں تو وہ تیر کھا کر لڑھکتے اور قلابازیاں کھاتے نیچے آ پڑے۔

محاصرہ تین اطراف پر تھا۔ پیچھے دریا تھا اور دریا کا پاٹ وہاں تک تھا اس لئے دریا کا جوش بھی زیادہ تھا اور گہرائی بھی زیادہ تھی۔

ابو نصر احمد نے ایسے آدمی تیار کر رکھے تھے جنہیں دور پیچھے جا کر کشتیوں کے ذریعے قلعے کے عقب میں اس خفیہ دروازے تک پہنچنا تھا جو اب ابن مسعود کی تحویل

میں تھا۔ ابن مسعود کے ساتھ منزل آفندی اور بن یونس تھے۔

دروازے کی چابی ابن مسعود کے پاس تھی۔ وہ جب بھی دروازہ کھولنے کے لئے آگے بڑھتا، کوئی نہ کوئی آدمی آ جاتا اور ابن مسعود پیچھے ہٹ آتا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ حسن بن صباح نے اس پر نظر رکھنے کے لئے خفیہ طور پر کچھ آدمی لگا رکھے ہیں۔

دنوں پہ دن گزرتے جا رہے تھے۔ منجنيقوں سے پتھر پھینکے گئے لیکن پتھر دیوار سے ٹکرا کر لڑھکتے ہوئے واپس آ جاتے تھے۔ یہ منجنيقیں چھوٹی تھیں اور بڑی منجنيق تھی ہی نہیں۔ ابو نصر احمد نے جانبازوں کی اس جماعت کو دریا کی طرف بھیج دیا کہ وہ دریا کے ذریعے خفیہ دروازے تک پہنچیں لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ دریا میں اترنے سے پہلے شہر کی دیوار کی طرف دیکھتے رہیں۔ دیوار سے ایک اشارہ ملے گا پھر دریا میں اتریں۔

دو دشواریاں پیدا ہو گئیں۔ ایک یہ کہ دریا میں جو کشتیاں حسن بن صباح نے رکھوائی ہوئی تھیں وہ خفیہ دروازے کے قریب بندھی ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی کشتی نہیں تھی۔ ابو نصر احمد کے ان آدمیوں کو ان کشتیوں تک پہنچنے کے لئے کچھ دور تک تیر کر جانا تھا۔

وہ جانباز دریا کے کنارے جا کر چھپ گئے اور قلعے کی دیوار کی طرف دیکھنے لگے۔ دیوار سے کوئی اشارہ نہیں مل رہا تھا۔

محاصرے کو ایک مہینہ گزر گیا اور ایک روز ابن مسعود نے دروازہ کھول دیا۔ دریا کا پانی اندر آ گیا۔ آگے چٹان کی اونچائی تھی اس لئے پانی وہاں تک محدود رہا۔ چٹان کو کٹ کٹ کر میڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ اچانک ایک آدمی ادھر آ نکلا اور اُس نے دروازہ کھلا دیکھا تو بلند آواز سے پوچھا کہ یہ دروازہ کس نے اور کیوں کھولا ہے۔ اس آدمی کی آواز اتنی بلند تھی کہ وہاں جو اور آدمی موجود تھے وہ بھی سن کر دوڑے آئے۔ وہ سات آٹھ تھے۔ وہ نیچے آئے تو ابن مسعود نے انہیں کہا اس نے یہ دروازہ آزمائش کے لئے کھولا تھا تاکہ ضرورت کے وقت اُنک نہ جائے۔

ان آدمیوں کو شک ہو گیا کہ یہ کوئی چال بازی ہے۔ ایک نے کہا کہ امام کو اطلاع دی جائے۔ اتنے میں ایک آدمی دوڑا آیا اور اس نے کہا کہ اس دروازے کا خیال رکھنا کیونکہ کچھ آدمی دریا کے کنارے چھپے ہوئے دیکھے گئے ہیں، ایسا نہ ہو کہ وہ دریا کے راستے ادھر آ جائیں۔

صورتِ حال ایسی پیدا ہو گئی کہ منزلِ آفندی اور بن یونس نے جوش میں آکر تلواریں نکال لیں اور ان آدمیوں کو لٹکرا۔ وہ تو حسن بن صباح کے خاص قسم کے جانباز اور قابلِ اعتماد آدمی تھے۔ انہوں نے بھی تلواریں نکال لیں اور اس جنگ جگہ میں خونریز معرکہ ہوا جس میں تین چار فدائی تو مارے گئے لیکن ابن مسعود، منزلِ آفندی اور بن یونس بھی مارے گئے اور انہیں ان آدمیوں نے باہر دریا میں پھینک کر دروازہ بند کیا اور مقتول کر کے حسن بن صباح کو جانتایا کہ وہاں کیا ہوا ہے۔

ابو نصر احمد پریشان ہو رہا تھا کہ ابھی تک اسے دیوار سے وہ اشارہ نہیں ملا جو اسے ابن مسعود نے بتایا تھا۔ وہ اُس طرف چلا گیا جہاں اس کے وہ جانباز انتظار میں بیٹھے تھے جنہیں دریا میں اتر کر اس دروازے تک پہنچنا تھا۔

ابو نصر احمد نے بڑا ہی غلط حکم دیا۔ وہ یہ کہ ایک آدمی کو دریا میں اترنے کو کہا کہ وہ پیچھے چلا جائے اور دیکھے کہ دروازہ کھلا ہے یا نہیں اور وہاں سے ایک کشتی میں بیٹھ کر واپس آئے۔ اُس نے اپنی طرف سے شاید ٹھیک ہی سوچا تھا کہ ایک یا دو آدمی ایک دو کشتیاں لے آئیں اور یہ پارٹی یہاں بیٹھنے کی بجائے اس دروازے کے قریب جا کر کشتیوں میں بیٹھی رہے لیکن جب وہ آدمی دریا میں اترتا تو تھوڑی ہی دور جا کر اُس نے چننا چلانا شروع کر دیا کیونکہ ہلکی ہلکی بر فباری شروع ہو گئی تھی اور دریا کا پانی ناقابلِ برداشت حد تک بگڑ گیا تھا۔ وہ آدمی اکڑ گیا اور یہ دیکھا کہ وہ ہاتھ پاؤں نہیں مار رہا تھا۔ دریا اسے ساتھ ہی لے گیا۔

ابو نصر نے ایک آدمی ضائع کر کے محسوس کیا کہ کشتیوں کے بغیر کوئی آدمی اس دروازے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے واپس اپنے سالاروں کے پاس آکر کہا کہ کچھ آدمی دور اوپر دریا کے کنارے کنارے بھیجے جائیں اور کہیں سے ایک دو کشتیاں لے کر آئیں۔ آدمی بھیج دیئے گئے۔

محاصرے کی ایک اور رات آئی اور رات کو ایسی شدید بر فباری شروع ہو گئی جو پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہلکی بر فباری کو تو سلجوقی فوج برداشت کرتی رہی لیکن مسلسل بگڑتے ٹھنڈ میں رہ کر فوجیوں کے جسم اکڑتے جا رہے تھے۔

رات بھر بر فباری جاری رہی اور بڑھتی ہی گئی۔ صبح ہوئی تو دنیا کا یہ خطہ سفید چادر میں ڈھک گیا تھا۔ گھوڑے بھی کانپ رہے تھے۔ درخت بھی برف کے بوجھ سے جھک

رہے تھے۔

حسن بن صباح کو بڑا اچھا موقع مل گیا۔ وہ دیوار پر چڑھا اور دونوں بازو پھیلا کر بڑی ہی بلند آواز سے کہا — ”اے آسمان، تُو نے مجھے زمین پر اتارا تھا۔ اب ایسا قبربرسا کہ تیرے اتارے ہوئے امام کے یہ دشمن اکڑا کر ختم ہو جائیں۔“

حسن بن صباح کی یہ پکار اور للکار سلجوقی فوج کے حوصلے پست کرنے لگی اور الموت کے شہریوں کے حوصلے مضبوط ہونے لگے۔ قدرت نے حسن بن صباح کو بڑا اچھا موقع فراہم کر دیا تھا۔ بر فباری رک ہی نہیں رہی تھی اور زمین پر برف کی تہہ بنتی جا رہی تھی۔ جو فوٹل کے حساب سے بلند ہو رہی تھی۔

ابو نصر احمد ایسا مجبور ہوا کہ اُس نے محاصرہ اٹھالیا اور اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا۔ تب اسے پتہ چلا کہ اس کی فوج کی کچھ نفری اس قدر اکڑ گئی ہے کہ اس کے لئے چننا یا گھوڑے پر سوار ہونا ممکن نہیں رہا۔ گھوڑوں کی حالت بھی بگڑ گئی تھی۔ بڑی ہی بُری حالت میں سلجوقی فوج وہاں سے ناکام نکلی۔



سلطان محمد کے وزیر اعظم ابو نصر احمد کے جذباتی فیصلے نے اپنی فوج کو کچھ عرصے کے لئے بیکار کر دیا۔ یہ تو جسموں کا معاملہ تھا کہ برف نے جسم بیکار کر دیئے تھے لیکن ذہنی طور پر بھی یہ فوج کچھ عرصے کے لئے لڑنے کے قابل نہ رہی۔ فوج میں جو لوگ تھے، وہ عالم فاضل تو نہیں تھے کہ سمجھ جاتے کہ یہ تو موسم ہی بر فباری کا تھا اور اب کے بر فباری زیادہ ہی ہوئی، وہ یقین کر بیٹھے کہ یہ حسن بن صباح کا معجزہ ہے کہ اُس نے آسمان تک اپنی آواز پہنچائی اور آسمان نے برف گرا کر سلجوقی فوج کو بھگا دیا۔

فوج کی جسمانی حالت تو جلدی ہی ٹھیک ہو گئی لیکن ذہنی اور نفسیاتی طور پر فوج نہ سنبھل سکی۔ اپنی شکست کی خفت مٹانے کے لئے بھی فوجیوں نے انواہیں پھیلائی شروع کر دی تھیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ حسن بن صباح نبی یا امام نہ سہی، اس کے ہاتھ میں کوئی ایسی آسمانی طاقت ضرور ہے جس سے وہ بڑی سے بڑی فوج پر بھی مصیبت نازل کر کے اسے شکست دے سکتا ہے۔ فوج کا لڑنے کا جذبہ اور حوصلہ جسے آج کی زبان میں مورال کہتے ہیں، ان انواہوں سے بڑی ہی بُری طرح مجروح ہو رہا تھا اور ایسی بددلی پھیل گئی تھی کہ وہ لوگ جو رضا کارانہ طور پر فوج میں شامل ہوئے تھے، وہ فوج سے نکلنے

سلطان محمد نے یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ پریشان ہو گیا۔ وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ اللہ کے سپاہی کی تو یہ شان تھی کہ وہ دنیا کے لالچ اور ہوس کو الگ پھینک کر لڑا کرتا تھا اور اس کے پیشِ نظر اللہ کی خوشنودی ہوا کرتی تھی لیکن اس فوج کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اس میں اللہ کے خوف کی بجائے حسن بن صباح کا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے ابو نصر احمد کو وزارت سے تو برطرف نہ کیا لیکن فوج کے ساتھ اس کا تعلق توڑ دیا اور فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس نے سالاروں کو بلایا اور انہیں کہا کہ وہ اپنی فوج میں دینی جذبہ پیدا کریں جو مجاہد کا جذبہ ہوتا ہے اور فوج سے حسن بن صباح کا خوف ختم کریں۔

سالاروں نے اپنی سی کوششیں شروع کر دیں۔ سلطان محمد نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ چند دنوں کے وقفے سے پوری فوج کو ایک جگہ اکٹھا کر کے خطاب کیا کرتا تھا۔ علمائے دین کی خدمات بھی حاصل کی گئیں جنہوں نے وعظ، خطبوں اور آیاتِ قرآنی سے فوج کے ذہن سے حسن بن صباح کے متعلق وہم اور وسوسے نکالنے شروع کر دیئے۔ یہ بڑا ہی صبر آزما اور دقت طلب عمل تھا جس کے اثرات نہایت ہی آہستہ آہستہ پیدا ہو رہے تھے۔

سلطان محمد نے ادھر اور سالار اور یزی نے اور شاہ در میں سلطان سخر نے بھی مشاہدہ کیا کہ حسن بن صباح کے جو اثرات ختم ہونے شروع ہو گئے تھے وہ پھر سامنے آنے لگے ہیں۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اور ہی زیادہ ضروری ہو گیا تھا کہ الموت پر فوج کشی کر کے حسن بن صباح کو ختم کیا جائے۔ اسلامی نظریات اور دین کے دیگر عقیدے تو اپنی جگہ اہم تھے ہی مگر اس صورتِ حال نے سلطنتِ سلجوقیہ کی بقا کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

سات آٹھ سال گزر گئے تب جا کر فوجِ ذہنی بلکہ روحانی طور پر تیار ہوئی۔ فوج میں سے بے شمار لوگوں کو نکال دیا گیا تھا اور بے شمار نئے لوگوں کو بھرتی کیا گیا۔ اس نئی نفری میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس نوجوان نفری کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کیا گیا تھا۔

سلطان محمد نے بڑے ہی گہرے غور و فکر سے اور ہر پہلو کو سامنے رکھ کر محاصرے کا منصوبہ تیار کیا جس میں سالاروں کے مشورے اور ان کی تجاویز بھی شامل تھیں۔ سلطان

محمد نے محاصرے کا بنیادی اصول یہ دیا کہ قلعے پر چڑھائی کرنی ہی نہیں نہ آگے بڑھ کر دروازے توڑنے ہیں بلکہ شہر میں داخل ہونے کی ذرا سی بھی کوشش نہیں کرنی بلکہ یہ کرنا ہے کہ شہر کو محاصرے میں لے کر بیٹھ جانا ہے خواہ یہ محاصرہ سالوں تک لمبا ہو جائے۔

ایک روز مرو سے فوج نکلی۔ اس کا رخ الموت کی طرف تھا۔ کچھ نفری دسم کوہ سے بلوا کر اس میں شامل کی گئی تھی اور کچھ نفری شاہ در سے بھی بلوالی گئی تھی۔ اس فوج کا سپہ سالار امیر نوش گین شیر گیر تھا۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ یہ سپہ سالار جذبات کے جوش میں آنے والا نہیں تھا بلکہ ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرنے کا عادی تھا۔ یہ اس کی بنیادی قوی تربیت تھی اور اس میں دوہری صلاحیت پائی جاتی تھی جو ایک کامیاب سپہ سالار کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

اس فوج نے الموت کو محاصرے میں لے لیا۔ سلطان محمد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ محاصرہ صرف تین اطراف ہو سکتا ہے۔ وہ فوج کا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے رات کو بھی باہر گھومتا پھرتا اور فوجیوں کے ساتھ باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے نمونیہ ہو گیا اور بایسوں نے بہت کوشش کی اور اسے مرو چلنے کو بھی کہا لیکن اس نے فوج کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

پانچ چھ دن ہی گزرے ہوں گے کہ سلطان محمد کی یہ بیماری اچانک اتنی بڑھ گئی کہ طبیب بھی کچھ نہ کر سکے اور سلطان محمد فوت ہو گیا۔

جب فوج میں یہ خبر پھیلی کہ سلطان کا انتقال ہو گیا ہے تو یکفخت فوج میں بد امنی سی پھیل گئی۔ سپہ سالار امیر نوش گین شیر گیر نے یہ صورت حال دیکھی تو اس نے محاصرہ اٹھالیا۔ فوج اس حالت میں واپس آئی کہ اس کے ساتھ سلطان محمد کا جنازہ بھی تھا۔ اس طرح اب کے بھی الموت صاف بچ گیا اور حسن بن صلیح اس پر قابض رہا۔

○

سلطان سنجر کو شاہ در میں سلطان محمد کے انتقال کی خبر پہنچی تو وہ بھگم بھاگ مرو پہنچا۔ اوہر دسم کوہ سے سالار اور یزی بھی آگیا اور جہاں جہاں امیر مقرر تھے وہ سب آگئے۔ سب حیران اور پریشان تھے کہ یہ کیا ہوا کہ سلطان کا انتقال ہو گیا اور فوج محاصرہ اٹھا کر واپس آگئی۔

سالار اور یزی اور ابو نصر احمد حیران تھے کہ ابن مسعودؓ منزل آفندی اور بن یونس الموت گئے تھے لیکن انہوں نے کچھ بھی نہ کیا اور واپس بھی نہ آئے۔ ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا کہ حسن بن صباح نے تینوں کو اپنا جادو چلا کر فدا لئی بنا لیا ہو گا۔

اب تو وہاں صورتِ حال ایسی بن گئی تھی کہ ایک دو یا چند ایک افراد کا کسی کو خیال ہی نہیں آ رہا تھا۔ اب تو سلطنتِ سلجوقیہ خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ سنجاب پوری سلطنت کا سلطان ہو گیا تھا۔ اُس کا سب سے بڑا بھائی برکیارق پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ اُس نے حکم جاری کر دیا کہ الموت کو ہر قیمت پر فتح کرنا ہے اور پوری کی پوری فوج کو تیار کر کے الموت لے جایا جائے اور محاصرے کو طول دینے کی بجائے چٹان پر جا کر شہر پر یلغار کی جائے۔

ایک بار پھر فوج کو تیار کیا جانے لگا۔ ادھر حسن بن صباح ایک بار پھر پہلے والے جوش و کمال میں آ گیا۔ وہ خود اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ اسے خدا نے کوئی مافوق الفطرت طاقت دے رکھی ہے کہ الموت کے محاصرے کے لئے جو بھی آتا ہے اُس پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے کہ وہ اپنی فوج کو واپس بھگالے جاتا ہے۔

سنجر کچھ زیادہ جوشیلا سلطان تھا اور اس میں دلیری اور بے خونی سب سے زیادہ تھی۔ اُس پر انتقام کا جذبہ بھی غالب تھا۔ اُس نے ساری سلطنت کی فوج مَرُو اکٹھی کر لی اور اپنی نگرانی میں اس فوج کو تیار کرنے لگا۔

اس نے زیادہ انتظار نہ کیا۔ ایک سال کے اندر اندر وہ تمام کا تمام لشکر لے کر الموت جا پہنچا۔ قیادت اس نے پاس رکھی اور محاصرے کو مکمل کرنے کے پورے انتظامات کر دیئے۔

اُس کا خیمہ فوج سے ذرا دور الگ تھلگ تھا اور اس خیمے میں اس کا بستر زمین پر بچھایا جاتا تھا۔

محاصرے کو ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ سلطان سنجاب ایک صبح جاگا تو اس نے اپنے بستر کے قریب تکتے کی طرف ایک لمبا خنجر زمین پر گر ہوا پایا۔ اس کے دستے کے ساتھ ایک کانڈ بندھا ہوا تھا۔ وہ تو دیکھ کر ہی گھبرا گیا۔ خنجر کے دستے سے کانڈ کھول کر پڑھا۔ اس پر فارسی زبان میں حسن بن صباح کی طرف سے مختصر سا پیغام لکھا ہوا تھا جس کا ترجمہ یہ ہے — ”اے سلطان سنجاب! ہمیں یہ اذیت دینے سے باز آ جاؤ۔ اگر تمہارا پاس خاطر نہ ہو تا تو

یہ خنجر زمین میں گاڑنے کی بجائے تمہارے نرم سینے میں گاڑنا آسان تھا۔ یہ خنجر اور اس پیغام نے سلطان خنجر کو پسینے میں نہلا دیا۔ وہ کوئی ایسا ڈرپوک آدمی بھی نہ تھا لیکن وہ اس خیال سے ڈرا کہ اس کے اپنے محافظوں میں ایک یا دو فدائی موجود ہیں ورنہ کوئی پرندہ بھی سلطان کے خیمے کے قریب سے نہیں گزر سکتا تھا۔ اُس نے اُسی وقت سالاروں کو بلا کر یہ خنجر اور پیغام دکھایا کہ معلوم کیا جائے کہ فوج میں یا محافظ دستے میں کون باطنی فدائی ہے.... اُس نے یہ حکم دے تو دیا لیکن خود ہی بولا کہ ایسے آدمی کو ڈھونڈ نکالنا ممکن نہیں۔

سالار رخصت ہوئے ہی تھے کہ اُسے اطلاع دی گئی کہ حسن بن صباح کا ایک اہلچی ملنے آیا ہے۔ اُس نے اہلچی کو اپنے خیمے میں بلا لیا۔ اہلچی نے کہا کہ اسے شیخ الجبل نے صلح کی درخواست کے لئے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اپنی شرائط بتائیں۔

ایک بڑی قدیم کتاب ”نامہ خسرواں“ کے باب ”حالات حسن بن صباح“ میں یہ شرائط تفصیل سے لکھی ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان خنجر کا حوصلہ اس خنجر اور پیغام کو دیکھ کر ایسا مجروح ہوا کہ اس نے اہلچی کو اپنی شرائط بتائیں جو مختصراً ”یہ تمہیں کہ آئندہ حسن بن صباح کہیں بھی کوئی قلعہ تعمیر نہ کرے نہ کسی چھوٹے یا بڑے قلعے کو سر کرنے کی کوشش کرے۔ دوسری شرط کہ باطنی وہ اسلحہ اپنے پاس نہ رکھیں جو فوج کے استعمال کے لئے ہوتا ہے خصوصاً ”مخفیق“ تیسری شرط یہ تھی کہ حسن بن صباح اپنے فرقے میں نئے مرید شامل نہ کرے اور اپنی تبلیغ بند کر دے۔

اہلچی چلا گیا اور خاصی دیر بعد واپس آ کر اُس نے بتایا کہ شیخ الجبل نے تینوں شرائط تسلیم کر لی ہیں۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ حسن بن صباح کے لئے ان شرائط میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ اُسے کوئی قلعہ تعمیر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ باطنیوں نے کم و بیش پچاس قلعوں پر قبضہ جمار کھا تھا۔ فوجی اسلحہ اور سختیقتیں باطنیوں کے کسی کام کی نہیں تھیں۔ انہیں صرف ایک چھری یا خنجر کی ضرورت ہوتی تھی۔

تیسری شرط یہ تھی کہ حسن بن صباح اپنے فرقے کی تبلیغ بند کر دے۔ یہ شرط بھی اُس نے یہ سوچ کر مان لی کہ وہ تو خفیہ طور پر بیعت لیا کرتا تھا۔ کسی کو اس کا ذکر نہیں چل سکتا تھا۔ اس کی تبلیغ بھی زیر زمین یعنی خفیہ طور پر ہوتی تھی۔

سلطان خنجر نے تحریری معاہدے پر اپنی مہر لگائی اور حسن بن صباح نے بھی اپنے

ستھپ کئے اور محاصرہ اٹھالیا گیا۔

فدائیوں نے اپنی قتل و غارت کی کارروائیاں پھر شروع کر دیں۔ ایک دو سال ہی گزرے تھے کہ حسن بن صباح انتقال کر گیا۔ وہ اٹھائیس ربیع الثانیہ 518ھ کے روز فوت ہوا تھا۔ اُس وقت اس کی عمر نوے سال تھی اور اُس نے 35 سال قلعہ الموت میں بیٹھ کر لوگوں کے دلوں پر حکومت کی تھی۔

اُس کی موت اُس کے فرقے کے لئے خاصی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اُس کے جانشین مقرر ہوتے رہے لیکن اس کا فرقہ تیس فرقوں میں تقسیم ہوتا چلا گیا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا باطنی فدائی کرائے کے قاتل بن گئے، جنہیں کسی بھی مذہب کے لوگ اپنے مخالفین کے قتل کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔

ان فدائیوں کو خیشین کہا جانے لگا کیونکہ یہ خیش کے بغیر جیسے زندہ ہی نہیں رہ سکتے تھے اور اسی نشے میں قاتلانہ کارروائیاں کرتے تھے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ انہوں نے صلاح الدین ایوبی پر چار مرتبہ قاتلانہ حملے کئے تھے۔ آخر تیمور نے آکر الموت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اس پر اسرار شہر کا نام و نشان ہی مٹا دیا۔ (ختم شد)



ADABI DUNIYA ادبی دنیا

PUBLISHER & BOOK SELLERS

510, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6
Ph.: 011- 23250122

